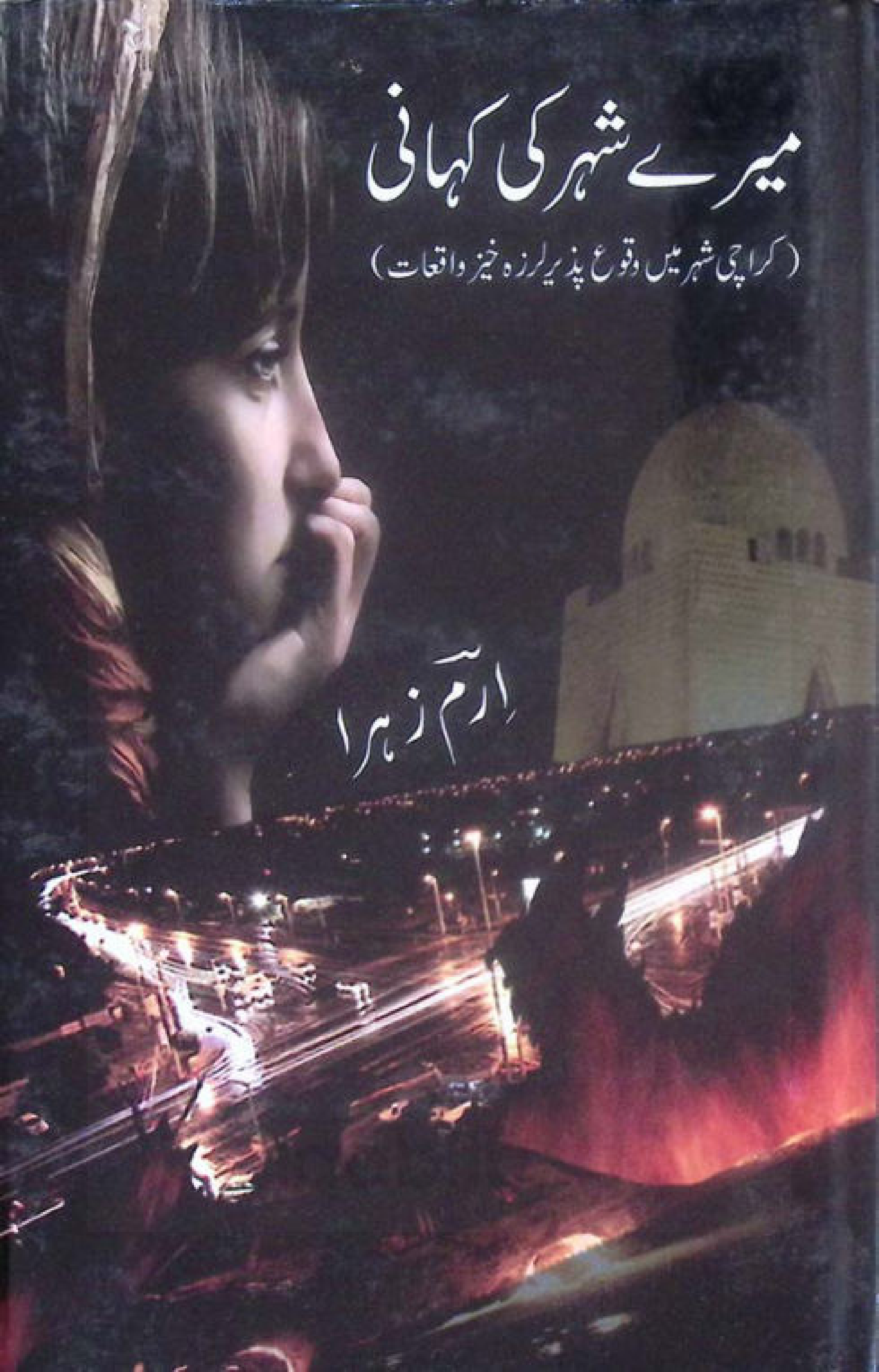

میرے شہر کی کہانی
(کراچی شہر میں وقوع پذیر لرزہ خیز واقعات)
ارم زہرا

میرے شہر کی کہانی

(کراچی شہر میں وقوع پذیر لرزہ خیز واقعات)

اِرم زہرا

ظفر اکیڈمی

نگرانِ اشاعت
شیرازی شاعر
0345-2610434

کتاب :	میرے شہر کی کہانی
کہانی کار:	اِرم زہرا
اشاعت :	جنوری/2014ء
کمپوزنگ:	رنگِ ادب
ناشر :	ظفر اکیڈمی، کراچی
ای میل :	rangeadab@Yahoo.com
تعداد :	500
صفحات :	464
قیمت :	RS 700

انتساب

اُس شخصیت کے نام

جنہوں نے وقت کی تُند و تیز ہواؤں میں

مجھے چلنے کا حوصلہ دیا ہے اور وہ

میرے والدِ گرامی

مرزا احمد لطیف

ہیں

نوٹ:

ان کہانیوں میں تمام تر کرداروں کے نام فرضی ہیں اگر کسی قسم کی کرداروں کے ناموں میں مماثلت پائی گئی ہو تو اس کے لیے ادارہ یا مصنف ذمہ دار نہیں ہوں گے۔

ادارہ

فہرست

پیش لفظ

میرا شہر کراچی عروس البلاد کے نام سے مشہور تھا۔ جس کی تازگی و خوبصورتی ہر نئے دن کے ساتھ بڑھتی تھی۔ جس کی روشن راتوں کی لوگ مثالیں دیتے تھے، جس کا سمندر دلہن کے بالوں میں چمکتی افشاں جیسا تھا اور سورج کی کرنیں فاختہ کی "ھو" کے ساتھ سمندر کے کناروں پر اترا کرتی تھیں اور میں اپنے اندر ایک جذب کی سی کیفیت لیے فاختہ کی اس "ھو" میں کھو جاتی تھی لیکن پھر اچانک یہ ہوا کہ فاختہ کی "ھو" کہیں کھوگئی۔ پانی کی ریشمی لہروں میں خون کی لکیریں نظر آنے لگیں وہ لہریں جو سنگیت کی پائل پہنے دور تک مدھر گیت سناتی چلی جاتی تھیں ان لہروں میں ڈوب کر خودکشی کی جانے لگی، نرم مٹی کی سوندھی خوشبو سے لہو کی بُو آنے لگی اور پھر جب ڈوبتا سورج سمندر کے پانی میں سینکڑوں فانوس روشن کرنے کے بجائے ندامت کا اظہار کرنے لگا اور کالی رات افسردگی کے عالم میں اپنا ستاروں سے بھرا آنچل پھیلانے لگی تو مجھے یقین ہوگیا کہ میں عدم تحفظ اور بے یقینی کے عالم میں ہوں۔ میرے گرد ہولناکیاں پھیلتی جارہی ہیں اور اب روشنیوں کا شہر تیزی سے تاریکیوں میں ڈوبنے لگا ہے۔ ہر طرف دہشت و وحشت کا بازار گرم ہونے لگا ہے اور میں غیر محسوس انداز میں اس کی تپش کا شکار ہونے لگی ہوں اور پھر گزرتے وقت کے ساتھ ان ہی گرم ہواؤں نے مجھے سیاسی شعور دینا شروع کردیا اور میرے احساسات کو توانائی اور گہرائی عنایت کی جس سے میرے وجدان کا چمن خزاں کا روپ اختیار کرگیا۔ روشنیوں کا شہر کراچی فقط لاشوں کا شہر بن گیا تب میں نے اس ظلم کے

خلاف اپنی آواز کو الفاظ کا روپ دینا شروع کیا کیوں کہ میں جانتی ہوں نقار خانے میں طوطی کی آواز کون سنتا ہے!!

یوں میرے قلم نے ظلم و جور کے روزنامے کو تاریخ کا حصہ بنانا شروع کر دیا۔ جو خاندان معاشرے میں جیتے جی مر رہے تھے، جن کا کوئی پُرسانِ حال نہیں تھا۔ جن کی صدائیں سننے والا کوئی نہیں، مجھے ان کے لیے کچھ کرنا تھا۔ مجھے کچھ ایسا لکھنا تھا جو پڑھنے والوں کو اک لمحے کے لیے ہی سہی یہ سوچنے پر مجبور کر دے کہ ہم جیتے جاگتے شہر میں نہیں بلکہ پتھروں کے دور میں واپس چلے گئے ہیں۔ جہاں بے حسی ہمارے جیسے افراد کو نگل رہی ہے شاید یہ تحریریں پڑھ کر کسی دردمند کو یہ خیال ستانے لگے کہ آخر کیوں ہمارے احساسات مردہ ہو چکے ہیں۔ کیوں ہمارا معاشرہ استدلال سے عاری ہو گیا ہے۔ شاید ان تحریروں کی رسائی ارباب اختیار تک ہو جائے اور وہ شہر بے اماں کے لیے امان ڈھونڈ سکیں۔ امن کی فاختہ کو واپس لا سکیں۔ مجھے میرے شہر کے لیے آگے بڑھنا تھا، مجھے حق کی خاطر لڑنا تھا۔ مجھے قلم سے جہاد کرنا تھا اور ہاتھ میں قلم تھام کر ایسے، ایسے پُر خطر راستوں پر چلنا تھا جہاں مظلومیت کسی ہمدرد کی منتظر ہو......!!

اور پھر سچی کہانیوں کی تلاش میں سفر کرتا میرا قلم ہر اس واقعہ پر چلتے، چلتے تھما ہے جب انسانیت بربریت کا نشانہ بنی، میرے قلم کی سنہری نوک کبھی کسی ماں کی دکھ بھری داستان لکھ رہی ہوتی تو کبھی بوری میں بند لاش پر تاسف کا اظہار کر رہی ہوتی۔ کہیں سفاک باپ شراب کے نشے میں اپنی بیٹیوں کو گولی مار دیتا تو کہیں کوئی باپ اپنی بیٹیوں کو مہنگائی کے باعث موت کے منہ سُلا دیتا۔ کہیں ٹارگٹ کلنگ نوجوانوں کو قبروں میں اتار دیتی تو میرے قلم کی نوک کے نیچے الفاظ تڑپنے لگ جاتے، کہیں خودکش حملہ تو کہیں پھول سے چہرے والی معصوم شفیقہ کا قصہ، ایسے بہت سارے واقعات میرے قلم سے نوحے کا روپ دھارتے رہے اور میں اس بے حس معاشرے کے ان چہروں کو بھی بے نقاب کرتی رہی جو کبھی میڈیا کی آنکھ سے دور رہے یا قانون کی گرفت میں آنے کے بعد معاشرے کی آنکھوں سے اوجھل ہو جاتے مگر میری کہانیوں نے ان کرداروں کو تاریخ کے سیاہ روپ میں بدل دیا۔

کاش کہ میں "میرے شہر کی کہانی" میں شہر کراچی کے قصیدے لکھتی مگر افسوس ظلم و جبر، معاشرتی ناہمواریوں اور بے حسی نے مجھے میرے شہر کا مرثیہ لکھنے پر مجبور کر دیا۔ یہ کہانیاں، سچی کہانیاں ڈائجسٹ کراچی میں "میرے شہر کی کہانی" کے عنوان سے چار سال تک شائع ہوتی رہیں اور یہ سلسلہ اتنا مشہور ہوا کہ ایک ٹی وی چینل نے باضابطہ اس بات کا اعتراف کیا کہ سچی کہانیاں کی رائٹر ارم زہراء نے قبرستانوں سے انسانوں کی ہڈیاں چرانے کی نیوز بریک کی، میری یہ کہانی "یہ کیسا کاروبار ہے" کے عنوان سے موجود ہے۔

آج جب یہ کہانیاں کتابی شکل میں آنے کے لیے تیار ہیں تو دل شدتِ غم سے یہ سوال کر رہا ہے کہ میں یہ کیسی کہانیاں تاریخ کے حوالے کر رہی ہوں؟

مگر کیا کروں، روشنیوں کے شہر پر لہو کی بارش مسلسل جاری ہے۔ امن و امان کا موسم بدل چکا ہے۔ سازش کرنے والے اپنا کام کر چکے ہیں اسی لیے میرے قلم کے آنسو قرطاس پر دم توڑ رہے ہیں۔ یہ کہانیاں تحریر کرنے کا مقصد یہی تھا کہ خدارا اب بھی وقت ہے اپنے ہاتھوں سے اپنے چمن کو تباہ کرنے کے بجائے کوئی سدباب کوئی حل ڈھونڈیے۔

شہرِ قائد آپ کا آشیانہ ہے اور اپنے گھر کو جلانا کہاں کی عقل مندی ہے؟؟ میرے شہر کی ہر کہانی کے آخر میں یہی اُمید افزا پیغام ہے جس کی جانب آپ کی توجہ اور اربابِ اختیار کی نظر ضروری ہے۔

میں نے اپنے حصے کی مشعل روشن کر دی ہے۔ اس سے مزید شمعیں جلانا اب آپ کا کام ہے۔

آخر میں سچی کہانیوں کے اس سفر میں، "سچی کہانیاں" کے ایڈیٹر ناصر رضا اور منیجنگ ایڈیٹر منزہ سہام مرزا کی میں دل سے مشکور ہوں۔ یہ سلسلہ "سچی کہانیاں ڈائجسٹ" میں باقاعدگی سے چار سال تک جاری رہا جسے ان کی محبت اور قارئین کی پسندیدگی نے بامِ عروج پر پہنچایا۔ اس کے ساتھ ہی میں اپنے فیملی ممبرز، پاپا "مرزا احمد لطیف"، تینوں بہنوں، "انعم زہرا"، "بشریٰ زہرا"، "صنوبر وسیم"، پیاری باجی "پروین جمال" اور اماں جانی "نصرت قمر زیدی" کی تہہ دل سے شکر گزر ہوں، اتنے پیارے رشتوں کا ساتھ میرا مان ہے۔

ایک ہی سال میں، میرا معاشرتی، اصلاحی ناول "چاند میرا منتظر" کے بعد "میرے شہر کی کہانی" لانا میرے لیے ناممکن تھا۔ اس کو ممکن بنانے کا سہرا معروف شاعر و نثر نگار محمد ایوب صابر کے سر جاتا ہے۔ ان کی علمی و ادبی کاوشوں کی میں ہمیشہ ہی معترف رہی ہوں۔ ساتھ ہی میں ادب نواز شخصیت و شاعر اپنے ماموں محترم کامرانؔ مرزا اور محمد ندیم کی ممنون ہوں جو میری حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔

اور آخر میں رنگِ ادب کے ناشر شاعر علی شاعرؔ کی میں دل سے شکر گزار ہوں جنہوں نے میری کتاب کی اشاعت کو قابلِ عمل بنایا۔

قارئین! آپ نے میرے ناول "چاند میرا منتظر" کو جس طرح پسند کیا اور میری حوصلہ افزائی کی، میں اُمید کرتی ہوں اِسی طرح "میرے شہر کی کہانی" کو بھی اپنی آراء سے نوازیں گے۔

دعاؤں کی متمنی

اِرمؔ زہرا

erumzehra8@hotmail.com

اندھیرے میں شمع

ایک حقیقی قلمکار وہی ہے جو اپنے قلم سے عصری مسائل کو سطحِ قرطاس پر لاتا ہے ۔جب یہ آلام و مصائب اخبارات ،رسائل اور کتب کے صفحات پر ابھرتے ہیں تو کسی نہ کسی وسیلے سے اربابِ اختیار تک رسائی حاصل کر لیتے ہیں۔قلمکار اِن مسائل کو زیرِ بحث لا کر معاشرے کے درد بانٹنا چاہتا ہے۔

ارمؔ زہراء کی تصنیف "میرے شہر کی کہانی" دراصل پاکستان کے سب سے بڑے شہر کراچی میں وقوع پذیر واقعات و حادثات کا احاطہ کرتی ہے۔عروس البلاد کہلانے والا روشنیوں کا شہر تقریباً ربع صدی سے آگ میں جل رہا ہے۔کبھی ان واقعات کو لسانی رنگ دیا جاتا ہے تو کبھی فرقہ واریت سے جوڑ دیا جاتا ہے۔لوگ کہتے تھے کہ کراچی ماں کی طرح ہے جو اپنے کسی بچے کو بھوکا نہیں سونے دیتی۔وہی غریب پرور شہر آج شہرِ بے امان میں تبدیل ہو چکا ہے۔خدا کا شکر ہے آج کراچی کے مسائل حل کرنے کی جانب سنجیدگی سے پیشرفت ہو رہی ہے۔

ارمؔ زہراء کی یہ کتاب امن کے ہاتھوں وقت کے دروازے پر دستک ہے۔یہ کتاب ایسے وقت پر شائع ہو رہی ہے جب تمام طبقات کراچی کے مسائل حل کرنے کی خاطر سر جوڑ کے بیٹھ رہے ہیں۔ اِن حالات میں ارمؔ زہراء کی یہ کاوش روشنیوں کے شہر میں ایک شمع کی حیثیت رکھتی ہے ۔ارمؔ زہراء نے سچے واقعات کو رپورٹنگ سے زیادہ تخلیقی انداز میں رقم کیا

ہے۔ انہوں نے کہانیوں میں مسائل کی نشاندہی کی ہے اور کہانی جب اپنے اختتام کی حد چھونے لگتی ہے تو اس میں حل بھی تجویز کیا گیا ہے۔

مجھے اس کتاب کو پڑھ کر حیرت ہوئی کہ ارم زہراء نے کرائم رپورٹنگ کو کس طرح افسانوی انداز میں بیان کیا ہے۔ اس کے باوجود کہانی کا اصل واقعہ اور تحقیقی مواد پورے اہتمام کے ساتھ مہیا کیا ہے۔ اس طرح ارم زہراء نے نئے قلمکاروں کے لئے ایک نیا دروازہ کھول دیا ہے۔ کرائم رپورٹنگ کو افسانوی انداز کا جامہ پہنانا ایک مشکل کام ہے جسے ارم زہراء نے آسانی سے کرلیا ہے۔ میں پورے وثوق سے کہتا ہوں کہ ارم زہراء ایک قدرتی قلمکار ہیں۔ ان کی سوچ کا زاویہ منفرد اور بلند ہے۔ جو مقام انہوں نے حاصل کیا ہے وہ صرف ان کی جداگانہ سوچ کا مرہونِ منت ہے۔

"میرے شہر کی کہانی" پڑھنے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ اس کتاب کو ضبطِ تحریر میں لانے کے لئے انہوں نے خود کس کربناک راستے سے اپنا سفر طے کیا ہے، جہاں ہر قدم پر پاؤں کانٹوں سے الجھتے ہوں وہاں جہدِ مسلسل سے چلتے رہنا ایک کارنامے سے کم نہیں۔ انہوں نے ہر ایک کہانی کو تحریر کرتے ہوئے کتنی دفعہ اپنی پلکوں کی منڈیر ٹشو پیپر سے خشک کی ہوگی۔ میں ان کو کتاب کی اشاعت پر مبارکباد پیش کرتا ہوں اور ان کی مزید کامرانیوں کے لئے دُعا گو ہوں۔

محمد ایوب صابر

سیالکوٹ

اعتراف

میرے ادارے پرل پبلی کیشنز سے آرم زہراء کا رشتہ جس پہلی تحریر سے جڑا تھا' اُسے پڑھ کر میں نے جو پہلی رائے قائم کی تھی' وہ یہ تھی کہ آرم زہراء قلم' قرطاس اور الفاظ کی دنیا میں بہت آگے جائیں گی اور پھر ایسا ہی ہوا۔

ماہنامہ ''دوشیزہ'' میں افسانے ہوں یا پھر ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کے لیے زندگی سے جڑی سچ بیتی کی تلاش' آرم زہراء نے خود کو قاری سے بہت بھرپور انداز میں منوایا ہے۔ میرے ادارے سے شائع ہونے والے مقبول ماہنامے ''سچی کہانیاں'' میں آرم زہراء کے سلسلے ''میرے شہر کی کہانی'' کو جو مقبولیت اور شہرت حاصل ہوئی ہے' وہ آرم زہراء کی صلاحیتوں کی منہ بولتی تصویر ہی نہیں' ایک ایسا سچا اعتراف بھی ہے جو یہ بتا رہا ہے کہ آنے والے وقت میں آرم زہراء اور بھی زیادہ نام اور مقام حاصل کریں گی۔

مستقبل کے اس خوبصورت سفر کے لیے میری تمام اچھی تمنائیں اور نیک خواہشات' آرم زہراء کے ساتھ ہیں۔

منزہ سہام

مینجنگ ایڈیٹر ماہنامہ ''سچی کہانیاں''

نیا سفر

ارم زہراء بہت اچھا ہی نہیں، نہایت سچا بھی لکھتی ہیں، ان کا تحریر کردہ ہر منظر اور مکالمہ زندگی کے آئینے میں عکس کی صورت نظر آتا ہے...... ''میرے شہر کی کہانی'' 'سچی کہانیاں' کا وہ کامیاب اور مقبول سلسلہ ہے۔جس نے لاکھوں قارئین کے دلوں اور ذہنوں کو اپنا اسیر بنایا ہوا ہے۔ارم زہراء اس سلسلے میں معاشرے سے کشید کی گئی ایسی سچائیاں، الفاظ کے روپ میں پیش کررہی ہیں، جن کے کردار میرے، آپ کے اور ہمارے اردگرد سانس لیتے ہیں، یہ بات میرے لیے نہایت مسرت کا باعث ہے کہ''سچی کہانیاں'' کا یہ کامیاب اور مقبول سلسلہ اب ارم زہراء کی کتاب کی صورت قارئین کے سامنے آرہا ہے...... ارم زہراء کو''کتاب'' کی دنیا کی طرف یہ قدم مبارک ہو...... دُعا ہے کہ اس سفر میں ارم زہراء کو کامیابی سے جڑی بہت سی منزلیں نصیب ہوں۔

ناصر رضا

سابق ایڈیٹر''سچی کہانیاں''

کہانیاں

رسموں کے غلام

اس کے ہاتھ میں آج کا اخبار تھا جس میں تین کالم کی خبر کے ساتھ ایک دوشیزہ کی لہولہان چہرے والی لاش موجود تھی۔ وہ بہت تیزی سے گرفتہ دل کے ساتھ پوری خبر پڑھ رہا تھا۔ اگلی چند ساعتیں اس پر قیامت بن کر ٹوٹی۔ خبر میں سب سے اہم بات یہ تھی کہ قاتل غلطی کر بیٹھا..... اس نے بے ساختہ اپنا منہ دونوں ہاتھوں سے چھپایا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اسکی سسکیاں' بند کمرے کا گلا گھونٹ رہی تھیں مگر اب کوئی تریاق نہیں تھا جو اس کے صدمے کو دُور کر دیتا۔ وہ دیوانہ وار اپنا سر پیٹنے لگا۔

وہ کافی دیر تک یوں بیٹھا رہا جیسے اس کا دم اب نکلے کہ تب نکلے۔ اس کی خالی خالی آنکھوں میں صرف ایک تصویر جم گئی تھی اور جیسے سارے منظر اس کے لئے جل کر خاک ہو گئے۔ وہ بھولی معصوم خوبصورت سی جمیلہ' جس کا چہرہ وہ اپنی پلکوں میں چھپائے پھرتا تھا، آج اس کا چہرہ اخبار کے سینے کو لہو میں ڈبو گیا...... اس نے کرب کے عالم میں سائیڈ ٹیبل کی دراز کھولی۔ سب سے اوپر ہی نیلے رنگ کی ایک فائل رکھی تھی۔ اس کے ڈگمگاتے ہاتھوں نے بڑی مشکل سے فائل کور کھولا تو جمیلہ کا مسکراتا چہرہ اس کی نظروں کے سامنے آ گیا۔ پل بھر میں وہ جمیلہ کی تصویر اپنے سینے سے لگائے بیٹھا تھا اور پھر دیوانہ وار تصویر کے بوسے لے رہا تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ خود کو گزرے کل میں لے جائے اور وقت کی نہ رکنے والی گاڑی کی زنجیر کھینچ دے تاکہ حال والی منزل آ ہی نہ سکے۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ جمیلہ سے گزری کل ہونے والی ملاقات ان کی آخری

ملاقات ہوگی۔ وہ جمیلہ کی تصویر کو اپنے سینے سے لگائے بیٹھا تھا۔ ماضی کے ہر نقش سے گرد اُڑتی جارہی تھی۔ اس کی چبھتی لال آنکھوں میں ہر گزرا منظر نمایاں ہوتا جارہا تھا۔

O......O......O

''جمیلہ، مجھے ٹی وی کمرشل میں آنے والی ماڈلز بہت اچھی لگتی ہیں۔ ان کے گلابی گال، خوبصورت بال، نازک سا سراپا، انکی ادائیں، میرا دل چاہتا ہے، بس میں انہیں دیکھتا ہی رہوں۔'' یہ کہتے ہوئے اکبر شاہ کے لبوں کی تراش میں ایک مبہم سی مسکراہٹ رقصاں تھی جبکہ لہجہ دھیما اور کھویا کھویا سا تھا۔

''اچھا.... ''جمیلہ نے بڑے ہی اشتیاق اور پُر شوق لہجے میں 'اچھا' کو کھینچا اور کھلکھلا کر ہنس دی۔

''تم میرا مذاق اُڑا رہی ہو؟'' اکبر شاہ نے منہ بسورا تھا۔

''نہیں تو میں آپ کے شوقِ نظر کی داد دے رہی ہوں۔'' جمیلہ کے لبوں پر پھیلی دل فریب مسکراہٹ نے اکبر شاہ کو اپنے حصار میں لے لیا۔

''اچھا جی، اُڑاؤ، اُڑاؤ، خوب اُڑاؤ میرا مذاق، لیکن یہ بھی تو ایک حقیقت ہے کہ میرے نیناں جس حُسن کی تلاش میں تھے' مجھے وہ تمہاری صورت مکمل طور پر مل گیا ہے۔'' ......اکبر شاہ نے یہ کہتے ہوئے گہری سانس بھری اور بھرپور نگاہوں سے جمیلہ کی طرف دیکھا تو اس کا دل جیسے معمول سے ہٹ کر دھڑک اٹھا۔ اسے ایک دم اپنے دل کے گلستان میں پھول ہی پھول مہکتے محسوس ہوئے۔

اکبر شاہ وہ پہلا لڑکا تھا جس نے جمیلہ کے درِ دل پر دستک دی تھی اور جیسے وہ بھی بے دھیانی میں قفل کھول بیٹھی تھی ورنہ تو وہ لڑکوں سے دُور بھاگتی تھی۔ کالج میں کتنے ہی لڑکے اس کی دوستی کے خواہاں تھے مگر وہ خاموشی سے نظریں جھکائے اپنا راستہ ناپتی ؛ ''نو لفٹ'' کا سگنل دیتی نکل جایا کرتی لیکن جب سے اکبر شاہ، جمیلہ کی کلاس میں آیا تھا، اس کے لئے جمیلہ کے دل میں نرمی کا گوشہ اپنے آپ جگہ بناتا چلا گیا تھا، شاید اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ اکبر شاہ لیٹ ایڈمیشن تھا، اب تک اس کی کسی سے دوستی نہیں ہوئی تھی اس لئے اس نے کلاس کی سب سے

لائق فائق لڑکی جمیلہ کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا تو وہ انکار نہیں کر سکی اور پڑھائی کے سلسلے میں اسکی مدد کرنے لگی.... نوٹس کے ساتھ جذبات' احساسات اور نظروں کا تبادلہ بھی شروع ہو گیا۔ تب جمیلہ کو احساس ہوا کہ متاثر ہونے کا یہ احساس دو طرفہ ہے اور یوں ان کی دوستی کی کونپل یونیورسٹی کے زیر سایہ نمو پانے لگی۔

O......O......O

وہ ایک چمکیلی دوپہر تھی جب جمیلہ کلاس اٹینڈ کر کے کینٹین کی طرف بڑھ رہی تھی کہ پیچھے سے تیز تیز چلتے قدموں کے احساس نے اسے پلٹ کر دیکھنے پر مجبور کر دیا، اکبر شاہ سگریٹ کا دھواں اُڑاتا جیسے اس کے تعاقب میں تھا۔

"خیریت؟" جمیلہ ٹپٹائے ہوئے انداز میں اس سے مخاطب ہوئی۔

"کیسی ہو؟ میں تمہیں ڈھونڈتا ہوا یہاں تک پہنچا ہوں۔ آؤ چلو اندر چلیں۔" کینٹین کی جانب ہاتھ کا اشارہ کرتے ہوئے اکبر شاہ آگے بڑھا جبکہ جمیلہ اس کے کپڑوں سے اٹھتی پر فیوم کی مہک سے مسحور ہوتی کینٹین میں داخل ہو گئی۔

اکبر شاہ ایک میز منتخب کر کے جمیلہ کے لئے کرسی کھینچتا ہوا اس کے چہرے کے تاثرات کا بغور جائزہ لیتے ہوئے بیٹھ گیا۔

"جمیلہ، میں سچ سچ تم میں انٹرسٹڈ ہوں، تمہیں اپنانا چاہتا ہوں۔"

"جانتی ہوں۔" وہ رازداری سے بولی۔

"میں چاہتا ہوں، تم پہلے میرے ساتھ میرے گاؤں چلو، میرے ماں باپ سے ملو، وہاں کا رہن سہن دیکھو پھر اس کو بعد جو چاہو، فیصلہ کرلو، مجھے منظور ہوگا۔" وہ بہت جذباتی لہجے میں جمیلہ سے مخاطب تھا۔

"تمہارا تعلق گاؤں سے ہے؟" جمیلہ حیرانی سے سوال کر بیٹھی۔ ایک پل میں جیسے اکبر شاہ نے جیسے اس کی سوچوں کو اتھل پتھل کر ڈالا تھا۔

"ہاں۔" انتہائی سچائی کے ساتھ اقرار کیا گیا۔

"تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا؟" جمیلہ الجھ سی گئی۔

"تم نے کبھی پوچھا ہی نہیں۔" اکبر اپنے منتشر بالوں کو سلجھاتے ہوئے بولا۔

جمیلہ گومگو کی کیفیت میں سر جھکائے بیٹھی تھی اسے کیا پتا تھا جس شخص کی محبت میں وہ گرفتار ہے، اس کا تعلق پسماندہ دیہی معاشرے سے ہے، جو رسم و رواج کی قید میں اور جاگیردار، وڈیروں کی خواہش کے تابع ہوتا ہے۔ وہ اب تک جس محبت پر اترایا کرتی تھی، وہ ایک پل میں اسکے لئے آکٹوپس بن گئی، جس میں وہ خود کو جکڑا محسوس کر رہی تھی۔

"کیا تمہاری محبت خوبصورت جذبوں کے بجائے شاہانہ طرزِ زندگی، خوبصورت عالیشان گھر اور عیش وعشرت کے راستوں سے ہوتی ہوئی شہرِ دل میں داخل ہوتی ہے۔" اکبر شاہ کی پیشانی پر چند تفکر کی لکیریں اُبھر آئی تھیں۔

"نہیں تو...." جمیلہ ایک دم سے الجھ پڑی تھی یا شاید وہ اپنی سوچوں کا گلہ دبانے کی کوشش کر رہی تھی، ایک طویل عرصے سے جو خوف دامن گیر تھا، آج وہ سر اُٹھائے پھن مارنے کیلئے تیار تھا۔

پسماندہ سماج، قبائلی رسم ورواج اور جاگیردارانہ سلوک کی پھیلی شاخیں جو عورت کے نرم و نازک وجود کو خاکستر کر دیتی ہیں، اسے وڈیروں جاگیرداروں سرداروں سے سخت نفرت تھی جہاں عورتوں کو مردوں کی غیرت کا نشان سمجھا جاتا ہے، جہاں عورتوں کو دوسرے درجے کی شہری گردانا جاتا ہے اکی تو جیسے کوئی حیثیت ہی نہیں ہوتی، دل چاہے تو قبر میں زندہ دفنا دیا اور جب دل چاہے تو کوڑے برسا دیئے۔ جائیداد کی تقسیم ہونے سے بچانے کیلئے زندہ و جاوید لڑکی کی قرآن پاک سے شادی کر دی جاتی ہے۔ تو کبھی کاروکاری کی بھینٹ چڑھا دیا جاتا ہے۔ جوتوں کی نوک پر عورت کو رکھنے والا قبائلی مرد سینہ تان کر جانے کیسے زمین پر تن کر چلتا ہے؟ ایک پل کو اس کی روح کانپ گئی اور آنکھوں میں نمی سی اُتر آئی۔ "کیا اکبر شاہ بھی ایسا ہی ہوگا؟ فطرت بہت مشکل سے بدلتی ہے"۔ ایک پل میں اکبر شاہ کیلئے اس کا دل راستہ بدل گیا۔

"کیا ہوا؟" اکبر شاہ خفیف سی حیرت کا اظہار کر رہا تھا۔

"جب جذبات اور خواہشات موت کی دہلیز پر کھڑے ہوں تو کیا ہوتا ہے؟" وہ گیلی لکڑی کی طرح سلگ کر بولی۔ اس کی آنکھوں میں جلن سی ہونے لگی۔ "نہیں میں ایسی سوسائٹی

میں کبھی قدم نہیں رکھوں گی۔ میرے خیالات اور میرے افکار آسمان پر کمند ڈالنے والے ہیں۔ میں کیوں، کیسے اور کس لئے پر یقین رکھتی ہوں۔ اس پسماندہ گاؤں میں میرے سوالات کے جواب دینے والا کون ہوگا؟'' اس نے خیالات کو یکلخت جھٹک دیا۔ چہرے سے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ کسی نتیجے پر پہنچ گئی ہے۔

اکبر شاہ کو شاید ایسے انقلاب کی اُمید نہیں تھی۔ وہ حیران پریشان سا جمیلہ کا چہرہ تک رہا تھا جہاں ایک رنگ جا رہا تھا اور دوسرا آ رہا تھا۔

''میں اب جانا چاہتی ہوں۔'' جمیلہ آہستہ سے بولی۔

''آؤ میں تمہیں چھوڑ دوں۔'' اکبر نے پیشکش کی۔

''نہیں، میں خود چلی جاؤں گی۔'' یہ کہہ کر جمیلہ تیزی سے اٹھی اور پھر اس نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔

O......O......O

کتنی پرسکون، خوبصورت، خوابوں جیسی زندگی گزر رہی تھی۔ اکبر شاہ نے جیسے پرسکون جھیل میں پتھر ڈال کر سب کچھ منتشر کر ڈالا۔ ایک لمحہ اس کی زندگی کو نیا رُخ دے گیا۔ اس کی سوچوں کے زاویے یکسر بدل گئے تھے۔ وہ ایک ماڈرن لڑکی تھی۔ شہری آسائشوں کی دلدادہ، ترقی پسند سوچ کی حامی، اس کا بھلا پسماندہ رواج سے کیا تعلق ہو سکتا تھا جہاں ابھی تک عورت کی زندگی کا نام مرد کی غلامی ہے۔

مگر اکبر شاہ کے جذبات، کیا مجھے ان کو روندنے کا حق ہے۔ کیا اکبر شاہ کے ساتھ میرا رویہ دُرست ہے؟ وہ ایک بھرپور انسان ہے، اس کے احساسات، اس کی محبتیں، اس کا خلوص سبھی کچھ تو معتبر ہے، وہ قابل ستائش ہے..... جمیلہ مذمت کرتے کرتے، اپنا دفاع کرتے کرتے، اس کے حق میں رائے دیتے دیتے، تھکنے لگی وہ بے اختیار دونوں گھٹنے سمیٹ کر ان کے گرد بازو ڈال کر ہری ہری گھاس پر بیٹھ گئی۔ یونیورسٹی کا یہ لان اسے ہمیشہ سے ہی پسند تھا، مگر آج وہ جس انقلاب کی زد میں آئی ہوئی تھی اس انقلاب نے اس کی ساری سوچوں کو، اس کی پسند ناپسند کو منتشر کر دیا تھا۔

"کب تک مجھ سے بھاگتی رہو گی؟" اکبر شاہ دونوں بازو سینے پر باندھے پیچھے کھڑا تھا۔ اس کے جنون اور دیوانگیوں کا طوفان کب تھم گیا۔ یہ تو اسے بھی نہیں پتا چلا۔ وہ خالی خالی نظروں سے اکبر شاہ کو دیکھتی رہی۔

"جمیلہ پلیز، یوں غیریت تو مت برتو میں کب سے کھڑا تمہارا انتظار کر رہا ہوں، میری جان پر رحم کرو۔ پلیز دیکھو، یہ زیادتی ہے۔" بے تابی اکبر شاہ کی نس، نس میں بسی تھی۔

"اکبر شاہ، میری اور تمہاری سوچوں میں محبت کے جذبے کے علاوہ کوئی چیز بھی مشترک نہیں ہے۔" ایک لمحے کو اس نے جیسے اذیت کے ساتھ آنکھیں میچ لیں۔ "میں آج کے ماڈرن، جدید ترقی یافتہ دور کی دلدادہ ہوں اور تم ابھی تک گاؤں کی طرف جانے والی پگڈنڈیوں کے راہی ہو۔ میرے اندر کچھ کر گزرنے کا جذبہ موجزن رہتا ہے اور تم ابھی تک مویشی کھیت، کھلیان اور فرسودہ رسم و رواج میں گم ہو؟" قطرہ قطرہ جمع کی ہوئی ہمتیں بالآخر کام آ رہی تھیں۔ "اکبر شاہ، تم خود سوچو، تم مجھ سے کیسے توقع رکھ سکتے ہو جب میں دلہن بن کر تمہارے گاؤں میں جاؤں گی تو سب سے پہلے میں تمہارے چوہدری، وڈیرے، جاگیرداروں کو سلام کرنے جاؤں؟ اس طرح کے جاگیرداروں کو میں نے ہمیشہ اپنی جوتی کی نوک پر رکھا ہے، تم ان وڈیروں کو اپنا مائی باپ کہتے ہو۔ میرا مائی باپ تو میرا اللہ ہے۔ یقیناً تمہیں میری باتوں سے بغاوت کی بو آ رہی ہو گی۔ ہاں، میں باغی ہوں فرسودہ روایات سے، سماج پر شخصیات کی بالادستی سے، بغاوت میری نس نس میں پیوست ہے۔ مجھ جیسی لڑکی کو نہ تمہارا معاشرہ قبول کر سکتا ہے، اور نہ تمہارے گھر والے، اس لئے بہتر یہی ہے، تم بھی بغاوت کر دو، پگڈنڈیوں کے راستے چھوڑ کر پختہ سڑک پر آ جاؤ جس کی چکاچوند روشنیاں اندھیروں کو پچھاڑ رہی ہوتی ہیں جو زندگی کی ضمانت ہیں اور اگر یہ سب کچھ نہیں کر سکتے تو تمہیں کیا ضرورت ہے کہ تم اعلیٰ تعلیم حاصل کرو، عارضی طور پر شہر میں رہو اور پھر مویشیوں کے باڑے میں لوٹ جاؤ؟"

اکبر شاہ، جمیلہ کی باتیں سن رہا تھا' سناٹے میں آ گیا۔ اس کو توقع نہیں تھی جسے وہ چھوٹی سی معصوم لڑکی سمجھتا تھا، وہ کس طرح اپنی سوچ اور خیالات میں چٹان کی طرح مضبوط ہے اسے آج اپنی کم مائیگی کا احساس شدت سے ستانے لگا۔ وہ جمیلہ کو کھونا نہیں چاہتا تھا۔ اس

کے ذہن میں ایک طوفان برپا تھا۔

"ہاں تم یہ سب کہنے میں حق بجانب ہو، کہو اور بھی کچھ کہو، جی بھر کر مجھے لعن طعن کرو۔ اچھا ہے اپنے دل کی بھڑاس نکال لو اور پھر ٹھنڈے دل سے میری بات سنو، دیکھو جمیلہ! دنیا میں وہ سب کچھ نہیں ہو جاتا جس کی انسان خواہش کرتا ہے، کچھ مجھے اور کچھ تمہیں اپنے اصولوں سے ہٹ کر بھی فیصلے کرنے ہوں گے۔ دیہی معاشرہ اتنا بھی برا نہیں جس قدر تم نفرت کا اظہار کر رہی ہو۔ وہاں بھی انسان بستے ہیں، معصوم اور سیدھے سے۔ کھیت اور کھلیان مجموعی طور پر معاشرے کی زندگی کی ضمانت ہوتے ہیں۔ اگر انسان اپنے سماج سے مویشیوں کو منفی کر دے تو خود سوچو معاشرہ کتنا بے حس ہو جائے گا۔ جانور بہت معصوم ہوتے ہیں، ہمیں محنت کے گُر سکھاتے ہیں۔ ذرا تصور کرو کہ جب تم سرسبز و شاداب کھیتوں سے گزرو گی تو وہ تصور تم زندگی بھر نہیں بھلا سکو گی۔"

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے، تم میری باتوں سے یہ سمجھ رہے ہو کہ شاید میں گاؤں کے رہنے والے لوگوں سے نفرت کرتی ہوں، ایسا ہرگز نہیں ہے، انسان جہاں پر بھی ہے، وہ میرے لئے قابل قدر ہے۔ میں تو صومالیہ اور کینیا کے سیاہ فام باشندوں کا بھی احترام کرتی ہوں اس لئے کہ ہمیں تو قرآن پاک انسانیت سے پیار کا درس دیتا ہے۔ ہمارے حقیقی مذہب میں دیہی معاشرے کی طرح دشمنیاں نسل در نسل نہیں چلتیں۔ یہی تو المیہ ہے کہ دیہی سماج کو ایک کوزے میں بند کر دیا گیا ہے اور یہ کوزہ ایک دن ضرور پاش پاش ہوگا۔" وہ جذباتی لہجے میں بولتی چلی گئی۔

"نہیں میرا یہ مقصد نہیں تھا، میرا اور تمہارا ساتھ دو دلوں کا ملاپ تو ہے ہی مگر میں تمہیں محبت کرنے والے ایسے لوگوں میں لے جانا چاہتا ہوں جو تمہیں پوجنے کی حد تک عزت و احترام کا درجہ دیں گے۔" اکبر شاہ کے اعصاب پر بڑا بھاری حملہ ہوا تھا۔ وہ انتہائی دل گرفتگی سے کہہ رہا تھا۔

"جی نہیں، اس عزت و احترام کے پیچھے موجود اس جذبے کو تم کیسے ختم کرو گے جہاں عورت کا تصور ہی آدھے انسان کا ہے؟ اس معاشرے میں تم مجھے پیار و محبت کی لوریاں دے رہے ہو۔" جمیلہ نہایت تلخ لہجے میں بولی۔

''پلیز جمیلہ، ایسے تو نہ کہو، میرے جذبات کا قتل یوں تو نہ کرو، میں تم سے محبت کرتا ہوں، کیوں میرا مذاق اُڑائے جا رہی ہو؟'' اکبر شاہ نے روٹھے لہجے میں اسے ٹوکا۔

''مجھے کچھ نہیں سننا''۔ جمیلہ اس کے اتنے تحمل پر بالکل بھی حیران نہ ہوئی اور اٹھنے لگی مگر اکبر شاہ نے اس کے ہاتھ کو مضبوطی سے تھاما اور اس کے سامنے بیٹھ گیا...... ''دیکھو اکبر شاہ، میں یونیورسٹی میں پڑھتی ہوں۔ نصاب کی وہی کتابیں پڑھتی ہوں جو تم پڑھتے ہو لیکن میرے اور تمہارے درمیان افکار کا ایک نا ختم ہونے والا تضاد موجود ہے، میں ہر بات کا سائنسی پہلو مدنظر رکھتی ہوں اور تم ایک چھوٹے سے سماجی دائرے سے باہر نکلنے کیلئے تیار نہیں۔ اکبر شاہ، آج انٹرنیٹ کا دور ہے، الیکٹرانک میڈیا نے آج کے انسان پر ادراک کے وہ دروازے کھولے ہیں کہ آج اسے کرۂ عرض اپنے قدموں تلے نظر آتا ہے۔ شاید تم ابھی تک گلوبل ولیج کے معنی ہی نہیں سمجھ سکے۔ ایسے میں گاؤں جانا تو بہت دُور کی بات، ہم دونوں شہر میں بھی کسی ایک نقطے پر اتفاق نہیں کر سکیں گے۔ میں تمہیں مخلصانہ مشورہ دوں گی کہ تم اپنی دنیا میں لوٹ جاؤ یا پھر میری دنیا میں آجاؤ جہاں تحقیق ہے، تجربہ ہے اور انسانیت کی بھلائی کے لئے بے شمار منصوبے ہیں جس میں تمہارے کھیت کھلیان بھی آجائیں گے اور تمہارے مویشیوں تک کی نسلیں سدھر جائیں گی۔''

''بس بھی کرو۔'' اکبر شاہ متردد سا، ٹھکرایا سا، یکدم نظر انداز کر دینے والا بھی نہ تھا مگر جمیلہ نے اس کے اعصاب پر جو وار کئے تھے، وہ ڈھے سا گیا اور اب اس پر وارفتانہ، دیوانہ وار، التفات وہ بھی ایک بشر ہی تھا.... ''جمیلہ، میرا اعتبار کرو، میں تمہارے سنگ چل کر اپنے اندر بہتری پیدا کرنا چاہتا ہوں۔''

''اب بس....'' اس سے پہلے کہ جمیلہ کچھ اور بولتی، اکبر شاہ نے اس کے ہونٹوں پر انگلی رکھ دی۔

''پلیز جمیلہ، میرا یقین کرو، میں کوشش کروں گا تمہاری توقعات پر پورا اترنے کی، تم صحیح کہہ رہی ہو، مجھے بھی ان فرسودہ روایات سے بغاوت کرنی چاہیے۔ اسکے لئے میں تمہاری مدد کا طلب گار ہوں، جمیلہ، میں تمہاری محبت سے مجبور ہوں۔ پلیز، مجھے یوں نہ ٹھکراؤ''...... ایک پل میں ہی احساس کمتری اکبر شاہ کے چہرے پر نمایاں تھی۔ کچھ حسد اور کچھ رشک کی

آگ میں جلتا وہ جمیلہ کو منانے کی کوشش میں ہر امتحان سر کرنے کے لئے تیار تھا۔

''گو کہ دنیا میں جنت کا وجود ناممکن ہے مگر میں تمہارے لئے ایک چھوٹا سا جنت نما گھر بنا سکتا ہوں جس میں ہماری دنیا آباد ہو جہاں بس ہماری محبت پروان چڑھے جہاں صرف اور صرف خوشیاں ہمارا مقدر ہوں جہاں پسماندہ اور شہری روایت سے الگ ہماری محبت کی قدریں زیادہ بلند ہوں جہاں صرف تم ہو اور میں ہوں۔''..... اکبر شاہ کا لہجہ اس کے پختہ اور بلند عزائم کی دلیل تھا۔ دیکھو، میں وہ سب کچھ کروں گا جو تم چاہتی ہو۔ مانا کہ میرا تعلق پسماندہ دنیا اور اس کے رسوم و رواج سے ہے مگر شہر میں تعلیم حاصل کرنے سے میری سوچوں میں اتنی تو وسعت ہے کہ میں تمہاری رائے کا احترام کرسکوں۔'' اکبر شاہ کسی پجاری کی طرح ایک دم اس کے آگے دوزانو ہو کر بیٹھ گیا اور جمیلہ کا دل سوکھے پتے کی طرح لرز کر رہ گیا۔ اکبر شاہ اس کے ضبط اور ارادوں کی تمام تر دیواروں کو گراتا ہوا آگے، بہت آگے اور بہت آگے بڑھ رہا تھا۔ اس کے تمام تر مدافعتی ہتھیاروں کو ناکام بناتا ہوا کسی فاتح جنرل کی طرح اس کے دل کے دروازے پر کھڑا تھا۔ جمیلہ نے ایک شکست خوردہ سی نظر اکبر شاہ پر ڈالی تھی جو بظاہر اس کے قدموں میں بیٹھا تھا۔ تشنہ اور امید افزا نگاہوں سے تکتا ہوا مگر درحقیقت فاتح تھا۔ اس کی کچھ کہنے کی کوشش اندر ہی دم توڑ گئی اور وہ پُر اُمید سی اکبر شاہ کو تکنے لگی۔

O......O......O

زندگی واپس اپنی ڈگر پر آ چکی تھی۔ اکبر شاہ اب جمیلہ کے انداز سے سوچنے لگا تھا۔ اسے جمیلہ کی صورت زندگی گزارنے کا نیا ڈھنگ مل گیا تھا اکبر شاہ چاہتا تھا جیسے ہی تعلیمی مدارج اختتام پذیر ہوں، وہ دونوں ازدواجی بندھن میں بندھ جائیں۔ خود جمیلہ بھی رضامند ہوگئی تھی مگر اس کی شرط اپنی جگہ قائم تھی کہ وہ شادی کے بعد شہر میں ہی رہے گی اور اس کی یہ خواہش یا شرط من وعن اکبر شاہ نے قبول کر لی تھی۔ وہ اکبر شاہ کی زندگی کی سب سے خوبصورت شام تھی جب وہ جمیلہ کا ہاتھ تھامے اس کے سامنے بیٹھا تھا۔ جمیلہ کے رخساروں پر سرخی اُمڈ رہی تھی جس سے اس کی قلبی کیفیت کا اندازہ ہو رہا تھا، مارے شرم کے اس کی نظریں اپنے ہاتھوں پر جمی تھیں جو اکبر شاہ کی قید میں تھے۔

"میں تمہارے ہر قول کا احترام کروں گا، جو کہو گی، وہ مانوں گا، بس ایک بار میری ہو جاؤ، شریک زندگی تو ہو ہی، شریک حیات بھی بن جاؤ" اکبر شاہ نے مقناطیسی پُر شوق نگاہیں جمیلہ کے چہرے پر جما دیں..... جمیلہ نے دونوں ہاتھوں سے چہرے کو چھپایا اور گہرے گہرے سانس لینے لگی "اگر میں تمہارے ممی پاپا سے بات کروں تو کیا وہ تمہارے گھر کے قریب ہی کوئی کرائے کا فلیٹ ڈھونڈ لیں گے؟" لہجہ سوالیہ تھا مگر انداز محبت سے بھرا ہوا تھا۔

"جی یقیناً۔" اس نے چور نظروں سے اکبر شاہ کو دیکھا۔

"کم آن جمیلہ یار، تم کتنی بولڈ ہو لیکن اس وقت بالکل روایتی لڑکیوں کی طرح شرما رہی ہو۔ پتا ہے ایسے تو میرے گاؤں کی لڑکیاں شرماتی ہیں۔" اکبر شاہ کا قہقہہ فضا میں گونج اٹھا۔

"بہت خوب، اڑا لیں مذاق میرا۔ اب تمہاری باری ہے" جمیلہ نے زور سے اس کے بازو پر گھونسا مارا۔

"اچھا، تمہارے والدین راضی ہو جائیں گے.... بلکہ یوں کریں انہیں یہیں کراچی لے آئیں، ہم انہیں اپنے ساتھ رکھ لیں گے۔" جمیلہ کے لہجے میں وثوق تھا۔

"ہاں ڈیئر، ضرور، کچھ ایسا ہی کریں گے، ویسے میرے اماں، ابا تو راضی ہیں ایک بار تو چلو گی ناں! ان سے ملنے پھر بے شک مت جانا؟" اکبر شاہ کے لہجے میں التجا تھی۔

"ہاں ضرور، کیوں نہیں۔" وہ شولڈر پر پڑے آڑے ترچھے بالوں کو پیچھے کرتے ہوئے بولی۔

"تمہارے ممی پاپا کے ساتھ بات ہو جائے تو میں گاؤں سے بابا سائیں کو بلا لوں گا پھر باقی کی فارمیلیٹی وہ پوری کریں گے کیوں میڈم، اب تو تم خوش ہو؟" اکبر شاہ نے ایک مسکراتی نظر اس کی آنکھوں پر ڈالی جہاں پلکوں کی جھالر پھر سے آنکھوں پر جھک چکی تھی۔

"افوہ پھر وہی شرمیلی مسکراہٹ؟"

"او کے پھر جلدی سے تمہارے گھر مٹھائی کے ساتھ آتا ہوں"۔ یہ کہہ کر اکبر شاہ نے بائیک اسٹارٹ کی اور تیزی سے نکل گیا جبکہ جمیلہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی گھر کی جانب چلنے لگی۔ آج معمول سے ہٹ کر دل دھڑک رہا تھا عجب سرور تھا جس پر اس کے قدم محو رقص

تھے۔اپنی شادی کا احساس اس کے اندر سے پھوٹ رہا تھا۔آج کے ان خوبصورت لمحات کا تصور اس کے اندر مہک رہا تھا کاش کہ یہ لمحات امر ہو جائیں ،کاش کہ میں ان ہی احساسات میں جکڑی رہوں ،کاش کہ یہ وقت یہیں رک جائے کہ ایسے میں اس کی پشت پر پھیلے بالوں کو کسی نے مٹھی میں جکڑ لیا اور پھر ایک جھٹکے سے اسے زمین پر گرا دیا۔جمیلہ کچھ سمجھ ہی نہیں سکی ۔ابھی اس نے مڑ کر حملہ کرنے والے کی شکل بھی نہ دیکھی تھی کہ اس شخص نے پستول نکال کر جمیلہ کے سر کے پیچھے فائر کر دیا۔گولی سیدھی جمیلہ کے دماغ میں اُتر گئی ۔اور ارمانوں سے بھرا دل پل بھر میں دھڑکنا بھول گیا۔

جمیلہ کے گرد ایک ہجوم تھا۔اب اس شخص نے منہ کے بل زمین پر پڑی ہوئی جمیلہ کے مردہ جسم کو سیدھا کیا تو اس کی آنکھیں پتھرا چکی تھیں اور زندگی کوسوں دُور جا چکی تھی ۔قاتل نے جونہی جمیلہ کے چہرے کی طرف غور سے دیکھا ،اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا ’’اوہ خدایا......! یہ میں نے کیا کیا؟ یہ میری بھتیجی عذرا تو نہیں؟‘‘ اسی لمحے لوگوں کا ہجوم اس قاتل شخص پر ٹوٹ پڑا۔اسی دوران ہجوم میں سے کسی شخص نے پولیس کو اطلاع کر دی ،قاتل اور مشتعل لوگوں کے درمیان ابھی ہاتھا پائی جاری تھی کہ پولیس موبائل کے سائرن کی آواز کانوں میں آنے لگی۔

ایدھی فاؤنڈیشن ایمبولنس جائے وقوعہ پر پہنچ چکی تھی ۔جمیلہ کا جسد خاکی ایمبولنس میں رکھا گیا اور پولیس نے ابتدائی قانونی کارروائی مکمل کی اور یوں ایک حسرت ویاس کی کہانی کا اختتام ہوگیا۔

آج نہیں تو کل، قاتل یقیناً اپنے انجام کو پہنچ جائے گا مگر کیا یہ دیکھتی آنکھیں اور یہ اندھا قانون بے گناہ جمیلہ کی حسرتوں بھری زندگی لوٹا سکے گا؟ جمیلہ روشن خیال اور جدید دور کے تقاضوں کے مطابق اپنی زندگی کے بارے میں خواب دیکھتی رہی جس کی سوچ فرسودہ روایات اور جاگیردارانہ سوچ کے خلاف تھی ،اس نے کبھی اپنی زندگی میں سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ کسی اور کی غلطی کی پاداش میں قبائلی رسم و رواج کی بھینٹ چڑھ جائے گی...... عذرا جس نے اپنے آبائی علاقے کی دیہی سوسائٹی میں بغاوت کا علم بلند کیا تھا ،پسند کی شادی کرنا کوئی جرم تو نہیں، عذرا شادی کے بعد نامعلوم شہر کی چکا چوند روشنیوں میں کہاں گم ہوگئی؟ نہیں معلوم اور اسے کیا پتا

تھا کہ اس کے بغاوت کی قیمت ایک بے گناہ لڑکی کے قتل پر چکائی جائے گی؟ عذرا اگر اپنے گھر سے فرار نہ ہوتی تو وہ یقیناً قبائلی رسم و رواج کی دہلیز پر پھانسی چڑھا دی گئی ہوتی، اس کے قاتل چچا سجاد نے پولیس کو یہ بیان دیا کہ...... ''مجھے اس بات کا دکھ بہت ہے کہ میں نے اپنی قبائلی روایات اور غیرت کے تقاضے کے مطابق قدم اٹھایا تو عذرا کے دھوکے میں ایک بے گناہ لڑکی قتل ہوگئی۔ میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ کوئی اور لڑکی بھی عذرا جیسی ہو سکتی ہے؟ وہ مجھے پشت سے اپنی بھتیجی عذرا جیسی ہی نظر آئی تھی۔ اے کاش، مجھے کہیں عذرا مل جائے تا کہ میں اس کی جان لے کر اپنے قبائلی معاشرے کی سربلندی کا فریضہ سر انجام دے سکوں۔ جب تک عذرا زندہ ہے، میں زندہ لاش کی طرح جیل کی سلاخوں کے پیچھے اپنی رہائی کا انتظار کروں گا اور جیل سے باہر آ کر عذرا کو قتل کر کے اپنے قبیلے کی رسم و رواج اور غیرت کے تقاضوں کو پایۂ تکمیل تک پہنچاؤں گا۔ اس طرح جمیلہ کے خونِ ناحق کی قیمت عذرا کا خون بہا کر ادا ہو جائے گی۔''

ادھر جمیلہ کا جنازہ قبرستان کی جانب رواں تھا، کلمہ شہادت کی آوازیں آ رہی تھیں، جمیلہ کی المناک موت پر ہر آنکھ اشکبار تھی، جنازے میں ایک خوبرو نوجوان کی سسکیاں بھی صاف سنائی دے رہی تھیں، یہ نوجوان اکبر شاہ تھا جس نے جمیلہ کی خاطر اپنی روایات سے بغاوت تک کی ٹھان لی تھی، اسے کیا معلوم تھا کہ جمیلہ کو انجانے میں، کسی غلط فہمی میں، انہی روایات کی بھینٹ چڑھا دیا جائے گا' جن سے وہ ڈرتی تھی۔

اکبر شاہ کے کانوں میں جاگیردارانہ سماج کے خلاف نفرت انگیز جملے اور الفاظ گونج رہے تھے۔ اس نے جنازے کے گہوارے کو مضبوطی سے تھام لیا اور بڑبڑایا'' جمیلہ میں آج بغاوت کا اعلان کرتا ہوں میں اکیلا تو کچھ نہیں کر سکتا لیکن اب میرے سماج میں جاگیرداری، وڈیرہ شاہی اور قبائلی فرسودہ روایت کے خلاف جو بھی آواز اٹھے گی وہ میری آواز ہوگی، جمیلہ تم گواہ رہنا۔''

گلستان جوہر کے ایک فٹ پاتھ پر رونما ہونے والے اس واقعہ کو درجنوں افراد نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ میں نے تو بس اس کہانی کے کرداروں کو زبان عطا کی ہے۔

☆......☆......☆

آخر قصور کیا تھا

میں یہ بات بہت اچھی طرح سے جانتی اور مانتی ہوں کہ بیکار لوگوں کے دلوں میں شیطان فوراً اپنا گھر بسا لیتا ہے۔اسی لئے مجھے بے کار بیٹھنے سے سخت چڑ ہے۔خواہ مخواہ کے الٹے سیدھے خیالات وتو ہمات دل کو میلا کرتے رہتے ہیں اور پھر اپنے نفس کے ساتھ جو مکالمے ہوتے ہیں ، وہ الگ دل کو پریشان کر دیتے ہیں۔اکثر اوقات تو مجھے اپنا نفس بھی شیطان کا پیروکار لگتا ہے۔اپنے نفس کے مخالف چل کر یقیناً سکون ملتا ہے۔یہ بات درست ہے۔نفس کی پاکیزگی ، اپنے اعمال کا محاسبہ ، نیکی کی طرف گامزن میرا ہر قدم مجھے شیطانی کاموں سے روک دیتا ہے لیکن کیا اس کے بعد بھی شیطان سے میں محفوظ ہوں؟ میرا اپنا یہ سوال تب پانی کے بلبلے کے مصداق ٹھہرا، جب میں نے سائرہ بی بی سے ام کلثوم کی کہانی سنی۔میں ہمیشہ سے یہی سوچتی آئی ہوں کہ عورت کا جہاد اگر اس کے نفس سے ہو تو معاشرے کے لئے بہترین مثال بن سکتی ہے کیونکہ عورت سے معاشرہ تشکیل پاتا ہے۔پاک کالونی کی حدود میں سائرہ بی بی مجھے زاروقطار روتی ہوئی نظر آئیں۔میرے دلاسوں نے ان کو ہمت عطا کی اور جو کچھ انہوں نے اپنی بھانجی کے بارے میں مجھے بتایا پھر اس پر میری ریسرچ مجھے سچی کہانیوں کے اوراق تک لے آئی۔

O.....O.....O

”آج میں بہت خوش ہوں ۔میری اکلوتی بیٹی کی شادی ہے۔“ محمد عمر نے خوشی سے

اپنی بیوی خالدہ کے ہاتھوں کو تھاما۔’ہاں جی، میں بھی بہت خوش ہوں۔بس میری یہی دعا ہے کہ کلثوم ہمیشہ خوش رہے۔کبھی بھی غم کی پرچھائیں اس تک نہ پہنچے۔‘‘ خالدہ بیگم نے اپنی خوشی اور دعاؤں کا برملا اظہار کیا جبکہ کمرے کے ایک کونے میں گوشہ نشیں کلثوم گھونگھٹ نکالے، اپنی پل پل کروٹ لیتی سوچوں میں گم تھی۔ کبھی خوش آئند تصورات کا سورج جگمگانے لگتا تو کبھی خوف کی زرد رات دھند کی طرح اسے اپنی لپیٹ میں لے لیتی مگر سوچوں کے اس کھیل میں خوش آئند تصورات کا پلڑا بھاری تھا، چونکہ اس نے ہمیشہ خوش حال زندگی کے خواب دیکھے تھے۔ کچھ ہی دیر میں ’بارات آئی، بارات آئی‘ کا شور آنگن میں گونجا..... اور پھر کلثوم ماں باپ کی دعاؤں کے سنگ اختر کے گھر رخصت ہوگئی۔

اختر ایک خاموش طبیعت انسان تھا۔کلثوم کے ماں باپ نے یہی سمجھا کہ اختر اپنے کام سے کام رکھنے والا شریف انسان ہے۔مگر اختر سے شادی کے بعد کلثوم نے جانا کہ اختر ایک گھنا آدمی ہے۔جو خاموشی سے وار کرتا ہے۔شادی کے کچھ دن تو ہنسی خوشی گزر گئے مگر پھر اختر اپنی اصل روش پر آگیا۔شاید اسے کلثوم کے کچوکے لگا کر سکون ملتا تھا۔وہ بلا جواز کلثوم کو تشدد کا نشانہ بناتا اور پھر اسے روتا بلکتا چھوڑ کر گھر سے باہر نکل جاتا۔اذیت پسند اختر نے کلثوم کی زندگی میں دکھ اور اذیت بھر دی اور یوں شادی سے پہلے خوشنما خوابوں کی چادر بُننے والی کلثوم مستقبل کے سہانے خوابوں کی کرچیاں سمیٹتی اپنے خوابوں کو رستا دیکھ رہی تھی۔

ابھی شادی ہوئے چھ ماہ کا قلیل عرصہ ہی گزرا تھا کہ والدین کو اپنی بیٹی کی حالت پر رحم آگیا اور وہ ام کلثوم کو گھر واپس لے آئے۔بیٹی کی بری حالت نے ماں کو غم کا روگ لگا دیا اور پھر وہ یہ روگ لگائے اس دنیا سے رخصت ہوگئی۔اس کے بعد باپ نے داماد سے بیٹی کے لئے طلاق کا مطالبہ شروع کر دیا۔

اختر ایک کینہ پرور شخص تھا۔اس نے کہا’ وہ ساری زندگی کلثوم کو لٹکائے رکھے گا۔طلاق نہیں دے گا‘۔اس صورت حال سے پریشان ہو کر باپ نے عدالت کا سہارا لیا،

جہاں تین ماہ کے بعد بالآخر کلثوم کو خلع مل گیا۔

شادی سے خلع تک کا سفر گو ایک سال کا تھا لیکن اس ایک سال میں کلثوم اپنی ماں کو کھو

بیٹھی۔باپ کو وقت سے پہلے بڑھاپے کا مرض لاحق ہو گیا اور خود اس کی روح پر جو گھاؤ لگے وہ اسے اندر ہی اندر ختم کرنے پر مصر تھے۔

'کلثوم تمہارا بابا اب بیمار رہنے لگا ہے۔بیٹی سمجھ میں نہیں آتا کہ تمہارے بارے میں فیصلہ کرنے میں ہم سے کہاں غلطی ہوئی تھی۔ہم تو اختر کو بہت اچھا انسان سمجھتے تھے مگر ......' محمد عمر نے نقاہت کے عالم میں کہا اور تاسف سے خلاء میں گھورنے لگے۔

'چھوڑیے بابا، یقیناً ماں باپ اپنی اولاد کے لئے بہتر سوچتے ہیں وہ کبھی نہیں چاہتے کہ ان کی بیٹی تکلیف میں رہے۔بس بابا جیسی میری قسمت، جو میرے نصیب میں لکھا تھا وہ ہی ہوا۔آپ خود کو الزام کیوں دیتے ہیں' کلثوم نے بابا کا سر اپنی گود میں رکھا اور آہستہ آہستہ دبانے لگی۔

'بیٹا جانے کیوں کچھ دنوں سے دل بہت گھبرا رہا ہے۔جب سے تمہاری ماں مجھے چھوڑ کر گئی ہے تب سے میں بالکل اکیلا ہو گیا ہوں۔دیکھو چندا زندگی اکیلے نہیں گزرتی۔میری زندگی کا کچھ پتا نہیں کب وقت میرا ساتھ چھوڑ دے اور قضاء سے میں کب تک بچوں گا۔جان جگر اگر تم کہو تو میں تمہارے لئے کوئی مناسب رشتہ دیکھوں؟' محمد عمر کی آنکھوں میں آنسو تھے اور لفظ ٹوٹ کر ادا ہو رہے تھے۔

'بابا مجھے شادی کے نام سے بھی نفرت ہو گئی ہے۔ناآسودگی، دکھ، اذیتیں جو کچھ میں نے سہا ہے وہ کانٹوں کی طرح تاعمر مجھے چبھتا رہے گا۔بابا اب دوسری شادی کا خیال تک مجھے ڈرا دیتا ہے۔کلثوم کی آنکھیں خوف سے پھیل گئیں۔

'نہیں مری بچی، خدا تمہارے دامن میں ڈھیروں سکھ کے پھول ڈالے۔ایسا نہیں سوچتے۔بس میرے چل چلاؤ کا اب وقت ہے یہ سوچ مجھے پریشان کر دیتی ہے کہ تم تن تنہا کیسے وقت گزارو گی؟'

وہ ضبط اور دکھ کے مراحل تیزی سے طے کرتی بابا کے جھریوں سے اٹے چہرے کو غور سے دیکھنے لگی۔اسے بابا کے کرب کا احساس شدت سے ہو رہا تھا مگر وہ خود بھی کیا کر سکتی تھی۔اس کے سارے ارمان ریت بن کر اس کے پیروں کی دھول بن چکے تھے۔بیٹا جواب تو

دو؟'' محمد عمر نے سوچتی ہوئی کلثوم کو مخاطب کیا۔

'جی بابا'۔وہ حقیقی دنیا میں لوٹ آئی۔

'بیٹا یاسین میرے دوست رحمٰن کا بیٹا ہے۔انہوں نے تمہارے حالات سننے کے بعد خود مجھ سے کہا ہے کہ اگر آپ چاہیں تو اپنی بیٹی کی شادی میرے بیٹے سے کر دیں۔کلثوم بیٹا یقیناً کچھ ایسے دکھ ہوتے ہیں جن کا ازالہ ممکن نہیں ہوتا مگر میری بچی کوشش ثمر آور ہوتی ہے۔' محمد عمر نے گہری سانس کھینچی۔

'بابا میں آپ کو سوچ کر جواب دوں گی'۔ کلثوم کی آواز آزردگی اور دل گرفتگی کے باعث دھیمی تھی۔

O......O......O

عورت اپنی خوشیوں بھری توقعات اور خواہشات اپنے جیون ساتھی سے منسوب کرتی ہے مگر کلثوم کے ساتھ جو ظلم ہوا جس طرح سے اس پر ستم ڈھائے گئے۔آج بھی ان کے نشان اس کے جسم پر موجود تھے۔گو کہ زخم بھر چکے تھے مگر جب بھی اپنی ازدواجی زندگی کا خیال آتا اسے اپنے زخم تازہ اور رستے ہوئے محسوس ہوتے تھے۔اس کا دل راکھ کا ڈھیر بن چکا تھا........اور اب بابا کی باتوں نے جیسے سلگتے الاؤ میں تیل چھڑک دیا تھا۔جب ارمانوں،خواہشوں کا خون ہو چکا ہو تو پھر ہر خوشی بے معنی ہو جاتی ہے۔بے بس زبان احتجاج تو کر رہی تھی مگر کس سے ،خود اسی سے جس کا حاصل کچھ بھی نہیں ۔اعصابی تھکن اور اضمحلال سے نڈھال وہ کھڑی ہوگئی اور خود کو اس شادی والے شکنجے سے چھڑانا چاہتی تھی۔

''میں ابھی جا کر بابا کی سوچ بدلنے کی کوشش کرتی ہوں''۔اس نے اگلا قدم ہی اٹھایا تھا کہ اسکے دماغ میں اس سوال سے ہلچل مچ گئی۔

''اگر خدانخواستہ بابا کو کچھ ہو گیا تو تم اکیلی کیا کرو گی؟'' بے ساختہ اس کے اٹھتے قدم وہیں ساکت ہو گئے.....اور پھر وہ گھٹی گھٹی آواز میں زارو قطار رونے لگی مبادا کہیں بابا کی آنکھ نہ کھل جائے.....اور اذیت کا احساس اس کے اندر جو کروٹیں لے رہا تھا۔بالکل لاشعوری طور پر وہ اپنی اذیت کا سارا حساب اسی رات لینا چاہتی تھی اور بالآخر یہ رات ایک فیصلہ

کن رات ثابت ہوئی۔

O......O......O

محمد عمر کے بیمار جسم میں جیسے کسی نے زندگی کی رمق جگا دی۔ ایک بار پھر وہ ساری ہمت مجتمع کیے بیٹی کو رخصت کرنے کے لئے تیار تھا۔ یاسین ان کے دوست کا بیٹا تھا اور انہیں پورا بھروسہ تھا کہ ان کے دوست رحمن صاحب ان کی بیٹی کو بہو نہیں بلکہ بیٹی کی طرح سمجھیں گے۔

''تم یاسین سے ملنا چاہو گی؟'' محمد عمر نے بیٹی کے چہرے کو غور سے دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ جہاں ملال کے رنگ واضح دکھائی دے رہے تھے۔

''بابا میں تو اختر سے بھی ملی تھی۔ میں کب جانتی تھی وہ اذیت پسند ہے۔ بابا شوہر تو اپنی بیوی کو گجرے پہنا کر خوش ہوتے ہیں۔ اسے ساحل سمندر پر لے جاتے ہیں۔ بیوی کے ساتھ محبت سے باتیں کرتے ہیں۔ اس کی ہر پسند کا خیال رکھتے ہیں مگر بابا اختر تو مجھے مار پیٹ کر سسکتا ہوا دیکھ کر خوش ہوتا تھا۔ جس بات پر میں خوش ہوتی وہ مجھے غصے سے گھورتا اور میری پسند کو ٹھکرا دیتا۔ میرا مذاق اڑاتا..... کیوں کرتا تھا وہ ایسے کیوں؟'' کلثوم زار و قطار رو رہی تھی اور محمد عمر بیٹی کو سینے سے لگائے دلاسے دے رہے تھے۔

''نہیں میری بچی سنبھالو خود کو، جو ہوا بھول جاؤ اب نئے سرے سے اپنی زندگی کا آغاز کرو، غم کی رات طویل ضرور ہوتی ہے مگر امید سحر ناامیدی کو مٹا دیتی ہے۔ میری بچی تو بہت بہادر ہے۔'' محمد عمر کا ہاتھ کلثوم کے سر پر تھا اور وہ دل مسوس کر رہ گئی تھی۔ آج اسے ماں کی کمی شدت سے محسوس ہو رہی تھی۔

''کلثوم بیٹی یاسین اپنی خالہ کے پاس حیدرآباد میں پلا بڑھا ہے پچھلے دنوں کراچی واپس آیا ہے۔ رحمن صاحب نے تمہاری ذمہ داری لی ہے۔ وہ تمہیں اپنی بیٹی بنا کر لے جا رہے ہیں۔ بہو نہیں''۔ محمد عمر کے لہجے میں امید کا رنگ تھا اور چہرے پر مسرت مگر دل کلثوم کی حالت پر رو رہا تھا۔

''جی بہتر بابا، جو آپ کو اچھا لگے۔'' کلثوم نے حالات سے سمجھوتہ کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا اور پھر نہایت ہی سادگی سے کلثوم کی شادی یاسین سے ہو گئی۔ مہمانوں میں مولوی صاحب

اور مرد حضرات کے ساتھ محلے کی کچھ خاص بڑی عمر کی عورتیں تھیں جو کلثوم کو اچھے نصیب کی دعائیں دے رہی تھیں اور ایک بار پھر ایک نئی سیج سجانے کے لئے کلثوم کے قدم بڑھے تھے۔قدموں میں لرزش تھی ۔جسم کپکپا رہا تھا مگر وہ قدرت کے اس فیصلے کے آگے بے بس تھی۔

O......O......O

کمرے کو بہت خوبصورتی سے سجایا گیا تھا۔گلاب کے سرخ پھولوں کی لڑیاں جھوم رہی تھیں۔ پرفیوم کی خوشبو سے مہکا کمرہ خوشگواریت کا احساس بیدار کر رہا تھا۔مخملی پردوں اور دبیز قالین پر ایک سرسری نظر ڈالتی وہ سرخ بیڈ شیٹ کو تکنے لگی۔

''ہٹو بھئی دولہا آرہا ہے۔راستہ تو دو'' اس کے کانوں میں نسوانی آواز گونجی تو وہ سمٹ کر بیٹھ گئی۔

دروازہ کھلنے اور فوراً ہی بند ہونے کی آواز پر اس نے کن اکھیوں سے آنے والے دولہے کو دیکھا۔آج اس کا نصیب اس شخص کے ساتھ نکاح نامے پر دستخط کرتے ہی جڑ چکا تھا۔اسے اپنے شوہر کے خوبصورت کپڑوں سے کوئی سروکار نہیں تھا۔وہ تو بس اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی جس پر خوشی کا نمایاں رنگ ظاہر ہو رہا تھا۔ایک دلفریب مسکراہٹ اور نظروں میں کھوج لئے وہ کلثوم کی جانب بڑھ رہا تھا۔ایک پل کے لئے کلثوم کا چہرہ اطمینان کے رنگ میں رنگ گیا۔اور وہ مزید سمٹی پلکیں جھکائے اپنی انگلی میں یاسین کے نام کی انگوٹھی دیکھنے لگی۔

''تم دلہن ہو ناں! پتا ہے مجھے دلہن بہت پسند ہے۔'' اس کا آنچل گھسیٹتے ہوئے کہہ گیا۔''ڈیڈ نے مجھ سے کہا ہے کہ تمہاری مجھ سے شادی ہوئی ہے۔اس کا مطلب تم میرے ساتھ میرے کمرے میں رہو گی؟'' اس کے کندھے کو جھنجوڑ کر پوچھا گیا۔

یہ انداز اور لہجہ کا تو تو لہو نہیں ، کلثوم کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں بھینچ لیا ہو۔اس نے تیزی سے اپنا گھونگھٹ الٹ دیا۔بچوں کی معصومیت اس کے چہرے پر سجائے اس کا شوہر اس سے عجیب سوال کر رہا تھا۔اس نے حیرت سے یاسین کو دیکھا۔

''بولو اب تم میرے کمرے میں میرے ساتھ رہو گی؟'' سوالیہ لہجے میں اب شدت تھی۔

کلثوم کے چہرے کا رنگ اب فق ہو چکا تھا۔ وہ پوری جان سے سلگ اٹھی تھی۔ اسے لگ رہا تھا اس کا دل کسی سخت چٹان سے ٹکرا کر ریزہ ریزہ ہو گیا ہے۔

"تم بولتی کیوں نہیں ہو؟ کیا گونگی ہو؟" وہ اسے بری طرح سے جھنجھوڑتے ہوئے چیخا مزاحمت کرتے کرتے اس کا آنچل سر سے ڈھلک گیا تھا۔ یاسین اس کی مانگ میں سجا ٹیکہ دیکھ کر زور سے ہنسا اس نے کلثوم کی مانگ سے ٹیکہ کھینچ لیا وہ تکلیف زدہ آواز گلے میں گھونٹ کر رہ گئی۔

"تمہیں ایک بات بتاؤں۔ مجھے ٹیکہ بہت پسند ہے" یہ کہتے ہوئے وہ ٹیکے سے کھیلنے لگا۔ وہ اپنے ضبط کا امتحان کب تک لیتی اس کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے اور وہ ٹکٹکی باندھے یاسین کو دیکھ رہی تھی۔ وقت نے ایک بار پھر اس کا خوفناک امتحان لیا تھا۔

"چلو تم مجھے لوری گا کر سلاؤ۔ وہ ایک دم ہی اس کے زانوں پر سر رکھ کر لیٹ گیا۔" ڈیڈ نے کہا ہے میری بیوی میرا بہت خیال رکھے گی اور کان کھول کر سن لو اگر تم نے میرا خیال نہیں رکھا تو میں تمہیں اپنے کمرے سے نکال دونگا۔" وہ لا ابالی انداز میں اسکا ہاتھ اپنے سینے پر رکھے ہوئے کہہ رہا تھا۔ وہ اپنی جھلسی ہوئی روح کو جھنجھوڑتی ہوئی اس کی ہر حرکت پر بے بس سی اسے تک رہی تھی۔

"سلاؤ مجھے۔" یاسین کے لہجے میں غصہ امڈ آیا اور اس نے حقارت سے کلثوم کو دیکھا۔

کلثوم کے رخسار پر سرخی سمٹ آئی اور مٹھیاں بند ہو گئیں۔ غم و غصے کے ابال کو وہ اندر ہی اندر اتارتی حیرت زدہ نظروں سے یاسین کو گھور رہی تھی۔

"میرا کہنا نہیں مانتیں؟" اگلے ہی لمحے اس کے بائیں رخسار پر ایک زوردار طمانچہ پڑا اور پھر اس کے بالوں کو مٹھی میں لے کر کھینچا جانے لگا۔

"چھوڑ دو مجھے، چھوڑ دو مجھے۔" کرب سے اس کی بند آواز لبوں کے بندھ توڑتی یاسین کی سماعت سے ٹکرائی۔

"نکل جاؤ میرے کمرے سے۔ چلی جاؤ یہاں سے۔ تم میری بات نہیں سنتیں۔ تم بہت بری ہو۔ اترو میرے بستر سے۔" اس کے اوپر ٹانگیں چلاتے ہوئے اسے بیڈ سے نیچے

گرا دیا گیا۔" خبردار جو میرے بستر پر اب آئیں؟" یاسین کی حالت یک دم غیر ہو گئی۔ اس کے منہ سے جھاگ نکلنے لگا۔ کبھی وہ خود کو مارتا تو کبھی کلثوم پر وار کرتا..... اسی وقت کمرے کا دروازہ کسی نے کھٹکھٹایا۔ یاسین کی چیخ وپکار نے باہر کے لوگوں کو متوجہ کردیا۔ کلثوم نے تیزی سے کمرے کا دروزہ کھولا۔

''کیا ہوا ہے یاسین کو؟'' رحمان صاحب تیزی سے یاسین کی طرف بڑھے۔ کوئی یاسین کو پانی پلا رہا تھا تو کوئی اسے سمجھا رہا تھا۔

''ارے نفسیاتی مریض ہے۔ پھر پڑ گیا ہوگا دورہ، پیدائشی پاگل ہے۔'' ایک خاتون کی آواز کلثوم کے کانوں میں آئی۔

''خبردار جو یہ میرے کمرے میں رہی۔ نکالو اسے نکالو'' وہ چیختے چلائے جا رہا تھا اور اسے قائل کرنے کی کوششوں میں رحمٰن صاحب اور ان کا دوسرا بیٹا اسے انتہائی پیار و محبت سے منا رہے تھے۔ جبکہ وہ ہراساں سی کمرے کی دیوار سے ٹیک لگائے اپنی خوشیوں اور ارمانوں کے جنازے کو کاندھا دینے کی تیاری کر رہی تھی۔

O......O......O

"دھوکا کیا ہے آپ نے ہمارے ساتھ، میری بیٹی کے حالات جانتے تھے۔ اس کے بعد بھی آپ نے ہمیں تکلیف پہنچائی۔ آپ نے ہماری نرمی کا فائدہ اٹھایا ہے۔ اپنوں پر اعتبار کرنے کا یہ صلہ ملتا ہے۔" محمد عمر غصے سے برہم رحمان صاحب سے بات کر رہے تھے۔

''میں سخت شرمندہ ہوں مگر کیا کروں۔ آپ یقین کریں یاسین بہت اچھا بچہ ہے۔ بس کبھی کبھی اس کی مرضی کے خلاف کوئی بات ہو جائے تو اس کا ایسا طرزِ عمل ایسا ہو جاتا ہے۔'' رحمان صاحب ٹپٹائے انداز میں بول رہے تھے۔

محمد عمر کا ہاتھ سامنے رکھی ہوئی ٹیبل پر دھماکے سے پڑا۔'' بس خاموش ہو جائیں آپ، میری بچی کی زندگی کا مذاق بنا دیا ہے آپ جیسے لوگوں نے۔"

" ارے بھائی بات تو سنیں آپ، یاسین آپ کے سامنے بیٹھا ہے۔ آپ خود بات کریں اس سے "رحمٰن صاحب نے انہیں بہلانے کی بھرپور کوشش کی۔

محمد عمر نے نظر بھر کر یاسین کو دیکھا۔ انتہائی سنجیدہ خاموشی سے بیٹھا یہ خوب صورت جوان کہیں سے بھی نفسیاتی مریض نہیں لگ رہا تھا۔

"ارے مان جائیے عمر صاحب، آپ یقین کریں میں آپ کی بیٹی کو اپنی بیٹی بنا کر رکھوں گا۔ بس اب آپ اسے میرے ساتھ بھیج دیں" ۔رحمٰن صاحب ایک بار پھر منمنائے .... محمد عمر کی آنکھوں سے لاوا ابلنے لگا۔ وہ خود کو بہت حوصلہ منداور بہادر سمجھتے تھے مگر خود پر قابو نہ رکھ سکے، رو پڑے۔

"ارے آپ کیا سوچ رہے ہیں؟ مان جائیں۔ یقین کریں یاسین کی ذمہ داری میں لیتا ہوں وہ آئندہ آپ کی بیٹی کو کوئی تکلیف نہیں پہنچائے گا۔" رحمان صاحب خوشامدانہ انداز میں بولے۔

"نہیں، زہر اگر جسم میں سرائیت کرتا رہے تو موت کا آجانا یقینی امر ہے۔ازدواجی رشتے کی یہ کڑواہٹ میری بچی کو اندر ہی اندر کھا جائے گی۔ زہر کا جسم سے نکل جانا ہی بہتر ہوتا ہے۔آپ سے درخواست ہے آئندہ میرے در پر اس ارادے کے ساتھ تشریف نہیں لا ئیں گے۔ میں اپنی بچی کو واپس نہیں بھیج سکتا۔ امید کرتا ہوں قانونی کارروائی جلدی مکمل ہو جائے گی ویسے بھی نفسیاتی مریض اور میڈیکل ان فٹ آدمی کے ساتھ نکاح ہونا نہ ہونے کے برابر ہوتا ہے۔ آپ میری بات سمجھ رہے ہوں گے کہ میں کیا کہنا چاہ رہا ہوں۔" محمد عمر نے شکستہ لہجے میں سر جھکاتے ہوئے کہا۔

تذلیل اور تحقیر کوئی پوشاک نہیں تھی جو رحمان صاحب اتار کر پھینک دیتے، یکلخت ندامت ان کے خون میں دوڑنے لگی اور ان کی کھال بن کر ان کے جسم سے لپٹ گئی۔ ہر جذبے سے عاری یاسین نے باپ کو ایک نظر دیکھا ۔ وہ باپ کی نظروں کا پیغام سمجھ گیا تھا۔ دونوں خاموشی سے اٹھ گئے۔

O......O......O

وہی سابقہ انداز، جیسے وہ ایک خواب سے جاگی ہو۔ وقت ایک بار پھر اپنے آپ کو دہرا چکا تھا۔ دل گرفتگی، محتاجی، ٹوٹ پھوٹ، انتشار، اس کے اعصاب کی طاقت جواب دے رہی

تھی کہ ایسے میں اچانک شور نے اس کو شعور کی دنیا میں واپس بھیج دیا۔

''ام کلثوم تمہارے بابا کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔ جلدی چلو وہ اسپتال میں ہیں۔وہ بد حواس سی اٹھی اور تیزی سے شور کی جانب بڑھی۔ ہر چہرہ بول رہا تھا مگر وہ گم سم تیز تیز قدموں سے آگے بڑھ رہی تھی۔ وہ اندیشوں کو ترک کرتی تو وہم ان کی جگہ لے لیتے۔ وہم کو دھکیلتی تو شک اس کو کچوکے لگانے لگتا۔ بالآخر وہ اسپتال پہنچ گئی۔

''بیٹی خدا کی جیسی مرضی، تمہارے بابا تمہارا دکھ برداشت نہ کر سکے بس بچی اب صبر ہی تیرا نصیب ہے۔'' اس کی دور کی خالہ سائرہ بی بی اسے سمجھا رہی تھیں۔

باپ کی موت کا دھچکا اس کے حواسوں کو معطل کر گیا تھا۔ باپ کے مر جانے سے ام کلثوم کی زندگی کے چراغ مدھم سے ہو گئے۔ وہ جو ہمیشہ سے چاہتی تھی کہ اس کے دامن میں گلاب مہکیں آج وہ اپنے دامن میں لگے گھاؤ دیکھ رہی تھی۔ باپ کا سایہ کیا اس کے سر سے اٹھا وہ کڑی دھوپ میں آ چکی تھی۔ زندگی کے ہمسفر بھی ہمسفر ثابت نہیں ہوئے بلکہ حقیقتوں کی آندھی بنے جو اس سے اس کا سب کچھ چھین کر لے گئے۔ وہ پل پل مر رہی تھی۔ اب اکیلا گھر اس کے سناٹے اسے ڈس رہے تھے اور رات کی تنہائی اور اندھیرے اس کے ضبط کو بے دردی سے قتل کر رہے تھے۔ یہ حقیقت ہے انسان تقدیر کے سامنے بے بس ہے۔ اس کے دل کی زمین بنجر ہو گئی تھی۔ شاید سیرابی اس کے مقدر میں تھی ہی نہیں اور اب وہ خوف زدہ سی ہر اٹھتی نظر کو اگلا شکاری سمجھنے لگی تھی جو کسی بھی وقت اس پر وار کرنے کے لئے تاک لگائے بیٹھا ہو۔

O......O......O

سائرہ خالہ آج رات اپنی بیٹی کے گھر آنے کے باعث چلی گئی تھیں اور اسے خاص ہدایت دے کر گئی تھیں کہ وہ گھر اچھی طرح سے لاک کر لے۔ وہ صبح جلدی ہی واپس آ جائیں گی اور اب وہ پریشان سی جو در و دیوار تک رہی تھی اسے لگا جیسے اس کی قسمت کا ایک دروازہ اور بند ہونے جا رہا ہے۔ خالہ جا چکی تھیں اور وہ ٹی وی کے سامنے بیٹھی چینل چینج کر رہی تھی کہ ایسے میں موبائل فون نے اسے اپنی جانب متوجہ کیا۔ نمبر انجان تھا۔ اس نے بھی کال اگنور کر دی اور دوبارہ ٹی وی پر نظریں جمالیں مگر اگلے ہی لمحے ڈھیٹ بیل پھر اس کو اپنی طرف

متوجہ کرنے لگی۔

"کہیں خالہ نے میری خیریت پوچھنے کے لیے تو فون نہیں کیا؟" وہ بڑبڑاتی ہوئی کال ریسیو کر چکی تھی۔

"السلام علیکم!" دوسری طرف سے، وجیہ انداز میں سلام کیا گیا۔

"وعلیکم السلام، جی کس سے بات کرنی ہے؟" اس کی آواز سرسراتی ہوئی دوسری جانب پہنچی۔

"ماشاء اللہ آپ کی آواز بہت خوبصورت ہے۔" ہلکی سی ہنسی کے ساتھ جواب آیا۔

"کیوں فون کیا ہے؟" اس کے لہجے میں غصے کی آمیزش آچکی تھی۔

"آپ سے بات کرنی ہے۔"

"آئندہ یہاں فون کرنے کی زحمت نہیں کیجئے گا۔ کیونکہ مجھے آپ سے کوئی بات نہیں کرنی۔" یہ کہہ کر اس نے لائن کاٹ دی۔

کلثوم بھینچی بھینچی سی سانسیں لے کر دل ہی دل میں اسے صلواتیں سنا رہی تھی تب ہی رنگ ٹون نے اس کے غصے کو مزید ہوا دے دی۔

"کہا ہے نا، مت تنگ کرو مجھے مگر تمہیں سمجھ نہیں آرہا ہے۔ شاید تم نسل کے ہی اچھے نہیں۔" یہ کہتے ہی اس نے لائن کاٹ دی اور پھر موبائل آف کر کے کمرے میں ٹہلنے لگی۔ پھر اس کا دل تو ٹی وی میں لگا اور نہ بستر کی جانب مائل ہوا۔ بس ہر آہٹ پر اسکی چکراتی نظریں دروازے تک جا کر پلٹ آتیں مگر خالہ نے تو صبح آنے کا وعدہ کیا تھا اور ابھی صبح ہونے تک رات کا سفر باقی تھا۔

O......O......O

"شہریار کہتے ہیں مجھے دیکھئے میم میں ایک مخلص انسان ہوں اور انسانوں کی قدر کرنا جانتا ہوں۔ نہیں سمجھ پا رہا کہ آپ کی آواز کی کشش کیوں مجھے آپ تک کھینچ لا رہی ہے..... میں ایک پریکٹیکل لڑکا ہوں۔ محبت پر کبھی میرا ایمان نہیں رہا۔ میں سوچتا ہوں کہ محبت تو بس اٹریکشن کا نام ہے کوئی ہمیں اچھا لگے اور ہمارا دل اس کو دوبارہ دیکھنے کو چاہے تو لوگ

اسے محبت کا نام دے دیتے ہیں مگر جب سے میں نے آپ کی آواز سنی ہے محبت کی صداقت پر ایمان لے آیا ہوں۔ آپ یقین کریں میں پوری رات سو نہیں پایا۔ آپ کا لہجہ میری سماعتوں کو لبھاتا رہا۔ حالانکہ رات آپ غصے میں تھیں آپ کا غصہ اتنا خوبصورت تھا کہ میں سوچنے پر مجبور ہو گیا ہوں کہ آپ کا پیار کتنا حسین ہوگا۔" دھیمی رفتار سے رواں ہوتا وہ پوری بات کہہ چکا تھا۔

کلثوم اس کے لب و لہجے کی سچائیوں کو کھوجتی یہ سوچ رہی تھی کہ وہ بچپن سے ہی ایسے الفاظ کی منتظر تھی۔ جو آج اس کے کان سن رہے تھے۔ زندگی نے اسے دوبارہ مہلت دی تھی مگر اسکی زندگی میں آنے والے دو مرد چکی کے دو پاٹ ثابت ہوئے جن کے درمیان صرف اور صرف وہ زخمی ہوئی اور آج ایک اجنبی اس کے کانوں میں رس گھولے چلا جا رہا تھا وہ خاموشی پر اکتفاء کئے بیٹھی تھی۔

"ہیلو میم۔" دوسری طرف سے آتی آواز نے اسے جھنجھوڑنا چاہا۔

"کہتے رہو، میں منتظر ہوں۔" وہ بے ایمانی نہیں کر سکتی تھی مگر دل کی بنجر زمین پر محبت کی نرم پھوار سے آشنائی پر وہ اشک بار ضرور ہوئی۔

"سوری میم میں نے آپ کو ہرٹ کر دیا۔ سچ میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ میں تو بس آپ سے دوستی کرنا چاہتا ہوں۔"

"جی آپ کی تقریر ختم ہوئی؟" وہ یکلخت اپنے جذبات کے جال کو توڑ کر باہر آ گئی۔

"میں سچ کہہ رہا ہوں۔ ویسے یہ میرا نمبر نہیں ہے کیا کرتا آپ میرے نمبر سے بھرپور نفرت کا اظہار کر رہی ہیں تو مجھے دوسرے نمبر کا سہارا لینا پڑا۔" وہ انتہائی ڈھٹائی سے بولا اور وہ جو لفظوں کی گرفت سے آزاد، زبان کے ساتھ چھوڑنے پر شکوہ کناں تھی اس نے خاموشی سے لائن کاٹ دی اور پھر یکدم ہی جسم کی ساری قوت اس کے رونے کی شدت میں منتقل ہو گئی وہ پھوٹ پھوٹ کر روتی رہی۔ دل کا غبار، شکوے، گھبراہٹیں، بدنصیبی سب آنکھوں کے راستے نکلنے لگے۔

O......O......O

اب یہ احساس جرم اسے کچو کے لگاتا رہتا کہ وہ ایک غیر مرد سے محو گفتگو ہے مگر دل تھا کہ بغاوت کیے جا رہا تھا اور وہ اپنے ضمیر پر بوجھ نہیں بننا چاہ رہی تھی۔ تب ہی اس نے بے سکونی کا موجب بننے سے انکار کر دیا اور خالہ سے ساری بات کہہ دی۔

''بیٹا فرعون کے گھر موسیٰ کی پرورش ہوئی تھی۔ کنول کا پھول کیچڑ میں کھلتا ہے اور میں نہیں سمجھتی تمہاری زندگی میں آنے والا ہر شخص ابلیس ہی ہو۔ میری بچی، محبت دل کی سرزمین پر وہ پودا ہے جسے لاکھ کاٹتے رہو اس سے ہر پل نئی کونپل پھوٹ نکلتی ہے۔ خود ہی کہہ رہی ہو۔ وہ اچھا لگنے لگا ہے تو بات کر لیا کرو دل کا بوجھ ہلکا ہو جائے گا۔ ایک اچھا دوست زندگی کی ساری کمی کو ختم کر سکتا ہے بشرطیکہ وہ مخلص ہو۔'' خالہ نے کوئی وضاحت طلب نہیں کی تھی مگر اس کا دل پہلے ہی سے گداز ہو رہا تھا وہ خالہ کی گود میں سر رکھتے ہی بکھر گئی۔

''میں تو کہتی ہوں۔ اس کو دیکھ، پرکھ لے اگر بہتر لگے تو گھر بلا لے۔ اس میں کوئی برائی نہیں۔'' خالہ چپ ہو گئی تھیں مگر وہ سمجھدار تھی۔

O......O......O

شاید زندگی اس پر پہلی بار مہربان ہوئی تھی۔ شہریار ایک خوب رو نوجوان تھا۔ ہر لحاظ سے اچھا اور سب سے بڑی بات وہ ایجوکیٹڈ تھا وہ کلثوم کی صرف آواز پر ہی نہیں مرا تھا بلکہ اسے تو کلثوم کے سراپے سے بھی عشق تھا۔ وہ خوشیوں کے ستارے کلثوم کے آنچل میں ٹانکنا چاہتا تھا۔ وہ باتوں باتوں میں کتنی بار اقرار کر چکا تھا کہ وہ کلثوم کا سائبان بننے کے لئے تیار ہے مگر کلثوم اسے اپنے دل کے داغ کیسے دکھاتی جو اس کی روح کو گھائل کر چکے تھے۔ وہ ایک بار نہیں دو بار شادی کے مراحل سے گزری تھی۔ شہریار ہر لحاظ سے اس کے لئے معتبر تھا مگر وہ جب اپنے سراپے پر نظر ڈالتی تو پاتال کی گہرائیوں میں اتر جاتی مگر شہریار کا ایک جملہ اسے وہاں سے کھینچ لاتا۔ ''تم جیسی بھی ہو میرے لئے قلوپطرا ہو اور تمہیں اپنا کر میں خود کو خوش نصیب تصور کروں گا۔''

آج وہ ہارے ہوئے مجرموں کی طرح دل کا بوجھ ہلکا کیے شہریار کے سامنے بیٹھی تھی۔ بالکل اس کٹی پتنگ کی مانند جو فضاؤں میں لہراتی ہوئی پستی کی طرف جا رہی ہوتی ہے۔

''تم جیسی بھی ہو اور جو کچھ تمہارے ساتھ ہوا اس کے بعد میں تمہاری عظمت کی داد دیتا

ہوں اور تمہیں دل کی گہرائیوں سے قبول کرتا ہوں۔" شہریار کا نرم مہربان ہاتھ کلثوم کے کندھے پر تھا۔ کلثوم کو یکدم اپنا سر گھومتا ہوا محسوس ہوا۔ اس نے سراسیمہ نگاہوں سے شہریار کو دیکھا اور اس کے کندھے پر اپنا سر رکھ لیا۔

O......O......O

"تم اپنا گھر کیوں بیچنا چاہتی ہو؟" خالہ کے لہجے میں حیرت تھی۔

"شہریار چاہتے ہیں ہم اورنگی ٹاؤن سے نکل جائیں ویسے بھی یہاں میری زندگی کے ناخوشگوار لمحات گزرے ہیں۔ یہاں کا محلّہ اور ہر گلی مجھے خون کے آنسو رلا دیتے ہیں۔"

کلثوم نے ٹھنڈی آہ بھری اور خاموش نظروں سے خالہ کو دیکھا۔

"گھر بیچ کر کہاں رہو گی؟" خالہ کے لہجے میں جھنجھلاہٹ تھی۔

"پاک کالونی میں شہریار نے گھر دیکھا ہے جو سات لاکھ تک کا ہے یہ گھر چلا جائے گا باقی وخودہ ملا رہے ہیں۔ بس خالہ اب میں شہریار کے ساتھ شادی کر کے زندگی کے بقیہ ایام پُرسکون گزارنا چاہتی ہوں۔ آپ میری سگی خالہ تو نہیں ہیں لیکن آپ نے مجھے سگوں سے بڑھ کر چاہا اور میرا مان رکھا۔" کلثوم گم سم سے لہجے میں بولی۔

"اچھی بات ہے بیٹی۔ بیٹیاں اپنے گھر میں ہی اچھی لگتی ہیں۔ خدا تمہیں ہمیشہ سکھی رکھے۔" خالہ نے اسے ایک ہی سانس میں ڈھیروں دعائیں دے ڈالیں۔

O......O......O

شہریار اپنے دوست سعد کے ساتھ کلثوم کے گھر پہنچا۔ مطلوبہ پارٹی نے کچھ ایڈوانس رقم کیش اور باقی چیک کی صورت میں کلثوم کے حوالے کردی۔ کلثوم کی طرف سے گواہوں میں شہریار اور اس کا دوست سعد موجود تھے۔

لین دین کے مراحل کے دوران وہ خالہ کا نمبر ملاتی رہی جو کہ مسلسل آف جا رہا تھا۔ گھر جلدی خالی کرنے کا کہہ کر وہ پارٹی جیسے ہی نکلی کلثوم کچن میں آگئی۔ آج اس نے شہریار کے لئے خاص اہتمام کیا تھا اور شہریار کی فرمائش پر اس نے کھیر بنائی تھی۔ جیسے ہی کلثوم کچن سے باہر نکلنے لگی۔ شہریار کا دوست سعد برق رفتاری سے کچن میں آگیا۔ اس نے کلثوم کو نیچے

گرایا اور اپنے دونوں ہاتھوں کی گرفت کلثوم کی گردن پر مضبوط کر دی۔ اسی اثناء میں شہریار بھی کچن میں آچکا تھا۔

شہریار نے کلثوم کی دونوں ٹانگوں کو پکڑ رکھا تھا۔ کلثوم مزاحمت کر رہی تھی مگر ابلیس کا رقص اپنے عروج پر تھا۔ کلثوم کے نالے و فریاد گھٹتی گردن کی وجہ سے ٹوٹ ٹوٹ کر بلند ہو رہے تھے مگر دونوں ابلیس کے کارندے بنے رہے اور پھر جلد ہی کلثوم اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھی۔

O......O......O

کلثوم کی نعش کو بوری میں بند کر کے زمین میں دفنا دیا گیا۔ کلثوم کی یوں اچانک گمشدگی کے بعد پاک کالونی کے رہائشیوں کی نشاندہی پر پولیس وہاں پہنچی اور تفتیش کے بعد شہریار کو گرفتار کر لیا گیا مگر سعد ابھی تک لاپتا ہے۔

شہریار نے بتایا کہ وہ کلثوم کو اپنی محبت کے جال میں پھنسا کر اس کی دولت حاصل کرنا چاہتا تھا اس کا کلثوم سے شادی کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔

کلثوم کی کہانی ہمارے معاشرتی رویوں کی عکاس ہے۔ آج بھی نہ جانے کتنی کلثوم ابلیس کے شکنجے میں پھنسی ہوئی ہیں اور وہ ان کی مجبوریوں سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ ضرورت تو اس امر کی ہے کہ عورت کو حوا کی بیٹی، برائی کی ترغیب دینے والی، کم عقل، جذباتی، احساسات سے عاری کٹھ پتلی سمجھنا بند کریں بلکہ عورت کو اس کے حقوق ملنے چاہیے۔ ان کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں کا خاتمہ ہونا چاہیے لیکن پیدائش سے موت تک ہر قدم پر عورت مرد کے مقابلے میں تفریق اور تعصب کا شکار رہتی ہے لیکن حقیقت میں عورت کیا ہے؟ معاشرے میں اسے کیا مقام ملنا چاہیے اس کے وجود کی حقیقت کیا ہے؟ ہمارے رواتی اور فرسودہ روایات سے بھرے اس معاشرے میں جہاں ترقی کی راہیں بڑی دشوار ہیں۔ وہیں ان سوالات کے جوابات ملنا بھی اتنا آسان نہیں۔ شہریار تو گرفتار ہو گیا۔ اسے سزا بھی مل جائے گی۔ سعد بھی یقیناً نہیں بچے گا۔ انسانوں کا قانون نہ سہی مگر قدرت کا قانون اسے نہیں چھوڑے گا لیکن ام کلثوم کا کیا قصور تھا جو وہ بھیانک بربریت کا نشانہ بن گئی؟

☆......☆......☆

چہرہ بنا سوال

ایمبولینس کے سائرن کی آواز جونہی فرح کے کانوں میں گونجی اس کا دل بے اختیار سا ہو گیا۔ بہت تیزی سے دھڑکنے لگا۔ ایک نامعلوم سا خوف ایک نادیدہ سا ڈر اس کے دل کی دھڑکنوں کو تیز کر گیا۔

وارڈ بوائے اسٹریچر کھینچتے ہوئے لا رہا تھا۔ جس پر ایک ادھیڑ عمر کا شخص خون میں لت پت چت پڑا تھا۔ اس کے سرہانے تیز تیز چلتا شخص بھی خاصا خون آلود تھا۔ اس کا سانس پھولا ہوا تھا اور وہ ''جلدی چلو..... جلدی سے لے چلو۔'' کی صدائیں لگاتا ایمرجنسی وارڈ کی طرف مڑ گیا۔

''یا الٰہی خیر'' فرح کو منہ سے بے اختیار نکلا۔ موبائل سائرن کی آواز جب اس کے کانوں میں گونجتی اس پر عجیب سی دہشت طاری کر دیتی اور وہ دل سے آنے والے مریض کے لئے دعائیں مانگنے لگتی۔

''نام بتایئے؟'' اگلے ہی لمحے وہ سنبھلی اور رجسٹر کے پیج پلٹتے ہوئے جلدی سے بولی۔

''پتا نہیں۔'' اس لڑکے نے بے ساختہ کہا۔

''مریض کا نام کیا ہے؟'' وہ قدرے حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔

''آپ ان کا سامان چیک کیجئے۔ اس سے آپ کو ان کے بارے میں معلومات مل جائیں گی۔ یہ روڈ ایکسیڈنٹ میں زخمی ہوئے ہیں۔ میں ان کو یہاں تک لے آیا ہوں کون

ہیں یہ؟ ان کا تعلق کہاں سے ہے۔ میں کچھ نہیں جانتا۔" وہ اپنی آستین کے کف جھٹکتے ہوئے بٹن بند کرنے لگا۔

"اوہ۔" فرح نے ہونٹ دانتوں میں دباتے ہوئے وارڈ بوائے کو اشارے سے بلایا۔" ابھی جو مریض آیا ہے۔ ذرا اس کا سامان چیک کرو کوئی ایڈریس وغیرہ مل جائے تو ہم اس کے گھر والوں کو خبر کر دیں۔" یہ کہتے ہوئے اس نے پین رجسٹر میں رکھ کر بند کر دیا۔

"آپریشن تھیٹر کس طرف ہے؟" ایک معمر سی خاتون بھاگتی ہوئی Reception تک پہنچی تھیں۔ فرح نے دائیں جانب اشارہ کر دیا۔

"ذرا دیکھ کر بتایئے۔ کمرہ نمبر 12 میں نفیس ایڈمٹ ہیں؟" سگریٹ لبوں سے لگائے وہ کوئی سندھی تھا۔

"جی ذرا ایک منٹ۔" وہ جلدی جلدی صفحے پلٹنے لگی۔

"سر پورا نام بتایئے؟"

"نفیس الرحمان گردے کا مریض ہے۔ دو دن پہلے ایمرجنسی میں آیا تھا۔" وہ شخص سگریٹ کا کش لگاتا ہوا میں دھواں چھوڑتا موبائل پر سائیں، سائیں، کی گردان کر رہا تھا۔

"جی روم نمبر 9 فرسٹ فلور پر چلے جایئے۔" فرح نے گھور کر اس شخص کو دیکھا اور منہ بنا کر بولی۔

"یہ مریض کی جیب سے کچھ کاغذات اور موبائل ملا ہے"۔ وارڈ بوائے کاؤنٹر پر سامان رکھ کر چلا گیا۔ تو وہ شخص بھی قریب آ گیا۔

"محمد ایوب۔" اس نے بڑبڑاتے ہوئے شناختی کارڈ پر درج اس کے نام کا رجسٹر میں اندراج کیا۔ تب وہ آگے بڑھا۔

"میں دراصل جلدی میں ہوں۔ آپ ان صاحب کے گھر والوں سے رابطہ کر لیجیے اور آپ کی بڑی مہربانی ہوگی اگر آپ مجھے اسپتال کا نمبر دے دیں۔ میں ان صاحب کی خیریت پوچھ لوں گا۔" وہ شخص اب دونوں کہنیاں کاؤنٹر پر ٹکائے بات کر رہا تھا۔

"ایک منٹ۔" وہ موبائل سے نمبر ٹریس کر رہی تھی اور ساتھ ساتھ نمبر ڈائل بھی کر رہی تھی۔

''سوری ابھی مریض کے گھر پر کوئی رابطہ نہیں ہو پا رہا۔ آپ کچھ دیر اور انتظار کیجئے۔'' فرح نے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔

''اچھا یہ میرا کارڈ رکھ لیجئے آپ، میرا نام فیصل ہے۔ جیسے ہی رابطہ ہو جائے آپ مجھے کال کر لیجئے گا۔ جب تک میں اپنے کپڑے واش کر لوں، وہ کاؤنٹر پر اپنا وزیٹنگ کارڈ رکھتا ہوا۔ اپنے کپڑوں پر لگے خون کے دھبوں کو دیکھنے لگا۔

''ایمرجنسی میں جو مریض آیا ہے۔ اس کے ساتھ کون ہے۔ اس سے یہ دوائیں منگوالو۔ وارڈ بوائے نے Receptionist کو مخاطب کیا تو اس لڑکی نے نظروں سے فیصل کی جانب اشارہ کر دیا۔

''لائیے میں دوائیں لا دیتا ہوں۔'' فیصل آگے بڑھا اور پرچہ لے کر تیزی سے باہر نکل گیا۔

''کتنا ہمدرد انسان ہے یہ۔'' فرح قریب کھڑی نرس سے گویا ہوئی۔

''جی بی بی آج کل کے دور میں ایسے لوگ کم ہی ملتے ہیں۔'' نرس نے دوپٹے سے منہ پونچھا اور میلی سی بینچ پر بیٹھ گئی۔

''دو بوتل خون کی ضرورت ہے۔ مریض کی حالت تشویشناک ہے۔ کون ہے اس کے ساتھ؟'' ڈاکٹر فیضان تیزی سے کاؤنٹر تک آئے۔

''وہ۔'' ابھی فرح کچھ بولتی کہ فیصل اسے سامنے سے آتا ہوا نظر آیا۔

''یہ لائے تھے مریض کو۔'' وہ دھیمے لہجے میں بولی۔

''دیکھیے آپ کے مریض کا خون بہت بہہ چکا ہے۔ فوراً دو بوتل خون کا انتظام کیجئے۔'' ڈاکٹر فیضان سنجیدگی سے بتا رہے تھے۔

''آپ میرا خون چیک کیجئے اگر گروپ مل جائے تو اچھی بات ہے ورنہ میں بلڈ بینک سے اس کو ایکسچینج کروالوں گا۔''

''آیئے میرے ساتھ۔'' ڈاکٹر فیضان آگے بڑھ گئے اور وہ میڈیسن کا شاپر ہاتھ میں لئے ان کے پیچھے چلا گیا اور پھر بڑی ہی مشکل اور صبر آزما مشقت کے بعد فرح اس مریض

کے لواحقین سے رابطہ کرنے میں کامیاب ہوگئی۔

O......O......O

''ایوب صاحب کی طبیعت اب کیسی ہے؟'' فیصل پھلوں کا شاپر لئے فرح سے مخاطب تھا۔

''ان کی حالت کچھ خاص اچھی نہیں ۔ان کے گھر سے ایک خاتون آئی تھیں اور وہ بھی صبح سے نظر نہیں آ رہیں۔ کیا آپ خاص ان کی طبیعت پوچھنے کے لئے آئے ہیں؟'' فرح نے حیرت سے فیصل کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''بہت دیر سے میں اسپتال کا نمبر ملا رہا ہوں مگر فون مسلسل بزی مل رہا ہے۔ اگر ممکن ہو تو آپ مجھے اپنا نمبر دے دیجئے میں فون پر ہی ان کی خیریت پوچھ لوں گا۔'' فیصل کے لہجے میں التجا تھی۔

''ہاں کیوں نہیں۔'' فرح بے ساختہ کہہ تو گئی مگر اب وہ شش و پنج میں مبتلا تھی کہ کیا کرے۔

''ڈاکٹر خرم کی ٹائمنگ کیا ہے؟'' سادے سے لباس میں ملبوس خاتون نے بڑی شائستگی سے پوچھا۔

''شام پانچ بجے سے سات بجے تک۔'' وہ ان کو جواب دیتی پرچی بنانے لگی۔

''میں ایوب صاحب سے مل کر آتا ہوں۔'' فیصل فرح سے کہتا جنرل وارڈ کی طرف مڑ گیا۔

''کتنا مخلص انسان ہے۔ روڈ ایکسیڈنٹ میں زخمی ایک شخص کو پہلے اسپتال لایا۔ اسکے تمام اخراجات برداشت کیئے اور اب اس کی خیریت پوچھنے چلا آیا۔'' فرح کے دل میں پلنے والے نیک خیالات و جذبات فیصل کے حق میں تھے۔اس لیے فیصل کی آمد پر اس نے تشویش کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اپنا موبائل نمبر فیصل کو دے دیا۔

''مریض کی حالت تو کافی سیریس ہے۔خداوند تعالیٰ ان کو جلد صحت یاب کرے۔'' وہ فکرمندانہ لہجے میں بول رہا تھا۔

''آپ ان کے گھر والوں سے کہیں ان کو کسی سرکاری اسپتال میں لے جائیں۔''
قدرے توقف کے بعد وہ بولا۔اس کی آواز میں فکر گھلی ہوئی تھی۔

''یہ تو ان کے گھر والے بہتر سمجھتے ہیں؟'' فرح نے افسردگی سے کہا۔

''اچھا مجھے دیر ہو رہی ہے۔ پھر میں آپ سے ان کی خیریت پوچھ لوں گا؟''

''جی ٹھیک ہے۔'' وہ خوش دلی سے بولی اور فیصل اپنے موبائل میں اس کا نام اور نمبر فیڈ کرتا ہوا داخلی دروازے کی جانب بڑھ گیا۔

O......O......O

فرح اپنے موبائل کی مسلسل بجتی رنگ پر بھاگتی ہوئی کمرے میں آئی..... ''ہیلو۔'' اس نے آہستگی سے کہا۔

''مس فرح، کیسی ہیں آپ؟'' دوسری طرف فیصل تھا۔

''میں بالکل ٹھیک ہوں لیکن ایوب صاحب کی حالت نازک ہے۔ وہ ابھی تک ہوش میں نہیں آئے۔'' وہ ایک ہی سانس میں اس کے فون کرنے کا مقصد واضح کر رہی تھی۔

''اوہ۔'' قدرے افسردگی کے عالم میں فیصل بولا۔

''آپ بتا سکتی ہیں انکو ہوش کیوں نہیں آیا؟ تین دن ہو چکے ہیں؟'' فیصل نے قدرے تحمل سے پوچھا۔

''ہو سکتا ہے دماغی چوٹ ہو لیکن میں اتنا خاص نہیں جانتی۔ اصل میں میڈیکل میری لائن نہیں ہے۔ میں تو بس ایک Receptionist کی حیثیت سے وہاں فائز ہوں۔'' وہ اپنے پیشے کے ساتھ بے ایمانی نہیں کر سکتی تھی۔

''او آئی سی یہ ضرورت بھی انسان کو کیا کچھ کرنے پر مجبور کر دیتی ہے۔'' وہ نرمی سے بول رہا تھا۔

''آپ کیا کرتے ہیں؟'' فرح نے گفتگو کا سلسلہ آگے بڑھایا۔

''میں ایک پرائیویٹ کمپنی میں مینیجر کے عہدے پر فائز ہوں۔اللہ کا شکر ہے اچھی گزر بسر ہو جاتی ہے۔ آپ کہیں اور کیوں نہیں اپلائی کرتیں؟'' فیصل اپنے بارے میں بتاتے

ہوئے ایک دم ہی اس سے سوال کر بیٹھا۔

''میں پہلے ایک پرائیویٹ اسکول میں ٹیچر تھی۔بڑی سخت اور صبر آزما انتظار کے بعد یہ جاب ملی ہے۔سیلری پیکج اچھا ہے تو اس لئے میں خاموش ہوں۔آپ تو جانتے ہیں آج کل گریجویٹ ہونا کوئی بڑی بات نہیں اور پھر میں جس فیملی سے تعلق رکھتی ہوں وہاں غربت و افلاس باپ دادا سے چلی آرہی ہے۔جب غربت ہمیں وراثت میں ملی ہے تو ہم کیسے سکھ کا سانس لے سکتے ہیں؟'' وہ بڑی سادگی اور سچائی سے اپنا حال بیان کر رہی تھی شاید اس لئے ایک طویل عرصے بعد کوئی مخلص ساتھی نظر آیا تھا۔ورنہ تو انسانی شکل میں بہروپیوں کے ہر روپ دیکھنے کی عادی ہو چکی تھی۔

''کیوں آپ کے والد کچھ نہیں کرتے۔'' وہ متعجب سے انداز میں بولا۔

'' والد عمر کے اس حصے میں ہیں جہاں ان کی موجودگی بھی ہمارے لئے بڑی بات ہے۔ان کا سایہ ہمارے سروں پر قائم رہے۔بس ہم یہی دعا کرتے ہیں۔'' وہ دل گرفتگی سے بول رہی تھی۔

''مطلب۔''

''مطلب یہ ہے کہ وہ ہر وقت بیمار رہتے ہیں اس لئے وہ کچھ نہیں کر سکتے۔''

''سمجھ سکتا ہوں اور آپ کے بہن بھائی کتنے ہیں؟'' فیصل نے بات کا رخ بدلنا چاہا۔

''تین بہنیں اور ایک بھائی میرا نمبر پہلا ہے اس لئے ساری ذمہ داری میرے کندھوں پر ہے۔ماں ایک روایتی قسم کی خاتون ہے۔جن کی صبح اور شام دعاؤں اور وظیفوں کے ذریعے خوشحالی کی آمد کی منتظر رہتی ہیں۔خیر چھوڑیے میں بھی کیا آپ کو اپنی روداد سنانے بیٹھ گئی۔'' وہ استہزائیہ سی ہنسی کے ساتھ گویا ہوئی۔

''میں نے آپ کو ڈسٹرب تو نہیں کر دیا؟'' فیصل نے کچھ دلچسپی لینے والے انداز میں پوچھا۔

''نہیں بس ابھی میری واپسی ہوئی ہے۔آج ٹریفک جام تھا اس لئے لیٹ ہو گئی۔''

''چلیے پھر تو آپ آرام کیجیے۔میں یقیناً آپ کو ڈسٹرب کر رہا ہوں۔'' فیصل نے دلی

جذبات کا بھرپور اظہار کیا۔

''اچھی بات ہے۔'' وہ بھی خوش دلی سے بولتی اللہ حافظ کہہ رہی تھی۔ ہمیں اس نفسا نفسی کے دور میں ایسے مخلص لوگوں کی قدر کرنا چاہیئے لیکن کون کرتا ہے؟ وہ اپنے ہی سوالوں کے جال میں مکڑی کی طرح الجھی سوچوں کے جال کو مزید وسعت دینے لگی۔

O......O......O

''بہت افسوس کے ساتھ آپ کو بتا رہی ہوں کہ وہ مریض اب اس دنیا میں نہیں رہا۔'' دو روز بعد۔ فرح نے تاسف سے ہونٹ بھینچتے ہوئے کہا۔

''اناللہ وانا الیہ راجعون۔'' وہ دکھ سے بولا۔

''بہت تکلیف دہ خبر سنائی ہے آپ نے، آپ کے پاس ان کے گھر کا ایڈریس ہے؟''

''جی لیکن کیوں؟''

''میں تعزیت کے لئے ان کے گھر جانا چاہتا ہوں۔''

''اچھا۔'' وہ چونکی۔

''آپ پلیز مجھے ان کے گھر کا ایڈریس میسج کر دیں۔''

''ٹھیک ہے کل صبح کر دونگی۔ اس وقت تو میرے پاس نہیں ہے۔'' وہ ایک گہری سانس کھینچتے ہوئے بولی۔

''انسان بھی کتنا عجیب ہے اس دنیا میں آتا ہے۔ محنت کرتا ہے۔ رشتوں میں بندھتا ہے۔ خوشی اور غم کے درمیان پنڈولم بنا وہ اپنے حالات سے لڑتا رہتا ہے اور پھر اس دنیا سے چلا جاتا ہے۔'' وہ مضمحل سا سانس بھرتا بول رہا تھا۔

''یہ تو ہے۔ خیر میں صبح آپ کو محمد ایوب کے گھر کا ایڈریس SMS کردوں گی۔ ابھی میں ذرا مصروف ہوں۔'' وہ جلد بازی کا مظاہرہ کرتی موبائل کا فلیپ گرا چکی تھی۔ سچ تو یہ تھا کہ وہ اس طرح کی باتوں سے الجھنے لگی تھی۔ اسے حقیقت سے انکار نہیں تھا مگر کسی کی بھی وفات کی خبر سے اس کا دل پریشان ہو جاتا اور پھر عجیب سے خیالات اسے ستانے لگتے۔

O......O......O

آج صبح ہی اس کی طلبی اسپتال کے منتظم کے سامنے ہوئی..... ''مس فرح آپ ذرا ٹائم کا خیال رکھیں۔آپ کی غیر موجودگی کتنے مریضوں کے لئے پریشانی کا باعث بن جاتی ہے۔کم از کم آپ مطلوبہ ٹائم تک تو پہنچ جایا کریں۔'' سرجن ضیاء دیر سے آنے پر اسے خفگی سے ڈانٹ رہے تھے۔

''سر آئندہ احتیاط کرونگی۔ سرجانی ٹاؤن سے یہاں تک پہنچنا دشوار ہوتا ہے اور صبح ٹریفک جام اور بسوں میں رش ہونے کی وجہ سے دیر ہوجاتی ہے۔''

''ہوں۔'' وہ برہم سے لہجے میں بولے۔''ٹھیک ہے آپ جایئے اور اپنا کام شروع کریں۔''

''اوہ آپ۔'' وہ سیڑھیوں سے اترتی نیچے پہنچی تو فیصل کھڑا تھا۔

''میں آپ کا منتظر تھا۔''فیصل پینٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالے اس کو دیکھ رہا تھا۔پھر وہ بھی جلدی جلدی رجسٹر کے صفحے پلٹتی رہی۔

''K-4 چورنگی کے قریب اس مریض کی رہائش ہے۔یعنی میرے گھر کے قریب۔'' وہ آہستہ سے بولی۔

''اچھا آپ اس طرف ہی رہتی ہیں؟'' فیصل نے اشتیاق سے پوچھا۔

''جی۔'' وہ کچھ جھجکتے ہوئے بولی۔

''تو یوں کیوں نہیں کرتے۔جب آپ کی آف ہو۔آپ میرے ساتھ چلیں۔ان کے گھر تعزیت کرنے کے بعد میں آپ کو آپ کے گھر ڈراپ کر دوں گا۔'' وہ مخلصانہ مشورہ دے رہا تھا۔'' ویسے آپ کی ڈیوٹی کب تک آف ہوجاتی ہے؟'' اگلا سوال اس نے جلدی سے کرلیا۔

''شام چھ بجے تک لیکن...... '' وہ مزید کچھ بولتی کہ وہ پھر بول پڑا۔

''اس سے اچھی کیا بات ہے۔میری بھی آف ٹائم یہی ہے۔میں آپ کو اسپتال سے پک کرلوں گا۔پھر تعزیت کے بعد آپ کو آپ کے گھر چھوڑ دوں گا۔ٹھیک ہے؟'' اس کے لہجے میں امید تھی اور وہ بھی منع نہیں کر سکی۔

''اچھا میں چلتا ہوں آپ کو ٹھیک سوا چھ تک لینے آجاؤں گا۔'' وہ کاؤنٹر پہ رکھا ہوا

ہیلمٹ ہاتھ میں لیتے ہوئے بولا اور اپنے بال سنوارنے لگا اور پھر ہلکی سی مسکراہٹوں کے تبادلے کے ساتھ باہر نکل گیا تو فرح بھی رجسٹر کھولتے ہوئے مصروف ہو گئی۔

اس دن چند وجوہات کے باعث فرح کی ڈیوٹی بڑی مشکل سے سات بجے آف ہوئی تھی۔ فیصل ویٹنگ روم میں اس کا منتظر تھا۔

''سوری مجھے دیر ہو گئی اصل میں اس اسپتال کے منتظم سرجن ضیاء اتنے اچھے انسان ہیں کہ میں انکا کہا ٹال نہیں سکتی۔ وہ ہوا یوں کہ......''

''اچھا، چلو دیر ہو رہی ہے؟'' فیصل اس کی بات اگنور کرتے ہوئے بولا تو وہ دونوں اسپتال کے گیٹ سے نکلتے پارکنگ ایریا میں آ گئے۔

''میں بائیک لے کر آتا ہوں۔ ویٹ پلیز۔''

''کیا بائیک پر؟'' وہ زیر لب بڑبڑائی۔

''آؤ جلدی سے۔'' اب وہ اس کے قریب بائیک اسٹارٹ کیے کھڑا تھا۔

''نہیں میں آپ کے ساتھ بائیک پر نہیں بیٹھ سکتی''۔ وہ اردگرد دیکھتے ہوئے بولی۔

''کم آن فرح ڈونٹ بی سلی، سب ہمیں دیکھ رہے ہیں۔ میرا مذاق تو نہ بناؤ'' وہ آہستہ آہستہ تنبیہ کرتے انداز میں گویا ہوا۔

''لیکن......!''

''جلدی کرو یار۔'' اور پھر وہ گومگو کی سی کیفیت میں اسکے پیچھے بیٹھ گئی۔ اسے جتنی دعائیں یاد تھیں وہ سارے راستے اپنا حصار کھینچتی رہی، مختلف گلیوں میں مڑنے اور پتا پوچھنے کے بعد انہیں بالآخر محمد ایوب کا گھر مل ہی گیا اور پھر وہ دونوں اگلے آدھے گھنٹے میں تعزیت کر کے فارغ ہو گئے۔

''کہاں چھوڑوں آپ کو؟'' فیصل کا لہجہ محبت اور خلوص سے بھرپور تھا۔

''میں اپنے گھر کے قریب ہوں۔ یہیں سے بس میں بیٹھ جاؤں گی۔ آپ کے ساتھ جانا مجھے کچھ عجیب سا لگ رہا ہے۔ میرے محلے والے کیا سوچیں گے؟'' وہ دھیمے لہجے میں بولتی چلی گئی۔

''بات تو درست ہے۔ تو ٹھیک ہے اب آپ جایئے میں بھی اپنے گھر جاتا ہوں۔ وہ اسٹاپ پر اترتے ہی پہلے سے کھڑی بس میں چڑھ گئی جبکہ فیصل موڑ کاٹتا ہوا روانہ ہو چکا تھا۔

فرح کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا آج ایک اجنبی کی رفاقت میں وہ اتنا بڑا قدم اٹھا چکی تھی۔

کہیں کسی نے دیکھ نہ لیا ہو؟ راستہ طے کرتی وہ ڈرتے ڈرتے گھر پہنچی تھی۔ مگر گھر میں سب کچھ معمول کے مطابق تھا۔ نہ ہی کوئی نئی بات اور نہ ہی کوئی نیا سوال لیکن ایک نئی بات ضرور ہوئی اور وہ فیصل کی کال تھی۔ وہ فرح سے خیریت سے گھر پہنچنے کے بارے میں دریافت کر رہا تھا۔

''میں تمہیں آدھے راستے میں چھوڑ تو آیا لیکن گھر پہنچنے تک پریشان رہا۔ تم خیریت سے تو پہنچ گئی تھیں ناں؟'' اس کا لہجہ فکر سے آباد تھا۔

''جی یہ تو معمول کی بات ہے؟''

''ٹھیک ہے پھر آرام کرو، باقی باتیں بعد میں۔'' فیصل لائن کاٹ چکا تھا مگر اس کے کان سے موبائل بدستور لگا ہوا تھا۔ اس کی خشک آنکھوں میں ہلکی سی نمی اتر آئی اور دل بے اختیار ہو گیا۔ فیصل کے لب و لہجے میں جو خیال اور پیار تھا وہ اس کی زندگی سے جانے کب کا خارج ہو چکا تھا۔ گھر میں سب اسی روٹین کے عادی ہو چکے تھے اس کو دیر سویر ہو ہی جاتی ہے۔ کسی کو اس بات کی پرواہ نہیں تھی۔ ہاں بس اس کی ماں تنخواہ والے دن ضرور اس کے پاس تھوڑی دیر بیٹھ جاتی اور اس سے احوال دریافت کر لیتی۔ ماں کے اس رویئے پر اسے پہلے کچھ دکھ ہوتا تھا مگر اب کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ یہی تو اس کی خواہش تھی کہ وہ اپنے ماں باپ کا سہارا بنے۔ بہنوں اور بھائی کو کسی مقام پر پہنچائے مگر آج فیصل کے اتنے پیار اور احترام کے ساتھ پیش آنے پر وہ ایموشنل سی ہو گئی تھی۔ زندگی نے پہلی بار اسے احساس دلایا تھا کہ وہ جو دوسروں کا سہارا بنی ہوئی ہے اسے خود بھی ایک سہارے کی ضرورت ہے۔ ایک ایسا ساتھی جو دکھ، درد اور غم میں اس کا ساتھ دے۔

O.....O.....O

لفظ محبت میں اتنی کشش ہوتی ہے کہ وہ جن فریقین کے درمیان آجائے انہیں ایک کر دیتی ہے۔ شاید مقناطیسی کشش کا دوسرا نام محبت ہی ہے۔ فیصل کی باتیں، اس کا انداز۔ اسے دن بدن گرویدہ بناتا چلا گیا۔ ملنسار تو وہ تھا ہی اور رحم دل بھی ۔ دکھ اور تکلیف دیکھ کر تڑپ جانے والا جب سے اس نے فرح کے گھر کے حالات جانے تھے اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ کیسے اس کی مدد کرے۔

"تم واپسی پر میرے ساتھ گھر چلا کرو تمہارا کرایہ بچ جائے گا۔"

"تم بھائی کی پڑھائی کے لئے پریشان نہیں ہو اسے اچھے کالج میں داخلہ میں دلوادوں گا۔"

"چھوٹی بہن پہلے پڑھائی تو ختم کر لے پھر اس کے جہیز کی فکر کرنا۔ میں ہوں ناں تمہارے ساتھ۔"

"ارے بابا کی فکر مت کرو۔ ان کو صرف غربت کا مرض لاحق ہے۔ گھر کے حالات صحیح ہوتے ہی ان کی طبیعت بھی بحال ہو جائے گی اور تمہاری امی وہ تو بہت سویٹ خاتون ہیں۔ اللہ انہیں ہمت و حوصلہ دے۔"

فرح کی ہمت مجتمع ہونی شروع ہو گئی اور وہ جو تھکنے لگی تھی۔ فیصل کا یقین اور عزم سے پُر لہجہ اسے پُر امید کر دیتا۔ دل تو پہلے ہی سیرابی کا متلاشی تھا۔ جانے کب فیصل کے نام کا تخم اس کے دل کی سرزمین پر اگ آیا اور پھر خود رو بیل کی طرح ایسا پھیلا کہ وہ خود بھی اس میں جکڑتی گئی۔ فیصل کی محبت فرح کے وجود پر چھا چکی تھی۔

O......O......O

"فیصل آپ کے گھر میں کون کون ہے؟" بہت عرصے بعد وہ یہ سوال فیصل سے کر رہی تھی جو شاید اسے بہت پہلے پوچھنا چاہئے تھا۔

"امی، ابو ایک بہن اور دو بھائی۔" وہ سادگی سے بتا رہا تھا۔

"اور کوئی نہیں۔" فرح نے کریدنا چاہا۔

"نہیں اور کوئی بھی نہیں۔" اس نے اسی کی ٹون میں جواب دیا۔ "ویسے تم ہو ناں کسی

اور کی کیا ضرورت۔" اسکے جواب نے فرح کے چہرے پر شفق کے رنگ بکھیر دیے

"مجھے آپ جیسے ساتھی کی تلاش تھی۔ میں اپنے رب کی شکر گزار ہوں کہ اس نے میرے خیال سے بڑھ کر مجھے ساتھی عطا کیا۔" وہ پلکیں جھکائے بول رہی تھی۔

"بہت شکریہ۔" وہ دلفریب انداز میں بولا

"مجھ سے شادی کریں گے آپ؟" فرح نا جانے کس احساس کے تحت پوچھ بیٹھی۔

"یہ میری خوش قسمتی ہوگی۔ لیکن فرح میں تم سے کچھ نہیں چھپاؤں گا۔" وہ اٹکتے اٹکتے بول رہا تھا۔" میرے والدین میری شادی خاندان میں کرنا چاہتے ہیں اگر تمہاری اور تمہارے گھر والوں کی رضامندی ہوئی تو میں تمہیں شادی کے بعد الگ رکھوں گا۔ اپنے گھر نہیں لے جا سکتا۔" وہ ٹوٹے ہوئے لہجے میں بول رہا تھا۔" تم میری بات تو سمجھ رہی ہو ناں؟"

"جی لیکن میرے ساتھ بھی ایک پرابلم ہے میں اپنے گھر والوں کی کفالت کرتی ہوں۔ میں ان کو اس حال میں نہیں چھوڑ سکتی۔ کیا آپ میری یہ بات مان لیں گے مجھے شادی کے بعد پورا حق دیں گے کہ میں ان کی اسی طرح دیکھ بھال کروں گی جیسے ابھی کرتی ہوں۔" وہ سنجیدگی سے بولتے ہوئے موبائل دوسرے کان پہ منتقل کر چکی تھی۔

"ارے یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ بھلا مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے اور جہاں تک مجھ سے ہو سکے گا میں بھی تمہاری مدد کروں گا۔" فیصل نے جوش کا مظاہرہ کیا۔

"ٹھیک ہے میں، امی، ابو سے بات کرلوں تو آپ کو بتا دوں گی۔" فرح نے حتمی فیصلہ سنایا۔

"او کے ڈیئر جیسی تمہاری خوشی، میرے لئے تو ہر حالت میں تمہاری خوشی مقدم ہے۔" وہ محبت بھرے لہجے میں اس کی سماعتوں میں رس گھولتا لائن کاٹ چکا تھا۔

O......O......O

"فرح کے والدین راضی نہیں تھے۔ انہیں نکاح کے خفیہ طریقہ کار پر اعتراض تھا مگر وہ بھی مجبور تھی اسے فیصل جیسا ملنسار اور محبت کرنے والا ساتھی پھر نہیں مل سکتا تھا۔ سو اس نے مشورے کی غرض سے اپنے اسپتال کے منتظم سرجن ضیاء سے بات کی۔

"ٹھیک ہے تم اس لڑکے کو میرے پاس بلاؤ۔ میں اس سے بات کرتا ہوں۔" سرجن ضیاء نے اس کو سمجھانے والے انداز میں کہا۔

"جی ٹھیک ہے۔" وہ اسی پر اکتفاء کرتی پلٹ آئی۔ اب اس کے دل و دماغ میں جنگ چھڑی ہوئی تھی۔ ارمانوں، خواہشوں اور احساس سے بھرپور اس رشتے کو چھپانا کتنا تکلیف دہ ہے مگر وہ مجبور تھی شاید اس لئے کہ فیصل سے اچھا رشتہ اسے نہیں مل سکتا تھا یا پھر اس لئے بھی کہ فیصل کو اس نے ایک نرم مزاج اور رحم دل انسان پایا تھا۔ اسی لئے دل بار بار فیصل کے حق میں رائے دے رہا تھا۔

O......O......O

"محترم! آپ سمجھنے کی کوشش کیجئے میرے والدین راضی نہیں ہوں گے۔" فیصل نے خود اعتمادی سے جواب دیا۔

"لیکن بیٹا آپ کوشش تو کر سکتے ہیں؟" سرجن ضیاء انتہائی تحمل سے مخاطب تھے۔

"سر آپ کی بات درست ہے لیکن مسئلہ یہ ہے میری والدہ اپنی بہن کی بیٹی سے میری شادی کرنا چاہتی ہیں۔ مجھے فرح پسند ہے اور میں فرح کو بطور شریک حیات اپنی زندگی میں شامل کر کے بہت خوشی محسوس کروں گا۔ میری خواہش تھی کہ میری بیوی ہمت و حوصلہ، بہادری اور ملنساری کی مالک ہو اور فرح میں یہ تمام خوبیاں موجود ہیں۔"

"برخوردار نکاح خفیہ کیوں رکھنا چاہتے ہو؟" سرجن ضیاء کے تیور کڑے تھے۔

"سر شادی کے کچھ عرصے بعد مناسب حالات دیکھتے ہوئے میں فرح کو امی سے ملواؤں گا، پھر انہیں فرح کو بہو کے طور پر قبول کرنا پڑے گا اگر انہیں نکاح سے پہلے اس بات کی سن گن بھی مل گئی تو وہ میری شادی فرح سے نہیں ہونے دیں گے۔" فیصل اپنے بال سہلاتے ہوئے بول رہا تھا جبکہ دونوں کی باتیں سنتی فرح کے ذہن میں بس یہی سوچیں اتھل پتھل ہو رہی تھیں کہ اب اسے نہ تو کسی چیز کی ضرورت ہے اور نہ خواہش کیوں کہ فیصل اب اس کے لئے طلب بن کر رہ گیا۔

"میرے خیال میں فیصل کی سوچ بری نہیں۔ تم بتاؤ فرح تمہارا کیا ارادہ ہے؟" سرجن

ضیاء فرح سے مخاطب تھے۔

"میرے امی، ابو اس طرح سے شادی کے لئے راضی نہیں۔" وہ جھجکتے ہوئے بولی۔

"ارے یار تم شادی کے بعد انکل اور آنٹی کا ویسے ہی سہارا بنی رہو گی جیسے ابھی ان کی مدد کرتی ہو اور میں بھی ان کا بیٹا بن کر ان کے پاس رہوں گا۔انہیں اور کیا چاہئے۔" فیصل کے لہجے میں ہلکا سا طنز جھلک آیا۔

"اچھی طرح سوچ لو، اگر دل اور گھر والے اجازت دیں تو تم دونوں میرے پاس آجانا میں گواہ کے طور پر تم دونوں کے نکاح میں شامل ہو جاؤں گا۔تم دونوں عقل و شعور رکھتے ہو۔ ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھتے ہو۔ بہتر فیصلہ کر سکتے ہو۔" سرجن ضیاء کمرے سے نکل گئے مگر فرح کی آنکھوں میں آئے آنسو فیصل سے چھپ نہیں سکے۔

"کم آن اتنا مت گھبراؤ میں تمہیں پریشان نہیں دیکھ سکتا۔" فیصل نے اسے انتہائی محبت سے اپنے کندھے سے لگایا تو وہ پر کٹے مفلوج پرندے کی طرح اس کے کندھے سے لگی پھوٹ ، پھوٹ کے رونے لگی۔ وہ ناقدری اور ناشکری نہیں بننا چاہتی تھی جو اتنی سچی اور بے غرض محبت سے اپنا دامن جھٹک لیتی۔

O......O......O

"فیصل! امی، ابو تیار ہیں۔ آپ سرجن ضیاء کے ساتھ مل کر نکاح کی تاریخ فکس کر لیں۔" وہ اتنی خوشی کی خبر انتہائی دل گرفتگی سے بتا رہی تھی۔

"مجھے دولتمند بنانے کا شکریہ،تمہارے پاس اتنے مخلص اور پیار کرنے والے رشتے ہیں ۔جن کی قدر مجھ سے بہتر کوئی بھی نہیں کر سکتا۔فرح دنیا جہاں کی خوشیاں تمہارے قدموں میں ڈھیر کر دوں گا۔ یہ میرا وعدہ ہے تمہارے لبوں سے مسکراہٹ کبھی نہیں روٹھے گی۔" فیصل بول رہا تھا جب کہ فرح کے چہرے پر حیاء کے ڈھیروں رنگ بکھرے ہوئے تھے۔

"فیصل ہم رہیں گے کہاں؟" وہ سر اٹھا کر سامنے دیوار کو گھورتے ہوئے بولی۔ اپنے لئے چار دیواری کے تصور سے آباد اس کی آنکھوں میں سوال تھا۔

"ڈونٹ وری، وہیں امی کے گھر کے قریب ایک مکان کرائے پر لے لیں گے اس

طرح تم دونوں ایک دوسرے سے قریب بھی رہو گے اور مجھے بھی اطمینان رہے گا۔"

"یہ تو بہت اچھی بات ہے"۔ وہ یک دم چہکی تھی۔

"فرح حالات ابھی ہمارے حق میں نہیں ہیں لیکن میں کچھ ہی دنوں میں تمہیں اپنے گھر لے جاؤں گا۔ امی، ابو کو راضی کر لوں گا۔ تم مجھے سمجھ تو رہی ہو ناں؟" فیصل فکرمندی سے پوچھ رہا تھا۔

"جی فیصل مجھے آپ پر پورا بھروسہ ہے میرے پاس کبھی اتنی فرصت ہی نہیں تھی کہ میں اپنے آئیڈیل کے بارے سوچتی لیکن آج اس بات کا احساس شدت سے ہو رہا ہے کہ اگر میں آئیڈیل ازم کے بارے میں سوچتی تو وہ آپ ہی جیسی شخصیت ہوتی۔"

"چلو پھر ہماری دلہن بننے کی تیاری شروع کرو۔ میں نہیں چاہتا کہ میری ہونے والی دلہن کسی بھی چیز سے محروم رہے۔" فیصل لائن کاٹ چکا تھا اور وہ گردش ایام کے اس انوکھے اور خوبصورت چکر میں پھنسی مسحور ہو رہی تھی۔

O......O......O

صبح و شام معاشی فکریں، بھائی بہنوں کی فیسیں، ابو کی دوائیں، بہن کے جہیز کیلئے جمع پونجی، گنتی اس کی ماں، دال روٹی پر جھگڑا، کھوں کھوں کرتی فضاء میں پھیلی دوائیوں کی بدبو ماں کی سلائی مشین کا شور اور صبح سے شام ریسیپشن پر کھڑے دکھتی اس کی ٹانگوں نے اس کے اندر کی شوخ اور ہنستی لڑکی کو مار دیا تھا۔ حالات کی چکی میں پستے پستے وہ اپنی عمر کے سہانے خواب دیکھنا بھول گئی تھی۔ بلکہ وہ تو خواب دیکھنے والی لڑکی ہی نہیں تھی لیکن آج فیصل کی رفاقت میں اس کے اندر کی وہ شوخ و چنچل سی لڑکی جاگ اٹھی تھی۔ دو کمروں پر محیط یہ مکان اس کی جاگیر تھا اور اس مکان کی راج دھانی اس کے قبضے میں تھی۔ فیصل کی محبت میں اس کو زندگی کے رنگوں سے آشنا کرا دیا تھا۔ اب وہ جو کچھ کماتی خاموشی سے امی کے ہاتھ پہ رکھ آتی اور فیصل کی کمائی پر اتراتی خود پر رشک کرتی۔ وہ اپنے رب کی شکر گزار تھی اور فیصل کی بھی مشکور۔

"فیصل آپ تین دن گھر پر نہیں تھے۔ میں اکیلے گھر میں ڈر گئی تھی۔ اس لئے امی کے

پاس چلی گئی تھی۔"

"اچھا کیا۔ میں بھی تین دن امی کے پاس رہا تو ان کا موڈ کچھ ٹھیک ہوا۔ سوچ رہا ہوں کچھ وقت گزرے تو تمہیں بھی گھر لے جاؤں۔" فیصل بجھے لہجے میں بول رہا تھا۔

"ہوں کوئی بات نہیں۔ اب آپ جب جائیں گے تو میں امی کے پاس رہنے چلی جاؤں گی۔ ٹھیک ہے ناں؟" وہ آئندہ کی منصوبہ بندی کر رہی تھی۔

"ہاں بھئی او کے۔"

"فیصل امی جہیز نہیں دے سکیں لیکن اس خالی گھر میں ضرورت زندگی کی چیزوں کی کتنی کمی محسوس ہوتی ہے؟" وہ آہستگی سے بولی۔

"اوہو۔ ہوم اپلائنسز والوں سے ٹی وی اور واشنگ مشین کی بات ہو چکی ہے۔ اگلے دو سال تک قسطیں ادا کروں گا میں اور کیا چاہئے میری پیاری بیوی کو، اور چھوٹی سوئی تو ہر چیز ہے ہی ہمارے پاس۔" وہ اس کا ہاتھ تھامے اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔

"نہیں اللہ کا شکر ہے، فیصل آپ کی رفاقت میں زندگی کتنی حسین لگنے لگی ہے۔ آپ تو مجھے ایسے ملے ہیں جیسے کوئی مسیحا۔" فرح نے اپنی آنکھیں زور سے میچ لیں اور فیصل کی گود میں اپنا سر گھسا لیا۔

"دکھ کا موذی مرض لئے اتنے عرصے سے اسپتال جا رہی ہو۔ دیکھا علاج ہمارے پاس تھا۔ تمہارے ڈاکٹرز بھی کچھ نہ کر سکے۔" فیصل شوخی سے بولا تو وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔

"میں آپ کی محبتوں کی مقروض ہوں۔ آپ نے مجھے اتنا کچھ دیا ہے تو میں بھی آپ کو ایک اچھی سی خبر سنانا چاہتی ہوں۔" فرح نے شرماتے ہوئے سر اس کی گود سے اٹھاتے ہوئے اس کے کندھے پر ٹکا دیا۔

"وہ کیا؟" فیصل نے اس کے بالوں کو سہلاتے ہوئے پوچھا۔

"وہ یہ کہ .... آپ خود سمجھ نہیں سکتے؟" وہ ایک زوردار مکا اس کے شولڈر پر مارتے ہوئے بولی۔

"نہیں یہ تو تم بہتر بتا سکتی ہو کہ ہمیں اس خوشخبری کے انتظار میں کتنے ماہ کا انتظار درکار

ہے؟'' فیصل کی انگلی اس کی ٹھوڑی پر تھی اور یہ جملہ فرح کے وجود میں تہلکہ مچا گیا۔

''آپ بھی ناں۔'' وہ آنکھیں بند کئے اس ادھورے جملے پر اکتفا کر چکی تھی مگر اس کی خفیف سی مسکراہٹ نے ماحول میں لطیف سا رنگ پیدا کر دیا تھا۔

O......O......O

''خبردار جو کوئی اپنی جگہ سے ہلا۔'' گھر میں گھسنے والے چار لڑکے منہ پہ کپڑا باندھے صحن کے چاروں کونوں میں کھڑے تھے۔ ان میں سے ایک نے فیصل کے سینے پر پستول رکھ دی۔ ''نیا شادی شدہ جوڑا لگتا ہے۔'' ایک لڑکے نے آہستگی سے دوسرے کے کان میں سرگوشی کی۔

''نکالو جلدی سے، جتنی نقدی اور زیور ہے، سب یہاں ڈھیر کردو۔'' ان چاروں میں سے ایک چلایا۔

''چلے جاؤ یہاں سے۔ تم لوگوں کی ہمت کیسے ہوئی یہاں گھسنے کی۔'' فیصل دھاڑا جبکہ فرح دوپٹہ خود سے لپیٹے ایک کونے میں کھڑی تھر تھر...... کانپ رہی تھی۔

''جلدی سے چابیاں میرے حوالے کر دو، کھولو الماری۔'' وہ پستول فیصل کی کنپٹی پر رکھتے ہوئے غرایا۔

''دھونس دیتا ہے مجھے۔'' فیصل نے اس کا ہاتھ جھٹکا۔

''بیوی تو تیری کمال کی ہے۔'' ان چاروں میں سے ایک نے دانت نکالے۔

''خبردار۔ جو میری بیوی کے بارے میں کچھ کہا، نکلو یہاں سے ورنہ میں شور مچا دوں گا۔'' فیصل ایک لڑکے کا گریبان پکڑتے ہوئے بولا۔ اب ان دونوں میں ٹھیک ٹھاک مزاحمت ہو رہی تھی۔

''چھوڑیے فیصل، پلیز رہنے دیں۔'' فرح روتی، چلاتی چیخ رہی تھی۔

''نہیں ابھی میں پولیس کو انفارم کرتا ہوں۔'' فیصل اس سے الگ ہوتے ہوئے موبائل اپنی جیب سے نکالنے لگا۔

''مار دو سالے کو۔'' ایک چلایا۔

"نہیں دیکھئے پلیز، میں معافی مانگتی ہوں آپ سے۔" فرح ہاتھ جوڑتی، منت کرتی ان کے سامنے تھی جبکہ فیصل نمبر ملا رہا تھا۔

"ارے ختم کردے۔" اور پھر اس جملے کے ساتھ ہی ایک اسٹریٹ فائر فیصل کے دماغ کو چھلنی کرتا گزر گیا..... فیصل فوراً ہی نیچے گر گیا۔ فرح کی دل خراش چیخیں فیصل کا سر گود میں رکھے بلند ہوئیں تو چاروں لڑکے دیواریں پھلانگتے واپس چلے گئے۔

O......O......O

فیصل کی ناگہانی موت نے فرح کو جیتے جی مار دیا۔ فیصل کی آخری رسومات سے پہلے فیصل کے ماں باپ کو اطلاع دی گئی اور پھر ان کے آنے کے بعد ایک اور پہاڑ فرح پر قہر بن کر ٹوٹا۔

"تم کون ہو؟" فیصل کی امی فیصل کے غم سے نڈھال فرح سے سوال کر رہی تھیں۔

"یہ فیصل کی بیوی ہے۔" پڑوس کی ایک خاتون نے گم سم بیٹھی فرح کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"جھوٹ ہے یہ، میرا فیصل تو پہلے سے شادی شدہ ہے۔ اس کے تو دو بیٹے بھی ہیں۔" یہ انکشاف فرح کی روح کو چھلنی کر گیا۔

"تم لوگوں کی ملی بھگت ہے۔ تم لوگوں نے ہی مارا ہے میرے بیٹے کو۔ میرے شریف بچے کو اپنے جال میں پھنسایا ہوا تھا جب ہی گھر سے تین تین دن غائب رہتا تھا وہ۔ میں تم لوگوں کے خلاف پولیس میں کمپلین لکھواؤں گی۔ ختم کر ڈالا میرے بچے کو۔" وہ دھاڑیں مار مار کر روتے ہوئے فرح سے کہہ رہی تھیں۔ "تو ڈائن ہے۔ میری گود اجاڑ دی تو نے، ہائے میرا بچہ۔"

"اور پھر کچھ ہی دیر میں ایمبولنس گھر آ گئی اور وہ فیصل کی میت اپنے ساتھ لے گئی۔ فرح چیختی چلاتی رہی۔ یقین دلاتی رہی مگر کون اس کی سنتا محلے والے بھی اس کو مشکوک سی نظر سے دیکھتے ہوئے اٹھنے لگے۔ اس کا عجب تماشہ بنا تھا۔ اس کے امی، ابو بھی خاموش تھے۔ وہ اس چار دیواری میں دیواروں سے سر پٹختی رہی۔ وہ گھر جو اس کے لئے جنت تھا آج

قفس بن گیا تھا۔ اسے نہ رب سے شکوہ تھا اور نہ تقدیر سے شکایت مگر وہ قدرت کی ستم ظریفی پر حیران تھی۔ اسے لگ رہا تھا فیصل کو نہیں بلکہ اسے قبر میں اتار دیا گیا ہے۔ اس کا ہمدم، اسکا چاہنے والا، اسکے محرم کا فقط ایک جھوٹ اسے زندگی بھر کیلئے مشکوک رشتے میں باندھ چکا تھا۔ جس کی تلافی وہ کیسے کرتی؟

''سرجانی ٹاؤن کے رہائشی فیصل کے گھر میں چار ڈاکوؤں نے حملہ کر دیا۔ مالک مکان کے مزاحمت کرنے کی وجہ سے اسے مار دیا گیا جبکہ ڈاکو گھر کا سامان لے کر فرار۔''

یہ خبر ہر اخبار میں چھپی لیکن کوئی اس خبر کی تصدیق نہیں کر سکا کہ فرح بے قصور تھی۔ وہ ایک جائز رشتے سے منسلک تھی۔ ایک ایسا رشتہ جو ہر لڑکی کا خواب ہوتا ہے مگر فرح کے لئے اس رشتے کا ثبوت اس کا نکاح نامہ بے کار تھا کیوں کہ وہ رجسٹرڈ نہیں ہو سکا تھا۔ بس اس کا گواہ اس کا رب تھا جس کے سامنے وہ جوابدہ تھی۔

O......O......O

فرح ابھی عدت کے مراحل سے گزر رہی تھی کہ ایک ننھی سی کونپل نے اس کے وجود سے جنم لیا۔ وہ بچہ ہو بہو فیصل تھا۔ اسے لگا ننھے فیصل نے اس کی گود میں آنکھ کھولی ہو۔"

''ناجائز اولاد ہے۔'' یہ پہلا تیر تھا جو اس کی پڑوسن نے اس کی جانب پھینکا۔

''پتا نہیں کس کے ساتھ رہ رہی تھی۔ شادی ایسے تھوڑی ہوتی ہے۔'' یہ دوسری پڑوسن تھی۔

بدنامی کے ڈر سے فرح کی ماں اور گھر والوں نے بھی خاموشی کو اپنا لیا مگر آج فرح کی زندگی ایک ایسی سفاک حقیقت ہے جس سے نظریں چرانا ناممکن ہے۔

زمانہ فرح کے بیٹے کی ولدیت کے خانے سے فیصل کا نام کھرچ دینا چاہتا ہے اور وہ فیصل کی اس نشانی کو گود میں لئے اپنی عدت مکمل کر رہی ہے۔ صرف اس عزم کے ساتھ کہ اس کا جو کچھ کھو چکا یہ بار تو وہ سہہ لے گی لیکن فیصل کی نشانی کو فیصل کے نام سے زندہ رکھے گی۔

''کیسے؟''

یہ سوال فرح کے چہرے پر نمایاں ہے؟ اور اس کا جواب؟؟ جانے کب اور کیسے ملے۔

☆......☆......☆

دُکھ دریا کے پار

ایک اور بم دھماکہ، ایک اور خودکش حملہ، درجنوں بے گناہ شہید کر دیے گئے خودکش بمبار کی نعش کی چیتھڑے اڑ گئے، اس کے جسم کے اعضاء دور دور تک بکھر گئے۔ یہ ہیں وہ تازیانے جو روز میرے ذہن پر برستے ہیں۔ صبح دم میں کانپتے ہاتھوں سے دہلیز پہ پڑے تازہ اخبار کو اٹھاتی ہوں اور جب میری نظریں خون آلود تصویروں پر پڑتی ہیں تو پھر میرا کیا حال ہوتا ہے؟

میری رات بھر کی محنت، شوق مطالعہ کچھ کر گزرنے کا جذبہ خاک میں مل گیا۔ مجھ پر یہ سوچ غالب آگئی ہے کہ میں یہ سب کچھ کیوں کروں کیونکہ ایک دن وہ آئیں گے اور میرا کلاس روم دھماکے سے اڑا دیں گے اور دہشت گردوں کے ہاتھوں طالبات مر جائیں گے۔

میں جو علم کی پیاس بجھانے رات بھر علم کے سمندر سے سچے موتی جمع کرنے کی سعی کرتی رہتی، صبح ہوتے ہی اخبار کی ایک خبر میرے وجدان کو خالی کر دیا کرتی اور بس میرے ذہن کے ہر گوشے میں ایک ہی خوف سر ابھارتا رہتا کہ کب نامعلوم مقام سے آنے والی گولی میرے دماغ کو چیرتی ہوئی گزر جائے گی؟ کب کسی دھماکے کی زد میں آکر میرے وجود کے چیتھڑے اڑ جائیں گے؟ ڈرتے ڈرتے کالج جانا اور پھر راستے بھر خواہ مخواہ بھلے چہروں کو بھی مشکوک نظروں سے دیکھتی، میں جب تک گھر نہیں آجاتی، تب تک مجھے سکون نہیں ملتا۔ کبھی پارکنگ میں کھڑی گاڑی سے غیر ارادی طور پر ٹیک لگاتے ہی سائرن کی آواز پر زور سے چیخ

میں دور بھاگ جاتی مبادا یہ الرٹ سائرن نہیں بلکہ بم پھٹنے کا سگنل ہو، کبھی کسی معصوم کی بے حرمتی کی خبر پر میرا وجود دہل کے رہ جاتا، کبھی کسی بچے کی بوری میں بند لاش پر میں تلملا اٹھتی۔ شاید ڈر نے اپنے پنجے میرے اندر مضبوطی سے گاڑ لیے تھے، جبھی میں ایمبولنس دیکھ کر بھی خوفزدہ ہو جایا کرتی اور میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگتا۔

مجھے آج بھی وہ منظر لرزا کر رکھ دیتا ہے جب میں نے T.V اسکرین پر ایک دوشیزہ پر کوڑے برستے ہوئے دیکھے، وہ کوڑے اس دوشیزہ پر نہیں بلکہ میرے دل و دماغ پر برس رہے تھے۔اس درد کی شدت میں آج بھی اپنے جسم و جان پر محسوس کرتی ہوں اور شاید اس درد سے میں زندگی کے آخری سانس تک بھی چھٹکارا نہ پا سکوں۔" اف خدایا! تیرے اس جہان میں سکون کہاں روپوش ہو گیا ہے اور امن کی فاختہ کس شکاری کے چنگل میں پھنسی ہوئی ہے؟"

"باجی! میں نماز پڑھنے جا رہا ہوں۔ دروازہ بند کرلو" عاشر کی آواز سے میری سوچوں کا حصار ٹوٹا۔

"کیا، نماز پڑھنے؟" میں زیر لب بڑبڑائی۔

"سنو عاشر.....!" میں عاشر کے پیچھے بھاگی۔

"جی باجی.....!" دروازے کے قریب پہنچے عاشر کے قدم میری آواز پر رک گئے۔

"میرے بھائی! نماز گھر پر ہی پڑھ لو"۔ میں نے التجائی انداز میں کہا۔

"کیوں؟" عاشر نے حیرت سے سوال داغا۔

"حالات کتنے خراب ہیں ناں؟" میں منمنائی حالانکہ مجھے ایسا کہنے میں سخت دقت پیش آئی تھی۔

"باجی! تو کیا میں مسجد میں نماز پڑھنے بھی نہیں جا سکتا؟" عاشر کے لہجے میں شکوہ تھا۔

"نہیں جان.....! وہ..... دراصل کب کوئی ناخوشگوار واقعہ ہو جائے، کوئی مسجد میں بم باندھ کے گھس آئے؟" میں نے اندر کے ڈر کو لاکھ چھپانے کی کوشش کی مگر ڈر میرے لبوں تک آ ہی گیا۔

"افوہ باجی.....!! اگر ایسا ہوا بھی ناں تو میں خود کو خوش نصیب تصور کروں گا۔ پتا ہے باجی ....! میں شہید کہلاؤں گا اور اس وقت آپ کو بھی مجھ پر ناز ہوگا کہ آپ ایک شہید کی بہن ہیں۔"

"عاشر....!" میں نے فرطِ محبت سے عاشر کو بازوؤں سے تھام لیا اور اس کی پیشانی کا بوسہ لیا۔

"باجی....! آپ کو پتا ہے ناں شہید کا مرتبہ کتنا بلند ہوتا ہے۔ میں تو ہر نماز کے بعد یہی دعا مانگتا ہوں کہ مجھے شہادت نصیب ہو۔ میں نے کتابوں میں پڑھا ہے، شہادت کا مرتبہ دنیا میں بلند ترین رتبہ ہے۔ چاہے وہ اللہ اور اس کے رسول کیلئے شہادت ہو یا پھر اللہ کی راہ میں اس کے دین کی بقا کیلئے اپنی جان کو قربان کر کے شہادت حاصل کرتا ہو اور اللہ تعالیٰ نے شہادت دینے والے رتبے کو اپنے کلام میں بیان فرمایا ہے۔

"اور جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے جائیں، ان کو مردہ نہ کہو بلکہ وہ اللہ کے ہاں سے اپنا رزق پا رہے ہیں لیکن تم اس کا شعور نہیں رکھتے" عاشر نے جوش کا مظاہرہ کیا۔

"میرے بھائی! یہ بہن تم پر قربان، ابھی تو تمہیں بہت کچھ دیکھنا ہے، بہت کچھ کرنا ہے، یاد ہے ناں، پاپا کی خواہش تھی کہ میرا عاشر انجینئر بنے؟" میں نے عاشر کو پاپا کی لاسٹ وش یاد دلا دی۔

"ہاں، یہ تو ہے۔" عاشر کی آنکھوں میں نمی واضح تھی۔

"میرے بھائی! تم امی کا اور میرا واحد سہارا ہو۔ ہمیں تم سے بہت ساری امیدیں وابستہ ہیں۔ یاد ہے ناں، امی نے تمہاری اور میری پڑھائی کیلئے کتنے سال سلائی کی ہے اور ہمیں ہر ضرورت کی شے میسر کی ہے اور جب امی بڑھاپے کے دور سے گزر رہی ہیں تو اس وقت تم ہی ان کا واحد سہارا ہو۔" میں نے اندر کے ڈر کو لفظوں کا پیرہن پہنایا۔ سچ تو یہ ہے، اپنے چھوٹے سے معصوم بھائی کو کھونے کا احساس ہی میرے لئے موت سے کم نہیں تھا۔

عاشر کو بہلا پھسلا کے میں نے گھر میں نماز پڑھنے کیلئے راضی تو کر لیا مگر پھر بھی مجھے ٹینشن یہی رہنے لگی کہ جب عاشر اسکول جائے گا تو کیا ہوگا؟ گھر سے باہر اس کی حفاظت کون

کرے گا؟ اور میرا بھائی تو ابھی اتنا سادہ اور معصوم سا ہے کہ اگر کسی نے اس کو کوئی بیگ یا تھیلا پکڑانے کی کوشش کی تو یہ آرام سے اس کی مدد کو تیار ہو جائے گا۔ تشویش تھی کہ بڑھتی ہی جا رہی تھی اور پھر عاشر کے نماز پڑھنے تک میں پریشان ہی رہی۔ نماز وہ پڑھ رہا تھا، سجدہ ریز وہ تھا اور میں خدائے پاک سے دل ہی دل میں اس کی صحت و سلامتی کی دعائیں مانگ رہی تھی اور پھر اٹھتے بیٹھتے عاشر کو سمجھانا جیسے میری ڈیوٹی بن گئی۔

"دیکھو راجہ بھائی..... ! سنبھل کر جانا، اردگرد لوگوں پر نظر رکھنا، کوئی مشکوک آدمی نظر آ جائے تو وہاں سے دور ہو جانا، کسی اجنبی سے بلا ضرورت بات نہیں کرنا"

"کیا ہے باجی.... ؟ میں کوئی بچہ تو نہیں ہوں، بڑا ہو گیا ہوں۔" عاشر برہمی سے کہتا۔

"ٹھیک ہے، میں کچھ نہیں کہتی، جو تمہیں اچھا لگے، وہ کرو، میں تو بس فکرمند ہو جاتی ہوں جب تم دیر سے گھر لوٹتے ہو اور امی بار بار مجھ سے ہی سوال کرتی ہیں کہ عاشر گھر کب لوٹے گا؟ آج کیوں دیر ہو گئی؟" میں یکدم ہی روہانسی ہو گئی اور شاید اندر کی frustration سے میری آنکھوں میں نمی آ گئی تھی اور پھر قطرہ قطرہ آنسو میرے گالوں پر اپنا راستہ تلاش کرنے لگے۔

"ایک تو باجی....! آپ اتنی emotional ہو جاتی ہیں" ۔ عاشر نے اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ جبکہ اگلے ہی پل وہ کرکٹ کھیلنے باہر جا رہا تھا اور میں سہمی نظروں سے اسے جاتا دیکھ رہی تھی۔

O......O......O

عاشورہ کی وجہ سے اس روز عام تعطیل تھی۔ پچھلے دنوں دو دھماکوں کی خبریں مل چکی تھیں، اس لئے میں نے عاشر کو خاص طور پر گھر پر رہنے کی تلقین کی کیوں کہ مختلف چینلز بار بار "News Alert" میں سیکیورٹی انتظامات کے حوالے سے نیوز دے رہے تھے اور میں جو سدا کی ڈرپوک تھی، اس خبر پہ دل ہی دل میں دعائیں مانگ رہی تھی کہ دس محرم کا یہ جلوس خیر و عافیت کے ساتھ اپنے مقام پر پہنچ جائے ایسے حالات میں شہر کے بیچوں بیچ رہنا مجھے عذاب سے کم نہیں لگتا کیونکہ سب سے زیادہ متاثر ایم اے جناح روڈ، صدر اور ٹاور کا علاقہ

ہی ہوتا ہے اور پھر مجبوراً گھر میں ہی مقید رہنا پڑتا ہے۔ جبکہ عام دنوں میں، میں شکر ادا کرتی ہوں کہ کتنی آسانیاں ہیں۔

"اچھا باجی! میں کمپیوٹر پر گیمز تو کھیل سکتا ہوں ناں؟" عاشر نے التجائی نظروں سے میری جانب دیکھا۔

"ہاں کیوں نہیں؟" میں نے اقرار کے انداز میں گردن ہلائی اور اپنے کمرے میں آگئی۔ ایسے میں امی کی آواز پر میں چونکی، ان کو کھانسی مسلسل ہو رہی تھی۔

"امی! آپ نے دوا نہیں لی؟" میں نے امی کے قریب بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"چاند! وہ تو کل رات ہی ختم ہوگئی۔" امی نے بمشکل جواب دیا۔

"تو بتانا چاہئے۔ آپ ٹائم پہ دوا نہیں لیتیں اور پھر شکایت کرتی ہیں کہ یہ مرض جان کو آگیا ہے۔" میں نے خفگی سے امی کو دیکھا۔

"بس بیٹا....! کیا تم لوگوں کو تکلیف دوں، اتنا تو تم کرتی ہو۔" امی نے میرا ہاتھ اپنی گود میں رکھ لیا۔

"اچھا، میں ابھی آتی ہوں۔" میں جانتی تھی کہ تمام دکانیں وغیرہ بند تھیں۔ بس ایک خیال تھا کہ شاید وہ میڈیکل اسٹور کھلا ہو، جہاں سے میں امی کی دوائیں لیتی تھی۔ میں نے جلدی سے خود کو چادر میں چھپایا اور قریبی میڈیکل اسٹور تک جانے کیلئے آگے بڑھنے لگی۔ عاشورہ کا جلوس ایم اے جناح روڈ پر پوری آب و تاب سے رواں تھا۔ عزادار، عزاداری میں محو تھے اور میں میڈیکل اسٹور تک پہنچنے کی کوشش میں آگے بڑھ رہی تھی، ایسے میں میری نظر ایک نوجوان پر گئی جس نے علم تھاما ہوا تھا، یہ نوجوان مجھے بالکل اپنے عاشر جیسا لگ رہا تھا ۔ میری نظریں کبھی اس نوجوان پر تو کبھی علم کے چمکتے پنجے پر تھیں اور میں خود سے کلام کرتی اپنی ہی سوچوں میں سوال کرتی، جواب ڈھونڈتی آگے بڑھتی جا رہی تھی کہ اچانک زوردار دھماکے سے لرزا دینے والی آواز پر میں بری طرح دہل گئی اور خود پر قابو نہ پاتے ہوئے گر گئی لیکن میری نظریں اسی نوجوان کے تعاقب میں تھیں۔ میں نے دیکھا، وہی نوجوان جو بری طرح سے زخمی ہو گیا تھا لیکن علم اس نے مضبوطی سے تھاما ہوا تھا اور پھر اپنے گرنے سے قبل اس نے

اسے سہارا دینے والے ہاتھوں کو علم تھما دیا تھا۔ میں جو سن ہو چکی تھی اور میرے پیر زمیں پر ساکت ہو چکے تھے، اچانک بھگدڑ مچ جانے کے باعث لاشعوری طور پر دوڑنے لگے۔ میں نے بمشکل خود کو ایک محفوظ مقام تک پہنچایا۔ لوگوں کی نعشوں کے ٹکڑے مختلف سمت میں بکھرے ہوئے تھے، بے شمار نفوس دکھ والم سے کراہ رہے تھے، ان میں خواتین بھی تھیں اور بچے بھی، ہر طرف خون ہی خون تھا، میرے جسم پر لرزہ طاری تھا اور مجھے لگ رہا تھا جیسے میں اپنے حواس کھو بیٹھی ہوں، سیکیورٹی فورسز موجود تھیں، اس کے باوجود جلاؤ گھیراؤ شروع ہو چکا تھا۔ میں دھماکے والی جگہ سے کچھ دور بے بسی کی تصویر بنی ہوئی تھی۔ میں کچھ کرنا چاہتی تھی۔ لیکن میں کر بھی کیا سکتی تھی؟ ایک لڑکی دیوانہ وار" بھیا.....! بھیا.....!" چیختی ٹکڑوں میں بٹی لاش سے لپٹ گئی تو کوئی ماں بچے کو گود میں تھامے بھاگتی نظر آئی، کسی کا ہاتھ غائب تھا، تو کسی کے پاؤں نظر نہیں آتے تھے، چیخ و پکار تھی، آہ و بکا تھی، آگ کی تپش تھی، جلی ہوئی گاڑیوں کے ڈھانچے سلگ رہے تھے، ہر طرف دھواں ہی دھواں تھا، ایمبولنس کا شور تھا، کرب کا منظر تھا جو کربلا جیسا لگتا تھا۔

ہنگامہ آرائی مسلسل جاری تھی، سڑک پر ہر طرف پتھر، شیشے کے ٹکڑے، جوتے، ٹوپیاں، تھیلے اور دیگر سامان بکھرا ہوا تھا، ہر طرف وحشت و بربریت کا راج تھا۔

اف.... میں نے بڑی مشکل سے خود کو سنبھالا اور واپسی کا رخ کیا۔ من من بھر کے قدم اٹھاتی جب میں گھر پہنچی تو امی اور عاشر دروازے پر میرے منتظر تھے۔

"میری بچی.....! خیریت سے آگئی؟" امی نے آگے بڑھ کر میری بلائیں لیں۔

"باجی....!" عاشر زار و قطار رو رہا تھا اور ایسا لگ رہا تھا جیسے میرے آنے پر اس کے حواس بحال ہو گئے ہیں۔ میں نے عاشر کا سہارا لیا اور گھر میں داخل ہو گئی، منتشر خیالات ایک کانفرنس کی شکل اختیار کر چکے تھے اور میں سوجی آنکھوں اور مرے ہوئے دل سے اس کی سربراہی کر رہی تھی۔ میں نے بیڈ کی پشت سے ٹیک لگائی اور آنکھیں بند کر لیں۔ منتشر خیالات یکسوئی سے قطار در قطار ہونا شروع ہو گئے۔ آج انسان گوشت پوست کا نہیں بلکہ مٹی یا کانچ کا کھلونا بن چکا ہے جسے جب چاہا، دھماکے سے اڑا دیا، جب چاہا، بوری میں بند کر کے

پھینک دیا، جب چاہا بے دردی سے قتل کر ڈالا، یا اللہ! یہ سب کیوں دیوانے ہو گئے ہیں؟ یہ تیری زمیں میں فساد کیوں برپا کر رہے ہیں؟ کیا رحم ان کے دلوں سے معدوم ہو چکا ہے؟ آخر یہ کیوں اخلاقی حدود اور اخلاقی ذمہ داریوں سے غافل ہو گئے ہیں؟ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ انسانیت کا معیار جو اتنی تیزی سے پست ہو رہا ہے تو ڈاکے، چوری، قتل و غارت، لوٹ مار رشوت، دھماکوں کے ذریعے معیار زندگی بلند کرنا کیا جہالت نہیں؟

اسلامی جمہوریہ پاکستان جس کی بنیادوں میں لاکھوں شہیدوں کا لہو شامل ہے، کیا اسلام میں اس بات کی گنجائش ہے کہ ایک شخص جو کہ خود کش بمبار ہے، وہ اپنے آپ کو اڑا دے اور ساتھ ہی سینکڑوں انسانوں کی موت کا باعث بنے؟ ہم کہاں کھڑے ہیں اور کیا کر رہے ہیں؟ اصلاحی پہلو پر غور سب ہی کرتے ہیں لیکن اسے عملی اقدامات میں ڈھالنا کس کا کام ہے؟ حکومت کا، عوام کا یا کسی غیبی طاقت کا؟

آخر زندگی میرے رب کی امانت ہے اور موت بھی اسی کی عطا کردہ ہے۔ جس طرح زندگی کو ہم از خود حاصل نہیں کر سکتے، اسی طرح موت کو از خود حاصل کر لینا اللہ کی مشیت میں دخل اندازی کے مترادف ہے۔ ہمارے دین کی بنیاد تو رواداری اور قوت برداشت پر رکھی گئی تھی تو پھر؟.......

”باجی.....! باجی.....! پانی پی لیجئے۔“ عاشر کی آواز پر میں چونکی، اسکی آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو تھے اور اس کا سر جھکا ہوا تھا۔

میں نے گلاس اس کے ہاتھ سے لے لیا۔ یکدم ہی میرے ذہن میں وہی نوجوان آ گیا جس نے علم تھاما ہوا تھا۔ اس کی شکل میرے عاشر سے کتنی مشابہت رکھتی ہے میں نے بڑھ کے عاشر کی پیشانی کا بوسہ لیا۔

”باجی.....! اب میں آپ کی ہر بات مانوں گا، اب میں بلا ضرورت باہر نہیں جاؤں گا۔“ وہ زارو قطار رو رہا تھا اور کہہ رہا تھا۔

”باجی.....! آج میں بہت ڈر گیا ہوں۔ اگر آپ کو کچھ ہو جاتا.....“۔ اس کے منہ سے الفاظ ٹوٹ ٹوٹ کر نکل رہے تھے اور میں اسے ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھی۔

''نہیں عاشر.....! آج مجھے سمجھ آگیا ہے اس دھرتی سے میرا رشتہ اور مضبوط ہو گیا ہے، میرے اندر ایک نیا عزم اور ولولہ جنم لے رہا ہے، ہمیں اپنے وطن کو اپنی دھرتی کو ان لوگوں سے بچانا ہے جن کا نہ کوئی دین ہے اور نہ مذہب...... ہمیں ان کی خون آلود آنکھوں کو ہمیشہ کیلئے بند کرنا ہے۔ ہمیں آنے والی نسلوں کا مستقبل محفوظ کرنا ہے تا کہ یہ بمبار، یہ خودکش حملہ آور چلتے پھرتے میزائل بننا ہمیشہ کیلئے بند ہو جائیں۔ ہمیں شدت پسندی اور انتہا پسندی کے مقابلے میں روشن خیالی، ترقی پسندی کی سوچ کو ابھارنا ہے۔ عاشر....! میں اور تم یا میری اور تمہاری طرح کے نوجوان ان موت کے پروانوں سے خوف زدہ ہو کر گھروں میں بیٹھ گئے تو پھر روشن خیالی کے خواب بکھر جائیں گے۔ ترقی پسندی کی سوچ پروان نہیں چڑھ سکے گی، کبھی نہیں.....''

☆......☆......☆

کہانی کی تلاش

میں کافی دیر سے ایک اور سچی کہانی لکھنے کے لئے کاغذ اور قلم لیے بیٹھی ہوں۔ میرے اندر ایک ہلچل سی مچی ہوئی ہے۔جیسے لکھنے بیٹھوں تو دل کا غبار منٹوں میں کاغذ کے سپرد کر دوں گی۔ یہ کیفیت مجھ پر پچھلے دو تین دن سے طاری ہے۔لیکن مصروفیت کی وجہ سے۔ میں کچھ لکھ نہیں پا رہی ہوں اور آج جب مجھے لکھنے کا موقع ملا ہے تو ایک عجب مسئلہ در پیش ہے۔میری سمجھ نہیں آرہا کہ کون سی کہانی لکھوں۔

کوئی تو ایسی بات ہے جو میرے اندر مسلسل سرگرداں ہے اور مجھے پریشان کر رہی ہے۔ میں پچھلے دو گھنٹوں سے اسی کوفت میں مبتلا ہوں۔ کسی بھی کہانی کی کچھ ہی لائنیں لکھتی ہوں۔اور پھر کاٹ دیتی ہوں۔ میں خود نہیں سمجھ پا رہی ہوں کہ اپنے ارد گرد بکھری بے شمار سچی کہانیوں میں سے کون سی کہانی لکھوں؟..... شاید مجھے ایک لڑکی جمیلہ کی کہانی لکھنی چاہئے جو ایک عورت فروش کی قید میں ہے اور......

نہیں، نہیں، مجھے ایک پریشان حال عورت عالیہ کی کہانی لکھنی چاہئے۔ جو غربت سے تنگ آکر مرنے کی کوشش کرتی ہے۔لیکن آخر میں اس کی ممتا جاگ جاتی ہے اور اپنے بچوں کی وجہ سے وہ مرنے کا ارادہ ترک کر دیتی ہے..... لیکن یہ کہانی تو پرانی ہو چکی ہے، آئے دن اخبارات میں ایسے ہی قصے پڑھ پڑھ کر میری روح فنا ہو جاتی ہے تو کیوں ناں میں ایک روح کی کہانی لکھوں جو اپنے جسم میں جانے کے لئے بے چین ہے لیکن اس کا جسم سپرد

خاک کر دیا گیا ہے اور اب وہ راتوں کے سناٹوں میں پریشان حال پھر رہی ہے۔اف، توبہ میرا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا؟ میں نے اپنے چکراتے سر کو تھاما۔ اتنے میں میری ماسی چائے لے کر آ گئی۔

''لو بیگم صاحب، گرم گرم چائے''۔ میں نے اس سے کپ لے کر میز پر رکھ دیا اور وہ دوپٹے کے پلوؤں سے ہاتھ صاف کرتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ دوپہر کی چمکیلی دھوپ بڑی ہی بھلی لگ رہی تھی۔

میں نے چائے کا ایک سپ لیا۔'' واہ نوراں، کیا مزیدار چائے بناتی ہو''۔ میں نے دل ہی دل میں اپنی ماسی کی تعریف کی اور پھر اپنی تمام تر توجہ کاغذ پر مرکوز کر دی۔

کیوں ناں، میں اس ماسی کی کہانی لکھوں، جس کا شوہر بہت ظالم ہوتا ہے اور وہ پیسے کی خواہش کے لئے اپنی بیوی پر ظلم کرتا ہے اور اس کی کمائی کھاتا ہے..... لیکن یہ بھی کوئی نئی کہانی تو نہیں ہے۔ اف، خدایا.....! کیا کروں؟ جب کچھ لکھا ہی نہیں جا رہا ہے تو پھر یہ بے چینی کیوں ہے؟ اتنی الجھن کا شکار کیوں ہوں؟ دو تین جملوں سے زیادہ دماغ میں کچھ نہیں آ رہا ہے۔

اگر میں جھونپڑیوں میں رہنے والے ممو اور رامو کی کہانی لکھوں تو کیسا رہے گا؟ میں نے خود سے سوال کیا لیکن دوسرے ہی لمحے منہ بسورتے ہوئے جواب ملا۔'' بالکل نہیں، ان کی زندگیوں پر کہانی لکھنا کتنا دردناک اور مشکل ہے۔اتنی غربت میں، اتنی چھوٹی سی جھونپڑی میں دس سے بارہ افراد جانے کیسے رہتے ہیں، کیا کھاتے ہیں، سردیوں میں کیسے سوتے ہیں؟اور پھر کچھ ہی عرصے پہلے جلتی ہوئی جھونپڑیوں کا منظر میری آنکھوں میں گھوم گیا۔ وہ چالیس افراد جو بے قصور مارے گئے۔میں نے گالوں پر پھسلتے آنسوؤں کو صاف کیا اور دونوں آنکھیں ہتھیلیوں سے رگڑ ڈالیں۔

چائے کے مزید سپ لے کر میں نے اپنا ذہن بدلنے کی بھرپور کوشش کی۔ایک تو میں اور میری حساسیت جو آج مجھے کہانی لکھنے سے مسلسل روک رہی ہے۔

کیوں ناں، میں ظلم و جبر کی کہانی لکھوں، لیکن یہ کہانی تو ہمارے معاشرے کا المیہ بن

بچی ہے، آج ہماری عوام بجلی، گیس اور مہنگائی کا جبر جس طرح برداشت کر رہی ہے، وہ قابل تحسین ہے، ہمارے لیڈرز مہنگائی کی صورت اور جانے کتنے ظلم عوام پر ڈھائیں گے؟ میرا تو مہنگائی کی خبریں پڑھ پڑھ کر دل خراب ہو جاتا ہے۔ کبھی CNG کے دام بڑھ گئے تو کبھی آٹے، گھی اور چینی کی قیمت میں اضافہ ہو گیا۔

میری دادو ہنستے ہوئے کہتی ہیں۔ ”ارے بیٹا.....! ایک ہمارا وقت تھا جب بجلی کی سہولت میسر نہیں تھی، تب بھی ہم اللہ کا شکر ادا کرتے تھے تو تم اس بات پر تو اللہ کا شکر ادا کرو کہ بجلی جا کے آ تو جاتی ہے“۔ دادو ہنستے ہوئے پان کی گلوری منہ میں دبا کر گوٹے کنارے سے سجا پنکھا ہلانے لگ جاتیں۔

”جی دادو.....! واقعی ہماری عوام قابل تحسین ہے جو برداشت کر رہی ہے“۔

لو بھلا میں بھی سوچوں میں کہاں دادو کے پاس چلی گئی۔ کتنا وقت ضائع ہو رہا ہے؟ کہانی ہے کہ لکھی ہی نہیں جا رہی۔ کیوں ناں، میں انصاف پر کہانی لکھوں لیکن اب میں پرانے زمانے کے بادشاہوں پر تو کہانی لکھنے سے رہی جو اپنے رعایا کو انصاف دلانے کے لیے بڑی بڑی جنگیں لڑتے ہیں لیکن مجھے تو آج کے دور کی کہانی لکھنی ہے مگر آج کے دور میں انصاف.....؟

اگر میں گناہ اور ثواب پر کہانی لکھوں تو کیسا رہے گا؟ تھوڑے سے توقف کے بعد میرا جواب نہ میں ہی تھا کیوں کہ اگر میں شریعت، گناہ اور ثواب کے بارے میں لکھنے لگی اور لکھتے لکھتے اگر میری کہانی میں 17 سالہ لڑکی کو کوڑے مارنے کا ذکر آ گیا تو.....؟ یہ سوچتے ہی میری روح پھر کانپ اٹھی۔ نہیں..... نہیں..... اس بارے میں اگر کچھ لکھا بھی تو ڈھیروں رائٹرز کی طرح میری آواز بھی دب جائیگی۔

”ارے بی بی جی.....! یہ آپ کیا لکھے جا رہی ہو؟“ ماسی نوراں میرے سر پہ کھڑی تھی، یکدم ہی میں سوچوں سے باہر آ گئی۔

”کچھ نہیں نوراں.....! بس کچھ ادھوری بچی کہانیاں لکھی ہیں۔ دیکھو، ان میں سے شاید کوئی پوری ہو ہی جائے“۔ میں نے نوراں کو مسکراتے ہوئے دیکھا۔

"آں بی بی.....! آپ نے تو ساری چائے ٹھنڈی کر دی۔ لائیے، میں دوسری بنا کے لا دوں"۔ نوراں نے کپ اٹھایا اور کچن میں چلی گئی۔

میں یکدم ہی پریشان ہو گئی۔ میں بھی کتنی ادھوری ہوں، اندر سے خالی خالی......! جیسے کچھ چاہے، ان چاہے کی خواہش، جیسے کچھ کر گزرنے کی خواہش میں ایک تشنگی کا عالم.... عجب بیزاری ہے جو بیداری کی متلاشی ہو، سب کچھ ہوتے ہوئے بھی اکیلا پن..... کیا ہے یہ میرے اندر.....؟ کیوں ہوں پریشان؟ کس کی رکھتی ہوں تمنا؟ شاید صرف اور صرف اصلاح کی کہ جس کی کمی مجھے ہر طرف نظر آتی ہے اور اپنے اندر بھی..... میں جو بڑی رومانٹک مزاج ہوں، میری ہر کہانی میں باغوں کی ہریالی، سورج کی سنہری روشنی، چاند کی ٹھنڈی کرنیں، ہواؤں کا ترنم، گلوں کی مہک، چڑیوں کی چہکار، سریلے گیت، قوس قزح کے رنگ، مسجد کی اذانوں میں محو منظر جھلملاتے ہیں۔ ایسے کردار جس سے ایک خوش گوار تاثر دل پر نقش ہو جائے۔ آج اسی رائٹر کا قلم صرف اور صرف تلخ کیوں لکھ رہا ہے؟ میں اب تشویش کا شکار ہو چکی ہوں۔ اب دل گھبرانے لگا ہے، وہ کیا ہے جو میں لکھ نہیں پا رہی؟ وہ کون سی سچی کہانی ہے جو اندر ہی اندر مجھے کھا رہی ہے۔

"امی......! امی......! امی......!" شجاع چیختا ہوا اپنے ہاتھوں میں کچھ سنبھالتے ہوئے میری طرف آ رہا تھا۔

"کیا ہے؟" میں نے اپنے پانچ سالہ بیٹے کو دیکھا"۔ "کیوں چیخ رہے ہو؟"

"امی......! یہ دیکھئے"۔ اس نے ننھی منھی چھوٹی سی چڑیا میرے سامنے رکھ دی"۔

"شجاع.....! یہ تم نے یہاں کہاں رکھ دی؟ اسے ہٹاؤ یہاں سے..... دیکھو، میرے صفحے خراب ہو رہے ہیں"۔

"امی......! دیکھو ناں، یہ زخمی بچہ کیاری میں پڑا تھا۔ میں نے اسے پانی بھی پلایا لیکن یہ آنکھیں نہیں کھول رہا"۔ کاغذ کے وسط میں چڑیا کا بچہ واقعی نڈھال تھا۔ اس کے جسم سے ٹپکتے پانی کے قطروں نے کاغذ کو گیلا کر دیا تھا۔

"امی.....! یہ بچ تو جائے گا ناں؟ باہر کتنی گرمی ہے"۔

''ہاں، ہاں۔'' میں اپنی کہانی کو بھول کر اس چڑیا کے بچے میں لگ گئی۔

''شجاع! تم نے اس کو پانی پلایا ہے یا نہلایا ہے؟''

''امی! میں تو پانی ہی پلا رہا تھا مگر اس کی چونچ اتنی چھوٹی ہے۔''

''دیکھو، یوں پانی پلاتے ہیں۔'' میں نے آہستہ سے اس کی چونچ کھول کر قطرہ قطرہ پانی اس کے منہ میں ڈالنا شروع کیا تھوڑی ہی دیر میں اس کے نڈھال، ساکت وجود میں جان سی آنے لگی پھر یکدم ہی اس نے اپنے پر پھڑ پھڑائے۔

''ارے واہ امی......! آپ کتنی اچھی ہیں۔ دیکھئے تو یہ ٹھیک ہو رہا ہے۔ آپ تو سچ مچ ''ڈاکٹر'' ہو''۔

میں شجاع کے ساتھ بچوں کی طرح خوش ہو رہی تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں چڑیا کا بچہ پھر سے اڑا اور کیاری میں منڈیر پر جا کر بیٹھ گیا۔

''امی...... میں اس کو دیکھنے جا رہا ہوں، ذرا پتا تو کروں اس کا گھر کہاں ہے؟'' شجاع نعرہ لگاتا ہوا چڑیا کے بچے کے پیچھے بھاگا۔ میں نے میز پر پڑے بھرے صفحات پر نظر ڈالی جن پر پانی گرنے کی وجہ سے سیاہی پھیل چکی تھی اور قریب ہی ننھی چڑیا کا ایک پر ہی پڑا تھا۔

''بی بی صاحبہ......! دیکھئے، میں زبردست سی چائے لائی ہوں، یقیناً آپ کو اچھی لگے گی اور اب دیکھئے گا آپ کتنی زبردست کہانی لکھتی ہیں''۔ نوراں نے کپ میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

''یہ کیا بی بی جی......؟ آپ کی تو ساری کہانی خراب ہو گئی؟ دیکھئے تو...... آں......'' نوراں نے اپنا ہاتھ منہ پر رکھ لیا۔

''نہیں نوراں......! میری کہانی خراب نہیں ہوئی ہے بلکہ میری اپنی زندگی کی کہانی کو نئی راہ مل گئی ہے جو بہت روشن ہے۔ میرا بیٹا موت کے بڑھتے ہوئے اس مہیب اندھیرے میں ایک چڑیا کے بچے کی جان بچانے کی صورت زندگی کی بات کرنے لگا ہے۔ یہی تو سب سے سچی اور خوبصورت کہانی ہے جسے ہم بھولتے جا رہے ہیں۔''

☆......☆......☆

خواہشوں کا بھنور

خواہشوں کا دل میں پلنا اور بڑھنا انسانی فطرت کا ایسا وصف ہے جس نے کرہ ارض اور بنی نوع انسان کی کایا پلٹ دی، خواہشات چھوٹی بھی ہوتی ہیں اور بڑی سے بڑی بھی، وسائل موجود ہوں تو خواہشات کی تکمیل کی راہیں کھلتی ہی چلی جاتی ہیں ورنہ چھوٹی سے چھوٹی خواہش کی تکمیل جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ بقول شاعر......

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے

آج میں "میرے شہر کی کہانی میں" ایک ایسی الم ناک خواہش کا تذکرہ کروں گی جس کی تکمیل کی خاطر ماں اپنا بیٹا گنوا بیٹھی اور بیٹا اس دنیا سے رخصت ہوتے ہوئے اپنا بیٹا، ماں کی گود میں ڈال کر چلا گیا۔

O......O......O

حیدر کی شادی کو ابھی ایک ماہ ہی ہوا تھا کہ حیدر کی ماں رفعت بی بی نے دبے لفظوں میں بہو کا ہاتھ دباتے ہوئے کہا تھا۔

"سن بیٹا! میرے بڑے ارمان ہیں کہ میری گود میں میرا پوتا کھیلے، کتنے عرصے سے یہ آنگن سونا سونا ہے۔ بہو! تم نہ آج کل کی لڑکیوں کی طرح پلاننگ میں لگ جانا...... جانے کیسا زمانہ آگیا ہے، شادی کے بعد انجوائے منٹ ہونی چاہئے، بچے بعد میں آتے رہیں گے۔ توبہ، توبہ کیسی، کیسی خرافات بسنے لگی ہیں آج کل کی لڑکیوں کے دماغ میں ....."

رفعت بی بی نے منہ بسورتے ہوئے ماڈرن دور پہ کڑی تنقید کر دی تھی۔ ''دلہن! تم سمجھ تو رہی ہو ناں؟ بس مجھے جلدی سے خوش خبری سنا دو''۔

حیدر کی دلہن جو یہ سنتے ہی خود میں سمٹ سی گئی تھی۔ ''جی امی......!'' آہستہ سے کہتے ہوئے وہ وہاں سے اٹھنے کا قصد کر رہی تھی کہ حیدر آ کے برابر میں بیٹھ گیا۔

''امی! یہ نئی نویلی دلہنیں شروع میں تو شرمائی، نظریں جھکائی بیٹھی نظر آتی ہیں اور پھر گزرتے وقت کے ساتھ آنکھیں دکھا دکھا کے شوہر کو ڈراتی رہتی ہیں۔'' حیدر نے آنکھ مارتے ہوئے اپنی بیوی نازو کو چھیڑا۔

خبردار جو میری بہو کو کچھ کہا۔ شکر ہے، مجھے میری پسند کی بہو مل گئی ورنہ اب تو ایسا دور آ گیا ہے کہ ولیمے کی دلہن بھی کندھے پر دوپٹہ سجائے، دولھا کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے پورے ہال کا چکر لگا رہی ہوتی ہے، شرم و حیا تو لگتا ہے، ختم ہی ہو گئی ہے۔ موا ماڈرن دور...... ذرا بھی اچھی نہیں لگتیں مجھے یہ بے باکیاں، لڑکیاں تو سر پر آنچل سجائے ہی خوبصورت لگتی ہیں''۔ جیسے ہی رفعت بی بی نے اپنی بات مکمل کی، بے اختیار نازو نے اپنے سر پر آنچل سجا لیا تھا''۔ چل شاباش، ذرا دلہن کو میکے لے جا اور بیٹے! ذرا جلدی گھر آ جایا کرو، ہم دونوں کب سے تمہاری راہ دیکھ رہے ہیں۔ دلہن کو وقت دیا کرو''۔ رفعت بی بی نے نصیحت آمیز لہجے میں اپنی بات مکمل کی۔

''اوئے..... ہوئے..... اتنی جلدی امی کو اپنی طرف کر لیا.....؟'' حیدر نے ایک بار پھر چپ بیٹھی نازو کو چھیڑا۔ نازو کے لبوں پر یکدم ہی دلفریب ہنسی بج گئی۔ اس نے شوخی سے حیدر کو انگوٹھا دکھایا اور کمرے سے بھاگ آئی۔

O......O......O

''مسز حیدر، آپ تیار ہو گئی ہیں؟'' حیدر نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے با آواز بلند نازو سے پوچھا۔ لال رنگ کے گوٹے لچکے سے سجے دوپٹے میں وہ واقعی بہت خوبصورت لگ رہی تھی۔

''بس میں تیار ہوں''۔ اس نے بالوں کو آہستگی سے کلپ میں قید کرتے ہوئے کہا تھا۔

''ایک منٹ ، ذرا بال کھولنا اپنے'' حیدر نے یہ کہتے ہوئے خود ہی کلپ اس کے بالوں سے کھینچ لیا۔

''اف حیدر......! آرام سے......'' وہ بے اختیار اس کی دیوانگی پر تڑپی۔

''سویٹ ہارٹ، اتنی پیاری لگ رہی ہو، ذرا میں موبائل کیمرے میں تمہاری تصویر تو اتار لوں، مسکراؤ تو......'' وہ نازو کے سامنے موبائل لیے کھڑا تھا اور پھر نازو باری باری مختلف اسٹائل میں تصویریں بنواتی رہی۔

''مغرب سے پہلے نکل جانا تم دونوں، بج سنور کے مغرب کے وقت نکلنا ٹھیک نہیں ہوتا۔ حیدر بیٹا! ذرا جلدی سے تیار ہو جاؤ'' رفعت بی بی دروازے پر کھڑی تھیں اور دونوں کی حرکتوں سے لطف اندوز ہو رہی تھیں۔

''جی امی......!'' حیدر جھینپ کر واش روم میں گھس گیا جبکہ نازو شرم سے کٹ کے رہ گئی۔

''لو ہم آگئے......'' ذرا دیر میں حیدر ڈریس آپ ہوا اس کے سامنے کھڑا تھا۔'' دیکھا ہم لڑکے کتنی جلدی تیار ہو جاتے ہیں''۔ اس نے جلدی جلدی کنگھا بالوں میں پھیرتے ہوئے کہا۔

''جی، نظر آرہا ہے''۔ وہ شوخی سے ہنسی۔

''چلو، جلدی سے امی کو خدا حافظ کہہ دیں''۔ یہ کہتے ہوئے وہ بے باکی سے اسے کھینچتا ہوا امی کے کمرے میں لے آیا۔ وہ جو چادر اوڑھنے کے لئے الماری کی طرف بڑھ رہی تھی۔ حیدر کے اس اچانک حملے سے بوکھلا گئی اور ''سنیں حیدر......! رکیں تو سہی......'' کہتی ہوئی امی کے کمرے تک پہنچ گئی۔

''امی......! ہم جا رہے ہیں''۔ حیدر نے ادب سے امی کے سامنے سر جھکاتے ہوئے کہا۔

''ایسے جاؤ گے؟'' رفعت بی بی نے حیرت سے دونوں کو گھورا تھا۔

''وہ......امی......! یہ مجھے کھینچتے ہوئے لے آئے ہیں، میں تو چادر اوڑھنے ہی جا رہی

تھی"۔ وہ بری طرح کھسیا گئی۔

"اونہہ، بہو کو تو میں سنبھال لوں گی مگر اس شتر بے مہار کے کان تو مجھے ہی کھینچنے پڑیں گے" وہ آگے بڑھیں اور حیدر کے کان زور سے کھینچنے لگیں۔

"امی.....! چھوڑ دیں، سچ، درد ہو رہا ہے، گرفت تو ہلکی کریں"۔ وہ چیختے جا رہا تھا جبکہ نازو مسکراتی ہوئی امی کے پیچھے آ چکی تھی۔"امی.....! زور سے..... امی.....! چھوڑیے گا نہیں....." کی صدائیں لگاتی جا رہی تھی۔

O.....O.....O

"ہیلو ڈیئر.....!" حیدر نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے نازو کی طرف ایک خوشگوار مسکراہٹ اچھالی جسے اس نے نظر انداز کرتے ہوئے ٹی وی اسکرین پر نظریں جما لیں تھیں۔

"روٹھے ہو تم، تم کو کیسے مناؤں پیا، بولو ناں..... بولو ناں....." حیدر کے لبوں کی تراش میں بجی دلفریب مسکراہٹ اور پھر اسٹائل سے گانے کا انداز، وہ بے اختیار اس کی طرف بڑھی، اس کا انداز کسی کم سن ناراض بچے کی طرح تھا جو محض اس لئے روٹھے کہ اسے منایا جائے۔

"کیا ہوا، کیوں ناراض ہو؟" حیدر نے پیار سے اس کا ہاتھ تھاما۔

"ٹائم دیکھا ہے آپ نے؟" نازو نے ناراض لہجے میں سوال کیا۔

"ہو جاتی ہے دیر جلدی جلدی کرتے ہوئے بھی، بندہ شرمندہ ہے، آئندہ احتیاط کرے گا"۔ حیدر نے نرمی سے جواب دیا۔

"امی.....! خوشخبری سننا چاہتی ہیں؟" نازو کے اس بے اختیار جملے نے حیدر کو پہلے تو حیران کیا اور پھر اگلے ہی پل شوخی اور مسکراہٹ سے اس کا چہرہ دمکنے لگا۔

"امی تو بعد میں سنیں گی، پہلے مجھے سناؤ" وہ ڈھٹائی سے اس کو اپنی طرف کھینچتا ہوا بولا۔

"حیدر.....! پلیز آرام سے"

"اوہ، آئی ایم سوری....." وہ فوراً سنبھل کر بیٹھ گیا۔

"نہیں، کوئی بات نہیں"۔ وہ آہستگی سے مسکائی مگر اس کی مسکراہٹ میں تازگی نہیں تھی،

افسردگی تھی۔

"کوئی پریشانی ہے" حیدر کا لہجہ ہی نہیں بلکہ چہرے پر بھی تشویش جھلکنے لگی۔

"نہیں تو......" وہ چپ سی ہوگئی اور نظریں اپنی ہتھیلی پر مرکوز کرلیں۔

"کیا بات ہے، کیوں مجھے الجھا رہی ہو؟" حیدر اضطراب کا شکار نظر آرہا تھا۔

"امی کو پوتا چاہیے، آج پھر وہ باتوں باتوں میں مجھ سے یہ بات کہہ رہی تھیں"۔ نازو کے چہرے پر پھیلی غیر معمولی سنجیدگی اس کے اندیشوں کو اور بڑھا گئی تھی۔

"تم اتنی سی بات پر پریشان ہو؟" حیدر نے اسے سہارا دیتے ہوئے تعجب سے پوچھا۔

"حیدر اگر اللہ نے ہمیں بیٹا نہیں دیا تو کیا امی ناراض ہوجائیں گی؟" نازو کے چہرے پر خوف تھا۔

"نہیں نازو..... ایسا کچھ نہیں ہے، بس امی اپنی خواہشوں کا اظہار کررہی تھیں اور پھر میں ان کا اکلوتا بیٹا ہوں تو شاید وہ چاہتی ہوں گی کہ ان کے بیٹے کا نام اس کی نسل آگے بڑھے۔"

"لیکن یہ میرے اختیار میں تو نہیں ناں؟" نازو نے معصومیت سے پلکیں جھپکاتے ہوئے حیدر کو دیکھا۔

"کوئی بات نہیں، میں امی کو سمجھا دوں گا، تم پریشان نہیں ہو"۔ حیدر نے اسے تسلی دی۔

"آپ نہیں سمجھیں گے حیدر.....! امی اپنی اس پوتے والی خواہش کا اتنا شدید اظہار کرتی ہیں، کہ میں کوفت میں مبتلا ہو جاتی ہوں۔ خواہ مخواہ خود کو چور محسوس کرنے لگتی ہوں۔ حیدر.....! میں تو یہ خوشخبری والی بات بھی امی کو بتاتے ہوئے ڈر رہی ہوں، پتا نہیں وہ کیا کیا امیدیں وابستہ کر کے بیٹھ جائیں گی؟" نازو کے دل میں انجانے اندیشے مچل مچل کر اپنی موجودگی کا احساس دلا رہے تھے اور وہ خوف سے نبرد آزما اتنی بڑی خوشی، وہموں اور اندیشوں میں لپیٹے حیدر کو سنا رہی تھی۔

"تم تو سچ مچ پاگل ہو.....یا ہو...... " حیدر نے ہوا میں مکا لہرایا"۔ نازو جانی..... تم بھی بس..... چلو اٹھو امی کو بتاتے ہیں، وہ کتنی خوش ہوں گی' اوہ مائی گاڈ! میں کتنا خوش

ہوں"۔

حیدر بالوں میں ہاتھ پھیرتا ہوا شوخی سے بول رہا تھا جبکہ نازو چپ' چپ سی حیدر کو دیکھ رہی تھی گو کہ اس نئے احساس نے اس کے انگ انگ کو خوشی سے بھر دیا تھا مگر ساس کی پوتا، پوتا کی رٹ جو شادی کے کچھ ہفتوں بعد ہی سے شروع ہو گئی تھی، اسے گھبرانے لگی تھی۔ اس کی ساری خوشی دل کے کسی گوشے میں روٹھی بیٹھی تھی، ایک پل کو اس کا دل چاہا، وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دے، ایسے میں حیدر نے اسے بے اختیار کسی نہایت ہی قیمتی متاع کی طرح اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا۔

O......O......O

حیدر کی پوری فیملی میں یہ بات پھیل چکی تھی کہ دلہن کے ہاں خوشخبری ہے، شادی شدہ بہنیں اور ساس اسے مشورہ دے رہی تھیں، کوئی اسے اچھی غذا لینے کا کہہ رہا تھا تو کوئی اسے آرام کرنے کا مشورہ دے رہا تھا۔ اس کی ساس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اسے ہلنے جلنے بھی نہ دیں اور پھر ہر نصیحت کے بعد بس ایک دعا ان کے لبوں پر مچلتی رہتی۔ "اے خدا! مجھے پوتے سے نواز دے"۔ اور وہ نازو کو بھی ترغیب دیتی رہیں، اولاد نرینہ کے لئے فلاں ٹوٹکہ آزمالو، فلاں دعا پڑھ لو اور بے چاری نازو دل ہی دل میں اللہ سے دعائیں مانگتی رہتی لیکن جانے کیوں بے یقینی کے عذاب نے اس کے دل میں گھر کر لیا تھا؟ اس کا دل پژمردہ نظر آرہا تھا جہاں روایتی ساس اپنی بہو کو بیٹی کی پیدائش پر طعنے دیتی ہے اور خوب برا بھلا کہتی ہے۔ اف، اس نے یکدم ہی اپنی سوچ کے زاویے بدلے۔

حیدر کب کا کمرے میں آچکا تھا اور اس کی بے چارگی، اس کی کیفیت نوٹ کر رہا تھا۔ اس کے لاکھ سمجھانے کے باوجود وہ خود اس کو کرب کی کیفیت سے نکال نہیں پائی تھی اور اس مسلسل اندیشوں کا شکار تھی جن کا وجود ابھی دور تک نہیں تھا۔

"ایک دانا کا قول ہے کہ نشاط وانبساط اور اندوہ کلفت یعنی تکالیف زندگی کی اصلی غرض وغایت نہیں، اس کا منتہائے مقصود تو یہ ہے کہ ہم ہمیشہ سرگرم رہیں اور خوش دلی کے ساتھ اپنے مستقبل کو بہتر بنانے کے لئے کوشاں رہیں۔ جانے کیوں تم ایسی باتوں میں الجھی ہو؟ جو

مشیت ایزدی ہے، جو ہمارا رب ہمیں عطا کر دے گا، ہم اسے خوشی سے قبول کر لیں گے۔ رحمت اور نعمت کا فیصلہ تو قدرت کے ہاتھ میں ہے۔ تم کیوں خود کو جلاتی رہتی ہو؟" حیدر نے اسے اپنے کندھے سے لگاتے ہوئے سمجھایا۔

"جی....." وہ رندھی آواز میں بولی۔

"میرے ساتھ حضرت عبداللہ شاہ غازی کے مزار پر چلو گی؟ ہم وہاں چل کر منت مانتے ہیں۔ میں نے سنا ہے ان کے مزار پر مراد مانگنے سے مراد بر آتی ہے۔"

"کیا سچ؟" نازو نے ڈبڈبائی آنکھوں سے حیدر کو دیکھا۔

"پہلے ہم اپنی حجت تمام کرتے ہیں پھر اپنے رب کے فیصلے کا انتظار کریں گے"۔ حیدر نے اس کے چہرے کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر کہا۔

O......O......O

حضرت عبداللہ شاہ غازی کے مزار آ کے نازو خود کو ہلکا پھلکا محسوس کر رہی تھی۔ سکون کہیں اندر ہی اندر سرائیت کرتا جا رہا تھا۔ وہ حیدر کی مشکور تھی اور اپنے اللہ کی شکر گزار کہ اس کو اتنا چاہنے والا اور سمجھنے والا شوہر عطا کیا۔ یقیناً ماں بننے کا احساس ہر جذبے پر حاوی تھا۔ حقیقی خوشی اسے اب محسوس ہو رہی تھی۔ جب وہ دل کا حال اللہ سے کہہ کر آئی تھی اور اللہ سے کی گئی عرضی پر حضرت عبداللہ شاہ غازی کے مزار پر مانی منت کی اسٹیمپ بھی لگا آئی تھی اب وہ اپنی درخواست کے قبول ہونے کی منتظر تھی کہ تصدیق اور قبول کرنے والی ذات تو صرف اور صرف خدائے بزرگ و برتر کی ہے۔ جوں جوں دن ماہ میں اور ماہ گزرتے دنوں کو اپنے دامن میں سمیٹتے چلے جا رہے تھے، اس کی ساس کی دعاؤں میں شدت آتی جا رہی تھی اور خود وہ پل پل بدلتے لمحے خود کو ڈھارس دیتی ننھے مہمان کی تیاریوں میں مگن تھی۔

اور پھر وہ دن نازو کی خوشیوں بھرے ہر دن پر حاوی ہو گیا تھا جب نرس نے آ کر اسے بتایا تھا کہ اس کے ہاں چاند سا بیٹا ہوا ہے۔ اس کی نگاہیں جھک گئیں، دل ہی دل میں وہ اللہ کی شکر گزار تھی اور تصور میں وہ مالک حقیقی کے سامنے سجدہ ریز تھی جس نے اس کے دل کو ہر اندیشے سے پاک کر دیا تھا۔

رفعت بی بی خوشی سے پھولی نہیں سما رہی تھیں۔ نازو کو بہو بن کر اپنی قدر کا احساس نہیں ہوا تھا جتنا اسے ایک بیٹے کی ماں بن کر ہوا تھا۔ آج اس کا دل حقیقی خوشی اور مسرتوں کی آماجگاہ بن گیا تھا جس کی وہ نجانے کب سے متلاشی تھی۔

"یہ تمہارے لبوں پر پھیلی مسکراہٹ کس کی محبت کا اعجاز ہے دیکھا؟ کل تک تم اداسی اور تشویش کا چلتا پھرتا اشتہار تھیں اور آج کتنا سکون اور طمانیت کا احساس ہے تمہارے چہرے پر، ماشاءاللہ، میری بیوی کو اللہ نظر بد سے بچائے"۔ حیدر نازو کے برابر بیٹھتے ہوئے چھوٹے سے وجود پر جھک گیا تھا۔"اف...... اتنا پیارا ہے میرا لاڈلہ!" حیدر اس کے گلابی گالوں کو انگلی سے سہلانے لگا۔

"چل ہٹ پیچھے، میں اپنے پوتے کو گھٹی پلا دوں"۔ رفعت بی بی نے حیدر کی قمیض مٹھی میں جکڑ کر کھینچی تو بے اختیار سب ہنس دیئے۔

"میں اپنے پوتے کا نام حمزہ رکھ رہی ہوں۔ اگر کسی کو اعتراض ہے تو وہ اپنا اعتراض اپنے پاس رکھے، مجھے تو اپنے پوتے سے خوب سارا کھیلنا ہے"۔ وہ حمزہ کو گود میں لیے توتلی زبان میں بول رہی تھیں جبکہ حیدر آہستگی سے نازو کے کان میں سرگوشی کر رہا تھا۔

"اب ہمیں دو بچوں کو سنبھالنا پڑے گا"۔ نازو بے ساختہ ہنس دی اور حیدر کے چہرے پر بھی سکون کے سائے منڈلانے لگے۔

O......O......O

حمزہ کو دنیا میں آئے ایک ماہ گزر گیا تھا اور اب جبکہ نازو مکمل صحت یاب ہو چکی تھی تو دونوں ہی کو یہ خیال آیا کہ اب ہمیں حضرت عبداللہ شاہ غازی کے مزار پر حاضری دینی چاہیئے۔ ہماری منت پوری ہو چکی ہے۔اس خیال کے آتے ہی وہ دونوں مزار پر حاضری دینے کا پروگرام بنانے لگے۔

"کیوں ناں، امی کو ساتھ لے لیا جائے؟ وہ حمزہ کو سنبھال لیں گی، تم اکیلی کہاں اسے اتنی دیر تک سنبھال پاؤ گی اور پھر امی بہت خوش ہوں گی ہمارے ساتھ چل کر"۔ حیدر نے آہستگی سے کہا۔

"ارے ہاں، کیوں نہیں، امی کے ساتھ چلنے سے مجھے بھی ڈھارس رہے گی"۔ نازو نے فوراً ہی شوہر کی بات کی تائید کی۔

"ٹھیک ہے پھر تم آرام کرو، میں امی کو بتا کر آتا ہوں"۔ حیدر جیسے تنبیہ کرتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔

O......O......O

کلینڈر میں سات اکتوبر دو ہزار دس کی تاریخ کو دائرہ بنا کر نمایاں کیا گیا تھا۔ حیدر خان نہ جانے کب سے اس دن کا منتظر تھا کیونکہ سات اکتوبر کو حمزہ پورے چالیس دن کا ہونے والا تھا۔ اور اس دن حیدر، حمزہ کو مزار پر حاضری کے لئے لے جانے والا تھا۔

آج سات اکتوبر کا ہندسہ کیلنڈر میں درج ہندسوں میں سب سے منفرد نظر آ رہا تھا۔ حیدر، نازو، رفعت بی بی اور حیدر کی سب سے بڑی بہن ننھے حمزہ کے ہمراہ حاضری کے لئے مزار پر آ چکے تھے۔ تینوں خواتین حاضری کے لئے پھول اور چادر خرید رہی تھیں کہ حیدر اسی اثناء میں مزار میں داخل ہو گیا۔ ابھی حیدر مزار کے احاطے میں سیڑھیوں کے قریب ہی پہنچا تھا کہ قریب ہی ہونے والے خودکش دھماکے کی زد میں آ گیا۔ مزار میں ایک افراتفری کا عالم تھا۔ ہر طرف سے چیخ و پکار کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں۔ ایک کہرام برپا تھا، ہر شخص بھاگ رہا تھا۔ حیدر کی بہن مجمع کو پرے کرتی بھائی کے پاس پہنچ چکی تھی، حیدر خون میں لت پت پڑا تھا، وہ بے بسی سے تڑپتے بھائی کے پاس بیٹھی مدد کے لئے پکار رہی تھی۔ مگر حیدر کو بروقت ایمبولنس تک لے جانے والا کوئی نہیں تھا۔ نازو شدت غم سے گنگ دیوار سے ٹیک لگائے کھڑی تھی جبکہ رفعت بی بی کی فریاد دل دہلا رہی تھی۔ ان کی کیفیت کسی دیوانگی سے کم نہیں تھی۔ ان کی حرکات و سکنات سے بخوبی اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ بیٹے کی محبت، پوتے کی چاہت اور اپنے دل میں پلنے والی ایک چھوٹی سی خواہش کی تکمیل پر کسی بڑے طوفان کی سی کیفیت کا سامنا کر رہی ہیں، انہیں اپنے الفاظ کانوں میں گونجتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے جب انہوں نے اپنی بہو سے پوتے کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ آج رفعت بی بی یہ کہنے پر مجبور تھیں۔

"اے کاتب تقدیر...... تیرے اپنے ہی فیصلے ہیں"۔

چیخ و پکار کے عالم میں رفعت بی بی آگے بڑھیں اور اپنی بہو نازو کی گود سے نومولود حمزہ کو چھیننے کے انداز میں جھپٹا اور اپنی آغوش میں دبوچ لیا۔ یہ منظر کرب ناک بھی تھا اور عزم و حوصلے کی ایک داستان بھی رقم کر رہا تھا۔ جب رفعت بی بی نے آسمان کی طرف اپنا چہرہ اٹھا کر رندھی ہوئی آواز میں رب کائنات کو پکار کے کہا۔

''اے خدا.....! یہ تیری مصلحتیں ہیں تُو ہی بہتر فیصلے کر سکتا ہے۔ میرا کڑیل جوان بیٹا بھی تیری امانت تھا اور میرا یہ نومولود پوتا بھی تیری امانت ہے۔ میں حضرت عبداللہ شاہ غازی کے قدموں پر کھڑی ہو کر تجھ سے وعدہ کرتی ہوں کہ میں تیری امانت اور اپنے پوتے کو اسی عزم و حوصلے سے پروان چڑھاؤں گی جس طرح میں نے اپنے بیٹے حیدر کو پال پوس کر جوان کیا تھا..... ایک خواہش میں نے اپنے پوتے کے لئے کی تھی اور آج پھر میں ایک خواہش کا عزم کرتی ہوں کہ میں حمزہ کو اپنی دھرتی اور اپنے وطن کا ایک ایسا بیٹا بناؤں گی جو پوری قوم کی امیدوں کا مرکز ثابت ہوگا۔ اے خدا.....! مجھے عزم و حوصلہ عطا فرما۔ بس یہی میری ایک خواہش ہے۔

☆......☆......☆

لہو میرا ہے کس کے سر

اس دور پر آشوب میں ہمارے معاشرے کا جو حال ہے، وہ بھلا کس سے ڈھکا چھپا ہے؟ یہ گزری کل کی بات ہے جب ہمارا خاندانی نظام برقرار تھا اور رشتوں کا احترام ہماری خوبی تھی مگر اب معاشی ناہمواریوں اور مذہبی، لسانی نفرتوں نے یہ رشتے بھی پامال کر دیے جسکا اظہار آئے دن کچھ اس طرح سے ہوتا ہے کہ کہیں ماں اپنے بچوں کو فروخت کرنے کے لئے سڑک کے کنارے بولیاں لگا رہی ہوتی ہے تو کہیں باپ اپنی معصوم بچی کا ہاتھ رقم کے لالچ میں کسی بوڑھے کے ہاتھ میں تھما رہا ہوتا ہے، بیٹے کے ہاتھوں ماں کا قتل، باپ کے ہاتھوں بیٹی کا عبرت ناک انجام، اب ہمارے معاشرے میں اچنبھے کی بات نہیں رہی، اب تو یہاں تک معاشی ناہمواریوں نے اپنے گل کھلانے شروع کر دیے ہیں کہ ماں باپ خود اپنے معصوم بچوں کو اپنے ہاتھوں ان کی بے گناہی کی سزا دے رہے ہیں، اولاد کو اپنے اوپر بوجھ سمجھنے والا یہ معاشرہ ہمیں ایسے ہولناک مناظر دکھاتا ہے کہ ساتوں آسمان بھی لرز اٹھتے ہوں گے۔

آج میرے شہر کی کہانی ایک ایسے ہی المناک واقعے کے گرد گھومتی ہے جو کراچی کے علاقے لانڈھی میں رونما ہوا۔ اخبار کا، جرائم کی دنیا کا وہ شمارہ میرے ہاتھ میں ہے جہاں تین معصوم کلیاں اپنے مستقبل سے بے نیاز کسی دست شفقت کی منتظر ہیں۔ ان بچوں کے والدین نے یہ منزل حاصل کرنے کے لئے کیا کیا نہ جتن کئے ہوں گے لیکن اخبار میں چھپی

ہوئی ان پانچ افراد کی لاشیں ہمارے معاشرے کے چہرے پر ایسا تازیانہ ہے جس کا جواب نہ آپ کے پاس ہے اور نہ میرے پاس، بس اس کے لئے میں محض اتنا ہی کہہ سکتی ہوں۔

''آعندلیب مل کے کریں آہ وزاریاں،

یہ واقعہ دیکھنے اور ضبط تحریر میں لانے تک میں یہ سوچنے پر مجبور ہوگئی ہوں کہ غربت شدت پسندی کو جنم دیتی ہے اور ایسا شخص نا صرف اپنے لئے بلکہ اپنے اردگرد رہنے والوں کے لئے بھی صرف اور صرف اذیت کا انتخاب کرتا ہے، یہ غربت جو ہمارے معاشرے کے لئے اک ناسور بن کر رہ گئی ہے، آخر یہ ناسور کب تک لاعلاج رہے گا؟

O......O......O

لانڈھی میں محلہ مجید کالونی کے رہائشی آصف بہاری کے گھر آج پھر معمول کے مطابق طعنے اور طنز کے نشتر تاج بی بی پر چلائے جا رہے تھے۔ تاج بی بی کا قصور فقط اتنا تھا کہ وہ اپنے شوہر آصف کی پہلے محبوبہ اور بعد میں شریک حیات بنی۔ آصف نے اپنی ماں منی بیگم کی خواہشات کا گلا گھونٹ دیا تھا اپنی پسند کی شادی رچا کے اس نے ماں کے دل میں عداوت کا بیج بو دیا تھا۔

اس روز تاج بی بی اپنے بخار میں مبتلا بیٹے ڈیڑھ سالہ یاسین کو بڑی مشکل سے سلا کر کمرے سے باہر نکلی ہی تھی کہ اس کی ساس منی بیگم اس کے سر پر سوار ہو گئیں۔'' اے بہو.....! کچھ کام کر لیا کر، صبح سے یہ وقت آ گیا ہے، اب کمرے سے نکلی ہے؟ جب سے گھر آئی ہے، عیش و عشرت کے دن گزار رہی ہے اور میری زندگی مصیبت میں ڈال دی ہے۔'' منی بیگم نے ہاتھ چلاتے ہوئے اپنا سر پیٹا تھا اور برآمدے میں بچھے تخت پر بیٹھ گئی تھی.... '' لا جلدی سے ناشتہ دے۔''

تاج بی بی جو پوری رات ننھے یاسین کے ساتھ جاگی تھی، رات بھر یاسین کے ماتھے پر پٹیاں رکھتی رہی تھی اور جب صبح بیٹے کے بخار کی حدت کم ہوئی تھی تو ساس کے لہجے کی حدت نے اس کی آنکھوں کو نم کر دیا۔ وہ خاموشی سے آنسو دوپٹے کے آنچل میں جذب کرتی باورچی خانہ میں آ گئی اور پرات میں آٹا نکال کر تیزی سے گوندھنے لگی۔

"ارے ذرا جلدی ہاتھ چلا، کم بخت، سوائے آرام کے، کوئی کام نہیں تجھے حرام خور......" منی بیگم ایک بار پھر چلائیں۔

"امی.... ! کیا صبح صبح صلواتیں سنا رہی ہو؟" شاہد جو تاج بی بی کا دیور تھا۔ وہ بھی کمرے سے نکل آیا اور اپنی ماں سے جھنجلائے ہوئے انداز میں مخاطب ہوا۔

"اماں.... ! یہ تم روز صبح میری نیند کیوں خراب کر دیتی ہو؟ جب سے یہ بھابھی گھر آئی ہے، ہمارا گھر جہنم بن گیا ہے، جہنم..... جب دیکھو، شور شرابہ گھر میں، ایک طوفان....."

شاہد اپنی دھن میں بولتا ہوا غسل خانہ میں گھس گیا۔

"ارے، کام چور، پیٹ پوچھن بڑا آیا، تیری تو نیند خراب ہوئی ہے، یہاں میری دنیا لٹ گئی ہے۔ میرا کماؤ پوت میرے ہاتھوں سے نکل رہا ہے تُو تو کچھ کماتا نہیں ہے اور نا ہی تجھے احساس ہے کہ مہنگائی کے سانپ نے ہمیں چاروں طرف سے جکڑ لیا ہے، بس دیکھ لینا، جس دن بھی ان سانپوں نے ڈسا، کوئی بھی نہیں بچے گا۔" منی بیگم تاسف بھرے انداز میں آہیں بھر رہی تھیں۔

"ساس نہیں، ناگن ہیں ناگن......" باورچی خانہ میں تیزی سے پیڑے بناتی ہوئی تاج بی بی منہ ہی منہ بڑبڑائی تھی اور جلدی جلدی روٹیاں توے پر ڈالنے لگی۔ اس وقت اسکے تصور میں اپنے دونوں بیٹے پانچ سالہ وقاص اور چار سالہ محسن آرہے تھے۔ وہ دونوں ہی آج بغیر ناشتہ کئے اسکول گئے تھے اور آصف اسے کتنی تسلی دے رگیا تھا کہ....." تم ننھے یاسین کا خیال رکھو، میں بچوں کو اسکول سے لانے جاؤں گا تو کچھ لیتا ہوا آؤں گا۔"

شوہر کے میٹھے بول اس کے احساس کو وقتی ٹھنڈک تو دے گئے تھے مگر ساس کی جلی کٹی باتوں نے اسے پھر تصور سے حقیقی دنیا میں لا کھڑا کیا۔

"اری کمبخت، نگوڑ ماری، ذرا جلدی ہاتھ چلا لے، ارے تجھے تو پتا ہے مجھے بھوک بالکل برداشت نہیں۔"

"جی، بس لائی۔" کی صدا لگاتی وہ رات کی سبزی گرم کرنے لگی۔ اسی دوران شاہد بھی ماں کے برابر آکے بیٹھ گیا۔

"بھابھی! میں بھی ماں کے ساتھ ہی ناشتہ کروں گا اور میری چائے میں اوپر سے بالائی ضرور ڈال دینا۔" شاہد فرمائش کرتا ہوا ماں کے کان میں کھسر پھسر کرنے لگا جبکہ تاج بی بی خاموشی سے آنسو پونچھتی ہوئی ٹرے میں ناشتہ سجانے لگی۔

O......O......O

رات کے دو بج رہے تھے، آصف بڑی مشکل سے اپنی جان چھڑا کر کمرے میں آیا تھا۔ معمول کے مطابق آصف کے گھر میں داخل ہوتے ہی منی بیگم نے اسے اپنے پاس بٹھا لیا تھا، ایسا روز ہوتا تھا اور پھر ماں اور بیٹے کے درمیان گھنٹوں کیا باتیں ہوتیں، یہ تو کبھی آصف، بیوی کو نہیں بتاتا تھا اور نہ ہی کبھی تاج بی بی نے اس سے پوچھنے کی ہمت کی تھی اسے شوہر کی خوشی عزیز تھی اور پھر وہ جانتی تھی کہ آصف ایک پیار کرنے والا شوہر ہی نہیں، ایک خدمت گزار بیٹا بھی ہے، مگر اسے اس بات پر بڑی حیرت ہوتی تھی کہ یہ وہی عورت ہے جس کا بات کرتے ہوئے چیخے بنا گزارا نہیں پھر بھلا وہ کیسے اتنے رازدارانہ لہجے میں گفتگو کر سکتی ہے؟ خیر یہ اس کیلئے روز کا معمول تھا، وہ تینوں بیٹوں کو سلا کر خود ہلکا پھلکا سا تیار ہو کر شوہر کے انتظار میں مرتے لمحوں اور گزرتے پلوں پر افسردگی کا اظہار کرتی رہتی اور جیسے ہی شوہر کمرے میں آتا، وہ دن بھر کی کٹھنائیوں کو بھول کر اپنی ساری محبتیں شوہر پر نچھاور کر دیتی۔ آج بھی جیسے ہی آصف کمرے میں داخل ہوا، وہ بڑی خوش دلی سے آگے بڑھی، آصف کا موڈ کافی خراب تھا لیکن بیوی کے اتنے پیار سے خوش آمدید کہنے پر وہ جلد ہی نارمل ہو گیا۔

"یاسین کا بخار اتر گیا؟" مختصر سا سوال کرتے ہوئے وہ سوئے ہوئے یاسین کے سرہانے بیٹھ گیا۔

"ہاں اللہ کا شکر ہے۔ پہلے سے طبیعت بہتر لگ رہی ہے۔"

"آپ کے لئے کھانا لگا دوں؟" تاج بی بی نے آہستگی سے کھانے کی پیشکش کی۔

"نہیں، رہنے دو، مجھے بھوک نہیں ہے، تم نے آرام بھی کیا یا پورا دن کام کی نظر ہو گیا؟" آصف نے پیار سے اس کے رخساروں پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا۔

"جی، بس میں ٹھیک ہوں، آپ سے کچھ کہنا چاہتی ہوں، اگر آپ آرام کرنا چاہیں تو

پھر کل بات کر لیں گے۔" تاج بی بی کی آواز میں درد تھا اور بے اختیار اس کی پلکیں بھیگ گئیں۔

"کہو، کیا پھر آج اماں نے کچھ زیادہ کہہ دیا ہے۔" آصف نے فکر مندانہ لہجے میں سوال کیا۔

"اماں کیا کہتی ہیں اور کیا چاہتی ہیں یہ تو میں اچھی طرح سمجھتی ہوں، اس لئے آپ سے ایک درخواست کرنی ہے۔"

"ہاں، ہاں، بولو۔" آصف کے تسلی آمیز رویے نے اسے رونے پر مجبور کر دیا۔

"آصف، ہم الگ نہیں رہ سکتے؟" اتنا کہہ کے وہ پھوٹ پھوٹ کے رو دی۔ آصف چپ تھا، لیکن وہ معاملہ سمجھ گیا تھا۔ دونوں کے درمیان خاموشی کا وقفہ جب طویل ہوا تو آصف نے آہستگی سے کہنا شروع کیا۔

"تاج، خدا سے دعا کرو کہ وہ ہماری روزی بڑھا دے، آمدنی ابھی قلیل ہے، ہمارے تینوں بیٹے ابھی چھوٹے ہیں، تم تو جانتی ہو ناں کہ بچوں کی فیس، ان کے خرچے، پھر گھر کا سودا سلف، یہ سب کچھ پورا کرنا میرے لئے کتنا مشکل ہو جاتا ہے اور پھر شاہد بھی کوئی کام جم کے نہیں کرتا، علیحدگی کی صورت میں ہم تو پریشان ہوں گے ہی، ساتھ ہی امی بھی پریشان ہو جائیں گی۔" آصف نے سمجھانے والے انداز میں اپنی بات مکمل کی۔

"جی آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" تاج نے بجھے بجھے انداز میں کہا، گو کہ اس کے معطل حواس معمول پر آ گئے تھے مگر شکست خوردگی کا احساس رگ و پے میں زہر بن کر دوڑنے لگا ہے۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ میں ہنستی مسکراتی زندگی میں اس محبت بھرے قدم رکھے تھے وہاں دکھ دبے پاؤں چلا آئے گا۔ آصف کی محبتوں کے سنگ چلتے چلتے جانے کب دکھ جھولی میں آن گرا اسے پتا ہی نہیں چلا۔

"تاج، تم ہمت نہیں ہارو دیکھو، میں شاہد کے لئے کام ڈھونڈ رہا ہوں، جس دن وہ بر سر روزگار ہو جائے گا ہم یقیناً الگ ہو جائیں گے اور امی کی باتوں کا برا نہیں منایا کرو۔ بس وہ مہنگائی کی وجہ سے پریشان ہو جاتی ہیں اور تمہیں کچھ الٹا سیدھا بول دیتی ہیں ورنہ تم تو جانتی

ہو، جب ہماری پسند کی شادی انہوں نے قبول کر لی ہے تو کچھ دنوں میں وہ تمہیں بھی سمجھ جائیں گی۔'' آصف گو کہ تاج کو سمجھا رہا تھا مگر اندر ہی اندر اس کا دل بھی ڈوبے جا رہا تھا۔

''جی، جیسی آپ کی خوشی، میں کوشش کروں گی اپنی طرف سے امی کو شکایت کا موقع نہ دوں، باقی اللہ کی مرضی۔'' اس نے جملہ ادھورا چھوڑ کر قریب لیٹے تینوں بیٹوں کو باری باری پیار کیا تھا اور شوہر کا بستر لگانے کے لئے کھڑی ہوگئی آخر زندگی کی مسرتوں، خوشیوں، رنگینیوں پر اس کا بھی حق ہے، یقیناً ہمارے پاس کچھ بھی نہیں لیکن ایک دوسرے کے لئے محبتیں تو وقف ہیں جو میں اپنے شوہر کی نظر کرنا چاہتی ہوں مگر ہماری زندگی میں امی جانے کیوں پھوٹ ڈالنے پر تلی ہوئی ہیں؟ وہ رحم طلب نظروں سے آصف کو دیکھتی ہوئی کمرے کی لائٹ آف کرنے کے لئے مڑ گئی۔

O......O......O

آج چھٹی کا دن تھا، آصف صحن میں بیٹھا تھا، وقاص اور محسن کی معصوم شرارتوں سے محظوظ ہو رہا تھا، جبکہ ڈیڑھ سالہ یاسین، آصف کی گود میں ہمک رہا تھا۔

''بابا، بابا، مجھے سائیکل چاہئے۔'' وقاص پنجے کے بل کھڑے ہو کر آصف کے کندھے کو چھونے لگا۔

''اور مجھے ریموٹ والی گاڑی۔'' محسن بھی بھائی کے پیچھے لپکا۔

''ہاں، ہاں بھئی لے لیں گے۔'' آصف نے بچوں کو پیار سے تسلی دی اور دونوں بچوں کا دھیان دوسری طرف بٹانے لگا۔

''ارے، گھر میں پکانے کو راشن نہیں، ایک عرصہ ہوا، مرغی کے گوشت کو ترس گئی اور تُو فضول خرچے کو تیار ہے۔ یہ سائیکل، ریموٹ والی گاڑی، سب پیسوں کا ضیاع ہے۔ یہ تیرے بچوں کے آگے تو تیری ماں کی کوئی حیثیت ہی نہیں ہے۔'' منی بیگم تیز تیز بولتے ہوئے زار و قطار رونے لگیں۔

''امی آپ غلط سمجھ رہی ہیں، میں نے تو بس بچوں کو بہلانے کے لئے کہہ دیا تھا اور ویسے بھی امی! ان بچوں کی خواہشات میں نہیں تو اور کون پوری کرے گا؟'' آصف نے کاٹ

دار لہجے میں جواب دیا۔

"جبھی تو کہتی ہوں، ماں جائے بھاڑ میں، بس کل کی آنے والی بیوی کی تو فکر کر اپنی اولادوں کی فکر کر، ذرا سوچ تُو بھی اتنا ہی سا تھا، کیسے تجھے پال پوس کر اس قابل کیا، اسی دن کے لئے تاں کہ تُو ماں کو جواب دے؟ ہائے میری قسمت، ہائے ہائے۔" منی بیگم نشتر چلائے جا رہی تھیں۔

"امی! ذرا آہستہ بولیئے تاج بڑی مشکل سے سوئی ہے جب سے چھوٹے کی طبیعت خراب ہے، اس کی نیند پوری نہیں ہو رہی ہے۔" آصف نے ماں کو سمجھانے والے انداز میں کہا تو وہ بھڑک اٹھیں۔

"چل، میں بری ہی سہی، چلا جا مجھے چھوڑ کر، تُو اور تیری بیوی بھی تو یہی چاہتے ہیں کہ بس علیحدہ ہو جائیں، تیری بیوی کا دل کام کاج میں نہیں لگتا، بس اسے خوب دیر تک سونا اور زبان درازی کرنا آتا ہے۔ ہو جاؤ الگ۔ چلے جاؤ مجھے چھوڑ کر، کر لو پورے دل کے ارمان۔ منی بیگم کی آہ و زاریاں تیز تر ہو گئیں تھیں۔"

آصف نے گھر چھوڑنے والی بات پر چونک کر ماں کو دیکھا، وہ حیران تھا کہ انہیں اس بات کی خبر کیسے ہوئی؟ مگر ساتھ ہی وہ کرب سے بھی گزر رہا تھا کہ آخر اس کی ماں کو کیا ہو گیا ہے؟

O......O......O

اگلے دن کام سے واپسی پر آصف کے قدم گھر جانے کے بجائے قریبی پارک کی جانب بڑھ گئے تھے یہ وہی پارک تھا جہاں وہ پہلی بار تب آیا تھا جب وہ میٹرک کا اسٹوڈنٹ تھا۔ اسے کرکٹ کھیلنے کا بڑا شوق تھا اور وہ جب فارغ ہوتا اسی پارک میں دوڑا چلا آتا۔ وہ اور اس کے دوست خوب دیر تک اپنا وقت یہیں بتاتے اور پھر جب ابا کی موت ہو گئی تو اس کے سارے شوق جیسے موت کا سیلابی ریلا اپنے ساتھ بہا کر لے گیا۔ وہ ایک دم خاموش ہو گیا اور سنجیدگی سے ملازمت ڈھونڈنے لگا۔ وہ اپنی ماں کا سہارا بننا چاہتا تھا اور پھر بہت ہی جلدی اسے ایک موزوں نوکری مل گئی گو کہ تنخواہ کم تھی مگر وہ ہمیشہ اللہ کا شکر ادا کرتا تھا۔ لیکن جب

سے اس کی زندگی میں تاج بی بی آئی تھی تو وہ جیسے دکھوں اور غموں کے طوفان سے از خود باہر آ گیا تھا۔ تاج بی بی کا ہنستا مسکراتا چہرہ، والہانہ پیار اسے زندگی کی طرف لوٹنے پر مجبور کر گیا اور پھر یہ مقام وہ مرکز بن گیا جہاں سے تاج اور آصف کی محبتیں عروج پر پہنچ گئیں۔

آصف تاج کو حاصل کرنے کیلئے بے تاب تھا مگر اسے پہلی بار تب شدت سے احساس ہوا شاید اس کی ماں اس سے محبت نہیں کرتی، اس کی اس خواہش کو بڑے ہی آرام سے ٹھکرا دیا گیا تھا۔ وہ ان دنوں کافی پریشان رہنے لگا تھا، اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ تاج ہر لحاظ سے ایک اچھی لڑکی ہے، سمجھ دار، سگھڑ، گھر سنبھالنے والی، پھر ماں کیوں نہیں چاہتی اور اس سوال کا جواب اسے اپنی شادی کے بعد مل گیا تھا۔

آصف، تاج کے بغیر نہیں رہ سکتا تھا، اس لئے وہ ماں کے لاکھ منع کرنے کے باوجود تاج سے شادی رچا کے اسے گھر لے آیا اور پھر اوپر تلے تینوں بیٹوں کی پیدائش نے جہاں آصف اور تاج کی زندگی خوشیوں سے ہمکنار کر دی، وہیں آصف نے غور کیا کہ جیسے جیسے اس کے اپنے بیوی بچوں کے اخراجات بڑھتے جا رہے ہیں، اس کی ماں کا رویہ اس کے ساتھ بد سے بدتر ہوتا جا رہا ہے۔ جب سے دونوں بڑے بیٹوں نے اسکول جانا شروع کیا تھا، تب سے اخراجات میں اور اضافہ ہو گیا تھا اور پھر بڑھتی مہنگائی نے ان کاموں کو بھی مشکل بنا دیا تھا جو پہلے آسانی سے پورے ہو جایا کرتے تھے۔ وہ ماں کو تو کیا ہی کچھ کہتا، بس چھوٹے بھائی شاہد کو سمجھایا کرتا کہ جلد کوئی اچھی سی نوکری ڈھونڈ لو اور کتنی نوکریاں اس نے خود بھی بتائیں مگر ماں کے لاڈ پیار نے شاہد کو بگاڑ دیا تھا اور وہ ابھی تک کسی بھی نوکری کے لئے سیریس نہیں ہو سکا تھا۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ آصف کا دماغ آہستہ آہستہ ماؤف ہوتا جا رہا تھا۔ پارک کا منظر نیند میں ڈوبا سا دکھائی دینے لگا تھا۔ ایک ایک کر کے سب ہی چلے گئے تھے، بس وہ ایک بڑے سے پیڑ کے نیچے بینچ پر بیٹھا کڑھ رہا تھا، اپنی زندگی کا تجزیہ کر رہا تھا۔ ماں کی محبت پر تو شک کرنا جیسے اس کے لئے حرام تھا مگر جانے کیوں اس کی نگاہیں ماں کو دیکھتے ہوئے کھوکھلی سی ہونے لگی تھیں۔ وہ ماں سے محبت کا طلبگار تھا مگر ماں کے دل میں اپنی محبت کا دریا

گھٹتا دیکھ کر اس کا دل ڈوبا جا رہا تھا جس انتشار کا وہ شکار تھا، اس میں اسے یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے؟ ماں کو اہمیت دے یا تاج کو جو ایک چھوٹے سے کمرے میں اس کی تین اولادیں صبر شکر کے ساتھ پال رہی تھی؟

O......O......O

گزشتہ کئی روز سے آصف بہت پریشان رہنے لگا تھا۔ ماں کے طعنے، بیوی کی خواہشیں، بچوں کی فرمائشیں سب مل کر اسے مارنے پر تلی ہوئی تھیں، مایوسی اور ناامیدی کا گھیرا اس کے گرد تنگ ہوتا جا رہا تھا۔ ایک پل کو تو اس کا دل چاہا تھا، سب کو ختم کر دے یا پھر خود ہی اپنا گلا گھونٹ لے، اس کے دل نے اسے بہکانے اور بھٹکانے کے لئے اس کی عقل کے دروازے پر دستک دی تھی۔

''تم کیوں زندہ ہو؟ جب تم اپنے خاندان کی خواہشات پوری نہیں کر سکتے، اچھا کما نہیں سکتے تو تمہیں جینے کا کوئی حق نہیں۔''

چند روز پہلے ماں سے ہونے والی گفتگو آصف کے سکون و اطمینان کی موت تھی۔ ماں نے اسے بہت آہستگی سے کہا تھا۔

''ارے، چھوڑ دے اسے، جب سے وہ تیری زندگی میں آئی ہے، سوائے غربت کے اور جہیز میں کچھ نہیں لائی اور تیرے اوپر تو میرے چاند، منحوسیت غالب آ گئی ہے، دیکھ تو، تُو میرا جواں حسیں بیٹا ہے، کہاں اس کے چکر میں پھنس گیا؟ میں تو کسی امیر گھر کی لڑکی سے تیرا بیاہ رچاتی، خوب جہیز بھی آتا اور اس کے گھر والے تیری مالی مدد بھی کرتے مگر ہائے، ہائے۔ تُو کہاں ماں کی سنتا ہے، اب بھگت۔'' ماں تو اور بھی جانے کیا کیا بول رہی تھی مگر اس کے اندر ڈر کے ہیولے ناچنے لگے تھے، کہیں یہ بات تاج نہ سن لے کیونکہ وہ تاج کے لئے تو اپنی جان بھی دے سکتا تھا۔

آصف آج پھر اسی پارک میں بیٹھا تھا، غربت کی گود میں جھولا لیتی شدت پسندی اس سے سوال کر رہی تھی۔ ''اب تُو زندہ رہ کر کیا کرے گا؟ تینوں بچوں اور بیوی کو پل پل مرتا دیکھے گا تُو؟ تنخواہ ملنے پر ایسے ڈرے گا جیسے ہاتھ میں نوٹ نہیں، بچھو رکھ دئے ہوں اور پھر یہ

میرے شہر کی کہانی...... ارم زہرا

لال، ہرے پھو، گھر کے صحن میں ادھم مچائیں گے تو ماں کے آگے منتیں کرے گا کہ تیری بیوی کے ساتھ اچھا سلوک کرے تو کبھی بیوی کو سمجھائے گا کہ وہ تیری ماں ہے، اس کا رویہ برداشت کرنا تیرا فرض ہے۔"

آصف جیسے چکی کے دو پاٹوں میں پستا چلا جا رہا تھا، اسے لگ رہا تھا جیسے زندگی اس سے روٹھ چکی ہے، واقعی زندہ رہنا کتنا مشکل ہے، اس نے اپنی آنکھوں میں آئے آنسوؤں کو پونچھا، موت بھی تو خدا کا ایک بہت بڑا عطیہ ہے جس کے ذریعے اپنے دکھوں سے چھٹکارا حاصل کر سکتا ہوں، ایسے حالات میں قبر کی تاریکی اس دنیا کے اندھیروں سے بدرجہا بہتر ہے۔ مایوسی اور مجبوری میں لپٹے اس کے قدم گھر کی طرف رواں تھے، گھر میں داخل ہوتے ہی اس نے دروازے پر کھڑی ماں پر ایک نظر ڈالی اور پھر زمین کو تکنے لگا۔

"کہاں رہ گیا تھا، کتنی دیر کر دی تُو نے آنے میں؟" ماں کے سوال کا اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

"چل اندر، آ میرے ساتھ، جب سے یہ حرافہ تیری زندگی میں آئی ہے، تجھے اندر ہی اندر کھاتی چلی جا رہی ہے....." ماں اس کا ہاتھ پکڑے جیسے کھینچتے ہوئے کمرے میں لے آئی تھی۔ آج اس کی چھوٹی بہن مہوش بھی اپنی ماں کا بھرپور ساتھ دے رہی تھی۔

"ایک تو یہ بھابھی بھی نہ، جان کا عذاب ہے، میرا بیچارا بھیا کتنا کمزور اور دکھی نظر آ رہا ہے۔" مہوش نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

"میرے لال کا کیا حال ہو گیا ہے؟" منی بیگم نے آصف کا سر اپنی گود میں رکھا اور اسے پچکارنے لگیں۔

دوسری طرف کمرے میں اپنے ارمانوں کا گلا گھونٹتی تاج اپنے آنگن کے تینوں پھولوں کو سنبھالے شوہر کی زندگی کے لئے دعا گو تھی۔ شوہر کی آمد پر گو کہ اسے ڈھارس ہوئی تھی مگر یہ اطمینان اس تشویش سے زیادہ خطرناک تھا جو اسے کچھ دیر پہلے لاحق ہو گئی تھی۔ وہ دروازے کی دہلیز پر آ کر بیٹھ گئی اور آصف کا انتظار کرنے لگی۔

O.....O.....O

اگلے دن جمعے کا سورج لانڈھی کے علاقے مجید کالونی میں ایک کہرام بن کر طلوع ہوا..... آصف نے اپنے تین بیٹوں اور بیوی کو زہر دے کر خودکشی کر لی۔ جنگل کی آگ کی طرح یہ خبر پورے محلے میں پھیل گئی، چند ہی لمحوں میں ایک خلقت جمع ہو گئی اور یہ منظر دیکھنے کے لئے لوگوں کا تانتا بندھ گیا۔ آصف کے گھر کو پولیس نے گھیرے میں لے لیا۔ منی بیگم دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھیں، وہ ایک ایک کو بتا رہی تھیں۔ ''صبح آنکھ کھلتے ہی میں تشویش میں مبتلا تھی کہ میرا بچہ اور بہو اب تک کمرے سے کیوں نہیں نکلے؟ میرے پوتے بھی اسکول نہیں گئے؟ بہت دیر تک دروازہ پیٹنے کے بعد میری بیٹی مہوش نے دروازے کی درز سے اندر جھانکا تو ہم نے دیکھا، تینوں بچے اور میری بہو بے خبر سو رہی ہے مگر ہمیں آصف کہیں نظر نہیں آیا، تب میرے چھوٹے بیٹے شاہد نے روشن دان کا کچھ حصہ توڑ کر اندر جھانکا تو وہ منظر ہماری روح فنا کر گیا، آصف کی لاش پنکھے سے لٹکی ہوئی تھی۔

ہائے، میرے بچے نے خودکشی کر لی، ہائے، ہائے، کیوں اور کیسے اس نے اتنا بڑا قدم اٹھا لیا؟'' وہ ایک ایک کو آصف کا لکھا خط دکھا رہی تھیں جس میں آصف نے ماں سے معافی مانگی تھی اور لکھا تھا۔ ''وہ مہنگائی سے تنگ آ کر یہ قدم اٹھا رہا ہے۔''

اسی ہجوم میں منی بیگم کے ساتھ ساتھ ایک اور عورت کی حالت تشویش ناک تھی یہ تاج بی بی کی والدہ تھیں، وہ چیخ چیخ کر دہائی دے رہی تھیں، وہ کہہ رہی تھیں۔ ''ہماری بیٹی پر ظلم ہوتا رہا، اسی منی بیگم نے ہماری بچی کو مارا ہے اور یہ ناگن اپنے بیٹے کو بھی ڈس گئی..... اسے اپنے پوتوں پر بھی رحم نہیں آیا..... میں ان سب کے قتل کا مقدمہ درج کرواؤں گی۔''

جائے وقوعہ پر پولیس اپنی تفتیش کر چکی ہے..... مگر سزا کسے ملے گی؟ اگر تین معصوم بچوں کا قاتل آصف خود ہے تو اس نے خود اپنے لئے سزائے موت کو چن لیا اور اپنے ہاتھوں سے اپنی زندگی کا خاتمہ کر کے تمام پریشانیوں اور دکھوں سے نجات حاصل کر لی..... یقیناً اسے یہ بات معلوم ہو گی کہ ہمارے مذہب میں خودکشی حرام ہے اور حرام چیز کو اپنانے والا اپنی دائمی زندگی میں سزا کا مستحق ہوتا ہے۔ آصف نے بربریت کا مظاہرہ کیا جب وہ چھوٹے چھوٹے اپنے معصوم بچوں کے حلق میں زہر انڈیل رہا تھا تو یقیناً اس کے ہاتھ بھی کپکپا اٹھے ہوں گے

مگر وہ خوفناک شقی القلب ثابت ہوا جس نے اپنا بے رحمانہ کھیل مکمل کر لیا اور اگر آصف کسی گہری سازش کا شکار ہوا ہے اور خاندان کے جس فرد نے بھی آصف اور اس کے خاندان کو نیست و نابود کر دیا ہے تو سکون تو اسے بھی نہ اس دنیا میں مل سکے گا اور نہ اللہ کے دربار میں اسکی بخشش کی کوئی راہ نکلے گی۔

یہ ٹھیک ہے کہ جزا اور سزا اللہ کے ہاتھ میں ہے لیکن اللہ نے ہی تو کہا ہے۔''انسانیت سے پیار کرو اور رشتوں کا احترام کرو۔''

مگر یہاں تو رشتے بھی پامال ہو گئے اور انسانیت بھی شرما اٹھی ۔ آصف کی المناک داستان کا سراغ پولیس لگا سکے گی یا نہیں مگر ایک بات طے ہے کہ آصف، اسکی بیوی تاج اور اس کے معصوم بچوں کی روحیں زندہ انسانوں سے یہ سوال ضرور کریں گی کہ انسانیت کے ٹھیکے دارو، کیا ہمارا انجام یہی تھا؟ کیا اللہ تعالی نے ہمیں اسی لئے پیدا کیا تھا؟ اور اس سوال کا جواب دینے والا کوئی نہ ہوگا، کوئی نہ ہوگا۔

☆......☆......☆

موت کا نقشہ

رات اپنے جوبن پر تھی۔ گلی میں سناٹے کا راج تھا۔ ہاں کبھی کبھار کتوں کے بھونکنے کی آواز خاموشی کا گلا گھونٹتی ہوئی اس کے دروازے پر دستک دے دیتی۔ حبیبہ نے خوف زدہ نظروں سے دروازے کو دیکھا اور پھر بے صبری سے پہلو بدل کر رہ گئی۔ جب بے چینی بڑھنے لگی تو جلدی سے بستر چھوڑ کر کھڑی ہوگئی۔ برابر والے کمرے میں اس کی تینوں بیٹیاں دنیا و مافیہا سے بے خبر سو رہی تھیں۔ حبیبہ نے ایک محبت اور شفقت بھری نظر تینوں بیٹیوں کے سراپے پر ڈالی اور پھر اپنے کمرے میں آ گئی بے کلی اسے کسی طرح چین نہیں لینے دے رہی تھی..... ایسے میں کتوں کو بھونکنے کی آوازیں بہت قریب سے آنے لگیں اور پھر داخلی دروازے کو زور زور سے پیٹا جانے لگا۔ حبیبہ کے کان اتنی دیر سے اسی دستک کے منتظر تھے اس کے قدم بے ساختہ داخلی دروازے کی جانب بڑھتے چلے گئے اور پھر وہ اس وجود کو سہارا دیتے ہوئے اندر لے آئی جو شراب کے نشے میں دھت تھا اور منہ سے اول فول بک رہا تھا۔ اس کے لڑکھڑاتے قدم آنگن میں رکھی چارپائی سے ٹکرائے مگر حبیبہ نے فوراً ہی اپنے شوہر کو مضبوطی سے تھاما اور اس کو سہارا دیتی ہوئی وہ کمرے میں لے آئی اور بیڈ پر لٹا دیا۔

حبیبہ کا شوہر ضمیر بھٹو کافی دیر تک بیڈ پر کروٹیں لیتا رہا۔ بیڈ کی چادر نوچتا کھینچتا رہا، تھوک کی صورت شراب اُگلتا رہا اور عالم مدہوشی سے نیند کی حالت میں چلا گیا پھر جب حبیبہ کو یقین ہو گیا کہ اس کا شوہر سو گیا ہے تو وہ بھی پُر سکون ہوگئی اور بیڈ کے ایک کونے پر گٹھڑی کی مانند اپنے وجود

کو سمیٹتے ہوئے لیٹ گئی۔ بیڈ کی چادر سے اٹھتی شراب کی ناگوار بُو اس کی ناک میں گھس رہی تھی۔
وہ کچھ دیر تک الجھتی رہی مگر پھر جلد ہی نیند کی مہربان دیوی اس پر مہربان ہوگئی۔

O......O......O

ضمیر بھٹو کا تعلق اندرون سندھ کے علاقے خیر پور سے تھا اور عرصہ دراز سے وہ چکل گوٹھ میں رہائش پذیر تھا۔ چکل گوٹھ میں واقع اس گھر کے علاوہ ضمیر بھٹو کی اور بھی اراضی تھی جو ضمیر بھٹو شراب کی نظر کر چکا تھا۔ ضمیر بھٹو نیشنل پولیس فاؤنڈیشن سیکیورٹی کمپنی میں گارڈ کی نوکری کرتا تھا۔ اس کی وردی پولیس کی وردی سے بہت زیادہ ملتی جلتی تھی جس کی وجہ سے اس کے علاقے کے لوگ اس سے ڈرتے تھے اور غیر ضروری گفتگو کرنے سے پرہیز کیا کرتے تھے۔

پچاس سالہ ضمیر بھٹو کی چار بیٹیاں تھیں۔ سب سے بڑی تو اس کی بیوی حبیبہ کی سمجھ داری کی وجہ سے جلد اپنے گھر کی ہوگئی تھی مگر تین چھوٹی بیٹیاں ضمیر بھٹو کی کفالت میں تھیں۔ ضمیر بھٹو کا یہ روز کا معمول تھا وہ شراب کے نشے میں دھت ہو کر گھر لوٹتا۔ بیوی بیٹیوں کو گالیاں دیتا، مارتا، پیٹتا اور پھر سو جاتا۔ آئے دن حبیبہ اور ضمیر کی لڑائی اسی وجہ سے ہوتی تھی کہ وہ شراب کے نشے میں ہوش وحواس کھو دیتا تھا۔ اسے اپنی یہ بری عادت جلد ہی ترک کر دینی چاہیے مگر ضمیر کی عقل پر پردے پڑ چکے تھے اور شراب کی لذت نے اسے عقل وشعور سے محروم کر دیا تھا اور پھر ایسے میں اچانک ہی اس نے نوکری ترک کے گھر کے ایک کونے میں شراب کی دکان سجالی۔

''امی! مجھے بابا سے بات کرنی ہے۔'' اٹھارہ سالہ فرزانہ نے کوفت کے عالم میں سوتے ہوئے بابا پر ایک نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

حبیبہ نے پیار سے بیٹی کو دیکھا اور اسے اپنے گلے سے لگا کر بولی۔ '' جانتی تو ہو اپنے باپ کو، رات دیر سے آیا تھا اور اب دن چڑھے تک سوتا ہی رہے گا۔ لاکھ اس کے سر پر کوئی ڈھول پیٹ لے، اسکی نیند تو اب سرِ شام ہی ٹوٹے گی''۔

''سب کے باپ تو ایسے نہیں ہوتے؟'' فرزانہ نے ماں کے چہرے کو بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں، تم بدنصیب ہو۔'' حبیبہ نے یہ کہتے ہی فرزانہ کو خود سے لگایا اور دوپٹے کے آنچل سے اپنی آنکھوں کی نمی پوچھنے لگی۔

''امی! میں ایک پرائیویٹ اسکول میں جاب کیلئے اپلائی کرنا چاہتی ہوں۔ میرا شناختی کارڈ تو ابھی بنا نہیں۔ اس لئے مجھے بابا کا شناختی کارڈ چاہیے''۔ فرزانہ نے آہستگی سے اپنی بات مکمل کی۔

''جاب کرنا چاہتی ہو؟'' حبیبہ نے حیرت سے اسے دیکھا۔

''امی بابا کو نوکری چھوڑ کر گھر بیٹھے پورا ایک ماہ گزر گیا ہے اور اب وہ اپنی جو جمع پونجی ہے، شراب کی نظر کر رہے ہیں، میں یہ سوچ سوچ کر پریشان ہو رہی ہوں کہ آنے والے دنوں میں ہماری گزر بسر کیسے ہوگی؟'' فرزانہ کے چہرے پر تشویش کے رنگ آ جا رہے تھے۔

''شناختی کارڈ تو میں تمہیں دے ہی دوں گی مگر بیٹا؟''

''اگر مگر کچھ نہیں امی، بس آپ مجھے کوشش کرنے دیجئے۔ باقی جو میری قسمت....'' فرزانہ نے ماں کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''اچھا ٹھیک ہے میں تمہیں شناختی کارڈ نکال دیتی ہوں۔'' حبیبہ سرگوشی میں جملہ ادا کرتی الماری کی جانب بڑھ گئی۔

''دیکھئے گا امی! میں آپ کو بیٹا بن کر دکھاؤں گی۔ بابا اگر کچھ نہیں کرتے تو کیا ہوا۔ آپ کا ہاتھ بٹانے کی میں کوشش کروں گی۔'' فرزانہ کا لہجہ اس کے پختہ عزائم کو ظاہر کر رہا تھا اور پھر وہ تیزی سے ماں کے ہاتھوں سے شناختی کارڈ لیتی اپنے کمرے میں آ گئی جہاں وہ اپنی دونوں بہنوں درشہوار اور ماریہ کو نئی جاب کے حصول کے بارے میں بتانے لگی۔ جبکہ حبیبہ شراب کے نشے میں دھت بستر پر لیٹے اپنے شوہر کو دیکھ رہی تھی جس کی خوب صورت رفاقت پر کبھی وہ ناز کیا کرتی تھی اور یہ سوچ کر خوش ہوا کرتی تھی کہ چاروں بیٹیوں کو رخصت کرنے کو بعد وہ اپنے شوہر کے ساتھ ایک مثالی زندگی گزارے گی مگر ضمیر نہ جانے کب اور کیسے شراب کے نشے کا شکار ہو کر ہوش و حواس سے عاری ہو گیا اور پھر وقت کے ساتھ ساتھ ضمیر کو راہ راست پر لانے والے حبیبہ کے سارے ہی حربے ناکام ہوتے چلے گئے اور اس کوشش کے

صلے میں حبیبہ کو بس مار پیٹ کے نشان ملے، چوٹیں ملیں، تکلیفیں ملیں۔ حبیبہ نے آبدیدہ نظریں اپنے سراپے پر ڈالیں اور سوچنے لگی.... یہ میرا وہی جسم ہے ضمیر جس کی تعریف کرتے نہیں تھکتا تھا۔ ہلکی سی خراش آنے پر بھی تڑپ اٹھتا تھا مگر مجھے آج روئی کی طرح دھنکنے کے بعد بھی اس کی تسکین نہیں ہوتی۔

O......O......O

''باجی شہوار، مجھے مضمون لکھوادو'' ۔ سل پر تیزی سے مصالحہ پیستی ہوئی درشہوار کو ماریہ نے مخاطب کیا۔

''تم چلو میں آتی ہوں'' ۔ درشہوار نے ماریہ کو جواب دیا اور خود تیزی سے مصالحہ پیسنے لگی پھر اس نے جلدی جلدی گوشت بھونا اور آٹا گوندھنے کے لئے آٹا تسلے میں نکالنے لگی۔ ماں آج فرزانہ کے ساتھ باہر گئی ہوئی تھی۔ اس لیے کھانے کی ساری ذمہ داری درشہوار پر تھی۔ اسی اثناء میں ماریہ پھر سے کچن کی دہلیز پر آ کر کھڑی ہوگئی اس کے ہاتھ میں قلم اور کتاب تھی۔

''ارے بس میں آہی رہی تھی'' ۔ درشہوار اسے اپنے سامنے کھڑا پا کر چونکی۔

''باجی، دیکھو اس کتاب میں کیا لکھا ہے کہ ہزار کتب خانہ ایک طرف اور باپ کی نگاہ ملتفت ایک طرف، اس کا کیا مطلب ہے؟'' ماریہ نے سوالیہ نظروں سے درشہوار کو دیکھا۔

''اس کا مطلب باپ کی توجہ اولاد کے لئے ہزار کتب خانہ سے بھی کہیں زیادہ بڑھ کر ہوتی ہے۔''

''یعنی ہم لائبریری جانے کے بجائے اپنے بابا کو پڑھیں؟'' ماریہ کھی کھی کرتے ہوئے بولی۔

''بے وقوف ہمارے بابا کا فرض ہے کہ وہ ہماری تربیت اچھے انداز میں کریں، ہمیں اچھا پڑھائیں، اچھا سکھائیں اور اسی طرح اولاد کا بھی فرض ہے کہ وہ اپنے والدین کی عزت کریں اور ان کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آئے۔ جانتی ہو ماں، باپ کے چہروں پر محبت سے نظر کرنا بھی خدا کی خوشنودی کا موجب ہے۔'' درشہوار، ماریہ کی طرف مڑتے ہوئے بولی۔

"تو ہمارے بابا ایسے کیوں نہیں ہیں؟" ماریہ الجھن بھرے انداز میں بولی۔

"بابا پہلے بہت اچھے تھے"۔ درشہوار اتنا کہہ کر چپ ہو گئی.... اسی وقت حبیبہ اور فرزانہ کی گھر واپسی ہوئی تھی۔

"نوکری مل گئی ہے۔اب میں اسکول ٹیچر ہوں، دیکھا پڑھا لکھا ہونے کا کتنا فائدہ ہوتا ہے"۔ صحن میں بچھی چارپائی پر فرزانہ بیٹھتے ہوئے بولی جبکہ حبیبہ برقع اتار کر کچن میں آ گئی۔

"واہ بجو.....! سچ بتاؤ؟" درشہوار، فرزانہ کے قریب آ کر بیٹھ گئی۔

"ارے ہاں بھئی، اب میں امی کا بیٹا بن گئی ہوں۔" فرزانہ نے ماریہ کو کھینچتے ہوئے خود سے قریب کر لیا۔

"اچھی ٹیچر جی، مجھے اطاعت والدین پر مضمون لکھوا دو۔" لفظ ٹیچر پر زور دیتی ماریہ شرارتی لہجے، میں بولی تھی۔

"ٹھیک ہے، لکھوا دوں گی۔فرزانہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

"بجو.....! اگر بابا کو جاب کا پتا چل گیا تو....؟ میں سوچ رہی ہوں آپ ان کو خود ہی بتا دیں۔" درشہوار نے فرزانہ سے دل میں پلتے خدشات کا اظہار کیا۔

"نہیں، ابھی نہیں، تم تو جانتی ہو ناں، بابا لڑکیوں کی جاب کے سخت خلاف ہیں۔ اگر ان کو علم ہو گیا تو وہ سخت ناراض ہوں گے۔" فرزانہ نے جیسے خوف کے مارے جھرجھری لی۔

"اور بابا کی ناراضگی کا مطلب ہے، مار، پیٹ، گالی، گلوچ، بجو کتنی بری بات ہے یہ، بابا ہم پر اگر ہاتھ اٹھائیں تو سمجھ میں بھی آتا ہے۔وہ امی کو کیوں مارتے ہیں؟" اس سوال کے ساتھ درشہوار نے سہمی ہوئی ماریہ کو دیکھا اور پھر فرزانہ کے چہرے کو تکنے لگی۔

"میں کیا کہہ سکتی ہوں؟" فرزانہ کی آواز درد میں ڈوبی ہوئی تھی جبکہ کچن کی دہلیز پر بیٹھی اس کی ماں حبیبہ سوچ رہی تھی کہ میں حالات کی سنگلاخ راہوں پر چلتے چلتے تھک چکی ہوں لیکن میں زندگی کی سفاک حقیقتوں سے اپنے بچوں کے لئے خوشیاں کشید کرنا چاہتی ہوں مگر کیسے.....یہ سوال اسے لمحہ بہ لمحہ کچوکے لگاتا رہتا تھا۔

O......O......O

"تجھے کس نے اجازت دے دی کہ ٹو نوکری کرے میری عزت خاک میں ملا دی ٹو نے۔" وہ فرزانہ کو بالوں سے کھینچتے ہوئے گھسیٹنے لگا۔

"وہ بابا.... میں ...." فرزانہ اتنا ہی کہہ سکی تکلیف سے اس کی آواز ہی نہیں نکل رہی تھی۔

"میں سب جانتا ہوں تو کیوں پڑھانے جا رہی ہے؟" باپ نے انگارہ آنکھوں سے بیٹی کو گھورا۔

"بیٹیوں سے اس طرح بات نہیں کرتے۔" حبیبہ نے فرزانہ کے آگے آتے ہوئے کہا۔

"ہٹ جا حرام خور..... ٹو نے ہی اسے بگاڑا ہے۔ یہ اسکول پڑھانے کے بہانے اپنے یار سے ملنے جاتی ہے جو اسکول کے باہر بیٹھا اس کا انتظار کرتا ہے پوچھ اس سے؟" باپ کا ایک زوردار تھپڑ فرزانہ کے منہ پر پڑا۔

"نہیں بابا.... تمہاری قسم لے لو، ایسا کچھ نہیں ہے۔ میں اسکول پڑھانے جاتی ہوں، میں تو بس امی کا ہاتھ بٹانا چاہتی ہوں۔ گھر کے اخراجات کیسے پورے ہوں گے بابا، آپ کی طبیعت بھی تو خراب رہتی ہے۔" فرزانہ نے روتے ہوئے چور نظروں سے اپنے باپ کو دیکھا۔

"اچھا میں بیمار ہوں؟ کیا یہی پڑھائی ہے تو نے لڑکیوں کو؟" ضمیر نے اب بیوی کو گھسیٹا..... "ٹو جوان لڑکی کو گھر سے باہر بھیج کر پیسے بٹورنا چاہتی ہے۔ خوب سمجھتا ہوں میں تجھے۔" ضمیر نے حبیبہ کے گلے پر اپنے ہاتھوں کی گرفت مضبوط کر دی۔

"بابا..... ماں کو چھوڑ دو، ان کی کوئی غلطی نہیں ہے۔ میں نے یہ اصرار کیا تھا۔" فرزانہ ماں کو بچانے کیلئے آگے بڑھی جبکہ ماریہ اور شہوار دروازے کے پیچھے چھپ کر بے بسی یہ تماشا دیکھ رہیں تھیں اور زارو قطار رو رہی تھیں۔

"دیکھ تیری بہتری اسی میں ہے کہ ٹو نوکری چھوڑ دے۔" ضمیر بھٹو نے ابلتی لال انگارہ آنکھوں سے بیٹی کو گھورا۔

"میں نوکری چھوڑ دوں گی بابا! کل سے میں اسکول نہیں جاؤں گی بلکہ میں تو اب گھر

سے باہر بھی قدم نہیں نکالوں گی۔ بس آپ میری ماں کو چھوڑ دیں۔" فرزانہ نے روتے ہوئے باپ کے سامنے ہاتھ جوڑے۔

"لے چل چھوڑ دیا۔ آئندہ مجھے پتا چلا کہ تو نوکری کے لیے گھر سے باہر نکلی ہے تو میں تیری ٹانگیں توڑ دوں گا۔" بیوی کو دھکا دیتے ہوئے وہ اپنے کمرے میں چلا گیا جبکہ حبیبہ، فرزانہ کو سینے سے لگائے زارو قطار روتے ہوئے سلگتی نظروں سے اپنی بچیوں کو دیکھ رہی تھی۔

O......O......O

آج ضمیر بھٹو کو گھر سے گئے ہوئے دوسرا دن تھا۔ حبیبہ کی جان نکلی ہوئی تھی۔ شوہر کیسا ہی کیوں نہ ہو، شوہر کا نام اور اس کا وجود ایک عورت کے لئے سائبان کا درجہ رکھتا ہے..... دو راتیں گزر گئیں تھیں۔ حبیبہ کی نظریں کمرے سے دروازے اور دروازے سے پورے صحن کا چکر کاٹ رہیں تھیں مگر وہ کوئی ایسی مانوس آہٹ نہیں سن پائی جس سے یہ ظاہر ہوتا کہ ضمیر بھٹو گھر لوٹ آیا ہو..... جوان بچیوں کا ساتھ اور اکیلا گھر، ضمیر جیسا بھی تھا کسی کی ہمت تو نہیں تھی ناں کہ اس گھر کی طرف میلی نظر اٹھائے..... حبیبہ نے جلدی سے دروازے کو اچھی طرح سے لاک کیا اور خود مصلیٰ بچھا کر بیٹھ گئی اور اپنے شوہر کی صحت وسلامتی کی دعائیں مانگنے لگی۔

"بجو.....! مجھے بابا بہت یاد آ رہے ہیں۔" ماریہ کے آنسو نہیں رک رہے تھے۔

"ہاں، مجھے بھی۔" درشہوار بھی سسکی۔ ہم سب بابا کو بہت تنگ کرتے ہیں۔ بابا کے ساتھ یہ کیسا برتاؤ ہے ہمارا۔ "ہم بابا کو برا بھلا بھی کہہ دیتے ہیں اور اس دن تو بجو تمہارے منہ سے یہ بھی نکلا تھا کہ..... وہ بھاڑ میں جائیں۔"

"آخر انہوں نے مجھے اتنا مارا بھی تو تھا۔ بیچ میں تو صرف بابا اور ماں کا ہاتھ بٹانا چاہتی تھی۔" فرزانہ نے اپنی صفائی پیش کی۔

"بجو! اگر ہم بابا کو برا بھلا کہہ کر انہیں تکلیف پہنچانے کے بجائے ان کا محبت سے ساتھ دیں تو..... " درشہوار کا انداز سوالیہ تھا۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا، بابا کی خدمت میں شراب پیش کریں؟" فرزانہ نے بہن کو

گھورا۔

''نہیں بجو....! کیوں نہ ہم بابا کو پیار سے سمجھائیں کہ شراب پینا کتنا بڑا گناہ ہے بلکہ اسلام میں تو ہر نشے والی چیز ہی حرام ہے۔ یہ انسان سے اچھے برے کی تمیز مٹا دیتی ہے۔ عقل کو زائل کر دیتی ہے اور بے شمار برائیوں کی جڑ صرف اور صرف شراب ہی تو ہے۔'' در شہوار نے فرزانہ کی جانب پُر امید نظروں سے دیکھا۔

''ہاں، کوشش کی جا سکتی ہے۔ اس بارے میں کچھ سوچیں گے لیکن پہلے یہ تو دعا کرو کہ بابا خیریت سے گھر آ جائیں۔'' فرزانہ نے فکر مند لہجے میں کہا۔

علی الصبح دروازہ زور، زور، سے پیٹا گیا..... یہ وہی مخصوص آواز تھی جسے سننے کے لئے گھر کے ہر فرد کے کان بے چین تھے۔ پوری رات سوتی جاگتی ماریہ سب سے پہلے بیدار ہوئی اور اس نے بھاگتے ہوئے صحن عبور کر کے بے اختیار دروازہ کھول دیا..... نشے کی حالت، مدہوشی کا عالم اور لڑکھڑاتے قدم.... ماریہ ایک دم سہم کے پیچھے ہٹ گئی۔

''کہاں ہے تیری ماں؟ کیا مر گئی؟'' ضمیر بھٹو بیٹی سے مخاطب ہوا۔

''نہیں، اماں سو رہی ہیں؟'' وہ کچھ غصے سے بولی۔

''چل اب سامنے سے ہٹ جا''۔ ضمیر بھٹو نے اپنا ہاتھ ہوا میں لہرایا۔

''پہلے کچھ ناشتہ لا کر دیں آپ، ہم سب دو دن سے بھوکے ہیں''۔ ماریہ نے خاصے مضبوط لہجے میں کہا۔

''ہٹتی ہے میرے راستے سے یا.....؟'' باپ نے بیٹی کو لال بھبوکا آنکھوں سے گھورا۔

''اچھے بابا! ناشتہ لا دو نا۔'' بیٹی بے اختیار نرم پڑ گئی۔

''ناشتہ چاہیے تجھے؟'' باپ نے نہایت عجیب سے لہجے میں پوچھا۔

''جی؟'' ماریہ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''یہ لے ناشتہ، میں آج ناشتے میں تجھے دو گولیاں دیتا ہوں''۔ اور پھر آناً فاناً ضمیر بھٹو نے نیفے سے پستول نکالا اور ماریہ پر گولی چلا دی۔ گولی ٹھیک نشانے پر لگی تھی۔

گولی کی آواز سے دونوں بہنیں اور ماں بھی صحن میں آ گئیں..... در شہوار، بہن کے

قریب آئی کہ اسے اٹھا سکے مگر شاید باپ کا دل اور آنکھیں بیٹیوں کی محبت سے عاری ہو چکی تھیں ۔ بڑی ہی سفاکی سے درشہوار پر بھی گولیاں برسا دی گئیں۔ اس ساری صورت حال سے فرزانہ گھبرا گئی۔ خود کو بچانے کی غرض سے اس نے کمرے میں جانا چاہاتو ضمیر بھٹو نے اسے بھی گولی کا نشانہ بنایا۔ اب حبیبہ شوہر کا ہاتھ پکڑنے کیلئے اس کے قریب آگئی مگر ضمیر بھٹو نے ظالمانہ انداز میں اسے دھکا دے کر ریوالور کی لبلبی دبائی مگر خوش قسمتی سے پستول میں گولیاں ختم ہو گئیں تھیں۔ اس بات پر ضمیر بھٹو مزید طیش میں آ گیا..... اور صحن میں پڑی ایک لوہے کی راڈ سے اس نے حبیبہ پر حملہ کر دیا۔

ضمیر بھٹو کی جنونی کیفیت کے آگے کسی کا بس نہیں چل سکا اور پھر وہ خود ہی تھک ہار کر دروازہ کھول کر گھر سے بھاگ گیا۔

محلے والے ایک ایک کر کے جمع ہو رہے تھے۔ ماریہ اور درشہوار تو موقع پر ہی ختم ہو گئیں تھیں مگر فرزانہ اور حبیبہ بیگم زندہ تھیں مگر زخموں سے چور سسک رہیں تھیں۔ بجل گوٹھ میں یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل چکی تھی کہ ضمیر نے اپنی دونوں بیٹیوں کو گولی مار کر ہلاک کر دیا جبکہ ماں اور ایک بیٹی شدید زخمی حالت میں، موت اور زیست کے کشمکش میں مبتلا ہیں۔ حیرت اور افسوس میں مبتلا محلے کے لوگوں کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس سفاکی پر کیا کہیں؟ محلے کے لوگوں نے بعد میں ضمیر کو پکڑ کر پولیس کے حوالے تو کر دیا تھا مگر حبیبہ شوہر کے ایسے ظالمانہ رویہ کی وجہ سے جیتے جی مر گئی ۔ ماریہ اور درشہوار جو اپنے باپ کی مدد کرنا چاہتی تھیں مگر خود وہ باپ کی سفاکی کی نظر ہو گئیں تھیں یقیناً اولاد کا ماں باپ سے محبت کا رشتہ انمول ہوتا ہے اور خود خداوند عالم نے اولاد کو سختی سے حکم دیا ہے کہ وہ اپنے والدین کی عزت کریں جبکہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے کہ رب کی ناراضگی والد کی ناراضگی اور رب کی رضا والد کی رضا میں پوشیدہ ہے۔ مگر جب ایک باپ اپنے ہی ہاتھوں سے اپنی اولاد کو ختم کر دے تو دنیا کی ہر رشتے سے اعتبار اٹھتا محسوس ہوتا ہے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ والدین پر فرض ہے کہ وہ مفلسی کے ڈر سے اپنی اولاد کو قتل نہ کریں مگر ضمیر بھٹو تو شراب کے نشے میں تھا، نشہ جو اچھے اور برے کی تمیز بھلا دیتا ہے نشے باز شخص کے جسم میں رشتوں کا خون نہیں بلکہ شراب بہہ رہی

ہوتی ہے اس کی غیرت مر جاتی ہے، وہ بے حس ہو جاتا ہے بالکل اسی طرح جس طرح ضمیر کا ضمیر نشے کی وجہ سے بے ضمیر ہو چکا تھا۔اس نے اپنے ہی خاندان پر قیامت ڈھائی تھی، معصوم بیوی اور بیٹیوں پر قہر بن کر ٹوٹ پڑا تھا۔اس نے خود ہی اپنے گلشن میں قیامت برپا کر دی تھی۔

قرآن مجید میں شراب کو حرام قرار دیا گیا ہے حرام چیز کو گلے میں انڈیل دینے والے سے نیکی کی توقع رکھنا ایسے ہی ہے جیسے خونخوار بھیڑیے سے آپ دوستی کر لیں اور یہ توقع رکھیں کہ وہ بھیڑیا بھی کبھی آپ کا ہمدرد بن سکتا ہے؟

☆......☆......☆

پھول بنا بارود

''یہ کوئی وقت ہے گھر آنے کا، شام کے چھ بج رہے ہیں۔ مغرب کا وقت ہو چکا ہے لاکھ سمجھایا ہے مغرب سے پہلے گھر لوٹ آیا کرو۔ مجھے ہول اٹھنے لگتے ہیں مگر تم کہاں سمجھو گی جب اپنی اولاد ہو گی تو تب سمجھ میں آئے گا کہ اولاد جب تک گھر نہیں لوٹ آتی، ماں کا دل مضطرب رہتا ہے اور نظریں دہلیز کو تکتی رہتی ہیں۔''

اماں نے نہ ختم ہونے والی تقریر کا پہلا پیراگراف مکمل کر لیا تھا۔ ویسے بھی، جب وہ لیٹ آنے پر تقریر شروع کرتیں، اکثر و ہمیشہ یہی ہوتا اور صفیہ ہر بار کی طرح..... ''جی امی! جلدی آنے کی کوشش تو کرتی ہوں، ٹریفک جام ہو جانے کی وجہ سے بس دیر سویر ہو جاتی ہے۔ آئندہ احتیاط کروں گی۔'' کہتی ہوئی کمرے میں بھاگ آتی۔ پھر کپڑے چینج کر کے کمپیوٹر کے سامنے بیٹھ جاتی اسائنمنٹ کی تیاری اگلے دن کا ایجنڈا اور ساتھ ہی دوستوں سے گپ شپ اور پھر رات گئے تک یہ سلسلہ جاری رہتا..... یہ اس کی روٹین تھی مگر آج وہ چینج کرتے ہی بستر پر آ گئی تھی۔ دل زور، زور سے دھڑک رہا تھا اور نظروں میں وہ چہرہ گھوم رہا تھا جس سے آج ہونے والی ملاقات اسے مسحور کئے دے رہی تھی۔

صفیہ نے آہستہ سے پرس کھولا اور اندرونی جیب سے وزٹنگ کارڈ نکالا جس پر وقار احمد کا نام جگمگا رہا تھا۔ ایک اہم عہدے پر فائز وقار واقعی گریس فل شخصیت کا مالک تھا اس کا نام اس کی شخصیت کے وقار کے بالکل عین مطابق تھا۔ اس نے آہستہ سے کارڈ میں درج نمبر

ہرایا اور پھر بیگ سے موبائل نکال کر وہ نمبر موبائل میں فیڈ کرنے لگی۔

''تم کھانا نہیں کھاؤ گی؟'' اس کی بڑی بہن ثمینہ سامنے کھڑی اس سے سوال کر رہی تھی۔

''جی بجو! آتی ہوں۔'' صفیہ جھینپ کر بولی اور جلدی سے وزٹنگ کارڈ بیگ میں رکھنے لگی۔

''صفیہ، جلدی آجاؤ اس سے پہلے کہ امی کا غصہ مزید بڑھے۔'' بجو اسے تنبیہ کرتے ہوئے کمرے سے نکل گئیں اور وہ تیزی سے واش روم کی جانب بڑھ گئی۔

صفیہ پانچ بہن بھائیوں میں دوسرے نمبر پر تھی جبکہ اس کے دونوں بھائی بہنوں سے چھوٹے تھے۔ صفیہ ایک سرکاری ٹیکنیکل ادارے میں ایسوسی ایٹ انجینئرنگ کی اسٹوڈنٹ تھی طبیعت میں شوخی اور ملنساری ہونے کے باعث وہ ہر دل عزیز شخصیت کہلاتی اور بہت جلد ہی دوستوں اور محفلوں میں اپنی جگہ بنا لیتی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ اس سے پہلی ہی ملاقات میں وقار احمد اپنا دل ہار بیٹھا اور صفیہ کی خوبصورتی پر مر مٹا۔ دونوں کی نگاہوں کا یہ تبادلہ دونوں کے دلوں میں انجانے سُر بکھیر گیا اور وقار احمد نے اپنا وزٹنگ کارڈ صفیہ کو اتنی رازداری اور محبت سے دیا کہ وہ انجانے محبوب جذبوں سے لبریز اسے سب کی نظروں سے چھپائے کسی قیمتی متاع کی طرح اپنے پرس میں روپوش کر گئی مگر چہرے پر پھیلی مسکراہٹ، دل میں اُمڈتے میٹھے جذبوں کی چغلی کھا رہے تھے جسے شاید وقار احمد بھی فراموش نہیں کر پا رہا تھا۔ مختصر تعارف اور نظروں کے تبادلے تک کا یہ سفر اتنا خوشگوار تھا کہ صفیہ اردگرد سے بے خبر کسی غیر مرئی نقطے میں وقار کے چہرے کو تلاش کر رہی تھی۔

''لڑکی، خیریت تو ہے؟'' اماں کی آواز پر وہ چونکی۔

''مم..... مم بس اماں..... یونہی۔'' وہ جلدی جلدی پلیٹ میں چاول نکالنے لگی اور اماں اسے گھورتے ہوئے کھانے میں مشغول ہو گئیں۔

O......O......O

رات کا جانے کون سا پہر تھا جب صفیہ کی آنکھ کھلی، بے ساختہ اس نے سائیڈ ٹیبل سے موبائل اٹھایا اور وقار احمد کے نمبر پر کال کرنے لگی مگر جلد ہی اس نے لائن ڈراپ کر دی۔ دل

اس کی مغلوب کر دینے والی شخصیت کے حصار میں محو تھا اور جیسے وہ بے خودی میں نمبر ڈائل کرتی اور کاٹتی رہی پھر اس حقیقت کا ادراک ہوا کہ وہ جس ذات کے سحر میں گرفتار ہے، وہ بظاہر تو پُر کشش ہے مگر اس کا دل، اس کی فطرت، غائبانہ کسی کا اسیر ہو جانا اور یوں پاگل پن کی حرکتیں کرنا کم از کم تعلیم یافتہ ذہن کا فطور ہی کہلائے گا مگر وہ پھر بھی کیا کرتی کہ وقار احمد سے روبرو، پہلی ہی ملاقات میں اسے وقار احمد کا دیوانہ بنا دیا تھا۔ ابھی وہ ان تصورات کے لطیف جذبوں سے سرشار کروٹیں بدل رہی تھی کہ موبائل فون پر چونک گئی۔ بے ترتیب دھڑکنوں کو ترتیب دیتی اس کی نظریں جونہی اسکرین پر گئیں وہاں وقار کا نام جھلملا رہا تھا۔ اف وہ برق رفتاری سے بیٹھ گئی۔

'' کیا کروں، کال اٹینڈ کروں ؟'' اسی اثناء میں لائن ڈراپ ہو چکی تھی۔ اس نے اطمینان کا سانس لیا مگر اگلے ہی لمحے پھر وقار احمد کا نام جھلمل، جھلمل کر رہا تھا۔ آخر ہمت مجتمع کر کے اس نے ہیلو کہا۔

'' صفیہ؟'' ہولے سے کہا گیا۔

'' آپ کو کیسے پتہ، یہ میرا نمبر ہے؟'' وہ حیران سی پہلو بدل کر بولی۔

'' مجھے معلوم تھا، تم مجھے کال ضرور کرو گی اور تمہاری مس کال سے مجھے تمہاری بے چینی کا اندازہ تو ہو ہی رہا ہے۔'' وہ استہزائیہ انداز میں بولا۔

'' بس یونہی مجھے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اتنی رات کو آپ کو کال کرنی چاہئے یا نہیں۔'' صفیہ کا لہجہ محبت سے بھرپور تھا۔

'' تم وقت کی قید سے آزاد ہو کر میرے بارے میں سوچا کرو کیونکہ میں اب اپنا سارا وقت تمہارے لئے وقف کرنا چاہتا ہوں اس لئے جب دل چاہے، کال کر لو۔'' گہری سانس لیتے ہوئے مخمور لہجے میں جواب آیا۔

'' اف وہ، اتنی جلدی یہ فیصلہ کن انداز۔'' وہ خواب ناک سی دھیمے لہجے میں بولی۔

'' کیا کروں، تمہاری شخصیت کا جادو جو سر چڑھ کر بول رہا ہے۔ نازک اندام بدن، خوبصورت آواز اور کشش اتنی کہ دل چاہے بس تمہیں دیکھتا ہی چلا جاؤں، کبھی خود کو دیکھا ہے آئینے میں۔ یقیناً دیکھتی ہو گی مگر کبھی میری نظر سے دیکھنا، تمہارے اندر غرور نہ جاگ جائے تو

میرا نام بدل دینا۔"

وقار نے ان خیالات کا اظہار کرتے ہوئے ادھر گہری سانس بھری اور ادھر صفیہ کا دل جیسے معمول سے ہٹ کر دھڑک اٹھا کہ وہ وقار احمد کے دل میں خوشبو بن کر چھاہ گئی ہے۔ اس کے لبوں کی تراش میں دھیمی سی مسکراہٹ جاگ گئی یہ خیال اس کے لیے فخر وانبساط کا باعث تھااور دل بے پناہ مسرت محسوس کر رہا تھا۔ کسی کیلئے خاص اور اہم ہونے کا احساس کتنا دل فریب ہوتا ہے اور پھر وقار کیلئے وہ بھی تو ایسا ہی محسوس کر رہی تھی۔

"کہاں کھو گئیں؟" دوسری طرف سے آہستگی سے پوچھا گیا۔

"نہیں، کہیں نہیں، بس آپ کے بارے میں ہی سوچ رہی تھی۔"

"ابھی تو تم مجھ سے باتیں کرو' جب موبائل پر گفتگو بند ہو جائے تب سوچنا۔ ویسے یہ احساس کتنا خوب صورت ہوتا ہے کہ کوئی ہمارے بارے میں سوچ رہا ہے۔" وہ چاہت بھری آواز میں گویا ہوا۔

صفیہ کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا جواب دے بس اس نے خاموشی پر ہی اکتفاء کیا جب خاموشی کا وقفہ طویل ہو گیا تو صفیہ راز داری سے بولی۔ "سونا چاہئے اب، رات کافی ہوگئی ہے۔"

"کیا تم آرام سے سو سکتی ہو؟" لہجہ سوالیہ تھا۔

"ہاں، کیوں نہیں۔" صفیہ کے لہجے میں کھنک تھی۔

"ٹھیک ہے بھئی، ہم جیسے مردوں کی نیند اڑانے کے بعد تم جیسی حسینائیں بے فکری سے ہی سو جایا کرتی ہیں۔"

"یہ کس نے کہا آپ سے؟"

"کتابوں میں پڑھا ہے، ہسٹری یہی کہتی ہے، خوبصورت دوشیزائیں اپنی خوبصورتی کے جال میں محبوب کو قید کر کے آرام سے سو جاتی ہیں کیوں کہ وہ جانتی ہیں کہ محبوب اب ان کا اسیر ہو چکا ہے اور وہ سوئیں یا جاگیں، محبوب تو ان کے ایک اشارے کا منتظر ہوتا ہے اسی لئے آپ بھی سو جایئے۔" انتہائی معصومیت سے کہا گیا۔

"کون سی کتابیں پڑھتے ہیں آپ، میں نے تو کہیں ایسا نہیں پڑھا۔" صفیہ نے ہنستے

ہوئے پوچھا۔

''تمہیں اب کتابیں پڑھنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ تمہارے پڑھنے کیلئے اب میرا کتابی چہرہ ہی کافی ہے، سوئٹ ہارٹ۔''

''اچھا جی؟ مگر اس چہرے کو پڑھنے کیلئے تو آپ کے روبرو ہونا پڑے گا۔''

''ہاں، کیوں نہیں، کل ملو گی مجھ سے، میں تمہیں، تمہارے انسٹیٹیوٹ سے پک کرلوں بلکہ کل تم لنچ میرے ساتھ کرو گی؟'' اتنی جلدی پیشکش کی صفیہ کو امید نہیں تھی۔

''میں کل بتاؤں گی آپ کو۔ بے بی، کل میری ایکسٹرا کلاس ہو پھر مشکل ہو جائے گا۔'' اس کی نگاہوں میں یکدم امی کا چہرہ گھوم گیا۔ دیر سے آنے پر کیسا قہر نازل ہوتا ہے اس کی جان پر۔ وہ بے اختیار کانپ گئی۔

''اچھا جیسی تمہاری مرضی، ویسے کل میں انتظار کروں گا تمہارا۔'' وقار احمد نے انتہائی سنجیدگی سے کہا۔

''اچھا تو پھر میں اب سو جاؤں اگر آپ اجازت دیں؟''

''اوہ، یس مائی ڈیئر، او کے تو پھر گڈ نائٹ۔''

''جی شب بخیر۔'' صفیہ نے آہستگی سے کہا اور پھر لائن کاٹ دی۔

دوسرے دن اس کی معمول سے الگ تیاری اسے سب کی نظروں میں خاص بنا رہی تھی۔ اس کی کئی دوستیں اسے قابل ستائش نظروں سے دیکھتے ہوئے تعریفی جملے ادا کر چکی تھیں مگر اس کا دل اور اس کا سراپا صرف اس آواز کا منتظر تھا جس کے لئے وہ صبح سے ہی اس کش مکش میں مبتلا تھی کہ کون سے رنگ کا سوٹ زیب تن کرے اور اب سب کی تعریفی نظروں نے اسے قائل کر لیا تھا کہ وہ ایک دم پرفیکٹ نظر آ رہی ہے۔ اپنے مسٹر پرفیکٹ کے لئے۔ کلاس اٹینڈ کرنے کے دوران اس نے وقار احمد کو میسج کر دیا۔ ''آپ مجھے کب تک پک کریں گے؟''

جواب فوراً ہی موصول ہوا تھا۔ ''دو بجے تک۔'' صفیہ نے خود کو سنبھال کر پہلو بدلا کہ کہیں کپڑوں کی کریس خراب نہ ہو جائے۔ میک اپ تو لائٹ نہیں ہو رہا اور یہ بال جو آدھے گھنٹے کی محنت سے اسٹیٹنر سے سیدھے کئے ہیں، یہ تو صحیح سے تیز ہیں ناں! اب وہ بار بار

گھڑی میں وقت دیکھتی..... مگر ٹائم تھا کہ گزر نہیں رہا تھا اور پھر بڑی مشکل سے ڈیڑھ بجے صفیہ کی ساری دوستیں کینٹین کی طرف بھاگیں اور صفیہ نے انسٹیٹیوٹ کے مین ڈور کی جانب دوڑ لگا دی۔ پرس سے سن گلاسز نکال کر اس نے آنکھوں پر جمائے وہ یقیناً بہت خوبصورت لگ رہی تھی۔ آج تو ہر نظر اسے پلٹ کر دیکھ رہی تھی مگر اس کی نظریں موبائل فون پر تھیں۔ اچانک بجتی بیل پر اس نے کال ریسیو کر لی۔

"کہاں ہیں آپ؟ میں انسٹیٹیوٹ کے باہر آپ کا انتظار کر رہی ہوں۔" صفیہ نے جلدی سے سوال کیا۔

"ایسا کرو، انسٹیٹیوٹ سے آگے ایک ورک شاپ ہے گاڑیوں کی، وہاں تک آجاؤ..... میں بلیک مرسڈیز میں ہوں۔" یہ کہہ کر لائن کاٹ دی گئی اور وہ جلدی جلدی قدم اٹھاتی آگے بڑھتی چلی گئی۔

چمک دار سی بلیک کلر کی مرسڈیز کے سائیڈ گلاس سے اسے دیکھتا ہوا وقار احمد وجیہہ لگ رہا تھا۔ اس کے دیکھنے کا انداز مدہوش کن اور دل نشین تھا۔ صفیہ سائیڈ ڈور کھولتے ہی اس کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گئی۔

"ویلکم سوئٹ ہارٹ۔" بلیک سوٹ میں ملبوس وقار احمد خوش دلی سے بولا تھا۔ پرفیوم سے مہکی گاڑی اور اے سی کی ٹھنڈک نے صفیہ کے اندر طمانیت کا احساس بیدار کر دیا۔

"تھینک یو۔" اس نے وقار احمد کو بھرپور نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"بہت خوبصورت لگ رہی ہو۔" فرطِ محبت سے کہا گیا۔

"آپ کا حسنِ نظر ہے۔" صفیہ نے آہستگی سے کہا اور سائیڈ گلاسز پر لگے شیڈز کو تکنے لگی۔

"تمہاری خوب صورت جلد کو دھوپ کی تپش سے بچانے کا انتظام ہے۔" بایاں ہاتھ سینے پر رکھتے ہوئے سر کو ذرا سا خم دیا گیا۔ ایک دل فریب مسکراہٹ نے صفیہ کے چہرے کا احاطہ کیا۔ "پہلی ملاقات پر پہلی خواہش کیا ہے؟ کہاں چلنا چاہو گی؟"

"کہاں چلنا چاہو گی.....؟" صفیہ زیرِ لب بڑبڑائی۔ پھر اگلے ہی لمحے بولی۔ "کسی ریسٹورنٹ میں بھئی۔ لنچ کا وعدہ کیا تھا آپ نے۔" شوخی اس کے چہرے پر دمک رہی تھی۔

"جو حکم تمہارا" اور پھر تیز رفتاری سے چلتی گاڑی مختلف راستوں سے ہوتی ہوئی فائیو اسٹار ہوٹل کے سامنے رک گئی۔ "تم اترو میں گاڑی پارک کرتا ہوں۔" وقار احمد نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اچھا۔" وہ فخریہ انداز سے گاڑی سے اتری۔ شاہانہ گاڑی میں سفر کرنے سے آپ ہی شخصیت میں ایک رعب آجاتا ہے۔ خوامخواہ اترانے کو دل چاہتا ہے۔ شانوں پر دوپٹہ سجائے وہ بالوں کو سنوارتی وقار احمد کی منتظر تھی اور پھر قدرے توقف کے بعد وہ وقار احمد کے قدموں سے قدم ملاتی فائیو اسٹار ہوٹل کی سیڑھیاں چڑھ رہی تھی۔ اس نے تو کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ وہ اتنے شاندار ہوٹل میں کبھی لنچ کرنے آئے گی۔

"اب بولو سوئٹ ہارٹ کیا کھانا پسند کرو گی؟" اپنی ٹائی درست کرتے ہوئے وقار نے فرنٹ پاکٹ سے سگریٹ نکال کر سلگائی۔

"جو آپ منگوالیں۔" پھر اس نے حیرت سے سگریٹ کو گھورا۔

"یہ شوق بھی ہے آپ کو؟"

"ہاں، ہاں کیوں نہیں۔" تھرڈ کلاس ہیرو کی طرح صفیہ کے چہرے پر سگریٹ کا دھواں اڑاتے ہوئے وہ بولڈ انداز میں بولا تھا۔ "آخر کیا برائی ہے اس میں۔"

"برائی تو خیر بہت ساری ہیں لیکن مجھے اس کے دھوئیں سے متلی ہونے لگتی ہے۔ پلیز آپ اسے بجھا دیں۔" صفیہ نے التجائی انداز میں کہا۔

"اوہ ہو یار۔" بادل نخواستہ وقار نے سگریٹ ایش ٹرے میں بجھاتے ہوئے سوال کیا۔

"تمہارے پاس کتنا ٹائم ہے میرے لئے؟"

"کیوں؟" صفیہ نے حیرت سے سوال کیا تھا۔

"بھئی پوچھ رہا ہوں، تمہیں گھر کتنے بجے تک جانا ہے اگر ٹائم ہے تو ہم یہاں سے سی ویو چلتے ہیں؟"

"نہیں میں امی کو بتا کر نہیں آئی، مجھے گھر جلدی جانا ہوگا۔ زیادہ سے زیادہ پانچ بجے تک۔"

"تین تو بج ہی گئے ہیں۔ یہاں سے فری ہوتے ہوئے پانچ تو بج جائیں گے۔ چلو

او کے پھر کبھی سہی وقار نے رسٹ واچ پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

O......O......O

وقار احمد اب صفیہ کے لئے ضرورت بنتا چلا جارہا تھا۔ وہ کیا کر رہی ہے۔ کہاں جارہی ہے۔ کیا کھا رہی ہے ہر بات چاہے وہ صفیہ کی ذات سے وابستہ ہو یا اس کے گھر والوں سے۔ وہ ہر بات وقار احمد سے شیئر کرنے لگی تھی ۔ دوستی اتنی جلدی محبت میں بدل جائے گی صفیہ نے تو سوچا ہی نہیں تھا وہ انسٹی ٹیوٹ سے کلاس مس کرتی اور وقار احمد کے سنگ وقت گزارا کرتی۔ کبھی سی ویو کا کنارہ ہوتا، تو کبھی شاپنگ مال ۔ وقار احمد اس کی ہر خواہش کا احترام کرتا۔ مہنگی سے مہنگی شاپنگ وہ اپنا فرض سمجھتے ہوئے صفیہ کو کراتا ۔ جسے صفیہ مختلف بہانوں سے گھر لے آتی اور پھر شاید صفیہ کے بہانے اور صفیہ کا طرز عمل اس لئے گھر والوں نے نظر انداز کر دیا کہ صرف صفیہ ہی ان کے گھر میں نہیں تھی جس پر کڑی نظر رکھی جائے صفیہ کے علاوہ بھی اور بہن بھائی تھے جن کی اپنی اپنی ضروریات تھیں اور جنہیں پورا کرنے کیلئے صفیہ کے والدین کے پاس اتنے ذرائع نہیں تھے اور محدود ذرائع ہونے کے باعث بچوں سے لاتعلقی ان کے مزاج کا حصہ بن چکی تھی۔

O......O......O

"سنو تم کل انسٹی ٹیوٹ نہیں جانا"۔ وقار کا لہجہ معمول سے ہٹ کر جذباتی تھا۔

"مگر کیوں؟" صفیہ نے محبت سے مخمور لہجے میں پوچھا۔

"میں کل تمہیں اپنے ایک دوست سے ملانا چاہتا ہوں۔ تم تو جانتی ہو، میری فیملی پنجاب میں ہوتی ہے۔ یہ میرا دوست کل پنجاب جارہا ہے، وہاں امی ابو سے بھی ملے گا تم اگر کل اس سے مل لیتی ہو تو وہ تمہارے بارے میں امی ابو کو بتا دے گا اور میں اسی کے ہاتھ تمہاری تصویر بھجوا دیتا ہوں۔"

"کیا سچ"۔ صفیہ نے بے اختیار کہا۔

"ہاں جان تمنا' میرا دل چاہتا ہے کہ میں تمہیں جلد از جلد اپنے گھر لے آؤں' امی ابو تمہارے بارے میں جان کر تمہاری تصویر دیکھ کر ذہنی طور پر تیار ہو جائیں تو پھر تمہارے رشتے کیلئے میں انہیں جلد کراچی آنے پر قائل کروں گا۔" وقار قدرے سنجیدگی سے بول رہا تھا؟"

"تو کیا کل کلاس نہیں لوں؟" صفیہ کا دل عجیب سی کیفیت سے دو چار تھا۔ اس نے آہستگی سے سوال کیا۔

"ارے یار! اکرم گیارہ بجے نکل جائے گا۔ میں تمہیں مارننگ میں ہی پک کرلوں گا اور جیسے ہی تمہارا ٹائم آف ہوگا انسٹی ٹیوٹ کا، میں اسی وقت تمہیں گھر کے قریب چھوڑ دوں گا۔ باقی تمہاری مرضی۔" وقار احمد کا انداز یکلخت بدل گیا تھا اور پھر صفیہ نے گومگو کی کیفیت میں ہامی بھرلی۔

"سنو اپنی اچھی سی تصویر لیتی آنا۔" وقار احمد نے اصرار کیا۔

"جی لیتی آؤں گی۔" صفیہ نے خود کو آمادہ کرتے ہوئے وقار احمد کو جواب دیا۔

"چلو ٹھیک ہے پھر صبح ملاقات ہوگی، تم جلدی سو جانا۔" وقار احمد انتہائی محبت سے اسے سمجھاتا ہوا لائن کاٹ چکا تھا اور وہ دل ہی دل میں اپنی نئی زندگی کیلئے دعائیں کرتی البم سے تصویریں نکالنے لگی۔

O......O......O

گاڑی انجانے راستوں پر رواں دواں تھی۔ اسکول یونیفارم میں بچے وین کے منتظر تھے جبکہ ہشاش بشاش سوٹ بوٹ میں ملبوس کھڑے چہروں پر وقت پر پہنچنے کی فکر نمایاں تھی۔ وہ سائیڈ گلاس سے باہر کے منظر دیکھ رہی تھی۔ تیزی سے بھاگتے درخت تو ہمیشہ ہی اسے اٹریکٹ کیا کرتے تھے۔

"اف، ابھی تو دکانیں بھی نہیں کھلیں۔" اس نے حیرانی سے وقار کو دیکھا۔ "ہم کتنی جلدی نکلے ہیں آج۔"

"تمہیں کچھ چاہئے" وقار نے اس کے دائیں رخسار پر جھولتی بالوں کی ریشمی لٹ کو ہولے سے چھو کر جھٹکا دیا۔

وقار کی اس حرکت پر وہ ٹپٹا سی گئی۔ "نہیں تو بس یونہی لیکن ہم جا کہاں رہے ہیں؟" فکر کے سائے اب اس کے چہرے پر نمایاں نظر آرہے تھے۔

"ارے سوئٹ ہارٹ، دیکھتی جاؤ بس۔" یوٹرن سے گاڑی موڑتے ہوئے وقار احمد نے اسے دلاسہ دیا اور پھر کچھ ہی دیر میں ایک بڑی سی شاہراہ سے گزرتے ہوئے گاڑی

سیدھے ہاتھ پر موڑ لی اور ایک بہت ہی بڑے اور خوبصورت سے بنگلے کے آگے گاڑی پارک کر دی گئی۔

''چلو شاباش، جلدی سے اترو۔'' وقار احمد نے صفیہ کو پیار بھرا آرڈر دیا۔ صفیہ، وقار احمد کو شکایتی انداز میں دیکھتے ہوئے گاڑی سے اتر گئی۔

''آؤ میرے ساتھ۔'' وہ اسے اشارے سے قریب بلاتے ہوئے موبائل کان سے لگا چکا تھا پھر آہستگی سے اس نے کچھ بولا اور موبائل جیب میں رکھ لیا۔

ایک نوجوان نے مین ڈور کھولا۔ ''صفیہ، ان سے ملو، یہ میرے جگری دوست اکرم ہیں اور صرف یہ میرے ہی نہیں بلکہ میرے ابو کے بھی پسندیدہ ہیں۔'' صفیہ، اکرم سے خوش دلی کے ساتھ ملی اور اکرم، صفیہ کی تعریف کرتا ہوا دونوں کو اندر لے آیا۔

مشرق اور مغرب کی آرائش کے امتزاج سے مزین یہ ڈرائنگ روم خوبصورتی کا شاہکار تھا۔ نہایت ہی جدید اور مہنگے ترین فرنیچر کے ساتھ وہاں موجود تمام ڈیکوریشن پیس امپورٹڈ تھے۔ صفیہ نے سرسری انداز میں کمرے کا جائزہ لیا۔ وہ متاثر ہوتے ہوئے ایک آرام دہ صوفے پر بیٹھ گئی بلکہ تقریباً دھنس ہی گئی۔ اس کے مقابل اکرم اور وقار بیٹھے تھے۔ وقار نے صفیہ کی تصویر والا لفافہ اکرم کو پکڑا دیا۔ دونوں دوست آہستہ آہستہ ایک دوسرے کے کانوں میں کھسر پھسر کر رہے تھے۔ صفیہ کو سخت کوفت اور گھبراہٹ محسوس ہو رہی تھی۔

''اچھا تم دونوں گپ شپ کرو، میں ذرا کچھ لے آتا ہوں۔ کولڈ ڈرنک چلے گی؟ بیکری سے تو اس وقت یہی ملے گا۔'' اکرم نے سوالی نظروں سے وقار کو دیکھا۔

''ارے یار، سب چلے گا۔''

''چلو ٹھیک ہے۔'' اکرم گاڑی کی چابیاں اٹھاتے ہوئے مین ڈور کی جانب بڑھ گیا۔ صفیہ عجیب کشمکش میں مبتلا تھی۔ اکرم کے جانے کے بعد وہ مزید سمٹ سی گئی۔ اس نے شکوہ کناں نظروں سے وقار کو دیکھا۔ وقار لبوں میں مسکراہٹ دبائے اس کی جانب دیکھ رہا تھا۔ ایک بہت بڑا سوالیہ نشان اس کے چہرے پر نمایاں تھا اور پھر وقار نے انتہائی محبت سے اپنے دونوں بازوؤں کو وا کیا۔

''کم آن صفیہ، اعتبار نہیں کرتی ہو مجھ پر؟''

"خود سے بھی زیادہ لیکن ہمیں چلنا چاہئے اب۔" وہ وقار کے دونوں ہاتھ تھامتے ہوئے بولی۔ اندر کا ڈر اس کے چہرے کو ہونق بنا چکا تھا۔ جبھی اسے ٹھنڈے، ٹھنڈے پسینے آنا شروع ہو گئے تھے۔

"یار تم تو بہت ڈرپوک ہو، میرے ہوتے ہوئے بھلا کیا ڈر تمہیں۔" وہ صوفے پر صفیہ کی گود میں سر رکھ کے لیٹ گیا اور اس کے بالوں سے کھیلنے لگا۔

"پلیز وقار...." صفیہ نے اسے زبردستی اٹھایا اور خود بھی سنبھل کر بیٹھ گئی مگر وقار احمد اسے انتہائی ڈھٹائی اور پیار سے اپنی طرف کھینچتا رہا اور وہ مزاحمت کرتے کرتے وقار کے سامنے بے بس ہوتی چلی گئی۔

مین ڈور کی بجنے والی بیل پر وہ دونوں ہوش میں آئے۔

"اوہ اکرم آ گیا ہوگا۔ میں ڈور پر جا رہا ہوں۔ تم فریش ہو جاؤ۔" وقار اسے ہدایت دیتا ہوا کھڑا ہو گیا اور اپنی حالت درست کرتے ہوئے مین ڈور کی جانب بڑھ گیا۔

صفیہ اضطرابی انداز میں خلا میں گھورتی ہوئی برق رفتاری سے کھڑی ہو چکی تھی۔ اس کے اعصاب یکدم منتشر ہو کر یوں بکھر گئے تھے جیسے وجود کے اندر ہی کہیں بم بلاسٹ ہوا ہو اور اس دھماکے کے بعد اس کے وجود کے ریزے ریزے ہو گئے ہوں۔ وہ اس کرب سے دو چار دوپٹے کو چادر کی طرح لپیٹی کھڑی تھی۔

"چلو شکر ہے، وہ گیٹ سے ہی چلا گیا۔ بڑی مشکل سے اس کی سمجھ میں آیا ہے۔ کم بخت کی شادی جلدی ہو گئی ناں؟" وقار اپنی دھن میں کہتا کولڈ ڈرنک منہ سے لگائے غٹاغٹ پی رہا تھا اس وقت صفیہ کو وقار سے گھن آ رہی تھی۔ وہ روبوٹ کی مانند اٹھی۔ اس نے پرس اٹھایا اور تیزی سے راہداری عبور کرتے ہوئے گاڑی کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔ اعصاب شکن احساس نے اسے شدید ترین بے بسی میں مبتلا کر دیا تھا۔ انتہائی دل گرفتگی اور روہانسی آواز میں وہ التجا کر رہی تھی۔

"پلیز، مجھے میرے گھر چھوڑ دیں۔" وقار گاڑی کی چابی لئے اس کے سامنے کھڑا تھا۔

"چلتے ہیں، اتنا ہائپر کیوں ہو رہی ہو، کم آن یار، بی ایزی۔ دس از پارٹ آف لائف، بی بریو یار۔" وہ جلدی سے ڈرائیونگ سیٹ پر آ گیا اور اسے سمجھاتے ہوئے گاڑی پارکنگ ایریا

سے نکالنے لگا.... صفیہ سلگی سلگی نظروں سے وقار احمد کو گھورتی رہی۔ وہ بالکل اب روئی کہ تب روئی والی کیفیت سے دوچار تھی۔

''اوہ، ایک تو تم لڑکیاں جانے کیوں اتنی نازک ہوتی ہو۔ پلیز بی ریلیکس۔'' وقار نے اس کو چھیڑا۔

''پلیز مجھے گھر پہنچادیں، میں جلدی جانا چاہتی ہوں۔'' وہ منمنائی اور پھر جب گاڑی تیزی سے چلتی مانوس رستوں پر آگئی تو صفیہ نے ایک ٹھنڈی آہ بھری تھی گاڑی جیسے ہی گھر کے قریب رکی.....وہ وقار احمد سے بنا کچھ کہے ہی گاڑی سے اتر گئی۔

O......O......O

اگلے ایک ہفتے وہ شدید کرب میں گرفتار رہی، اس نے اپنا موبائل سوئچ آف کیا ہوا تھا اور نہ ہی اس میں اتنی سکت تھی کہ وہ انسٹی ٹیوٹ جاسکے۔ بس گھر میں ہی وہ گم سم بیٹھی رہی۔ اس کا دل چاہتا پھوٹ پھوٹ کر رو دے تو کبھی اس کا دل کرتا وقار احمد کا گلا گھونٹ دے۔ آج بڑی مشکلوں سے اس کے حواس بحال ہوئے تو اس نے ہمت کر کے موبائل آن کر دیا۔ موبائل آن ہوتے ہی وقار احمد کا میسج اسکرین پر نمودار ہوا۔

''اوہ خدایا....! اب یہ شخص کیا چاہتا ہے؟ وقار، تم اتنے گرے ہوئے ہوگے، میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔'' وہ بڑبڑاتی ہوئی میسج پڑھنے لگی۔

''میں اپنے کئے پر نادم ہوں صفیہ، امی ابو کو تمہاری تصویر بہت پسند آئی ہے۔ وہ تم سے ملنا چاہتے ہیں اگر تم رضامند ہو تو میں انہیں تمہارے گھر لے آؤں؟'' یہ پڑھتے ہی ایک پل میں صفیہ کی سوچوں کا رخ بدل گیا۔ شاید میں غلط تھی۔ وقار ویسا نہیں جیسا میں اس کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ صفیہ نے فوراً ہی وقار کو جواب دیا کہ'' پہلے میں اپنے امی، ابو سے ذکر کر لوں پھر آپ اپنے گھر والوں کو لے آئیے گا۔''

اس کے جواب میں وقار نے فوراً ہی کال کر لی۔ صفیہ کا موڈ قدرے بہتر تھا مگر وقار سے وہ لئے دیئے انداز میں گفتگو کر رہی تھی۔ ''اب مجھے تم یہ بتاؤ تم کب اپنی امی ابو سے بات کرو گی؟'' وقار نے سنجیدگی سے پوچھا تھا۔

''جی، جلدی کروں گی۔'' یہ کہہ کر صفیہ نے لائن کاٹ دی اور جب صفیہ نے گھر میں

اس بات کا ذکر کیا تھا تو سب ہی کے موڈ آف ہو گئے تھے۔ "کون ہے، کہاں سے آ گیا، اس لئے تمہیں اجازت دی تھی آگے تعلیم حاصل کرنے کی۔ جانتی تو ہو، ہم خاندان سے باہر رشتہ نہیں کرتے؟" یہ امی کے الفاظ تھے جو اس پر نشتر چلا رہے تھے۔

"مگر امی....! مجھے وقار پسند ہے۔ آپ بھی ملیں گی تو آپ کو بھی اچھے لگیں گے اور پھر کیا برائی ہے اس میں جب ان کے گھر والے رشتہ لے کر آ رہے ہیں ہمارے گھر؟" صفیہ نے ناراض لہجے میں کہا۔

"تمہارے ابا کو پتا چلے گا تو تمہاری ٹانگیں توڑ دیں گے۔" صفیہ کی والدہ نے غصے سے کہا۔ آج پورا گھر صفیہ کے خلاف باتیں کر رہا تھا اور صفیہ کو یوں لگ رہا تھا جیسے اس کی خوشیاں چنگاریوں کی طرح اڑ، اڑ کر بھڑکنے لگی ہیں۔

"میں کچھ نہیں جانتی، آپ سب کو میری خوشی کی خاطر رضا مند ہونا پڑے گا۔ اماں.....! میں بھی آسودہ زندگی کے خواب دیکھتی ہوں۔ میرا بھی دل چاہتا ہے اچھے سے گھر میں رہوں۔ بڑی سی گاڑی میں گھوموں۔ نت نئے ڈریس پہنوں، اچھے ہوٹلوں میں کھانا کھاؤں۔" آج اس کے اندر کی خواہشیں جیسے دبی ہوئی چنگاریوں کی طرح بھڑکنے لگی تھیں۔ "اماں میں کب تک ترستی رہوں گی۔ جب مجھے قسمت سے ایسا بر مل رہا ہے تو پھر واویلا کیوں۔ کیوں آفت مچا رکھی ہے آپ سب نے۔" وہ زور زور سے روتی ہوئی کمرے میں آ چکی تھی۔

O......O......O

اگلے دن صفیہ نے وقار احمد سے خود رابطہ کیا۔ وہ اس سے مل کر اپنے معاملات خود طے کرنا چاہتی تھی کیوں کہ وہ اپنی خاندانی روایات کے بارے میں اچھی طرح جانتی تھی۔ اس کے والد سخت روایتی قسم کے انسان تھے جو کبھی بھی اتنی آسانی سے اس کا ہاتھ ایک غیر لڑکے کو نہیں سونپ سکتے تھے۔

وقار ہم بتاؤ، مجھے کیا کرنا چاہئے؟ کیا تم مجھے کچھ وقت دو گے؟" اس نے التجائی انداز میں وقار کو دیکھا۔

"ہاں کیوں نہیں، لیکن جب تک تمہارے گھر والے راضی نہیں ہو جاتے تب تک تم مجھ پر یونہی ستم ڈھاتی رہو گی۔ پہلے ہی ایک ہفتے تم نے مجھے سزا کا مرتکب سمجھا حالانکہ وہ سب

کچھ تو ہمارے پیار کا حصہ تھا۔ تم میری شریک حیات بننے جا رہی ہو اور تمہیں ہی مجھ پر اعتبار نہیں۔" اس نے تاسف بھرے انداز میں صفیہ کو تکا۔

"نہیں بس وہ سب کچھ مجھے اچھا نہیں لگتا۔ محبت کے کچھ تقاضے ہوتے ہیں۔ کچھ کام اپنے وقت پر ہی اچھے لگتے ہیں۔"

"اوہ گاڈ۔" وقار نے اسے بیچ میں ہی ٹوک دیا۔ "پلیز صفیہ تم ایک پڑھی لکھی لڑکی ہو۔ روایتی لڑکیوں جیسی تو باتیں نہ کرو۔ اوہ کم آن۔" صفیہ نے خالی اس کے چہرے کو تکا جو ہر احساس سے عاری نظر آ رہا تھا۔ اس نے خاموشی سے نظریں جھکا لیں وہ کیا کرتی۔ مزاحمت کرتی تو وہ اسے چھوڑ ہی نہ دیتا۔ جانے کیوں اس کے والدین اس کی خوشی میں رکاوٹ بن رہے ہیں۔ اس کے دل میں پنپنے والی بدگمانیاں اور اداسیوں کا پودا تناور ہوتا جا رہا تھا۔

"کیا سوچ رہی ہو، چلو میرے ساتھ۔" وقار اسے گاڑی تک لے آیا۔ "یہ جان لو کہ تم میری ہو دنیا کی کوئی طاقت ہمیں جدا نہیں کر سکتی کیوں کہ تم میرے لئے بنی ہو، صرف میرے لئے میں تمہارے لئے ہر کسی سے لڑ سکتا ہوں مجھ پر اعتبار تو کرو پہلے۔ یقین کرو، میں تمہارے گھر والوں کو بھی راضی کر لوں گا۔" وقار جوش میں بول رہا تھا اور وہ بے یقینی کے عالم میں سنتی جا رہی تھی۔

"چلو گاڑی میں بیٹھو، تم اس وقت ذہنی طور پر اپ سیٹ ہو۔ زیادہ مت سوچو۔ وقار نے بڑی چاہت سے اس کے لئے گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ وہ خاموشی سے گاڑی میں بیٹھ گئی۔

"اپنے وقار پر تمہیں اعتبار نہیں؟"

صفیہ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"تو پھر ڈارلنگ، چلو میرے ساتھ، ہم اپنی لائف انجوائے کرتے ہیں، کیوں گھٹ گھٹ کر جئیں اور مریں ایسے لوگوں کے لئے جو ہماری خواہشات کی پرواہ ہی نہیں جو ہمارے احساسات کو ہی نہیں سمجھتے۔

صفیہ کے دل سے جیسے بوجھ ہولے سے سرک کر ہوا میں تحلیل ہو گیا۔ سچ تو ہے بے حس، بے مروت اور یکسر اپنی ذات میں رہنے اور اپنے ہی فیصلے کرنے والے ہیں، میرے والدین

جانے کیوں انہیں میری خوشی عزیز ہی نہیں؟ وہ خالی خالی نظروں سے وقار کو دیکھتی اور اپنے دل میں پلتی بدگمانیوں کو پرے کرتی وقار کے سنگ پھر اسی بنگلے میں آ گئی۔

عمدہ آرائش اور راحت کے ہر سامان سے مزین اس بلند و بالا عمارت میں اس کی ذات اور اس کی عزت اس کاٹھ کباڑ کی مانند ہو گئی جو رکھا ہوا بدنما تو لگتا ہے مگر اسے پھینکنے کا دل نہیں کرتا، اس کا بکھرا وجود مکمل طور پر وقار احمد کی دسترس میں تھا پھر تو یہ معمول بن گیا تھا۔ جب صفیہ گھر سے دلبرداشتہ ہوتی، وہ وقار احمد کے سنگ اس گھر کو اپنی جائے پناہ تصور کرتی اور وقار، صفیہ کو۔

O......O......O

آج صفیہ کے چہرے پر حقیقی خوشی تھی۔ اس کی ضد اور چہرے کی زردی نے اس کے گھر والوں کو راضی کر لیا تھا گو کہ رضامندی میں خوشی کم احسان کا عنصر زیادہ تھا مگر صفیہ کے حق میں فیصلہ سنایا جا چکا تھا اور جب صفیہ نے یہ خوشی کی خبر وقار کو سنائی تو وہ سٹپٹا گیا۔

"صفیہ تم نے گھر والوں کو راضی کرنے میں بہت دیر کر دی۔"

"کیا مطلب؟" صفیہ حیرانی سے چیخی اس کا سانس ایک لمحے کے لئے سینے میں گم ہو گیا۔

"میرا مطلب یہ ہے کہ امی، ابو کو تمہارے اور میرے تعلقات کے بارے میں پتا چل گیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ تم ایک بدکردار لڑکی ہو۔ یار، اب میں تمہیں کیا بتاؤں، ہماری ہر ملاقات کا ذکر اکرم نے گھر پر کر دیا ہے، سچ، میں تم سے بہت شرمندہ ہوں۔ میں تو تمہیں یہ بات بتانے ہی والا تھا مگر اس لیے چپ رہا کہ تم پہلے ہی پریشان ہو۔"

"تم پاگل تو نہیں ہو؟" تم میرے ساتھ اتنا برا سلوک کیسے کر سکتے ہو؟ وہ بری طرح چیخی، ہزار وا ہمے، تمام تر دبے خدشات اللہ اللہ کر اس کے اضطراب میں اضافہ کرتے جا رہے تھے۔

"وقار...... تم گھٹیا انسان ہو۔"

"تم پہلے اپنے حواس بحال کرو پھر مجھ سے بات کرنا۔ ابھی تم اپنے آپ میں نہیں ہو مجھے جو کہنا تھا، میں نے کہہ دیا۔" یہ کہہ کر وقار نے لائن کاٹ دی۔

صفیہ کا دل لحظہ بھر سینے کی دیوار میں لرز سا گیا۔اس خوف زدہ نظروں سے اپنے سراپے کو دیکھا جو کسی کھردری جھاڑی کی مانند اس کی روح کی زمین کو بنجر کر چکا تھا۔صفیہ نے اگلے ہی پل اپنے اعصاب کے تنے ہوئے تاروں کو ڈھیلا کرنے کی سعی کی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

O......O......O

لٹنے کے غم سے جب صفیہ آزاد ہوئی تو اسے احساس ہوا کہ اب تو بہت دیر ہو چکی ہے۔ ایک بھونچال وہ ذہن و دل میں لئے وقار احمد کی تلاش میں نکل گئی۔وقار نے اب اپنا ٹھکانا ہی نہیں سم بھی چینج کر دی تھی اور پھر وہ وقار ہی کے ایک دوست کے ذریعے اس کے آفس تک پہنچ گئی۔

"ذلیل انسان.... ایک لڑکی کی زندگی برباد کر کے تُو اتنے آرام سے کیسے زندہ رہ سکتا ہے؟"صفیہ پورے اسٹاف کے سامنے اس کے روبرو تھی۔

وقار کو صفیہ کے اتنے شدید ردعمل کی امید نہیں تھی۔وہ ٹپٹائے لہجے میں مخاطب ہوا۔" تم غلط سمجھ رہی ہو، میں پریشان تھا۔میرے ساتھ ٹریجڈی ہوئی ہے اور اسی وجہ سے مجھے وہ گھر اور جاب چھوڑنی پڑی۔"

"تم پھر جھوٹ بول رہے ہو۔تم پھر مجھ سے کھیل رہے ہو۔میں کھلونا نہیں ہوں۔ صفیہ نفرت انگیز لہجے میں چیخی۔

وہ صفیہ کو کھینچتا ہوا آفس سے باہر لے آیا۔

"آخر تم چاہتی کیا ہو؟ میری یوں بے عزتی کرنے کا تمہیں کوئی حق نہیں۔"

"میں کچھ نہیں جانتی، تم مجھے ٹشو پیپر کی طرح استعمال کرتے رہے اور اب تم نے مجھے خالی ڈبے کی مانند اٹھا کر باہر پھینک دیا ہے، آخر کیوں؟ میری محبت میں کہاں کمی تھی؟ عورتوں سے اس طرح کا سلوک تم مردوں کا وطیرہ ہوگا مگر ہمارا نہیں۔ہماری عزت ہمارے لئے سب کچھ ہے جو میں داؤ پر لگا چکی ہوں۔"اس کے اپنے ہی الفاظ اس کے ذہن پر ہتھوڑے کی مانند برس رہے تھے۔"تم مجھ سے لاتعلق کیسے ہو سکتے ہو؟ ذہنی اور دلی رشتے کیا فقط جسموں کے ملن کے متلاشی ہوتے ہیں یا پھر میرے لئے صرف اور صرف ناپاک عزائم تھے تمہارے

دل میں؟ اس کے چہرے کے تاثرات اسے اضطراب میں دھکیل رہے تھے۔

"اچھا آؤ میرے ساتھ۔" وقار اسے سمجھاتے ہوئے آفس سے کار پورچ تک لے آیا تھا۔

"چلو گاڑی میں بیٹھو، میں تمہیں گھر چھوڑ دوں۔" شاید وہ صفیہ کی بے باکی سے ڈر گیا تھا۔

"دیکھو، میں تمہارے خلاف پولیس میں کمپلین کر دوں گی۔ تم نے مجھے دھوکا دے کر اچھا نہیں کیا۔" وہ زخمی شیرنی کی طرح بپھری ہوئی تھی۔

"صفیہ، یقین جانو میں پریشان تھا مگر میں تم سے اب بھی محبت کرتا ہوں۔ کیا ہوا اگر امی، ابو راضی نہیں ہم نکاح کر کے یہیں اسی شہر میں رہ لیں گے مگر تم مجھے سنبھلنے کا تو موقع دو۔ جو کچھ میل کچیل تھی تمہارے دل میں میرے لیے، وہ تو تم نکال ہی چکی ہو۔ اچھا ہی ہوا میں بھی جان گیا کہ ہمارا صرف اور صرف نفرت کا رشتہ تھا اور ہمارے رشتے میں نفرت تم نے پیدا کی ہے۔"

وقار غصے میں آہستہ آہستہ غرا رہا تھا۔

"اب لفاظی کا وقت نکل چکا ہے۔ مجھ سے نکاح کرو گے؟" صفیہ نے حتمی فیصلہ اس سے سننا چاہا۔

"ہاں بابا...... یہ بات ہم آرام سے بھی کر سکتے تھے۔"

"تو چلو میرے ساتھ۔ میں آج ہی نکاح کرنا چاہتی ہوں۔" صفیہ نے فیصلہ کن انداز میں اپنی بات مکمل کی۔

"آج ہی.....؟" وقار کے چہرے پر حیرانی کا تاثر تھا۔

"ہاں آج اور ابھی۔" صفیہ کے لہجے میں چبھن تھی۔

"ٹھیک ہے جیسی تمہاری مرضی۔ گاڑی میں بیٹھو، میں کرتا ہوں انتظام مولوی کا۔" پھر وہ کتنی دیر تک نمبر ملاتا رہا اور مختلف نمبروں پر بات کرتا رہا۔ صفیہ خاموشی سے گاڑی میں بیٹھی اس کی منتظر تھی۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد وقار ڈرائیونگ سیٹ پر آ گیا۔

"اکرم سے بات ہو گئی ہے اس نے کہا ہے کہ ہم گھر میں اس کا انتظار کریں وہ مولوی

صاحب کو وہیں لے آئے گا اور بطور گواہ اکرم ہی ہمارے نکاح نامے پر دستخط کرے گا۔"

میں کیسے یقین کرلوں؟" صفیہ نے بے یقینی سے سوال کیا۔

"یہ لو بات کرو۔" وقار نے اکرم کا نمبر ملا کر موبائل صفیہ کو دے دیا۔

"جی صفیہ بہن آپ نکاح کے لئے تیار رہئے گا۔ میں ایک گھنٹے تک مولوی صاحب کو لے کر پہنچ جاؤں گا، انشاء اللہ۔" دوسری جانب اکرم نے بڑے تحمل سے جملہ ادا کیا اور لائن کاٹ دی۔

صفیہ اور وقار ایک بار پھر اس بنگلے میں قدم رکھ رہے تھے۔ صفیہ نے نفرت انگیز نگاہ اس بنگلے پر ڈالی اور کرب کی شدت دور کرنے کیلئے اپنی کنپٹیوں پر انگلیاں رکھ لیں ابھی وہ سنبھل ہی پائی تھی کہ وقار احمد اپنے اصل روپ میں اس کے سامنے آ گیا۔ وہ صفیہ کو کھینچتا ہوا کمرے میں لے آیا۔

"اپنے آپ کو بہت بہادر سمجھتی ہے۔ ابھی نکالتا ہوں تیری بہادری۔"

"دیکھو تم مجھے ہاتھ نہیں لگاؤ گے۔" صفیہ نے خوف کے عالم میں دیوار کا سہارا لیا۔

"میں نے تو تجھے عزت سے چھوڑ دیا تھا مگر تجھے عزت راس نہیں آئی۔ اب میں تجھے بتاتا ہوں کہ تیری اوقات کیا ہے؟" وقار نے صفیہ کا دوپٹہ کھینچتے ہوئے کاٹ دار لہجے میں کہا اور ایک بار پھر وہ جلاد بن گیا مگر آج صفیہ بے بس نہیں تھی۔ اس کے نازک اندام وجود میں جانے کہاں سے بجلی کوندی۔ اس نے برق رفتاری سے اپنی قمیض کے دامن میں چھپا چاقو وقار کے پیٹ میں گھونپ دیا۔ وقار احمد اس اچانک حملے کیلئے تیار نہیں تھا وہ فوراً ہی گر گیا۔ صفیہ اس کے پیٹ میں چاقو گھونپتی رہی اور چیختی رہی پھر اس نے بیڈ شیٹ زمین پر بچھائی اور اس میں وقار احمد کو لپیٹا اور ایک کاغذ کی چٹ اس نے وقار احمد کی گٹھڑی کی مانند بنی نعش پر لگائی جس پر لکھا تھا۔ "بے وفائی کا انجام۔" صفیہ خود کو سنبھالتی اور سمیٹتی ہوئی بنگلے سے باہر نکل آئی۔ رات کا اندھیرا صفیہ کا نقاب بن گیا تھا اور وہ اپنے ٹوٹے پھوٹے وجود کو گھسیٹتی ہوئی گھر آ گئی۔

O......O......O

پولیس نے جب کورنگی کی رہائشی صفیہ کو گرفتار کیا تو وہ بہت پر سکون دکھائی دے رہی تھی

، پریشانی یا خوف کی کوئی علامت اس کے چہرے پر نہیں تھی ۔ تفتیش کے دوران پولیس کے ہرسوال کا جواب اس بات کا غماز تھا کہ صفیہ کے نرم و نازک سراپے میں برپا طلاطم تھم چکا ہے۔ قتل کے اس بھیانک واقعے کے بارے میں کیوں اور کیسے کے ہر سوال کے جواب میں صفیہ کی گرج دار آواز گونجتی اور وہ چیخ کر کہتی .... ''ہاں، میں نے قتل کیا ہے۔ وقار جیسے ہوس کے بھیڑیے معاشرے کا ناسور ہیں ۔ یہ لوگ لڑکی کو نازک اندام، پھول کی کلی اور نا جانے کون کون سے القابات سے نوازتے ہیں تا کہ لڑکی کو کم تر، بزدل اور ڈرپوک ثابت کیا جائے ۔ انسپکٹر صاحب، میں ڈرپوک نہیں ہوں۔ پھانسی کے پھندے کو مالا کی طرح گلے کا ہار بنانے کیلئے تیار ہوں ۔ آپ کاروائی کیجئے ۔ میں نہیں ڈرتی وقار جیسے ایک ہزار وقار بھی میرے سامنے آجائیں تو میں انہیں قطار میں کھڑا کر کے توپ کے گولے والے بارود کی طرح پھٹ جاؤں گی...... کاش ! اے کاش میرے وطن کی تمام بیٹیاں میری طرح کی سوچ اپنا لیں تو وقار جیسے گھناؤنے کرداروں کا ہمیشہ ہمیشہ کیلئے خاتمہ ہو جائے۔

☆......☆......☆

تڑپتی روحوں کا نوحہ

مجھے اپنا بچپن اچھی طرح سے یاد ہے جب میں خواب دیکھتی اور خوف سے اپنی والدہ کے پہلو میں دبک جایا کرتی تھی۔اسی خوابیدہ حالت میں مجھے دھکیل کر اپنے آپ سے جدا کرتیں اور میں سسکیاں لے کر دوبارہ ان کی پناہ میں جانے کی کوشش کرتی۔ معلوم نہیں ،میرے لاشعور میں وہ کون سا خوف تھا جو آج دل ودماغ میں پختہ ہو چکا ہے؟

میں نے اپنی آنکھیں بند کرلیں ۔ دو آنسو بے قاعدہ اپنے سفر پر روانہ ہوئے۔ دل مضطرب انجانے احساس سے دھڑکنے لگا۔ جانے کیوں کبھی کبھی یہ اداس راتیں میرے اندر عجب اضطراب پیدا کردیتی ہیں اور میں وسوسوں کا شکار ان راتوں سے نبرد آزما ہوتی ہوں اور آنکھیں بند کیے سکون کی منزل تک پہنچنے کی سعی کرتی رہتی ہوں۔ میرے لیے یوں راتوں کو بے قرار ہونا کوئی نئی بات نہیں۔

آج بھی جب رات کی ٹھنڈی ہوا میرے کمرے کا پردہ سرکاتی ہے تو مجھے لگتا ہے جیسے کوئی روح اندر آنے کی کوشش کر رہی ہے۔ مگر میرے جسم کی روح سے اس کی ملاقات ممکن نہیں کیوں کہ میری اپنی روح میرے جسم میں پابند ہے اور پھر میں کتنی دیر تک صرف اس لئے نہیں سو پاتی کہ جب میں نیند کی دیوی کے سینے پر سر رکھے مدہوش ہو جاؤں گی تو میری روح اس روح سے ملے گی اور اگر وہ روح میری روح کو اپنے ساتھ لے جائے اور عالم بالا میں قید کر لے تو میں یہاں کیا کروں گی؟ کیا دنیا گھومنے والا میرا خواب، خواب ہی رہ جائے گا اور

سفر کی خواہش رکھنے والی میری روح کا سفر کیا قبرستان کی دہلیز پر ختم ہو جائے گا؟

حالانکہ میں یہ بھی جانتی ہوں کہ یہ سب کچھ خواب و خیال کی دنیا ہے لیکن اس کی وضاحت شاید اتنی آسان نہیں،ایک ہلچل ایک تڑپ،انجانا خوف ، مقابلے کا جذبہ سب کچھ میرے اندر موجود ہے۔جس کے اظہار کے لئے نہ میرے پاس الفاظ ہیں اور نہ جذبات۔

بچپن تو بچپن تھا، انجانے خوف میں نا معلوم وہ کون سی پُر اسرار قوت تھی جو مجھے خوف زدہ کیے رکھتی تھی لیکن اب تو میں شعور کے اس دور میں ہوں جہاں پُر اسراریت اپنے معنی کھو چکی ہے۔لیکن شاید میرے گردونواح میں رونما ہونے والے ہولناک واقعات،سڑکوں اور گلیوں میں خودکش دھماکوں میں مرنے والے بے گناہ افراد کے اعضاء،معصوم بچوں اور خواتین کی خون میں لت پت لاشیں ، غربت کی ماری ماؤں کے ہاتھوں اجتماعی خودکشی کا شکار ہونے والے معصوم بچوں کی روحیں میرے خوف کی اصل وجہ ہیں۔لیکن بچپن کا خوف اور آج کا خوف دو ایسی متضاد حقیقتیں ہیں جنہیں صرف میں ہی محسوس کر سکتی ہوں۔

میں نے انجانے خوف کی شدت سے اپنی آنکھیں کھولیں،شوریدہ ہوائیں لان سے ہوتی ہوئیں میرے کمرے کے دروازے پر دستک دے رہی تھیں۔طوفانی ہواؤں کے ہاتھ دروازے کو مسلسل پیٹ رہے تھے۔ میں نے دروازے کی درز سے باہر جھانکا، مجھے یوں لگا جیسے کوئی سفید کپڑوں میں ملبوس سر سامنے سڑک پر چلتا آ رہا ہے۔جس کا چہرہ آشنا سا ہے۔مگر جسم سفید لٹھے میں لپٹا ہے۔میرا لاشعور مجھے جھنجوڑ رہا ہے کہ یہ کوئی روح ہے مگر میں اپنے شعور کی اس بات سے منکر ہوں ۔ وہ سر جوں جوں میرے گھر کے قریب آتا جا رہا ہے۔ مجھ پر عجیب وحشت طاری ہوتی جا رہی ہے اور مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے میری آنکھوں کا پانی خشک ہو گیا ہو، ہواؤں کی شدت بڑھ گئی ہے اور پھر بجلی کی زوردار کڑک لکیر کی مانند میری دہلیز چھوتی ہوئی زمین میں دفن ہو گئی۔روشنی اتنی تیز تھی کہ میری آنکھیں چندھیا سی گئیں اور پھر جب میں نے آنکھیں کھولیں تو وہ سفید لبادے میں ملبوس وجود میرے سامنے کھڑا تھا۔میرے حلق کی چیخیں کہیں اندر دب چکی تھیں اور میری سانسیں میرے وجود میں سسک رہیں تھیں اور میں اندر ہی اندر خود سے محوِ گفتگو تھی۔

میرے شہر کی کہانی...... ارم زہرا

"ڈاکٹر شاکر......! ڈاکٹر شاکر......!" میری بڑبڑاہٹ پر اچانک ہی وہ روح غائب ہو گئی۔ موت، زندگی کی سب سے بڑی حقیقت ہے جسے آنسوؤں میں ڈبویا نہیں جا سکتا مگر ایسی موت جو زبردستی کسی کا مقدر بنائی جائے تو..... میں نے پیشانی پر آئے پسینے کے قطروں کو انگلی کے پور پر لیا۔

دس سال ہو گئے اس واقعہ کو، ڈاکٹر شاکر کو ان کے کلینک پر گولیوں کا نشانہ بنا دیا گیا تھا۔ ایک مسیحا کا جنازہ کفن میں ملبوس اسی سڑک سے قبرستان کی جانب جا رہا تھا اور میں اپنے دروازے پر کھڑی اسے دیکھتی رہ گئی۔ وقت گزر گیا مگر میرے دل میں ڈر بیٹھ گیا اور ہر رات جب میرا بدن تھکن سے آزاد ہوتا ہے اور دل بے بس ہوتا ہے، تب میں ڈاکٹر کی روح اسی سڑک پر پریشان حال دیکھتی ہوں۔

"کیا وہ روح مجھے اپنے قاتلوں کے بارے میں بتا سکتی ہے؟" اگلے ہی پل میرے دماغ کے کسی گوشے میں یہ سوال سرسرایا۔ میں بھاگتی ہوئی داخلی دروازے پر آ گئی اور تیزی سے دروازہ کھول دیا۔ باہر کوئی بھی نہیں تھا، ڈاکٹر کی روح بھی نہیں، شاید مجھے اسے ڈھونڈنا چاہئے۔ میں خود کلامی کرتے ہوئے آگے بڑھنے لگی اسی سڑک پر جہاں وہ روح کچھ دیر پہلے اپنی بے بسی کا ماتم کر رہی تھی۔ میرے قدم میکانکی انداز میں آگے اور آگے کی جانب رواں تھے میں اپنے ہی قدموں کی چاپ سن رہی تھی اور میرا دل اس تال پر دھڑک رہا تھا کہ اچانک گلی کا موڑ کاٹتے ہی ایک خوبصورت نوجوان میرے سامنے آ گیا۔

"اف خدایا.....!" درد کی شدت سے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ پتھرائی آنکھوں کی نمی آنچل میں جذب کرتی میں اس شہزادے کو دیکھ رہی تھی جس کے سینے سے لہو ابل رہا تھا۔

"نعمان بھائی! آپ بھی بھٹک رہے ہو؟" میں چیخ چیخ کر پوچھنا چاہ رہی تھی مگر میری آواز میرے رندھے گلے میں گھٹ چکی تھی یا شاید یہ اس بات کی گواہی تھی کہ میں ایک انسان ہوں۔ نعمان بھائی کے سینے سے نکلنے والا لہو کا فوارہ ان کی مذہبی افکار اور روشن خیالی کی سوچ کا عکس تھا۔ کیا یہاں اپنے حق کی تلاش کے لئے ہر ابھرتا سورج ایسے ہی گولیوں کے نشانے پر غروب ہو جایا کرتا ہے؟

گلی کے تاریک گوشوں سے کچھ سائے میری جانب بڑھنے لگے تو میں گھبرا کر بھاگی۔عجب بھیانک آوازیں تھیں۔ جیسے مڑ کر دیکھوں تو لہو میں نہا جاؤں......

''تڑ.... تڑ.... تڑ.... تڑ.... ''گو میں ان آوازوں سے مانوس ہوں۔مگر میں لہو میں نہانا نہیں چاہتی۔ میں دہشت زدہ سی نامعلوم سمت کی طرف چلی جا رہی ہوں۔''کیا میں اپنی موت سے خوف زدہ ہوں؟'' میں نے خود سے سوال کیا مگر میرے الفاظ میرے سوال کی آگ سے راکھ ہو گئے۔

''نہیں، نہیں تو..... '' میں نے خود کو جواب دیا مگر اچھا ہی ہوا، یہ لمحے جلد مر گئے۔اگر وہ تڑتڑاتی گولیاں میری زندہ لاش کو چھلنی کر دیتیں تو..... تو یقیناً کل کا سورج اپنے کاندھوں پر میرا جنازہ لے کر طلوع ہوتا۔میری سوچیں لفظوں کے پیراہن میں ڈھل رہی ہیں اور میں اپنے لفظوں میں چھپی اندر ہی اندر گھلتی چلی جا رہی ہوں۔میرے ہی گولی جیسے الفاظ میرے نازک احساسات کو کبھی مجروح کرتے ہیں تو کبھی مرہم بن رہے ہیں۔

برگد کے بڑے سے پیڑ کے ساتھ میں کھڑی تھی۔ سڑک دور تک بل کھاتی نظر آ رہی ہے اور میں اس سڑک پر اپنے مرے ہوئے قدموں کو اٹھاتی آگے بڑھنا چاہتی ہوں کہ دفعتاً میں نے دیکھا، برگد کے پیڑ کے نیچے چار پائی پر سرنگ چادر اوڑھے کوئی بڑے اطمینان سے سو رہا ہے مگر اس کے سرہانے بیٹھی عورت فضا کو اپنی چیخوں سے جھنجوڑ رہی ہے۔

'' آخر یہ کیوں اتنا چیخ رہی ہے اور چار پائی پر یہ کیسی نیند ہے جو اتنی دردناک چیخوں سے بھی آنکھیں نہیں کھولتی؟''

میں نے بچپن میں پڑھا تھا اور سنا بھی تھا کہ درختوں پر آسیب ہوتے ہیں اور رات وہ آسیب مختلف شکلوں میں خود کو ڈھال کر راہ گیروں کو تنگ کرتے ہیں۔ میں بہت ڈری ہوئی ہوں۔اور خود کو وہاں سے چھپاتے ہوئے گزرنا چاہتی ہوں۔میں نے اپنی چال میں بجلی بھرنے کی کوشش کی مگر میرے قدم جیسے زمیں نے جکڑ لئے تھے۔

'' ہائے میرا جوان چاند.... !میری عمر بھر کی کمائی.... '' اس عورت کے بین حساسیت کو مردہ کرنے کے لئے کافی تھے۔ مجھے ایک پل کو اپنے خلوص اور نرم مزاجی پر شبہ سا ہونے لگا۔

''کیا ہوا اس کے بیٹے کے ساتھ؟'' میرے ہونٹوں سے سوال پھسل گیا۔

''مار گئے ظالم.... یہ دنیا ظالم ہے..... ظلم کرتی ہے..... معلوم نہیں کس کی گولی کا نشانہ بنا میرا لختِ جگر؟ اسی سال تو اٹھارہ برس کا ہوا تھا۔ اب تو اس قابل ہوا تھا کہ میرے خوابوں میں حقیقت کا رنگ بھرتا، ہائے میرا دل.... ! ہائے میرا جوان....!'' کائنات کا سارا درد اس دکھیاری ماں کے جملوں میں سمٹ آیا تھا۔

''اوہ خدایا...... ! ماں کے حسین خوابوں کی لاشیں بھی بیٹے کی نعش پر قربان ہو گئیں۔ ایک پل کو میرا دل چاہا' اپنے دونوں ہاتھوں کی گرفت اپنے گلے پر مضبوط کرلوں اور خود کو ختم کرلوں مگر میرے سامنے موت کی دیوی کھڑی مسکرا رہی ہے اور کہہ رہی ہے۔ میں تو اس ماں پر بھی مہربان نہیں ہوئی جو اندر سے مر چکی تھی۔ میں یہاں سے بھاگ جانا چاہتی ہوں ۔ مجھے میرا گھر یاد آرہا ہے۔ میرا وہ کمرہ جہاں کچھ دیر پہلے میں اپنے احساس سے کھیل رہی تھی' اپنی حساسیت کا سر اپنے کاندھوں پر رکھے اس کے آنسو پونچھ رہی تھی' شاید سڑک کسی چوک سے آکر ملی ہے۔ میں نے مٹی سے اٹے اپنے پیروں کو غور سے دیکھا اور پھر اس ہجوم کو جہاں تاحدِ نظر ہیولے ہی ہیولے تھے' چوک کے اطراف ساکت سڑکوں پر روحوں کا اجتماعی جلوس نظر آرہا تھا۔ میں بے دھڑک اس مقتل کا حصہ بن گئی ہوں۔ میرا چہرہ تاثر سے عاری ہے۔ مجھے روحوں کا اجتماعی جلوس سڑکوں پر سرگرداں نظر آرہا ہے۔ جن کی کان پھاڑ دینے والی آوازیں زندہ جاوید انسانوں سے سوالات کر رہی ہیں۔

ایک بھٹکی ہوئی روح مجھ سے پوچھ رہی ہے۔ 'میری ماں کس حال میں ہے؟' کہیں سے آواز آتی ہے۔ 'میرے بچوں کا کیا بنے گا؟' اف خدایا...... ! میرے چاروں طرف بے قرار روحیں رقصاں ہیں۔ یکا یک چار معصوم چہرے ابدی نہیں' عارضی نیند سوتے ہوئے محسوس ہو رہے ہیں۔ ان کے ساتھ ان کی ممتا کی روح بھی زندہ جاوید انسانوں کے بے حس رویئے پر نوحہ کناں ہے۔ معصوم روحیں ماں سے پوچھ رہی ہیں۔

''مما.... ! آپ غریب تھیں، آپ غربت کی ماری تھیں تو ہمارا کیا قصور تھا؟ آپ نے ہمیں زہر کا انجکشن کیوں لگایا؟ ابو سے جھگڑے کی بنیاد ہم تو نہیں تھے پھر آپ نے یہ قدم

کیوں اٹھایا؟ اپنی دنیا بھی گنوا دی اور ہم سے ہمارا بچپن بھی چھین لیا؟"

روحوں کی تڑپتی ہوئی آوازوں نے میری جیتی جاگتی دنیا کو جہنم میں بدل دیا ہے۔ ہر طرف شعلے ہی شعلے ہیں اور آگ کا ایسا الاؤ ہے کہ جس میں میرا جسم بھسم ہونے کو ہے۔ میں روحوں کے جم غفیر میں گھری ہوئی ہوں اور ان میں بعض روحوں کے چہرے بھی شناخت کرنے کی کوشش کر رہی ہوں۔

ہاں، وہ نوجوان، یہ اسی کی روح ہے جو ایک نہتی لڑکی سے موبائل فون چھیننے کی کوشش کر رہا تھا، اسی دوران پولیس آگئی، فائرنگ کا تبادلہ ہوا اور آناً فاناً یہ نوجوان زندگی کی قید سے آزاد ہو گیا۔ معلوم نہیں، اس کی کیا مجبوری تھی جس نے اسے رہزن بنا دیا؟ اب اس کی روح بشر کے تعاقب میں ہے اس نوجوان کا چہرہ بار بار میری نظروں کے سامنے گھوم رہا ہے۔ جب میں ناگن چورنگی کے اسٹاپ پر کھڑی تھی، تب میں نے یہ منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا، سڑک پر تڑپتا ہوا اس کا جسم آج بھی میری نظروں میں گھوم جاتا ہے۔

روحوں کے اس غول میں کس کس کا ذکر کروں؟ کس کس کو تلاش کروں؟ صبح دم اخبار ہاتھ میں تھامتی ہوں تو ہر سطر میں مجھے ایک بے چین، تڑپتی ہوئی، بلکتی ہوئی روح نظر آنے لگتی ہے۔ میری حالت اب کچھ یوں ہوگئی ہے، میرا دم اب نکلے کہ تب نکلے.....

میں ان بے قرار روحوں سے پیچھا چھڑانا چاہتی ہوں جنھوں نے میری صبح و شام کو قید کر دیا ہے۔ میں اپنے آپ کو ہر وقت خون کے الاؤ میں جلتا ہوا محسوس کرتی ہوں۔ ایوان اقتدار، ارباب اختیار، حاکم اعلیٰ سب سے میری زندہ جاوید روح یہ سوال کرتی ہے کہ روحوں کے تڑپنے کا یہ کھیل کب ختم ہوگا؟ کیا انہیں امام مہدی کا انتظار ہے یا حضرت خضر علیہ السلام کا؟ امام مہدی آئیں تو حکمرانوں کو سیدھی راہ دکھائیں گے یا حضرت خضر آئے تو بھٹکی ہوئی روحوں کو راہ دکھائیں گے۔

کیا ہوگا، کب ہوگا، مجھے نہیں معلوم۔

لیکن ایک دن یہ ضرور ہوگا کہ میری روح بھی جسم کی قید سے آزاد ہونے کے بعد روحوں کے اس جم غفیر میں صدائے احتجاج بلند کر رہی ہوں گی۔

آج کے اس سائنسی دور میں روحوں کے بارے میں میرے یہ تصورات کچھ عجیب بات نہیں لیکن کیا کروں، اپنی تمام تر روشن خیالی اور سائنسی افکار کے باوجود انسانوں کی تڑپتی، مچلتی ہوئی یہ روحیں مجھے ہی نہیں، ہر درد دل رکھنے والے انسان کو تڑپاتی رہیں گی۔ اگر کوئی بے حس، بے درد ہے اور بنی نوع انسان سے غافل ہے، اس کے احساسات مردہ ہو چکے ہیں، وہی ان روحوں کے وجود سے انکار کر سکتا ہے، وہ خود کش بمبار تو ہو سکتا ہے، انسان نہیں، وہ دہشت گرد روحوں کی بھینٹ لینے کا عادی ہوتا ہے نہ اس کے افکار مذہب پر مبنی ہیں اور نہ سائنس پر۔ میں پھر بھی تڑپتی روحوں کے اس احتجاج میں اپنی صدائے احتجاج شامل کرتی رہی ہوں اور کرتی رہوں گی اس لئے کہ مجھ سے ان تڑپتی روحوں کی تڑپ دیکھی نہیں جاتی۔ مجھ میں اور ان روحوں میں یہی تو قدرِ مشترک ہے کہ جو انسان زندہ نہیں اور زندہ رہنا چاہتے ہیں، ان روحوں کو بھی ان کی فکر ہے اور میں بھی ان کے لئے فکر مند ہوں۔

☆......☆......☆

تاریک راہوں کے مسافر

جیل کا نام ذہن میں آتے ہی خوف و وحشت ذہن پر سوار ہو جاتی ہے۔ اس کے باوجود میں خواتین کی جیل کے مرکزی دروازے پر کھڑی تھی۔ قریب ہی ایک چار سال کی بچی موجود تھی جسکا ہاتھ ایک پولیس کانسٹیبل نے سختی سے تھاما ہوا تھا۔ پولیس کے ہاتھ میں اس بچی کا ہاتھ دیکھ کر میرے ذہن میں ہتھکڑی کا خیال آیا۔ میں بچی کے قریب گئی اور پولیس کانسٹیبل سے پوچھا۔

''کیا یہ بچی قیدی ہے؟''

پولیس اہلکار نے اپنی روایتی شک بھری نظر سے مجھے سر سے پاؤں تک گھورا.... وہ مجھے دیکھ رہا تھا اور میں بچی کو۔ بچی نا معلوم کب سے رو رہی تھی؟ صرف اس کے حلق سے سسکیاں نکل رہیں تھیں، آنکھیں خشک تھیں۔ میں نے اپنا سوال دہرایا۔

''اس بچی کا کیا جرم ہے؟''

پولیس اہلکار ایسے چونکا جیسے دہکتے انگارے پر اس نے اپنا پاؤں رکھ دیا ہو۔'' جی، جی، جی نہیں، میں اس بچی کو اس کی ماں سے ملانے لایا ہوں، اس کی ماں قاتل ہے۔ اس ظالم نے اپنی پانچ ماہ کی بیٹی کو بیٹے کی خواہش میں قتل کر دیا۔ میاں بیوی گرفتار ہو گئے۔ اعتراف جرم بھی کر لیا ہے، یقیناً انہیں سزا بھی ہو جائے گی لیکن اس معصوم بچی کو ظالم ماں باپ نے حالات کے تھپیڑوں کی نظر کر دیا ہے۔''

ایک پولیس والے کے لبوں سے ہمدردی کے یہ الفاظ سن کر میں حیرت زدہ رہ گئی اور سوچنے لگی کہ یہ پولیس اہلکار بھی تو کسی کا بھائی، کسی کا بیٹا اور کسی کا باپ ہوگا؟

یکلخت اس پولیس والے نے اس بچی کا ہاتھ میرے ہاتھ میں تھما دیا اور پھر میرے کانوں میں پولیس اہلکار کی آواز آئی۔

''یہ ماں کی ممتا اور باپ کی شفقت سے محروم ہے۔آپ تھوڑی دیر کیلئے اس کا ہاتھ تھامے رکھیں، شاید اس کی تڑپتی ہوئی معصوم روح کو کچھ دیر کیلئے سکون مل جائے۔''

میری آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔ میں نے معصوم بچی سے پوچھا۔'' بیٹا....! کیا ہوا تھا؟''

''امی نے قتل کر دیا....'' بچی نے سہمے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

''کس کو؟'' میں خوفزدہ سی ہوگئی۔

''بے بی کو۔''

''بے بی کون تھی؟''

''میری بہن''۔

''کیوں قتل کیا تمہاری امی نے اسے؟'' میں نے اسے خود سے قریب کرتے ہوئے پوچھا۔

''بے بی بھوکی تھی، بار بار روتی تھی۔ امی اور ابا اسے چپ کراتے تھے مگر وہ چپ نہیں ہوتی تھی۔ ابا نے اسے مار دیا۔'' بچی نے رحم طلب نظروں سے میری جانب دیکھتے ہوئے بات مکمل کی۔

''پھر کیا ہوا؟'' میرے لہجے میں درد نمایاں تھا۔

''پھر.... پھر ابا اور اماں نے کمرے میں قبر کھود کر بے بی کو دبا دیا۔''

''آہ....'' ایک درد کا طوفان میرے دل سے گزر گیا۔ اسی دوران مرکزی جیل کا دروازہ کھلا اور بچی کا نام پکارا گیا بچی اور پولیس کانسٹیبل میری نظروں سے اوجھل ہو گئے لیکن ایک طوفان تھا جو میری رگ و جاں میں بپا تھا۔

میں جیل کے دروازے پر کسی سچی کہانی کی تلاش میں آئی تھی، سوچا تھا، جیل کے ارباب اختیار سے ملوں گی، قیدیوں سے ان کی داستانِ حیات پوچھوں گی چونکہ یہاں تو ہر کردار ایک کہانی لئے پھر رہا ہے مگر اب ایک معصوم بچی نے جو اپنی قاتل ماں سے ملنے آئی تھی، جھنجوڑ کے رکھ دیا تھا اور مجھے جیل کے عقوبت خانے میں جانے سے قبل ہی ایک ایسی لرزہ خیز کہانی مل گئی تھی جو ہمارے معاشرے کے چہرے پر بھرپور طمانچہ ہے۔ اب میں نے اس بچی مریم کی ماں سے فوراً ملنے کا فیصلہ کیا، سو جیل کی انتظامیہ کو اپنی آمد کا مقصد بتایا، ضابطے کی کاروائی مکمل ہوئی اور پھر میں سلاخوں کے سامنے کھڑی تھی۔

جیل کی سلاخوں کے پیچھے ایک عورت مجسم سوال تھی، آنسو اس کی آنکھوں میں تھے۔ اور کرب اس کے چہرے پر۔ خلاؤں میں گھورتی وہ عورت بے بسی کی تصویر نظر آ رہی تھی۔

''آپ کا نام ثناء ہے؟'' میں نے اسے مخاطب کیا۔

''ہاں۔'' بے حس لہجہ اس بات کا غماز تھا کہ وہ اپنے بارے میں بتا بتا کر تھک چکی ہے۔

''میں آپ کے بارے میں، آپ سے جاننا چاہتی ہوں۔ ابھی تک میں نے آپ کے بارے میں اخبارات میں پڑھا ہے۔ کیا ہوا تھا آپ کے ساتھ؟'' میں نے ہمدردانہ رویہ اختیار کیا اور اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ اگلے ہی پل وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی، شاید ہمدردی کے الفاظ اس کے لئے اجنبی بن چکے تھے مگر میرے رویے نے اس کے ضبط کو لمحوں میں توڑ دیا۔ اس نے اپنے سرد لہجے کو دل کے کرب سے پگھلانا شروع کیا اور ٹوٹے پھوٹے لفظوں، سسکیوں میں جو کچھ ثناء نے بیان کیا، وہ کہانی کی صورت میں آپ کے سامنے پیش کرتی ہوں۔

ثناء کی یہ سرگزشت ہمارے معاشرے کی پیشانی پر کالک سے کم نہیں، سوچتی ہوں، آج ہم ترقی یافتہ دور میں زندگی بسر کر رہے ہیں، دنیا گلوبل ولیج بن چکی ہے، آج میڈیا اور کمپیوٹر کا دور ہے ہر چیز کا حصول با آسانی ممکن ہے۔ آج کا انسان تحقیق کو ترجیح دیتا ہے، کیوں، کیسے اور کیا وجہ ہے، کی بنیاد پر بات کرتا ہے، روشن خیالی نے اپنی جگہ بنالی ہے، تو ہم پرستی اور

دقیانوسیت، یہ ساری باتیں آج کے دور میں ختم ہو چکی ہیں، شاید میں ایسا ہی سمجھ رہی تھی مگر ہمارا آج، آج بھی دقیانوسی بیڑھی پہنے ہوئے ہے اور توہم پرستی آج بھی ہم پر راج کر رہی ہے۔

O......O......O

خلا میں کسی غیر مرئی نقطے کو گھورتی شاہ نے اپنی آنکھیں یکدم بند کر لیں اور جب اس نے آنکھیں کھولیں تو آنسو تواتر سے اس کے گالوں پر بہنے لگے۔ ''میرا دوسرا بیٹا بھی مر گیا۔ تیری ماں جادو کرتی ہے، جادو، وہ نہیں چاہتی ہے کہ ہمارے ہاں بیٹا پیدا ہو۔'' میرے شوہر ندیم نے نفرت انگیز لہجے میں کہا۔

''ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟'' میں نے درد بھری آواز میں پوچھا۔ ''میری ماں کوئی میری دشمن تھوڑی ہے اور پھر وہ کیوں جادو کرنے لگی؟''

''میں کچھ نہیں جانتا، کل ہی میرے پیر صاحب نے پڑھائی کرنے کے بعد مجھے بتایا ہے، وہ کہتے ہیں، تیرے سسرال والے کالا جادو کرتے ہیں جس کی وجہ سے تیرے بیٹے پیدا ہوتے ہی مر جاتے ہیں.... '' ندیم نے اندر کا زہر اگلا۔

''مگر میرے گھر والوں کو اس سے کیا فائدہ ہوگا؟'' میں نے آہستگی سے کہا۔

''وہ تو ہیں ہی سدا کے میرے دشمن، نہیں چاہتے ہوں گے کہ میری نسل آگے بڑھے۔'' ندیم کا لہجہ کاٹ کھانے کو دوڑ رہا تھا۔

''مگر.....'' میں منمنائی۔

''اگر مگر میں نہیں جانتا، تیری بھلائی اسی میں ہے کہ تُو میرا ساتھ دے ورنہ اپنی ماں کے گھر چلی جا۔'' اسی دوران میری چار سالہ بیٹی مریم میری گود میں آکر بیٹھ گئی۔ میں نے بیٹی کے گالوں پر پیار کیا۔

''امی بھوک لگ رہی ہے۔'' مریم نے معصومیت سے التجا کی۔ میں نے بچی کو گود سے نیچے بٹھایا اور کچن کی طرف جانے لگی۔

''دیکھ، میں صحیح کہہ رہا ہوں، میرے دو بیٹے اس آگ میں جل گئے جو تیرے گھر

والوں نے میرے گھر میں لگائی ہے۔"

"کون سی آگ؟" میں نے حیرت سے دیکھا۔

"کالا جادو کرتے ہیں وہ، انہوں نے میرے گھر میں ہی نہیں میرے دل میں بھی آگ لگا دی ہے۔

"تمہارا دماغ خراب ہوگیا ہے۔" میں غصے سے چیخی۔

"بس کل ہی تم میرے ساتھ عمل کرو گی۔ پیر صاحب نے مجھے بتایا ہے کہ تمہارے سسرال والے جادو کرتے ہیں جس کی وجہ سے تمہارے بیٹے پیدا ہوتے ہی مر جاتے ہیں اور یہ کالا جادو تیری بیوی پر کیا گیا ہے۔ اب ہم دونوں اس کالے جادو کا توڑ ڈھونڈیں گے۔" ندیم نے مجھے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

O......O......O

"میں تجھے صاف بتا رہا ہوں کہ ہمیں پیر صاحب کی بات پر ہر صورت میں عمل کرنا ہے۔" دو بیٹوں کی موت نے میرے شوہر ندیم کو اندھا کر دیا تھا اور ہر احساس سے عاری بھی۔

"میں تمہاری بتائی ہوئی کسی بھی بات پر عمل نہیں کروں گی کیونکہ مجھے ان سب باتوں پر یقین نہیں ہے۔" میں نے نہایت سخت لہجے میں کہا۔

"ٹھیک ہے تو میں فضیلت کو اپنے ساتھ لے جا رہا ہوں۔" ندیم نے بیڈ سے میری پانچ ماہ کی بیٹی فضیلت کو اٹھاتے ہوئے کہا۔

"اس کو تم کہاں لے کر جا رہے ہو؟" میں نے خوف زدہ ہو کر اس سے بچی کو چھیننا چاہا۔

"میں اسے پیر صاحب کے پاس لے جا رہا ہوں، مجھے خواب میں بشارت ہوئی ہے میرے پیر صاحب کا بلاوا آیا ہے کہ اپنی چھوٹی بیٹی کے ساتھ ہمارے پاس حاضری دو۔"

"مگر وہ اس کے ساتھ کیا کریں گے؟ اور کہاں ہیں تمہارے پیر صاحب؟" میں نے اپنے رکے ہوئے سانس کو بحال کرتے ہوئے پوچھا۔

"غور سے سن، میرے پاس کچھ وظیفے ہیں، جنہیں میں بتائی گئی تعداد کے مطابق پڑھتا ہوں، وظیفے پڑھتے پڑھتے نیند کی آغوش میں چلا جاتا ہوں اور پھر مجھے پیر صاحب کی زیارت ہوتی ہے۔انہوں نے ہی مجھے بتایا ہے کہ تُو اور تیری بیوی کالے جادو کی لپیٹ میں ہے اور اس کے لئے مجھے چلہ کاٹنا پڑے گا اور جیسے ہی تیرا چلہ مکمل ہو جائے گا، تجھ پر سے کالے جادو کے اثرات ختم ہو جائیں گے۔"

میں جو نہایت خوفزدہ سی شوہر کی بات سن رہی تھی، یکدم بولی۔"تمہارے پیر صاحب یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے دونوں بیٹے کالے جادو سے ہی مرے ہیں؟"

"دیکھ، ایک تو دونوں بیٹوں کی موت پیدائش کے فوراً بعد ہوئی تھی اور دوسرے بیٹے کی پیدائش کے بعد تجھے یاد نہیں، تیری کیسی پاگلوں جیسی حالت ہوگئی تھی تُو بڑبڑاتی رہتی تھی کہ کوئی میرے بیٹے کو چھیننے والا ہے تُو خود ہی تو کہتی تھی کہ ایسا لگتا ہے، کوئی پُراسرار قوت میرے بیٹے کو چھیننے کی کوشش کر رہی ہے۔"

"ہاں، یہ بات تو بالکل صحیح ہے۔" میں نے ندیم کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"بس نیک بخت، مان جا۔ میں نے کچھ قرآنی نسخے، وظیفے وغیرہ پیر صاحب سے لے لئے ہیں۔ اگر تو رضا مند ہو جاتی ہے تو ہم آج رات ہی یہ عمل شروع کر دیں گے۔ پیر صاحب خواب میں آئیں گے اور ہمیں آگاہ کرتے رہیں گے کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ اس طرح ہم اپنے بیٹوں والی خواہش بھی پوری کر سکیں گے۔"

ندیم نے قائل کر دینے والے انداز میں بات مکمل کی تو میں نے خاموشی سے نظریں جھکا لیں اور پھر اگلے ہی لمحے میں خود کو شوہر کے بتائے گئے منصوبے کے لئے تیار کر چکی تھی۔

"تو پھر دونوں بچیوں فضیلت اور مریم کی قسم کھا کہ تُو اپنی بات سے نہیں پھرے گی تو اس چلّے میں آخر تک میرا ساتھ دے گی تو مجھ سے وعدہ کر۔" ندیم نے جذباتی انداز میں مجھے کاندھوں سے پکڑ کر جھنجھوڑا۔

"ہاں، میں وعدہ کرتی ہوں۔" میں نے ننھی فضیلت کو گود میں لیتے ہوئے کہا۔

اگلی ہی رات ندیم نے مجھے وظیفے کے بارے میں بتایا تھا کہ اس وظیفے کے پڑھنے کے

بعد مجھے خواب میں پیر صاحب نظر آتے ہیں، اب تجھے بھی نظر آئیں گے اس لئے پوری یکسوئی کے ساتھ ہمیں وظیفہ پورا کرنا ہے اور اگر اسے بیچ میں چھوڑ دیا تو اس سے ہمیں ہی نقصان ہوگا اور ذرا سوچ، اگر یہ وظیفہ ہم پورا کر لیتے ہیں تو ہمارے ہاں بیٹوں کی پیدائش آسان ہو جائے گی"۔

ندیم بار بار مجھے بیٹوں کا لالچ دے رہا تھا اور پھر بالآخر اس نے کمرے میں اگر بتی جلائی تھی اور لوبان کی دھونی دی۔ کمرے میں اگر بتی کے دھوئیں سے بنتے مرغولے اور لوبان کی خوشبو نے ماحول کو عجیب پُر اسرار بنا دیا تھا میں بہت سہمی سہمی تھی پھر میں نے ندیم کے بتائے گئے طریقے سے وظیفہ پڑھنا شروع کر دیا تھا۔ ہم دونوں میاں بیوی کی آنکھیں بند تھیں اور ہمارے لب مسلسل ہل رہے تھے کہ اچانک ننھی فضیلت نے زارو قطار رونا شروع کر دیا تھا۔ بچی کے رونے کی آواز سن کر میری ممتا جوش مارنے لگی تھی۔ میں نے وظیفہ پڑھنا ترک کر دیا تھا اور فضیلت کو گود میں اٹھا کے ٹہلنے لگی تھی میرے اس عمل پر ندیم نے مجھے نحوست بھرے انداز میں گھورا تھا، اس کا سانس بری طرح پھول چکا تھا اور غصے کی شدت سے وہ ہانپ رہا تھا اس کی محنت خاک میں مل چکی تھی کیونکہ میں نے وظیفہ بیچ میں چھوڑ دیا تھا۔

"یہ تُو نے کیا کیا؟ میں نے تجھ سے کہا تھا ناں کہ وظیفہ بیچ میں نہیں چھوڑنا؟"

"میری بچی رو رہی تھی۔" میں نے فضیلت کے ماتھے کا بوسہ لیتے ہوئے کہا۔ میری آنکھ سے گرتے دو آنسو فضیلت کے بالوں میں جذب ہو گئے۔

"لیکن میں نے تجھے سمجھایا تھا کہ....." ابھی ندیم جملہ مکمل کر ہی رہا تھا زور وشور سے ہوائیں چلنے لگیں، لوبان اور اگر بتی کی مہک پورے کمرے میں پھیل چکی تھی اور شوریدہ ہوائیں کمرے میں موجود چیزوں کو اپنی لپیٹ میں لیتی ہوئی فضیلت اور مریم کی جانب بڑھنے لگیں۔ میں نے تیزی سے فضیلت کو اپنی بانہوں میں چھپایا جبکہ ہواؤں کی شدت اتنی زیادہ تھی کہ میں مریم کو اپنے نرغے میں لئے بستر سے زمیں پر آ گئی۔ ندیم نے گھبرا کر مریم کو رسی کی مدد سے ایک کرسی پر باندھ دیا اسی اثناء میں میں فضیلت کو دوپٹے کی مدد سے بیڈ پر باندھ چکی تھی ہواؤں کے وہ جھکڑ اتنے زوردار تھے کہ ہمارے ہاتھ کام نہیں کر پا رہے تھے۔ فضیلت

اور مریم ہمارے حصار سے نکلے جا رہی تھیں اور ہوائیں ان کو چھیننے پر مصر تھیں اور ہم دونوں خوف سے بے ہوش ہو گئے تھے اور پھر بے ہوشی کے عالم میں ہمیں ایک غیبی آواز نے جھنجھوڑ دیا۔

''تُو نے وظیفہ مکمل نہیں کیا، اب تیری بیٹیوں کو کوئی نہیں بچا سکتا۔ اگر اپنی بیٹیوں کی جان پیاری ہے تو چالیس روز کا چلہ کاٹ، خاموشی سے وظیفہ مکمل کر، چالیس روز تک روزے رکھ، کھانا پینا بند کر اور گھر کا دروازہ مت کھول اور خبردار، جو کسی سے ملنے کی کوشش بھی کی....''

غیبی آواز کی خاموشی کے ساتھ ہی ہم دونوں کی آنکھیں کھل گئیں تھیں۔ اب میرا رو رو کے برا حال تھا۔ کبھی میں پانچ ماہ کی فضیلت کو چومتی تو کبھی مریم کو گلے لگاتی اور زور زور سے چیختی۔ ''میری دونوں بیٹیوں کو کچھ نہیں ہوگا۔ میری دونوں بیٹیاں ہمیشہ سلامت رہیں گی۔'' ندیم کے ہوش و حواس کچھ بحال ہوئے تو وہ پاگلوں کی طرح گھر کا داخلی دروازہ بند کرنے بھاگا جو ہواؤں کے زور سے کھل چکا تھا۔

''دیکھ یہ سب تیری غلطی کی وجہ سے ہوا ہے تُو اگر وظیفہ بیچ میں نہیں چھوڑتی تو یہ سب کچھ نہیں ہوتا۔'' اس کے ساتھ ہی ایک زناٹے دار تھپڑ میرے گال پر پڑا۔

''میری کیا غلطی ہے اس میں؟'' ڈر کے باعث میرے منہ سے سسکیاں نکل رہی تھیں۔ ''میں نہیں کروں گی اب یہ عمل۔ میری بچیاں.... '' میں ٹوٹے پھوٹے لفظوں کے جملے بناتی زار و قطار رو رہی تھی۔

''اگر تو یہ وظیفہ اب مکمل نہیں کرے گی تو وہ پراسرار طاقت ہم سے ہماری دونوں بچیاں چھین لے گی۔'' ندیم نے التجائی انداز سے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''نہیں، میں کچھ نہیں جانتی۔'' میں نے دیوانہ وار بچوں کو دیکھا، مریم جو کرسی کی پشت سے بندھی ہوئی تھی، اس نے رونا شروع کر دیا، خوف کے سائے اس کے چہرے پر لہرا رہے تھے اور وہ امی....! امی.....! کی گردان کرتی روتی جا رہی تھی۔ میں بے اختیار آگے بڑھی اور کرسی سے بندھی مریم کو دیوانہ وار پیار کرنے لگی۔ آنسو میری آنکھوں سے رواں تھے اور میرے جسم پر لرزے کی کیفیت طاری تھی۔

''دیکھ، تیری کیفیت پھر ویسی ہی ہو رہی ہے جیسے پہلے ہوا کرتی تھی۔ یاد کر، تیری اس کیفیت میں جانے کے بعد ہی ہمارے دونوں بیٹے ہم نے کھو دیئے۔'' ندیم نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھامتے ہوئے کہا۔

''نہیں، نہیں، کچھ نہیں ہوگا میری بچیوں کو۔'' میں ہذیانی انداز میں چلاتے ہوئے شدت غم سے رو رہی تھی۔

''تو پھر تو خود کو سنبھال اور دوبارہ چلہ مکمل کرنے کیلئے تیار ہو جا، حوصلہ رکھ، کچھ نہیں ہوگا اب کے۔'' ندیم نے نرمی سے مجھے منانے والے انداز میں سمجھایا تھا۔

''میں اپنی بیٹیوں کیلئے کچھ بھی کر سکتی ہوں، کچھ بھی۔'' میں نے چار سالہ مریم کو گلے لگاتے ہوئے کہا۔

''چل، جلدی سے اٹھ جا، دوبارہ چلہ شروع کرتے ہیں، ورنہ ہوائیں اگر واپس آ گئیں تو سب کچھ ہمارے ہاتھوں سے نکل جائے گا۔'' ندیم نے مجھے مضبوطی سے اپنی جانب کھینچا۔

''مگر میری بچیاں ابھی بھوکی ہیں اور... '' میں نے ابھی جملہ مکمل بھی نہیں کیا تھا کہ ندیم غرایا۔

''دیکھ، پیر صاحب نے کہا ہے، اگر ذرا بھی دیر ہوئی تو بچوں سے ہاتھ دھونا پڑیں گے۔ چل، جلدی سے اٹھ جا۔'' ندیم نے میرا ہاتھ پکڑ کے کھینچا اور چلے والی جگہ پر آ گیا۔

وظیفہ پوری یکسوئی کے ساتھ شروع ہو چکا تھا۔ ہم دونوں میاں بیوی کی پوری توجہ وظیفہ پڑھنے پر مرکوز تھی۔ اس دوران ہمارے کانوں میں دونوں بچیوں کے رونے اور بلکنے کی آوازیں آتی رہیں مگر ہم دونوں بے رحم بن چکے تھے۔ جیسے ہر احساس سے عاری ہوں۔ بچیاں روتی رہیں، تھک کے سو گئیں پھر بھوک کی شدت سے اٹھ گئیں مگر ہماری آنکھیں بند رہیں اور ہم خاموشی سے وہ عمل کرتے رہے اب تیز ہواؤں کا سلسلہ ایک بار پھر سے شروع ہو چکا تھا۔ اس کے ساتھ ہی مجھ پر گھبراہٹ طاری ہونا شروع ہو گئی تھی۔ ہواؤں کے جھکڑ جوں ہی چلنا شروع ہوئے، میرے کانوں میں ایک آواز گونجی۔

''وظیفہ جاری رکھ، ان ہواؤں کی پرواہ نہ کر۔'' اور پھر اچانک شدید ہوا اور بجلی کے جھٹکے

نے پانچ ماہ کی فضیلت کو زمین پر پٹخ دیا۔ میں اور ندیم دونوں ہی دیوانہ وار بچی کی جانب لپکے۔ہم نے بہت کوشش کی کہ فضیلت آنکھیں کھول دے مگر ہمارا فعل بے سود رہا اور آخر فضیلت مرگئی۔ اس دوران میں چار سالہ مریم کی چیخیں اور رونا کہیں اندر دب چکا تھا، بس اب وہ سسکیاں لے رہی تھی، نقاہت اس کے وجود پر طاری تھی، خوف اس کی آنکھوں میں نمایاں تھااور پھر وہ بے ہوش ہوگئی، صدمہ بہت گہرا تھا مگر دوسری بچی کو بچانے کا جذبہ مجھے جلد ہی ہوش میں لے آیا۔ننھی فضیلت کی لاش بیڈ کے بیچوں بیچ پڑی تھی اور ہم دونوں میاں بیوی حیرت کی تصویر بنے پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔

عجب بے بسی کا عالم تھا۔فضیلت کو موت گلے لگائے بیڈ پر پڑی تھی جبکہ مریم خوف کی تاب نہ لاکر کرسی کی پشت سے بندھی بے ہوش ہو چکی تھی۔

''عمل دوبارہ شروع کر، فضیلت زندہ ہو جائے گی....''

ہمیں ایک بار پھر اس غیبی آواز نے جھنجھوڑا تھا۔

ہماری آنکھیں لاشعوری طور پر ایک بار پھر بند ہوگئی تھیں اور عمل شروع کر دیا گیا تھا۔ ہم تیز تیز آواز میں وظیفہ پڑھ رہے تھے۔غم و بھوک سے نڈھال ہمارے وجود کمزور پڑتے جارہے تھے مگر پیر صاحب کا غیبی حکم تو گویا پتھر پر لکیر تھا۔ ہم خاموشی سے پڑھائی میں مگن رہے مگر فضیلت زندہ نہ ہوئی اور گزرتے وقت کے ساتھ اس کی نعش سے تعفن اٹھنے لگا، نعش پھولتی جارہی تھی اور ماحول میں سڑاند بھرتی جارہی تھی۔

اب ہم دونوں میاں بیوی پر خوف طاری تھا کہ کہیں محلے والوں کو خبر نہ ہو جائے۔ ہم دونوں اسٹور روم میں بھاگے اور کھدائی شروع کردی پھر جیسے تیسے ہم نے فضیلت کی نعش کو زمیں کھود کر دفنا دیا کہ مبادا محلے میں کسی کو خبر نہ ہو جائے۔

اب ہم دونوں کا سارا دھیان چار سالہ مریم پر تھا جو کرسی کی پشت سے بندھی ہوئی تھی۔ دو دن گزر جانے کے باعث بھوک کی وجہ سے اس پر نیم بے ہوشی طاری تھی مگر ہم دونوں پیر صاحب کا حکم ماننے پر مجبور تھے اور ایک بار پھر تمام تر ہمتوں کو مجتمع کر کے عمل شروع کرنا چاہتے ہی تھے کہ دروازے پر زور زور سے دستک ہوئی مگر ہم دونوں اپنی جگہ سے ہلے نہیں،

ڈٹے بیٹھے رہے اور ساتھ ہی اور زیادہ بلند آواز میں وظیفہ پڑھنے لگے اور پھر یکدم ہی دروازہ توڑ دیا گیا اور ایک جلوس کی شکل میں لوگوں کی آمد ہوئی۔

''یہ تو پولیس آئی ہے۔'' میرے منہ سے بے اختیار نکلا تو ندیم بدحواس سا کھڑا ہو گیا اور پولیس نے ہمیں گرفتار کر کے تفتیش کرنا شروع کر دی۔

O......O......O

سلاخوں کے پیچھے ثناء کی ہچکیاں بندھ چکی تھیں اپنی داستانِ عبرت پر وہ خود خون کے آنسو بہا رہی تھی۔

میں سوچتی ہوں، پولیس کی تفتیش مکمل ہو جائے گی۔ یقیناً ثناء اور ندیم اپنے کیے کی سزا بھگتیں گے، شاید انہیں سزائے موت ہو جائے یا انہیں عمر قید کی سزا سنا دی جائے گی مگر کیا یہ سزائیں ہمارے معاشرے کو توہم پرستی، ضعیف الاعتقادی سے نجات دلا سکیں گی؟

کورنگی میں پیش آنے والا یہ واقعہ جہالت، توہم پرستی کی ایسی مثال ہے جس پر جتنا بھی ماتم کیا جائے کم ہے۔ دنیا آج خلاؤں میں پہنچ چکی ہے، کرۂ عرض کے خزانوں کے بند دریچے توڑ ڈالے ہیں، سائنس عقل کو حیران کر دینے والے کارنامے انجام دے رہی ہے، لڑکیاں ان کامیابیوں اور کامرانیوں میں مردوں کے شانہ بشانہ ہیں مگر بدقسمتی سے ہمارا معاشرہ کہاں کھڑا ہے، ہم تو ابھی تک چلے کاٹ رہے ہیں، بیٹا دینے کا وعدہ کرنے والے پیر فقیر والدین کے بچوں کو ہی کاٹ دینے کا حکم دے رہے ہیں، فاقہ کشی پر مجبور کر رہے ہیں اور بدبخت ہیں وہ لوگ جو ان احکامات کی بجا آوری کرتے ہیں۔

میرے شہر کراچی میں جنم لینے والی اس چشم کشا کہانی نے عیاں کر دیا ہے کہ ہم ترقی یافتہ قوموں سے سینکڑوں برس پیچھے رہ گئے ہیں، ہمیں تاریک راہوں کا مسافر بنا کر ہم سے شاید جینے کا حق چھینا جا رہا ہے۔

☆......☆......☆

یہ ہیں زندگی کے دُشمن

نادر سے میری ملاقات سول اسپتال کے ایمرجنسی وارڈ میں ہوئی ہے.... وہ سندھ کے ایک اندرونی دیہات سے اپنی شدید بیمار بیوی کو علاج کے لئے کراچی اپنے ایک رشتہ دار کے پاس لایا تھا..... اس رشتہ دار نے نادر کو ایک بنگالی بابا کے چکر میں ایسا ڈالا کہ ..... وہ بے چارہ کہیں کا بھی نہیں رہا..... میرے شہر کراچی میں جنم لینے والی یہ کہانی آپ نادر کی زبانی ہی سنئے جسے الفاظ کا روپ میں نے دیا ہے۔

میں نے اس گھر کو غور سے دیکھا، گلی میں داخل ہوتے ہی سیدھے ہاتھ کے پانچویں نمبر پر یہ مکان واقع ہے۔ مکان کی حالت کافی خستہ سی نظر آرہی ہے۔ لیکن اسے سفیدی کروا کے قدرے بہتر کر دیا گیا ہے۔ ساٹھ گز کے اس مکان کا دروازہ اتنا چھوٹا ہے کہ اندر جانے کے لئے سر جھکا کر دروازے میں داخل ہونا پڑتا ہے۔ کالے رنگ کے داخلی دروازے کے دائیں جانب والی دیوار پر جلی حروف میں لکھا ہوا ہے۔

''عملیات کے ماہر، جادو ٹونے کا توڑ، محبوب آپ کے قدموں میں، گھریلو ناچاقی، ساس بہو کا جھگڑا، قرض کی ادائیگی، اولاد کا نہ ہونا، بچوں کی شادی، آپ کی ہر پریشانی کا تسلی بخش علاج، صرف اور صرف بنگالی بابا کے پاس۔'' بڑی تلاش کے بعد آج اپنے دُور کے رشتے دار سلیم چنا کی رہنمائی میں، میں اس در تک بھی پہنچ گیا تھا۔ ''یقیناً رضیہ یہاں سے صحت یاب ہو کر لوٹے گی''۔ میں منہ ہی منہ میں بڑبڑایا تھا مگر میری آواز سلیم چنا کے کانوں تک پہنچ گئی

تھی۔

"ہاں یار، ضرور، صبر کر۔ انشاء اللہ یہ بنگالی بابا بہت پہنچے ہوئے ہیں اور میرے آزمائے ہوئے ہیں، تُو بس انتظار کر، میں ابھی ان کے پاس حاضری دے کر آتا ہوں، ساتھ ہی تیرے بارے میں بھی بتا کر آتا ہوں پھر تُو دیکھ لے، جیسی تیری مرضی" اگربتی اور مٹھائی کا ڈبہ لیے سلیم چنا اندر داخل ہو گیا اور میں داخلی دروازے پر کھڑا دھوپ کی شدت سے آیا پسینہ پوچھنے لگا۔

"چل یار بنگالی بابا تجھے اندر بلا رہے ہیں"۔ پندرہ منٹ کے انتظار کے بعد سلیم چنا کی آواز آئی۔

دروازے سے داخل ہوتے ہی اندر ایک بہت بڑا کمرہ تھا جس کی سامنے والی دیوار کے ساتھ بچھی دو اونچی مخملی گدیوں پر بنگالی بابا تشریف فرما تھے۔ کندھوں پر پھیلی لمبی لمبی زلفیں، بڑھی ہوئی داڑھی، گلے میں منکوں کی بڑی سی مالا پہنے سر تا پا سیاہ لباس میں ملبوس آلتی پالتی مارے وہ آنکھیں بند کئے کچھ پڑھ رہے تھے پھر آنکھیں کھولتے ہی انہوں نے سامنے بیٹھی لڑکی پر پھونک ماری اور مور کا پنکھ اس کے سر پر مارنا شروع کر دیا۔

"اٹھ جا..... اٹھ جا..... چل بھاگ، بھاگ..... بھاگ...." بنگالی بابا کے منہ سے رعب دار آواز نکل رہی تھی۔

"آ..... آہ..... آ....." لڑکی کراہ رہی تھی اور درد کی شدت سے چلا رہی تھی جبکہ بنگالی بابا کا سر زور زور سے دائرے کی شکل میں گھوم رہا تھا۔ ان کے چہرے پر جلال تھا اور آنکھیں لال انگارہ ہو رہی تھیں۔ اور وہ تیزی سے مور کے پنکھ اس لڑکی کے سر پر مارتے جا رہے تھے۔ لڑکی کے بال بکھر چکے تھے۔ کپڑے بھی بے ترتیب ہو چکے تھے اور جب وہ درد کی شدت سے چیخ چیخ کر بے حال ہو گئی تو وہیں بنگالی بابا کے قدموں میں ڈھیر ہو گئی۔ بنگالی بابا کی آنکھیں کھل گئیں اور انہوں نے اشارے سے ساتھ بیٹھی عورت سے لڑکی کو لے جانے کے لئے کہا۔

"جا، لے جا اسے پاؤ بھر دودھ میں چھوہارے پکا کر اسے پلا دے، اس کے جسم میں پھر سے طاقت آ جائے گی۔ چلا گیا کم بخت..... کالا جادو کیا گیا تھا تیری بیٹی پر..... جا، لے جا

اسے اب..... " بنگالی بابا نے آگے بڑھ کر لڑکی کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

لڑکی کے ساتھ بیٹھی عورت نے مٹھی میں چھپی کوئی چیز بنگالی بابا کی جانب بڑھائی جسے بنگالی بابا نے بڑی راز داری کے ساتھ کنارے پر رکھی صندوقچی میں ڈال دیا۔

" ہاں بھئی، تو لڑکی کی تصویر لے آیا؟" بنگالی بابا نے سلیم چنا کی جانب نظر دوڑائی۔

" جی بابا..... " سلیم چنا نے مٹھائی کا ڈبہ اور ایک عدد لفافہ بنگالی بابا کی جانب بڑھا دیا۔

" ٹھیک ہے، تیرا یہ کام بھی ہو جائے گا"۔ لڑکی کی تصویر پر جیسے ہی عمل پڑھ کر پھونکوں گا، وہ تیرے پاس کھنچی چلی آئے گی۔"

" اچھا، اچھا" بنگالی بابا کی بات سن کر سلیم چنا کی آنکھوں میں چمک نمایاں تھی۔

" کیا ہی اچھا ہوتا تو لڑکی کی قمیض لے آتا، ایسا پکا کام کرتا کہ تیرا دل خوش ہو جاتا"۔ بنگالی بابا نے مسکراتے ہوئے سلیم چنا سے کہا۔

" بس بابا، کیا کروں یہ تصویر بھی بڑی مشکل سے ملی ہے۔ جیسے ہی وہ لڑکی میرے قبضے میں آگئی، میں آپ کو منہ مانگا ہدیہ دوں گا اور ہاں بابا، یہ ہے میرا دوست نادر، بہت دور سندھ کے ایک دیہات سے آیا ہے۔ اس کی بیوی بہت بیمار ہے، آپ سے اپنی بیوی کا علاج کروانا چاہتا ہے۔ اسے اس بات کا مشورہ میں نے دیا ہے۔" سلیم نے خود کو بابا کے قریب کرتے ہوئے رازدارانہ لہجے میں بتایا۔ میں سانس روکے بنگالی بابا کو دیکھ رہا تھا کہ وہ یکدم ہی مجھ سے مخاطب ہوئے۔

لے آ اپنی بیوی کو، ہو جائے گا اس کا علاج.... " یہ کہہ کر انہوں نے دوبارہ اپنی آنکھیں بند کر لیں اور میں امید بھرا دل لیے سلیم کے ساتھ وہاں سے نکل آیا۔

O.....O.....O

" بابا، یہ رضیہ ہے۔" دوسرے دن آستانے میں بنگالی بابا کے سامنے رضیہ کے ناتواں گٹھڑی جیسے وجود کو سنبھال کر بٹھاتے ہوئے میں نے کہا۔ رضیہ نے ابھی تک میرے ہاتھوں کو مضبوطی سے تھاما ہوا تھا۔

"کیا ہوا ہے اسے؟" بنگالی بابا نے ایک نظر رضیہ کو دیکھا پھر نظریں جھکا لیں۔ رضیہ کی خوبصورت سفید رنگت، زردی مائل ہو چکی تھی اور یوں لگتا تھا جیسے وہ صدیوں کی بیمار ہو۔

"بابا، ہمارے چار لڑکے تھے مگر چاروں بیٹے پیدائش کے فوراً بعد ہی فوت ہو گئے۔ یہ بے چاری اسی غم میں جان سے جا رہی ہے، بہت کمزور ہو گئی ہے، ایک کے بعد ایک بچے کی موت نے اسے مریضہ بنا دیا ہے، آئے دن بخار رہتا ہے، اول فول بہکی بہکی باتیں کرتی ہے اور اب تو اسے ایک نیا مرض چٹ گیا ہے، اس کے منہ سے اکثر خون آتا ہے، مجھے تو شک پڑتا ہے، کوئی بد روح اس پر آ گئی ہے....." میں ایک سانس میں بولے چلا گیا۔

"ٹھیک ہے، ہم سمجھ گئے"۔ بابا نے پوری بات سن کر ایک لمبی سانس لیتے ہوئے کہا۔

"مجھے کیا کرنا ہوگا؟" میں نے مودبانہ انداز میں سوال کیا۔

"چھوڑ جا اس کو کچھ دیر کے لئے، ہم کچھ پڑھ کر اس پر دم کریں گے پھر تجھے بتائیں گے کہ تجھے کیا کرنا ہے؟" بابا کا لہجہ اچانک اتنا سخت ہوگیا کہ مجھ میں مزید کچھ کہنے کی ہمت نہیں رہی اور میں خاموشی سے دل پر ہاتھ رکھے آستانے سے باہر آ گیا۔

آدھے گھنٹے کے صبر آزما انتظار کے بعد ایک بچہ داخلی دروازے پر مجھے بلانے آیا۔

"یہاں بیٹھ اور غور سے ہماری بات سن"۔ بابا نے مجھے اپنے پاس بٹھاتے ہوئے کہا۔ دیکھ تیری بیوی پر ایک بہت بڑی بد روح کا سایہ ہے جو تیرے بچے کو جینے نہیں دیتی، پیدا ہوتے ہی انہیں مار دیتی ہے اور ساتھ ہی وہ تیری بیوی کو بھی ختم کرنا چاہتی ہے۔"

"اچھا"۔ میں نے خوف و دہشت کے مارے تھوک نگلتے ہوئے اپنی بیوی کے بے جان جسم کو دیکھا۔

"یہ کام بہت مشکل ہے اور اس کام میں ہماری جان بھی جا سکتی ہے کیونکہ وہ بد روح بہت طاقتور ہے اور اتنی آسانی سے تیرا پیچھا نہیں چھوڑنے والی۔ اب تو یوں کر، ایک منگی، دس گرام حنا کے پھول اور ایک پورے کفن کا انتظام کرتا کہ ہم قبرستان میں جا کر چلہ کاٹیں، تین دن کا چلہ جیسے ہی مکمل ہوگا، ہم کفن اس بد روح کے نام سے دفنا دیں گے اور اس قبر کی مٹی منگی میں ڈال کر حنا کے پھولوں کا عرق اس میں ملا کر تیری بیوی کے سرہانے رکھ دیں گے۔ بس تو

سمجھ لے، اس کے بعد ہی تیری بیوی کو سکون ملے گا۔''

میں اپنی پیاری سی شریک حیات کو ٹھیک دیکھنے کی خاطر مہنگے سے مہنگے علاج کے لئے تیار تھا، سو اگلے ہی دن بنگالی بابا کے کہنے کے مطابق، ساری چیزیں لے کر اپنی بیوی سمیت ان کے آستانے پر پہنچ گیا۔

''ٹھیک ہے، اب تُو اپنی بیوی کو اس کمرے میں تنہا چھوڑ دے۔''

میں نے بنگالی بابا کے کہنے کے مطابق رضیہ کو برابر والے کمرے میں لٹا دیا تھا۔ اس کمرے کے کونے میں ایک انگیٹھی سلگ رہی تھی۔ بنگالی بابا نے کمرے میں داخل ہوتے ہی لوبان کا سفوف انگیٹھی میں ڈال دیا۔ کمرے کی پوری فضاء لوبان کی خوشبوء سے رچ بس گئی تھی۔ ''اب تو باہر آجا، ہم ان خاص پھولوں پر پڑھائی کر کے کمرے میں رکھ کر تھوڑی دیر کے لئے تیری بیوی کو اکیلا چھوڑ دیں گے۔'' یہ بابا کا حکم تھا۔ میں نے سر جھکایا اور کمرے سے باہر آگیا۔ ٹھیک آدھے گھنٹے بعد بنگالی بابا بھی کمرہ بند کر کے باہر آگئے۔

''میری بیوی صحیح تو ہو جائے گی؟'' میں بنگالی بابا کے قدموں کے پاس بیٹھ گیا۔

''دیکھ، یہ مرض تو بڑا پرانا ہے۔ اور پیچیدہ لگتا ہے۔ تجھے روز اپنی بیوی کا اتارا کروانا ہوگا۔''

''بابا، میں تو اندرون سندھ ایک دیہات سے آیا ہوں، آپ ہی میری کچھ مدد فرمائیں۔'' میں نے فکرمند لہجے میں اپنی پریشانی بیان کی۔

''اس سلسلے میں میں تیری کوئی مدد نہیں کر سکتا کیونکہ آنا تو تجھے روز ہی پڑے گا۔ اگر ایک دن کا بھی ناغہ ہوا تو ہمیں عمل اول دن سے ہی کرنا پڑے گا یعنی ناغوں کا شمار نہیں ہوگا۔'' بنگالی بابا نے مجھے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

''ٹھیک ہے بابا، میں کچھ نہ کچھ کرلوں گا مگر میری بیوی ٹھیک تو ہو جائے گی ناں؟'' میں نے امید بھرے لہجے میں سوال کیا۔

''ہاں، ہاں آج رات ہی ہم قبرستان میں جا کر عمل شروع کر دیں گے، چلہ جیسے ہی مکمل ہوگا، تیری بیوی کے جسم سے وہ بدروح بھاگ جائے گی، بس اب تُو جا اور ہاں ہدیہ اس

صندوقچی میں ڈال دے، ہمیں جنوں کے نام کا کھانا نکالنا پڑتا ہے، ایسے ہی جنات ہمارے قبضے میں نہیں آجاتے، ہمیں ان کی خواہشات بھی پوری کرنی پڑتی ہے۔"

بابا نے اپنی بات مکمل کی تو میں خاموشی سے صندوقچی کی جانب بڑھ گیا۔ سلیم کے بتائے گئے طریقے کے مطابق میں نے صندوقچی میں ہرے ہرے چار نوٹ ڈالے پھر بابا کے ہاتھ چوم کر رضیہ کو سہارا دیتے ہوئے آستانے سے باہر آ گیا۔

اب میں روز رضیہ کو بنگالی بابا کے آستانے پر لے آتا۔ وہ اسی طرح کمرے میں بند کر کے عمل کرتے اور پھر میں ایک سے ڈیڑھ گھنٹے بعد رضیہ کو واپس لے جاتا۔

ٹھیک ایک ہفتے بعد بنگالی بابا نے ایک مٹکی میری جانب بڑھائی۔"اس میں قبرستان کی مٹی ہے، اب روز رات ہوتے ہی تو یہ مٹکی بیوی کے سرہانے رکھ دینا اور تھوڑی سی مٹی اس کی مانگ اور پیروں کے تلووں میں لگا دینا، بس پھر تو دیکھ، کیسے تیری بیوی کو آرام ملتا ہے۔"

اس وقت بنگالی بابا کے آستانے پر رش بڑھتا جا رہا تھا اس لئے مجھے زیادہ سوال کرنے کا موقع نہیں مل سکا۔ سلیم کے بتائے طریقے کے مطابق میں صندوقچی میں نوٹ ڈالتا، بنگالی بابا کے ہاتھ چومتا، رضیہ کو لئے آستانے سے باہر نکل آیا۔

اس روز جب ہم بنگالی بابا کے آستانے سے سلیم کے گھر پہنچے تو رضیہ نے اچانک مجھ سے واپس گھر لوٹنے کا مطالبہ کر دیا۔ ساری رات عجیب وحشت سے وہ جاگتی رہی اور صبح تک اس پر یہ ضد سوار ہو چکی تھی کہ ہمیں واپس اپنے گھر لوٹنا چاہیے اور پھر میں نے رضیہ کی ضد سے مجبور ہو کر اس کے گھر واپس چلنے کا وعدہ کر لیا۔

دوسرے دن بنگالی بابا کے آستانے پر پہنچ کر میں نے ان کے سامنے بیٹھتے ہی سب سے پہلی بات یہی کی۔

"بابا، اب رضیہ کی حالت کچھ بہتر نظر آتی ہے، میں اسے واپس لے جا سکتا ہوں؟"

بنگالی بابا جیسے میری بات سن کر جلال میں آ گئے تھے۔ غصے کی لالی ان کی آنکھوں میں نمایاں تھی۔"خبردار....." کرختگی کے ساتھ جملہ ادا کیا گیا۔

"تو ہمارے کیے کرائے پر پانی پھیرنا چاہتا ہے؟ ہماری ساری محنت مٹی میں ملانا چاہتا

ہے؟ رک جا، ابھی رک جا، ابھی ایک ہفتہ بڑا کام باقی ہے۔ جس کے بغیر سارا عمل ادھورا ہے۔''

''وہ کیا؟'' میں نے ڈرتے ڈرتے ان سے پوچھا۔

''ایک ہفتے تک روز کالے رنگ کا بکرا لے کر آنا ہے۔ ہم اس کا صدقہ کریں گے پھر تُو اپنی بیوی کو لے جانا۔''

''مگر بابا جی.... میں تو بہت غریب آدمی ہوں، ایک ہفتے تک روز بکروں کا انتظام کیسے کرسکتا ہوں؟'' میں نے باقاعدہ احتجاج بھرے انداز میں کہا۔

''یہ ہم نہیں جانتے، اگر صدقہ نہیں دیا تو تیری بیوی پھر اس بدروح کی لپیٹ میں آسکتی ہے، کل رات کو ہی تو اس بدروح کو مار کر بھگایا ہے، اس کے نام کا کفن قبر میں دفنایا ہے۔ اب تیری اس کوتاہی کی وجہ سے وہ بدروح پھر تیری بیوی کے پیچھے پڑ جائے گی۔'' بابا کے چہرے پر غضب نمودار تھا۔ ''اچھا چل، ایسا کر، ابھی کہیں سے صدقے کے لئے دو بکرے لے آ، باقی معاملہ میں خود دیکھ لوں گا۔''

ان کی بات سن کر میں الٹے پاؤں بھاگا۔ رضیہ کو میں آستانے پر ہی چھوڑ گیا تھا اور پھر سلیم سے پیسے مزید ادھار لے کر دو بکرے خرید لیے۔

بنگالی بابا نے دونوں بکرے اپنے پاس رکھ لیے اور ایک بوتل میں پڑھا ہوا پانی، ساتھ ہی ایک پڑیا میں نمک باندھ کر میرے حوالے کر دیا۔

''جا، تیری بیوی کی اب خیر ہوگی جب یہ پانی پئے تو اس پانی کے چند قطرے اور جب کھانا کھائے تو کھانے میں یہ نمک شامل کر دینا، اس سے تیری بیوی کے منہ سے خون آنے والی بیماری بھی آہستہ آہستہ جاتی رہے گی، بس اب تُو اپنی بیوی کو لے جا۔'' میں نے ہر بار کی طرح اس بار بھی بنگالی بابا کے ہاتھ چومے تھے لیکن اب میرے پاس صندوقچی میں ڈالنے کیلئے کچھ نہیں بچا تھا بلکہ میں تو بری طرح سے سلیم کا مقروض ہو چکا تھا۔ بہرحال میں بیوی کو سہارا دے کر اس آستانے سے باہر نکال آیا۔

آستانے سے واپسی پر رضیہ نے مجھ سے بڑی عجیب، بہت سی الجھی ہوئی باتیں کی تھیں۔ بنگالی بابا کے نام پر اس نے کئی بار تھوکا تھا اور پھر کھوئے کھوئے لہجے میں بولی تھی، ''نادر.....!

مجھے اپنے آپ سے گھن آرہی ہے، اب تو مجھے ایک ایسی بیماری بھی لگ گئی ہے جس کا علاج بھی ممکن نہیں ہوگا۔ تم خود بتاؤ، روح پر لگے زخم کا بھی کوئی علاج ہوتا ہے؟" میری سمجھ میں رضیہ کی بہت سی باتیں آگئیں تھیں اور بہت سی باتوں کو میں سمجھ کر بھی شاید نہیں سمجھنا چاہ رہا تھا۔

O......O......O

ہم دونوں میاں بیوی بس کے انتظار میں، بس اسٹینڈ پر بیٹھے تھے کہ اچانک رضیہ کو خون کی اُلٹیاں شروع ہوگئیں۔ میں بری طرح سے گھبرا گیا تھا، بس اسٹاپ پر بھگدڑ سی مچ گئی تھی۔ رضیہ کی حالت اس سے پہلے کبھی اتنی خراب نہیں ہوئی تھی اور پھر میں کچھ لوگوں کی مدد سے رضیہ کو اسپتال لے آیا۔

O......O......O

ایمرجنسی روم میں رضیہ کی حالت تشویش ناک تھی۔ بقول ڈاکٹرز، رضیہ موت وحیات کی کشمکش میں مبتلا ہے، میں حسرت ویاس کی تصویر بنا کبھی وارڈ میں اپنی لب دم بیوی کو دیکھتا تو کبھی آسمان کی طرف سر اٹھا کر رضیہ کی زندگی کی دعائیں مانگنے لگتا۔ مجھے ڈاکٹروں سے پتا چلا کہ رضیہ خون کے سرطان کی مریضہ ہے اور یہ مرض اسے خاندانی ورثے میں ملا ہے۔ بچپن میں علاج کے بجائے والدین رضیہ کا علاج نیم حکیم خطرۂ جان جیسے معالجین سے کراتے رہے۔ شادی کے بعد رضیہ کے ماں باپ اور سسرال والوں نے مختلف بابا، پیر وفقیر کے کہنے پر رضیہ کو بدروحوں کا شکار قرار دے دیا اور اس کا علاج تعویذ، گنڈوں اور عملیات کے ذریعے ہی ہوتا رہا، اس کے گھر کے ہر فرد کے ذہن میں ایک ہی بات تھی، رضیہ بدروحوں کے نرغے میں آگئی ہے۔

رضیہ کا شوہر نادر آج اللہ سے گڑگڑا کر اپنی بیوی کی زندگی کی دعائیں مانگ رہا ہے۔

قرآن مجید میں اللہ کا فرمان ہے۔" میں ہی ہوں جو بیمار کو شفا دیتا ہوں۔" قول رسول ﷺ ہے۔" جب تم بیمار ہو جاؤ تو علاج کراؤ"۔

کاش..... یہ بات رضیہ کے شوہر اور اہل خانہ کو پہلے سمجھ آجاتی تو آج خوشیوں بھرا یہ گھر تباہی اور بربادی کا شکار نہیں ہوتا۔

☆......☆......☆

جب زندگی ہار گئی

میں اپنے آفس میں بیٹھی کام میں مصروف تھی کہ...... اتنے میں ہمارے ٹی وی چینل کے چیف کنٹرولر پروگرام کی آمد ہوئی..... خلاف معمول اس وقت ان کے چہرے پر چھائی اداسی نے مجھے کچھ حیران اور پریشان کر دیا۔

''سر...... سب خیریت تو ہے؟ آپ اس وقت کہاں سے آرہے ہیں؟'' میرے اس سوال کے جواب میں انہوں نے مجھے ایک لرزہ خیز واردات کے بارے میں بتایا، پھر اس واقعہ پر میری جستجو اور تحقیق اس لرزہ خیز کہانی کی صورت میں سامنے آئی جو میں سچی کہانیوں کے لئے رقم طراز ہوں۔

سرد خانے میں بیس بائیس سالہ نوجوان لڑکے کی لاش دیکھ کر میری آنکھیں نم ہو گئیں اور جسم پر لرزہ طاری ہونے لگا۔ اس خوبصورت نوجوان کے ایسے بے دردی سے قتل اور اس کی لاش کو پڑے دیکھ کر تھوڑی دیر کے لئے میرے بھی حواس منتشر ہو گئے۔ وجیہ شخصیت، صاف ستھرے کپڑوں میں ملبوس یہ نوجوان شہزادہ لگ رہا تھا۔ کون ہے، کیا ہوا اس کے ساتھ، کہاں سے آیا تھا، کیسے قتل ہوا؟ بہت سے سوالات میرے ذہن میں گردش کر رہے تھے۔ ایسے میں ایک صاحب میرے قریب آ کر کھڑے ہو گئے۔ جو زارو قطار رو رہے تھے۔

''کیا یہ آپ کا کوئی رشتہ دار تھا؟'' میں نے ہمدردی سے پوچھا۔

''نہیں، میں اس لڑکے کو کچھ عرصے پہلے سے جانتا ہوں، بڑا اچھا تھا، بڑی اچھی باتیں

کرتا تھا۔"

"تو اس کا کوئی رشتہ دار نہیں آیا؟" میں نے تھوڑے توقف کے بعد پوچھا۔

"کوئی نہیں ہے اس کا یہاں" انہوں نے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔

"کیا مطلب؟" میں نے فکر مندانہ لہجے میں سوال داغا۔

انہوں نے مجھے قریب ہی بینچ پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور پھر بتانا شروع کیا۔"میں اس لڑکے کے بارے میں نہیں جانتا، بس اتنا معلوم ہے کہ کچھ عرصے پہلے ہی یہ سوات سے آیا تھا۔اس کا نام رحمٰن خان ہے۔نوکری کی تلاش میں تھا۔کچھ ہی عرصے پہلے ہمارے محلے کے افغانی ہوٹل پر Receptionist کی ملازمت اس کو ملی تھی۔شکل وصورت اچھی اور پڑھا لکھا ہونے کی وجہ سے محلے کے لوگوں میں گھل مل گیا تھا۔گزشتہ رات ہونے والے ہنگامے میں جانے کون بد بخت لوگ رحمٰن اور ساتھ ہی ایک چودہ سالہ بچے کو ہوٹل سے پکڑ کر لے گئے۔اور دونوں کو گولی ماردی۔ بے چارہ نہ یہاں کراچی میں کسی کو جانتا تھا اور نہ اس کا کوئی قصور۔بس تلاش معاش کی خاطر ایک افغانی ہوٹل کے Receptionist کی نوکری نے اس کی زندگی چھین لی۔اللہ ہی رحم کرے۔اس وقت ملک کے جو حالات ہیں، کچھ سمجھ نہیں آرہا، یوں بے گناہوں کو ماردینا کہاں کا انصاف ہے؟"

"اچھا، اس کے بارے میں مزید کچھ پتا چل سکتا ہے؟ کوئی اس کا سامان وغیرہ جس سے مجھے اس کے گھر والوں کا سراغ ملے"۔اسی دوران سرد خانے کا عملہ بھی آگیا۔وہ بھی مرنے والے کے اہل خانہ کی بارے میں چھان بین کر رہے تھے۔تاکہ اس کی میت ان کے حوالہ کی جاسکے۔

"دیکھیے میڈم، یہ جہاں رہتا ہے، میں آپ کو وہاں کا پتا دیتا ہوں، آپ اس کے سامان کی تلاشی لیجیے پھر جیسی آپ کی مرضی"۔

میں نے رحمٰن خان کے گھر کا رخ کیا جہاں مجھے اس کے تھوڑے سے سامان کے ساتھ ایک ڈائری ملی، میں جیسے جیسے ڈائری پڑھتی گئی۔میرے اندر ٹوٹ پھوٹ سی مچ گئی۔آنکھوں سے اشک جاری ہو گئے اور مجھ پر لرزے کی سی کیفیت طاری ہوگئی۔میری سمجھ میں نہیں آرہا

کہ میں کیا کروں اور کیا کہوں؟ رحمٰن خان کی کہانی اس کے قلم کی نوک سے کچھ یوں ڈائری میں بکھری ہوئی تھی۔

O......O......O

"آج بھی پہاڑیوں کے دامن میں پھیلی سدا سہاگن ہریالی جھوم جھوم کے صبح سویرے کی ہواؤں کو خوش آمدید کہہ رہی ہے اور پہاڑیوں کی آغوش سے بہتی آبشار اپنے حسن میں ڈوبی سریلے نغمے الاپ رہی ہے۔ندی کنارے دور تک بطخوں کے ٹولے نے کیچڑ پھیلائی ہوئی ہے۔بطخوں کے یہ ٹولے اپنے بچوں سے چھپ چھپ کرتے ایک دوسرے کو چھیڑتے پھر ہلکی سی پرواز لے کے پُر سکون ندی کی آغوش میں ایک ڈبکی لگاتے اور پھر کنارے پر آجاتے ہیں گیلی مٹی کے اس آنچل پر ڈھیروں پھول محو گفتگو ہیں۔پرندے ندی کنارے پر پھیلا کر فضا میں چند ثانیوں کے لیے معلق ہو جاتے اور پھر دھیرے سے زمین پر اتر آتے۔آج ندی کنارے سورج نکلنے سے کچھ دیر پہلے زندگی یوں حرکت میں آئی جیسے ابھی ابھی زندگی کی نوید پائی ہو، جیسے خوش رنگ شگوفے کھلنے کے لئے بے چین ہوں۔شبنم سے دھلے پھولوں کے کٹورے رقص کرنے کے لئے بے قرار ہوں۔پرندوں کو اپنے پروں پر جیسے نیا نیا اعتماد ہو اور فضا حیرت سے ابھی ابھی وجود میں آنے والی دنیا کو پھلتا پھولتا، پروان چڑھتا دیکھ رہی ہو۔جوں ہی شب باشی کی انگڑائیوں اور کسل مندی سے رات کا خمار ٹوٹا پُر سکون ماحول پرندوں کے شور سے گونج اٹھا۔میں ایک بہت بڑے پیڑ کی پھیلی جڑوں میں اپنی ٹانگیں پھنسائے، صبح سویرے کے مناظر میں گم تھا۔جیسے ہی چرند پرند نے صبح کی نوید دی، میں مسکرانے لگا۔

وادئ سوات کی اس خوبصورت صبح کو آج بھی میں اپنی ڈائری میں قلم بند کر رہا تھا۔میری ڈائری لکھنے کی عادت پرانی ہے لیکن لکھنے کا دل تب ہی چاہتا ہے جب دل کا غبار حد سے بڑھ جائے، تب دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لئے ڈائری سے اچھا دوست تو اور کوئی بھی نہیں ہو سکتا اور ایسے میں اگر فطری ماحول بھی موجود ہو جہاں قدرت کی کاری گری اور قدرتی مناظر دیکھنے کو ملیں تو کیا کہنے۔ویسے تو سوات کا کونہ کونہ ہریالی اور سبزے سے بھرا ہوا

ہے، میٹھے اور شفاف چشمے، صحت بخش آب و ہوا، بلند و بالا برف سے بجی چوٹیاں۔ اگر میں سوات کو زمین کی جنت کہوں تو غلط نہ ہوگا۔ یہ جنت نظیر وادی میرا وطن، میری دھرتی ہے۔ مجھے دل و جان سے عزیز ہے۔ مٹی کا یہ رشتہ انوٹ ہے، میرے انگ انگ میں بسا ہے۔

میرے گھر کے نزدیک سے ہی چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ خوبصورت گرتی آبشار، ٹھنڈے پانی سے لبالب بھری اس ندی نے یہاں کے حسن کو چار چاند لگا دئے ہیں۔ B.Sc کا اسٹوڈنٹ ہونے کی وجہ سے مجھے پڑھنے کے لئے اس سے بہترین جگہ کہیں نہیں مل سکتی اس لئے میں صبح سویرے ہی اس درخت کے نیچے آکر بیٹھ جاتا ہوں۔ اتنی خوبصورت صبح کی شروعات کے ساتھ اپنی پڑھائی کی شروع کرنا مجھے ہمیشہ سے ہی اچھا لگتا۔ اب مجھے گھر جانا چاہئے ابا اور اماں انتظار کر رہے ہوں گے۔ باقی باتیں پھر لکھوں گا۔

O......O......O

''آج ابا ذکر کر رہے تھے کہ سوات میں دہشتگرد پھیل گئے ہیں۔ ہر طرف ڈر اور خوف کی ایک لہر ہے جو تیزی سے تمام علاقوں کو اپنی لپیٹ میں لیتی جا رہی ہے۔ والدین کو اپنے اسکول جانے والے بچوں کی فکر دامن گیر ہے۔ خواتین کو ڈر ہے کہ انہیں باہر نکلنے پر کوئی دھمکی مل سکتی ہے۔ یہ مخصوص وضع قطع کے لوگ بات بات پر فتوے دیتے نظر آ رہے ہیں۔ یہ بات تو اب میں بھی اچھی طرح سے جان گیا ہوں کہ اسکولوں کو لاحق خطرات بالکل حقیقی ہیں اور انہوں نے اب اسکولوں اور کالجوں کو بند کرنے کی دھمکی دینی شروع کر دی ہے۔ لیکن یہ کیا بات ہوئی، اب ہمارے پڑھنے پر بھی پابندی لگ جائے گی؟ یہ کون سا اسلامی قانون ہے۔ جو خواتین کو پڑھنے سے روکا جا رہا ہے؟ ہمارے دین کا تو آغاز ہی ''اقراء باسم ربک الذی'' سے ہوتا ہے۔ ہمارے نبی کا تو یہ فرمان ہے کہ ''علم حاصل کرو چاہے تمہیں چین ہی کیوں نہ جانا پڑے۔'' تو پھر یہ لوگ کیوں ایسا چاہتے ہیں؟ یہ کیسا نظام شریعت ہے؟ اسلام کے نام پر اپنی من مانیوں کو یہ نظامِ شریعت کہنے والے کیا یہ نہیں سوچتے کہ عادل تو اوپر موجود ہے جو انہیں مسلسل دیکھ رہا ہے اور اگر میرے رب کو طیش آ گیا تو پھر کوئی بھی انہیں عذاب الٰہی سے نہیں

بچا سکتا۔ جب ابابیلوں نے ہاتھیوں کی فوج کو شکست دی تھی تو پھر یہ کیا شے ہیں؟ شاید سوات کی ہسٹری نہیں جانتے جہاں سکندر اعظم، مغل بادشاہ بابر، اکبر بادشاہ سب کو معرکہ جنگ میں شکست ہوئی تھی سوائے محمود غزنوی کے جس نے راجہ گیری نامی حکمران کو شکست دے کر سر زمین سوات کو اسلام کی ابدی قندیل سے روشن کیا تھا۔ وہ واقعی اسلام کا نفاذ تھا ورنہ ہم غلامی کی زندگی پر موت کو ترجیح دینے والے لوگ ہیں اور کسی بھی دور میں کسی کے زیر نگیں رہنا قبول نہیں کرتے۔ آج دل رو رہا ہے اور غم و غصے کی شدت سے پھٹ رہا ہے۔ اب مزید لکھا نہیں جا رہا۔ ابھی مجھے ابا کی طرف بھی جانا ہے۔ ہماری زمرد کی کانیں ہیں اور ہم ان سے برآمد ہونے والے اسٹون مختلف شہروں میں سپلائی کرتے ہیں۔ اچھا پیاری ڈائری، پھر تم سے ملاقات ہوگی، ابھی مجھے جانا ہے"۔

O......O......O

" آج سوات دھماکوں کی آوازوں سے گونج رہا ہے۔ ہر طرف چیخ و پکار مچی ہوئی ہے۔ اسکولوں کو بم دھماکے سے اڑایا جا رہا ہے۔ لوگوں کے گھروں میں گھس کر انہیں مارا جا رہا ہے۔ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ آج کی صبح کتنی سہمی ہوئی ہے، ہوا بھی گولیوں کی بوچھاڑ سے زخمی لگ رہی ہے، درختوں کی کوکھ بھی زخمی نظر آ رہی ہے، جیسے پہاڑوں کی گرتی آبشار آنسو بہا رہی ہو"۔

O......O......O

" آج پورے دو ہفتے ہو گئے ہیں، نہ میری دونوں بہنیں اسکول گئی ہیں اور نہ میں کالج جا سکا ہوں۔ اب تو اپنے اپنے گھروں میں بھی ہم محفوظ نہیں۔ مجھے بہت غصہ آ رہا ہے۔ دل چاہتا ہے، باہر نکل جاؤں اور جا کر ان سے لڑوں، کیوں یہ گلیوں میں دندناتے پھر رہے ہیں؟ یہ کون سا نیا اسلام لا رہے ہیں؟ مگر اماں اور ابا کا اکلوتا بیٹا ہونے کی وجہ سے ان کی محبت کے آگے سر جھکا دیتا ہوں لیکن انتہا پسندی اور شدت پسندی کی وجہ آخر کیا ہے؟ کیوں یہ اپنے ہی ہم وطنوں اور ہم مذہب بے قصور بھائیوں کو قتل کر رہے ہیں؟ یہ کون سا نظام ہے جس میں خواتین کی تعلیم پر پابندی لگا دی گئی ہے جبکہ ہمارے مذہب نے علم کا حصول مرد اور عورت پر

یکساں فرض قرار دیا ہے پھر یہ لڑکیوں کے اسکول و کالج بموں سے کیوں اڑا رہے ہیں؟ آخر کیوں یہ اسلام کو بدنام کر رہے ہیں؟ پہلی اسلامی ایٹمی طاقت پاکستان کو ٹکڑے کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ کیا یہ پاکستان کے خلاف کوئی سازش ہے؟''

O......O......O

''میں پچھلے کچھ دنوں سے نوٹ کر رہا ہوں کہ اب ان لوگوں نے سوات کو مرکز بنا کر دوسرے علاقوں میں بھی کارروائیاں شروع کر دی ہیں۔ علاقوں میں رہنے والے سکھوں سے ''جزیہ'' کے نام پر روپے وصول کرنا شروع کر دیے ہیں۔ ہندو، سکھ، عیسائی سب کا یہاں اتنا ہی حق ہے جتنا مسلمانوں کا لیکن آج تو میرے بابا کو بھی دھمکی ملی ہے۔ انہوں نے بابا کو دھمکی دی ہے ہماری جو زمرد کی کانیں ہیں، وہ اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہیں۔ انہیں ہمارے حوالے کر دیا جائے مجھے آج بہت غصہ آ رہا ہے۔ یہ کیا بات ہوئی؟ اس طرح تو یہ پوری دنیا اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہے (بے شک) لیکن زمرد کی کانوں پر قبضہ کرنا، یہ کہاں کا انصاف ہے آج میں نے ابا سے کہہ دیا کہ..... آپ نے بہت افہام و تفہیم سے بات کر لی، اب میں جا کر بات کرلوں گا لیکن ابا نے مجھے خاموش کرا دیا۔

''خبردار، جو تم گھر سے باہر بھی نکلے، میں خود بات ان لوگوں سے''۔

''بہت خراب ہیں وہ لوگ۔ میں نے علاقے کے بڑے لوگوں سے بات کی ہے کہ یہ ہماری جائیداد ہے، ہمارا روزگار ہے۔ اسے اللہ تعالیٰ کی ملکیت قرار دے کر قبضہ کرنا کہاں کا انصاف ہے؟''

''ابا..... ! سوات کے حالات بگڑتے چلے جا رہے ہیں۔ سب لوگ یہاں سے ہجرت کر رہے ہیں، ہمیں بھی یہاں سے کہیں چلنا چاہئے''۔

''لیکن بیٹا..... !! ایسے کیسے جا سکتے ہیں؟ ہمارا سب کچھ یہیں پر ہے، تم بس اپنی ماں اور دونوں بہنوں کا خیال رکھو، میں ان لوگوں سے خود بات چیت کرلوں گا''۔

ابا نے ایک بار پھر مجھے ڈانٹ کر خاموش کرا دیا ہے۔ اب میں گھر کے باہر اپنے دوستوں کے پاس بھی نہیں جا سکتا۔ اب بس میں، میرا کمرہ اور میری ڈائری، جو میری واحد

دوست رہ گئی ہے جو میرے دل کے ہر راز اپنے سینے میں چھپا لیتی ہے"۔

O......O......O

"آج میں کچھ بھی لکھنے کی ہمت مجتمع نہیں کر پا رہا نہ قلم ساتھ دے رہا ہے اور نہ میرے الفاظ میرا ساتھ دے رہے ہیں۔ ایسی منحوس گھڑیاں میں گزار رہا ہوں، جن کا شاید کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا، کتنا کرب میرے اندر بھرا ہے، میں کتنا بے بس ہوں، دو دن سے میرے ابا لا پتا تھے۔ میں ان کو پاگلوں کی طرح ڈھونڈ رہا تھا۔ کتنے لوگوں سے میں نے فریاد کی لیکن کسی نے میری مدد نہیں کی۔ سب خوف میں گرفتار اپنے گھروں میں چھپے بیٹھے تھے اور آج جب مجھے خبر ملی کہ میرے ابا پر اللہ تعالیٰ کی ملکیت کو چیلنج کرنے کا الزام لگا کر انہیں سر عام درخت سے لٹکا کر پھانسی دے دی گئی ہے تو میرے قدموں سے زمین نکل گئی۔ کتنے ظالم ہیں یہ لوگ.....

اسلام جو یتیموں، اور مسکینوں کے ساتھ حسن سلوک کا درس دیتا ہے تو یہ کیسا اسلام ہے جس کی پیروی کرتے ہوئے انہوں نے مجھے اور میری بہنوں کو یتیم کر دیا؟ میری ماں کو بیوہ بنا دیا؟ ہمارا سب کچھ ہم سے چھین لیا، ہمارا سائبان ہم سے چھین لیا۔

میں جانتا ہوں، انہوں نے ہماری زمرد کی کانوں کے منہ پر مورچے بنا کر اس پر توپیں نصب کر دی ہیں، وہ ایسے ہی ہمارا سب کچھ ہم سے چھین لیتے لیکن ابا کو تو ہم سے نہیں چھینتے۔ آج کتنا خوف محسوس ہو رہا ہے۔ باپ کا سایہ بچوں کے لئے کتنا اہم ہوتا ہے، آج اندازہ ہو رہا ہے کہ ہم کتنے اکیلے ہو گئے ہیں۔

O......O......O

آج بہت دنوں بعد لکھنے کا موقع ملا ہے، میں اور میری والدہ نے DCO Office میں جا کے درخواست دی ہے کہ ہمارے والد کو اس طرح سر عام پھانسی دی گئی ہے، ہم نے بہت احتجاج کیا۔ شاید حکام بالا کو ہم پر رحم آ جائے اور وہ ہماری کچھ مدد کر سکیں۔ شاید ہمارے یہ جرگے اور احتجاج ہماری جائیداد واپس دلا دیں اور ہمارے بابا پر جو دین سے بغاوت کا الزام لگا کر پھانسی انہیں دی گئی ہے، شاید وہ الزام غلط قرار پائے لیکن آج اتنے دن گزر جانے کے بعد ابھی تک کچھ نہیں ہو سکا ہے۔ ہمارے احتجاج، ہماری آوازیں شاید صدا بہ صحرا بن کر رہ گئی

ہیں۔

O......O......O

عنایت صاحب میرے والد کے بہت اچھے دوستوں میں سے ایک ہیں۔ اس دن میں عنایت صاحب سے ملنے ان کے گھر آیا تھا اپنے والد کے حوالے سے بات کرنے۔ ابھی میں بیٹھا ہی تھا کہ اسی اثنا، میں شور کی آواز سنائی دی۔ محلے کے ایک بچے نے مجھے آ کے بتایا۔

"رحمن بھائی، جلدی گھر جاؤ، تمہاری امی اور دونوں بہنوں کو کچھ لوگ گھسیٹتے ہوئے ایک بڑی سی گاڑی کی طرف لے گئے ہیں۔ ان کے چہروں پہ کالے نقاب پڑے ہوئے ہیں"۔

میں ہونقوں کی طرح گھر بھاگا لیکن جب تک وہ گاڑی جا چکی تھی۔ کہاں لے گئے میری ماں اور معصوم بہنوں کو؟ میں پاگلوں کی طرح چلا رہا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کہاں انہیں ڈھونڈوں؟ جتنے قریبی اڈے مجھے پتا تھے، میں وہاں بھی گیا، ہر جگہ سے مجھے مار پیٹ کر نکال دیا گیا۔ اتنا بے بس تو میں کبھی نہیں تھا۔ میری آواز میرے رندھے گلے میں دب چکی تھی اور میرا سر ایسا ہو گیا تھا جیسے بھاری پتھر میرے سر پر رکھ دیئے گئے ہوں۔ عنایت صاحب نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ میری مدد کریں گے میری ماں اور بہنوں کو ڈھونڈنے میں۔ میں سارا سارا دن ان کے گھر کے باہر بیٹھا رہتا۔ میرے پاس اپنوں کی تلاش کا اور کوئی راستہ نہ تھا پھر عنایت صاحب نے مجھے گھر کے باہر نکلنے سے بھی منع کر دیا۔ انہوں نے مجھے چھپے رہنے کی تلقین کی تھی کیونکہ مجھ پر "امریکی جاسوس" کا الزام لگا کے سزائے موت کا اعلان کر دیا گیا تھا اور حکم دیا گیا تھا، میں جہاں نظر آؤں مجھے قتل کر دیا جائے۔ میں سارا سارا دن عنایت صاحب کے گھر میں چھپا رہتا، یہ ایک چھوٹا سا کمرہ تھا جہاں مجھے دو وقت کی روٹی مل جاتی۔ میرے دن بڑی اذیت میں گزر رہے تھے۔ میں سارا دن خلاؤں میں گھورتا رہتا اور دو لفظ ڈائری میں لکھ کر گھنٹوں روتا رہتا۔ جیسے تیسے ایک ہفتہ گزر گیا۔

اس دن عنایت صاحب میرے پاس آئے۔ آتے ہی وہ سر جھکا کر بیٹھ گئے۔ ان کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ میں "نہیں"...... کہہ کے ان کے سینے سے لگ گیا۔ "مجھے بتائیں، کوئی خبر ملی میری ماں اور بہنوں کی؟"

تب عنایت صاحب نے مرے ہوئے لہجے میں بتایا۔"بیٹا......! صبر سے کام لو۔ تمہاری ماں اور بہنوں پر بدکاری کا الزام لگا کر انہیں سزائے موت دے دی۔ان کی لاشیں خونی چوک سے آج ملی ہیں"۔

یہ خبر سنتے ہی میں بے ہوش ہو گیا۔ جب ہوش آیا تو عنایت صاحب میرے سرہانے کھڑے تھے۔وہ ہاتھ جوڑ کر مجھ سے معافی مانگ رہے تھے۔میں ان کی بات سمجھ گیا تھا اور پھر میں راتوں رات اپنا بیگ تھامے کراچی کے لئے روانہ ہو گیا۔

O......O......O

"آج بہت دنوں بعد کراچی شہر کی خاک چھاننے کے بعد اس چھوٹے سے کمرے میں بیٹھ کر میں اپنی ڈائری کا یہ صفحہ لکھ رہا ہوں۔ بارہا ایسا ہوا کہ جب میں نے ڈائری کے پچھلے اوراق پڑھنا شروع کئے، میرا دل خودکشی کرنے کو چاہا لیکن میں ایسا نہیں کر سکتا کیونکہ میں جانتا ہوں، اسلام میں خودکشی کرنا حرام ہے۔اب میں ایک نئی زندگی شروع کرنا چاہتا ہوں۔ جو کچھ بھی میرے ساتھ ہوا، جیسا وقت گزر گیا، وہ سب میں سوات میں ہی چھوڑ آیا ہوں۔وہ درد بھرے لمحات اور یادیں زندگی بھر میرے ساتھ رہیں گی لیکن اب میں یہاں دوبارہ کسی اچھے سے کالج میں ایڈمیشن لوں گا اور اپنی تعلیم شروع کروں گا۔یہاں مجھے ایک افغانی ہوٹل میں معمولی سی نوکری مل گئی ہے۔میں یہ نوکری کرتے ہوئے کسی اچھی کمپنی میں ملازمت کی کوشش کروں گا۔کراچی کا دامن وسیع ہے میں یہاں پہلے بھی آتا رہا ہوں میرے والد کا یہاں کے لوگوں سے کاروباری تعلق رہا ہے، یقیناً یہ لوگ میری مدد کریں گے۔

پیاری ڈائری..... تم میرے اپنوں کی موت سے خون آلودگی ہو چکی ہو۔اب میں تمہیں دفنا دوں گا اگر میں یہ کر سکا تو....."۔

O......O......O

ڈائری کا آخری ورق پڑھنے کے بعد میں نے خاموشی سے ڈائری بند کر دی۔میرا سر جھکا ہوا تھا اور آنکھوں میں آنسو تھے۔میں سوچ رہی تھی۔"رحمٰن خان جو سوات میں شدت پسندوں کے خلاف لڑتا رہا اور اپنا سب کچھ گنوا کر کراچی جیسے روشن خواب شہر میں نئی زندگی

شروع کرنے آیا تھا جو کسی کی مدد کا طلب گار تھا جو مستقبل کے روشن خیال دیکھ رہا تھا، وہ یہاں کس بے دردی سے بے گناہ قتل ہو گیا؟ گولی جب بندوق سے نکلتی ہے تو وہ یہ نہیں دیکھتی کہ اس کا نشانہ روشن خیال ہوگا یا شدت پسند، گولی تو اپنا کام کر دیتی ہے"۔

میں نے رحمٰن خان کی میت کو غور سے دیکھا، اس کی نیم وا آنکھیں مجھ سے بے شمار سوالات کر رہی تھیں۔

میرے پاس ان میں سے کسی سوال کا بھی کوئی جواب نہیں ہے۔

☆......☆......☆

لمحوں کی پاداش

فاطمہ سومرو کے بارے میں چند سطر کی ایک خبر اخبار کی زینت بنی، خبر پڑھنے کے بعد کہانی کی تلاش والی میری حس جاگ اٹھی، ہر ماہ "سچی کہانیاں" کیلئے میرے شہر کی کہانی کی تلاش میں مجھے اس کیفیت سے گزرنا پڑتا ہے، کافی سوچ بچار کے بعد میں نے یہ فیصلہ کیا کہ فاطمہ سومرو سے ملاقات کی جائے، سو اخبار کے دفتر فون کیا، تو وہاں سے مجھے بتایا گیا کہ حمید بلوچ لیاری کے علاقے میں قتل ہوا ہے، آپ وہاں کے تھانے سے رابطہ کریں تو آپ کو معلومات مل سکتی ہیں۔

لیاری وہ علاقہ ہے جہاں آئے دن گولی چلتی ہے، دستی بموں سے ایک دوسرے پر حملہ کیا جاتا ہے، قتل و غارت گری کا بازار گرم رہتا ہے، تاہم میں نے ہمت کر کے متعلقہ تھانے فون کیا تو وہاں پر ڈیوٹی افسر نے مجھے بتایا کہ اس کام کے لئے آپ کو خود تھانے آنا پڑے گا۔ اس حوالے سے میں نے جب اپنے خوف کا اظہار کیا تو وہ قہقہہ لگا کر ہنسا اور بولا۔

"بی بی، ایسی کوئی بات نہیں ہے، لیاری بھی کراچی کے شہریوں کا علاقہ ہے بلکہ یہ قدیم بستی ہے، اس بستی کو کراچی کی ماں کا درجہ حاصل ہے۔ لیاری تو محبت کرنے والوں کا علاقہ ہے۔"

یوں میری کچھ ہمت بندھی اور میں نے لیاری جانے کا فیصلہ کیا اور جب وقت مقررہ پر پہنچی تو ایک بلوچ لڑکا وہاں پہلے سے میرا منتظر تھا اور کچھ ہی دیر میں، میں اس بلوچ لڑکے کی

ہمراہی میں فاطمہ سومرو کی دہلیز پر کھڑی تھی۔ فاطمہ سومرو کی کہانی سننے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچی کہ دیہی معاشرے میں عورت کو کس قدر حقیر ہے، ذرا ذرا سی بات پر اسے قتل اور دیگر اذیت ناک سزاؤں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ فاطمہ سومرو پر کیا گزری، اس کا اندازہ آپ کو خود کہانی پڑھنے کے بعد ہی ہوگا۔

O......O......O

فاطمہ سومرو محبت کے معاملے میں بہت شدت پسند تھی۔ مجید قمرانی صرف اس کی محبت ہی نہیں تھا بلکہ اس کے لئے زندگی اور موت کا مسئلہ بن چکا تھا۔ اندرون سندھ ڈہرکی کے قریبی دیہات میں پلنے والی فاطمہ سومرو کے خواب شہری لڑکیوں جیسے تھے، یوں تو وہ معمولی پڑھی لکھی تھی مگر اس کا رکھ رکھاؤ، اس کا بات کرنے کا شائستہ انداز اور اس کی چال ڈھال، دیہات کے بیشتر لوگوں کا خیال تھا کہ فاطمہ سومرو شہر سے آئی ہے لیکن یہ کوئی نہیں جانتا تھا کہ فاطمہ سومرو کی تربیت اس کے ماں باپ نے نہیں بلکہ ٹی وی ڈراموں نے کی ہے، ٹی وی پر نت نئے ڈراموں کو دیکھ دیکھ کر اس نے اپنے ساتھ ساتھ اپنے گھر کو بھی نئے ڈھنگ سے سنوارنا شروع کردیا تھا۔ فاطمہ سومرو کی ماں اللہ کو پیاری ہو چکی تھی مگر وہ اپنے دلکش اور تمکین نقش فاطمہ سومرو کی صورت چھوڑ گئی تھی، گوری، گلابی رنگت، لمبے خوبصورت بال اور نازک اندام یقیناً آئینہ بھی فاطمہ کو قائل کرتا رہتا تھا کہ تُو ایک حسین لڑکی ہے۔

فاطمہ کے بابا کا سارا وقت کھیتوں کی نذر ہو جاتا اور فاطمہ دن بھر اپنی سکھیوں کے ساتھ ہنسی مذاق کرتی رہتی یا پھر چھوٹی بہن کے ساتھ مل جل کر گھر کے کام نمٹایا کرتی۔ زندگی حسین تھی، جوانی کے ہر رنگ سے بھرپور۔ فاطمہ سومرو اس دن خوابوں اور خیالوں کی دنیا سے باہر آئی جس دن اس کی سکھی مہرو نے اسے مجید قمرانی کے بارے میں بتایا۔

''اکبر چاچا کا بیٹا ہے۔ کراچی سے آیا ہے، بالکل ہیرو مافق ہے، سچ فاطمہ، پورے دیہات میں تیرے قابل کوئی نہیں، بس اکبر چاچا کا یہ سپوت مجھے پہلی نظر میں تیرے لئے اچھا لگا پھر وہ شہر والا ہے اور تیرے خیالات بھی تو بڑے اونچے ہیں۔'' مہرو ہاتھ چلاتے ہوئے اسے مجید قمرانی کے بارے میں تفصیلی رپورٹ دے رہی تھی۔

''دھت..... تُو بھی ناں.....'' فاطمہ شرما کر پہلو بدل گئی۔

''اچھا چل تُو میرے ساتھ ایک نظر دیکھ تو لے پھر دیکھتی ہوں تیری یہ گوری رنگت کیسے دمکنے لگتی ہے جلدی کر ہم چاچا اکبر سے اس کی خیر خبر لینے چلتے ہیں۔'' مہرو نے فاطمہ کے گال پہ چٹکی لے کر کہا۔

''رک تو سہی۔'' فاطمہ نے جلدی جلدی اپنی بڑی بڑی آنکھوں میں کاجل لگایا' کلائیوں کو چوڑیوں سے بھرا اور چنری سلیقے سے شانوں پر پھیلائی اور کھڑی ہوگئی۔

''تو ایسے جائے گی؟'' مہرو نے اسے آنکھیں دکھائیں۔''بابا نے تیرے دیکھ لیا تو ساری اکڑ فوں یہیں نکال دیں گے' چل آنچل سر پہ ڈال۔'' مہرو نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔

''لے چل ہو جا خوش۔'' فاطمہ نے آنچل سر پہ سجایا اور دونوں کھی کھی کرتے ہوئے اٹھ گئیں۔

O......O......O

''مجید' یہ نور بابا کی دھی ہے۔'' مہرو اسے سامنے کر کے خود کواڑ سے پرے ہوگئی۔ اکبر چاچا اس کا تعارف کراتے ہوئے اسے اندر بلانے لگا۔

''آ اندر آجا' کیسا ہے تیرا بابا؟''

''جی اچھا ہے۔'' اس نے آہستگی سے جواب دیا اور بے چارگی سے اپنے پہلو میں دیکھا' مہرو کب کی جا چکی تھی۔

''آجا بیٹا' میں تیری ماسی کو بلاتا ہوں۔'' اکبر چاچا اسے بڑی اپنائیت سے بلا رہے تھے مگر اس کی نظریں مجید کے سراپے میں الجھ کر رہ گئی تھیں' بالکل فلمی ڈراموں والا انداز' جینز شرٹ میں ملبوس' کلین شیو' لمبا چوڑا مجید اسے پہلی نظر میں بھا گیا۔ مجید کی نظر بھی فاطمہ کے سراپے سے ہٹ نہیں رہی تھی۔ مجید کے ایک ٹک دیکھنے سے فاطمہ نے نظریں جھکا لیں' شرم کی لالی اس کے چہرے پر سمٹ آئی اور وہ وہاں سے بھاگ آئی۔

O......O......O

''میں کہتی تھی ناں کہ شہری بابو تیرے قابل ہے' دیکھا' کیسا چھورا تاڑا ہے میں نے تیرے لئے۔'' مہرو نے آنکھیں پھیلاتے ہوئے کہا۔

''تُو کہتی تو سچ ہے۔'' فاطمہ نے اپنی آنکھیں مٹکائیں۔

''ملواؤں تجھے اس سے؟'' مہرو کا یہ جملہ فاطمہ کے دل کے تار چھیڑ گیا۔

''کیا کہہ رہی ہے تُو؟'' فاطمہ نے تھوک نگلتے ہوئے کہا۔

''پیار کی کنڈی تو یونہی آگے بڑھتی ہے' جب تک ہمت نہیں کرے گی تب تک معاملہ کیسے آگے بڑھے گا؟''

''اچھا چل' اگر تُو کہتی ہے تو پھر ٹھیک ہے۔'' فاطمہ نے ہامی بھرلی۔

''اوئے ہوئے' ایک بار تیرا اور مجید کا پیار شروع ہو جائے پھر لگن ہونے میں دیر نہیں لگے گی لیکن دیکھ' اپنی سکھی کو نا بھول جانا تُو پیا دیس سدھار جائے اور مجھے بھول جائے' یہ مجھ سے برداشت نہیں ہوگا۔'' مہرو ہاتھوں کے ساتھ ساتھ پیر بھی ہلا رہی تھی۔

فاطمہ کی دنیا رنگین ہو چکی تھی' خوشنما تصورات اسے پاگل کر رہے تھے' فلموں ڈراموں کے مناظر کی طرح ایک ایک سین کٹ ٹو کٹ کی طرح اس کے احساسات کو رعنائیاں دے رہا تھا۔ کچھ ہی پل میں مجید کا چہرا' اس کا سراپا اس کے لئے اتنا مانوس ہو چکا تھا کہ وہ کچھ بھی جانے سمجھے بنا اپنا آپ اسے سونپنے کے لئے تیار تھی۔

''لے تُو' تو کام سے گئی؟'' مہرو نے اسے چھیڑا۔

''نہیں' بس یونہی' چھوڑ مجھے' تُو شربت پیئے گی؟''

''شربت؟ کیا نور چاچا نے ستو لانا چھوڑ دیا؟''

''چل' تجھے ستو ہی پلاتی ہوں۔'' فاطمہ نے تیزی سے اٹھتے ہوئے کہا۔

''سن' ذرا گڑ زیادہ ڈالنا۔'' مہرو نے دو بدو جواب دیا۔

''ہاں ہاں' گڑ بھر بھر کے تجھے پلاؤں گی تاکہ تُو یونہی میٹھا میٹھا بولتی رہے۔'' فاطمہ نے ہنستے ہوئے گڑ بٹے سے توڑنا شروع کر دیا۔

''سیانی کہیں کی۔'' مہرو دانت پیستے ہوئے بولی اور فاطمہ کو گھورتی نظروں سے دیکھنے لگی۔

O......O......O

فاطمہ دیر سے کھڑی پکی فصلوں کے نظاروں سے لطف اندوز ہوتے ہوئے مجید کا انتظار کر رہی تھی۔ اس کے پاؤں تلے سبزہ مخمل کی طرح بچھا ہوا تھا جس پر طرح طرح کے پھولوں نے سلمٰی ستارے کا کام کر رکھا تھا۔ آج وہ مہرو کی خواہش پر زرد رنگ کا گھاگھرہ چولی پہن کر تیار ہوئی تھی۔ اس کے بال کھلے ہوئے تھے۔ کلائیوں کی بجتی چوڑیاں اور پازیب کی جھنکار اس کے دل کو نئے سُروں سے آشنائی دے رہی تھی۔

انتظار جانے کیوں صبر آزما ہوتا ہے؟ بابا صحیح کہتا ہے' جب تک انتظار کی فصل دل میں نہیں پک جاتی' تب تک کھیتوں کی ہریالی نظر نہیں آتی۔ وہ خود کو فصلوں میں چھپائے کھڑی تھی مگر آسمان اسے گھور گھور کر دیکھ رہا تھا۔ اس نے نیلی جیکٹ پہنے آسمان کو نظر بھر دیکھا۔

''فاطمہ......!'' اگلے ہی لمحے اس نے خود کو سنبھالا۔ اس کے سامنے مجید کھڑا تھا۔ میلوں انتظار سے ملن تک کا سفر اب گز بھر کا رہ گیا تھا۔ فاطمہ نے مسکراتے ہوئے نظریں جھکا لیں۔

''مہرو یہی کہتی ہے' تم بہت حسین ہو۔'' مجید نے سرد آہ بھری۔

''اپنے بارے میں کچھ بتاؤ۔'' مجید نے اس کی جانب بھرپور نظروں سے دیکھا۔

''میں فاطمہ ہوں' بابا کے ساتھ رہتی ہوں اور مجھ سے چھوٹی میری ایک بہن ہے۔'' لفظ ٹوٹ ٹوٹ کر ادا ہو رہے تھے۔ شرم قینچی بن گئی تھی جو اس کے لہجے کو بار بار کاٹ رہی تھی۔ مجید کے چہرے پر آتی مسکراہٹ دل میں امڈتے جذبات کی عکاس تھی۔

''آپ شہر میں ہوتے ہیں؟'' فاطمہ سومرو نے چوری سے اسے نظریں اٹھا کر دیکھا۔

''ہاں' میں کراچی میں ہوتا ہوں ایک ہفتے کے لئے آیا ہوں' پھر چلا جاؤں گا۔''

''صرف ایک ہفتہ؟'' فاطمہ کا چہرہ یکدم ہواؤں کی نظر ہو گیا۔

''ہاں' ایک ہفتہ۔'' اس نے اسی کے انداز میں جواب دیا۔

''اچھا۔'' وہ دل مسوس کر رہ گئی۔

''پڑھی لکھی ہو؟'' مجید کا یہ سوال اسے کچھ اچھا نہیں لگا مگر اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''موبائل دوں تو استعمال کر لوگی؟'' اگلے سوال نے فاطمہ کے چہرے کی رونقوں میں

اضافہ کر دیا۔

"جی..... جی.....؟"

فرنٹ پاکٹ سے موبائل نکال کر اس کی گلابی ہتھیلی پر رکھتے ہوئے مجید نے اپنا سر آہستہ سے اس کی پیشانی سے لگایا تو وہ دل تھام کے رہ گئی۔

"سکھاؤں تمہیں؟" مجید نے ہولے سے اس کے کان میں سرگوشی کی۔

"وہ کیا ہی سیکھتی' بس وہ مجید کے سحر میں ڈوبی اپنی سماعتوں کو یقین دلاتی رہی کہ وہ اس کے بہت قریب ہے اور بالکل ویسا ہی ہے جیسا ہمیشہ اس نے اپنے لئے سوچا تھا۔

"بابا گھر لوٹ آیا ہوگا' میں چلتی ہوں۔" وہ آہستہ سے بولی۔

"ٹھیک ہے' میں تمہیں کال کروں گا۔" مجید نے اس کی آنکھوں میں جھانکا اور پھر ایک غیر ارادی طور پر بوسہ اس کے گال پر ثبت کرتا وہ مڑ گیا مگر فاطمہ کے لئے اس کے لبوں کا لمس زندگی کی رمق بن گیا۔

O.....O.....O

فاطمہ جس کے لئے وقت کاٹے نہیں کٹتا تھا' اب یوں گزر رہا تھا جیسے وقت کو پر لگ گئے ہوں۔ مجید واپس جا چکا تھا۔ دونوں کی موبائل پر باتیں شروع ہو چکی تھیں۔ رات فاطمہ' مجید سے باتیں کر کے گزارتی جبکہ دن بھر وہ منہ ڈھانپے سوتی رہتی۔ فاطمہ کی ضد پر مجید دو دن کے لئے ڈھرکی آیا تھا مگر اسے کیونکہ لمبی چھٹیاں نہیں مل رہی تھیں اس لئے وہ جلدی چلا گیا مگر بے قراری فاطمہ کا نصیب کر گیا۔

فاطمہ کی شدت سے یہ خواہش تھی کہ مجید اسے ہمیشہ کے لئے اپنے پاس رکھ لے مگر مجید ابھی اس کے لئے تیار نہیں تھا۔ وہ فاطمہ سے بیاہ کے لئے راضی تو تھا مگر اسے وقت درکار تھا جبکہ فاطمہ کے لئے یہ بات گزرتے دنوں کے ساتھ ساتھ اذیت بنتی جا رہی تھی کہ مجید جب اس سے پیار کرتا ہے تو پھر کیوں وہ دیر کر رہا ہے؟ اس سوچ بچار میں دو سال کا عرصہ گزر گیا اور بالآخر وہ اپنی اذیت نما سوچوں کے شکنجے سے نکلنے میں کامیاب ہو گئی۔ اس نے از خود فیصلہ کیا' ایک ایسا فیصلہ جو اس کے لئے زندگی اور موت کا فیصلہ ثابت ہو سکتا تھا۔

O.....O.....O

فاطمہ مختصر سامان کے ساتھ کراچی جانے والی بس میں سوار ہو چکی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹی سے پرچی تھی جس میں شاہ لطیف ٹاؤن کا ایڈریس لکھا تھا جہاں مجید کی رہائش تھی۔ وہ اسٹیل ملز میں جاب کرتا تھا۔ فاطمہ نے پرچی کو مضبوطی سے مٹھی میں دبا لیا اور کھڑکی کے باہر نظاروں میں گم ہو گئی۔ چھوٹی بہن اور بابا کی یاد آہستہ آہستہ اس کے انتہائی قدم پر حاوی ہونے لگی مگر وہ سارے خیالات جھٹکتی رہی' طویل سفر ختم ہوا اور وہ کراچی بس اڈے پر اتر گئی' تب اس نے مجید کا نمبر ملایا اور اسے بتایا کہ وہ کراچی پہنچ چکی ہے' وہ اسے لینے آجائے مگر یہ سنتے ہی مجید کے پیروں سے تو زمیں نکل گئی۔

''واپس چلی جاؤ تم نہیں جانتی' گاؤں والے ہمیں کاروکاری کے جرم میں مار دیں گے' ہم بے موت مارے جائیں گے۔ ذرا صبر کرو' کیا تمہیں مجھ پر اعتبار نہیں ہے؟''

مجید چلا چلا کر اسے سمجھا رہا تھا۔

''نہیں' پہلے تم مجھے لینے آؤ پھر باقی باتیں بعد میں' میں سنوں گی۔'' ابھی وہ اسے قائل ہی کر رہی تھی کہ مجید نے لائن کاٹ دی اور پھر فاطمہ بدستور مجید کا نمبر ملاتی رہی مگر نمبر مسلسل بند مل رہا تھا۔

'اونہہ' کیا سمجھتا ہے خود کو' وہ قریب ہی کھڑی ایک ٹیکسی کے پاس آئی اور ٹیکسی ڈرائیور کی جانب پرچی بڑھا دی جس پر مجید کے گھر کا پتا لکھا ہوا تھا۔

''محترمہ' یہ تو نامکمل ایڈریس ہے' اس میں مکان نمبر ہی نہیں لکھا ہے۔ شاہ لطیف ٹاؤن تو بہت بڑا ہے' آپ کہاں بھٹکیں گی؟'' ڈرائیور اپنی دانست میں مشورہ دیتا ہوئے ٹیکسی گھمانے لگا جبکہ وہ وہیں کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ جلد بازی میں کیا گیا فیصلہ بھاری ثابت ہوا تھا۔ آنسو تواتر سے اس کی آنکھوں سے بہہ رہے تھے' تب اس نے ہمت مجتمع کی اور وہاں بس اڈے پر موجود ایک بڑی عمر کی خاتون کا انتخاب کیا جو شکل سے معزز لگ رہی تھیں۔

''دیکھیئے میں ایک غریب لڑکی ہوں' میرا آگے پیچھے کوئی نہیں' اگر آپ میری مدد کر سکیں تو میں آپ کی شکر گزار رہوں گی۔ ابھی ابھی میں گاؤں سے یہاں پہنچی ہوں۔ اگر ہو سکے تو مجھے کوئی کام دلا دیں۔ خاتون نے نظر بھر کر اس کی طرف دیکھا اور بولی۔

"دیکھو بچی.....! اپنے گاؤں واپس چلی جاؤ۔ تم جوان جہان ہو یہاں تم اکیلی نہیں رہ سکتیں۔" خاتون کا انداز اسے سمجھانے والا تھا۔

"نہیں نہیں آپ کوئی کام مجھے بتا دیں، میں گزارہ کر لوں گی۔ اگر آپ مجھے اپنے پاس رکھ لیں تو میں آپ کے گھر کا کام کر دیا کروں گی۔" وہ تیز تیز لہجے میں بول رہی تھی۔

"اچھا آؤ میرے ساتھ۔" خاتون اس کی ضد کے آگے مجبور ہو گئیں اور اسے گاڑی میں بٹھا کر دارالامان لے آئیں۔ وہ خاموشی سے باہر کھڑی منتظر تھی۔ تھوڑی دیر میں وہ خاتون پرس شولڈر پر ٹینگ کرتی ہوئی اس کی جانب آ گئیں۔

"اب تم یہیں رہو گی، یہاں تمہیں کسی قسم کی تکلیف نہیں ہو گی۔ یہ لوگ تمہیں پناہ دیں گے بس تم ان کا کہنا ماننا۔"

فاطمہ ہامی بھرتی ہوئی اندر داخل ہو گئی مگر کچھ ہی گھنٹوں میں وہ سمجھ گئی کہ وہ عورتوں کی ایک جیل میں آ گئی ہے اس کے خواب، خیال اور ٹھٹھرتے ہوئے اعصاب اس وقت منتشر ہوئے جب رہنمائی کرنے والے ایک افسر نے اسے چبھتی، شوخ نظروں سے دیکھا۔ اسے ایک خاص کمرے میں بھیجا گیا تھا، وہاں اس جیسی ایک سے ایک حسین صورتوں والی عورتیں موجود تھیں۔ وہ تو ابھی بچی تھی مگر قدرت نے عورت کو یہ خاصیت دی ہے کہ وہ غلط نظروں کو ہزاروں میں بھی پہچان لیتی ہے۔ اس نے نظریں جھکائے جھکائے انہی عورتوں کے درمیان اپنی جگہ بنالی اور اپنا غلط نام اور پتا بتانے لگی جس کا اندراج ایک بندہ کر رہا تھا جو لکھ کم رہا تھا وراسے گھور زیادہ رہا تھا۔

O......O......O

فاطمہ کو یہاں آئے ابھی ایک رات نہیں گزری تھی کہ اس نے یہاں سے فرار کا منصوبہ بنا لیا تھا اور پھر اگلے تین دن میں اس کا منصوبہ کامیاب ہو گیا، دیوار پھلانگنے اور اتنی تیز رفتاری سے بھاگنے کا اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا مگر بس وہ بھاگ رہی تھی گو کہ سیکیورٹی گارڈ نے اسے نہیں دیکھا تھا مگر ایک لاشعوری خوف تھا کہ کوئی ہے جو اسے پکڑنے کی سعی میں مسلسل اس کے پیچھے بھاگتا آ رہا ہے۔ جب وہ بھاگتے بھاگتے تھک گئی تو اس نے پناہ لینے

کی غرض سے ایک احاطے میں بیٹھی عورتوں میں اپنی جگہ بنالی، وہاں سیلانی ویلفیئر کے توسط سے دسترخوان لگایا جارہا تھا۔ بھوک بھی عجیب آگ ہے جب پیٹ میں لگ جائے تو ہاتھ پاؤں مارتا انسان اسے بجھانے کیلئے کچھ بھی کرنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔اس نے بھی صبر وشکر کے ساتھ سب کے ساتھ کھانا کھایا، اب اس کی نظریں بڑی سی گاڑی میں بیٹھے ایک بھلے سے انسان کا احاطہ کر رہی تھیں۔ وہ خاموشی سے کپڑوں کی گٹھڑی سینے سے لگائے اس کے پاس پہنچی اور اس سے مدد طلب کرنے لگی اس کی پوری روداد سننے کے بعد اس شخص کو فاطمہ پر ترس آگیا اور فاطمہ کو اپنے ساتھ لیے لیاری کے علاقے میں آگیا جہاں اس نے ایک کمرے کا مکان کرائے پر لے کر فاطمہ سومرو کو دیا۔

حمید بلوچ نامی یہ شخص فاطمہ کے لئے حقیقی بھائیوں جیسا ثابت ہوا۔ وہ فاطمہ کی کفالت کرنے لگا۔ضرورت زندگی کا ہر سامان اسے میسر کرنے لگا اور اس کے ساتھ ساتھ اس نے فاطمہ کے بتائے ایڈریس پر مجید کو ڈھونڈنے کی کوششیں بھی شروع کر دی تھیں، دوسری طرف ڈھرکی میں فاطمہ سومرو کے گھر والے جرگے تک پہنچ گئے۔ فاطمہ کے بابا کا خیال تھا کہ مجید فاطمہ کو بھگا کر لے گیا ہے جبکہ مجید کے گھر والوں کا کہنا تھا کہ مجید تو خود لاپتا ہے، وہ کراچی میں کہاں رہتا ہے ہم تو یہ بھی نہیں جانتے۔ جرگے نے فیصلے کے بعد اعلان کیا کہ دونوں باہمی رضامندی سے بھاگے ہیں، اسی لئے دونوں کو کاروباری کے جرم کا مرتکب ٹھہرایا گیا اور یہ اعلان بھی کیا گیا کہ دونوں کو جہاں دیکھا جائے وہیں مار دیا جائے۔

O......O......O

ادھر ایک ہفتہ ہونے کو آیا تھا، حمید بلوچ کا کچھ پتا نہیں چل رہا تھا، فاطمہ کے پاس ضرورت زندگی کا سارا سامان ختم ہو چکا تھا اور اب کمرے کی مالکن اس کے سر پر سوار تھی کہ وہ اس کمرے کا کرایہ بھرے، زندگی نے اس کے ساتھ عجیب مذاق کیا تھا یا شاید وہ خود اپنی زندگی کا مذاق بنانے پر تلی ہوئی تھی۔ بابا کا چہرہ، بہن کی میٹھی باتیں اسے یاد آرہی تھیں، گھر سے دور کراچی شہر کے ایک کونے میں وہ سب کی یادوں کو سجائے رنجیدہ تھی مگر اسے سب سے زیادہ غصہ مجید پر آرہا تھا جس کی خاطر اس نے اتنا بڑا قدم اٹھایا تھا مگر اس نے اس کا ساتھ نہیں دیا

اور اس دن سے آج تک اس کا نمبر بھی بدستور بند مل رہا ہے اس کا مسیحا حمید بلوچ جو اسے یہاں تک لایا تھا، وہ بھی ایک ہفتے سے لاپتہ تھا۔ وہ ہی تو اب اس کا واحد سہارا رہ گیا تھا جو مجید کو ڈھونڈنے میں اس کا مددگار تھا۔

جب کمرے کی مالکن حمیدہ بیگم کا زور بڑھ گیا تو اس کے پاس کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ اپنی سرگزشت ان کو سناتی، ویسے بھی دل نے اپنا فیصلہ سنا دیا تھا کہ وہ گھر جا کر بابا سے معافی مانگ لے گی، ان کے پاؤں پڑ جائے گی مگر رہے گی وہیں اپنوں کے ساتھ، جذبات میں آکر جو اس نے بڑا فیصلہ کر لیا تھا وہ آج اس کے لئے عذاب بن چکا تھا۔ وہ صدق دل سے اپنے رب سے معافی کی خواستگار تھی۔ مکان کی مالکن حمیدہ بیگم ایک سمجھ دار خاتون تھیں، انہوں نے فاطمہ سومرو کی مکمل کہانی سنی اور اس کی مدد کرنے کا فیصلہ کیا اور سب سے پہلے ایک آدمی کو صورت حال معلوم کرنے کیلئے فاطمہ کے گاؤں بھیجا۔

O......O......O

"فاطمہ بیٹی....! جو کچھ ہم تمہیں بتا رہے ہیں، وہ تحمل سے سنو۔ کبھی کبھی انسان بہت بڑے بڑے فیصلے اتنی آسانی سے کر لیتا ہے کہ اس کے وہم و گمان میں بھی یہ نہیں ہوتا کہ ایک دن یہ فیصلہ اس کی زندگی کا سب سے بڑا المیہ بن جائے گا۔ بیٹی....! نافرمانی چاہے اللہ کی ہو یا والدین کی، دونوں صورتوں میں اس کا نتیجہ مصائب ہی نکلتا ہے۔ تمہارا فیصلہ قلبی تھا یا عقلی، تم نے گھر چھوڑ کر اچھا نہیں کیا۔ جانتی ہو، مجید ابھی تک لاپتہ ہے اور تمہارے بھاگ آنے سے جرگے والوں نے تم دونوں پر کاروکاری کا الزام لگایا ہے اور انہوں نے یہ فیصلہ سنایا ہے کہ تم دونوں میں سے جو کوئی بھی نظر آیا، وہ اسے قتل کر دیں گے۔"

"کیا....؟" وہ جو خود کو ملامت کرتی خاموشی کا سہارا لئے بیٹھی تھی، اچانک چیخ اٹھی۔ "میرے بابا تو خیریت سے ہیں ناں؟ میری بہن کیسی ہے؟" وہ ایک دم پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

"ہاں بچی...! وہ دونوں خیریت سے ہیں مگر تمہارے محسن حمید بلوچ کو انہوں نے قتل کر دیا ہے، حمید بلوچ نے تمہارے گاؤں والوں سے رابطہ کیا تھا، وہ مجید کو ڈھونڈنا چاہ رہا تھا، پس

تمہارے ظالم جرگے نے حمید کو قتل کر دیا، ان کی نظر میں وہ تم دونوں کی مدد کر رہا تھا اس لئے حمید غائب ہے۔"

"نہیں...." فاطمہ زاروقطار رونے لگی۔ حقیقت اس پر غضب بن کر ٹوٹی تھی۔ اسے لگا کہ وہ اندھی کھائی میں گر گئی ہے اور سارے راستے بند ہو گئے ہیں، جلتا، کڑھتا دل صرف آنکھوں میں پانی بھر رہا تھا اور وہ حمیدہ بیگم کے سینے سے لگ کر جیسے پھٹ گئی تھی۔ بابا اور بہن سے ملنے کا احساس، خواہش معدوم ہو گئی تھی۔ جان ہر کسی کو پیاری ہوتی ہے، یقیناً اسے بھی پیاری تھی اگر اس نے واپس اپنے گاؤں میں قدم رکھا تو وہ لوگ اسے جان سے مار دیں گے، وہ اپنے محسن کو کھو چکی تھی اور اب اس کے اس عمل نے یقیناً مجید کے دل میں بھی اس کے لئے نفرت کا الاؤ بھڑکا دیا تھا۔ عجیب کشمکش تھی، ایسا لگ رہا تھا جیسے بھری دنیا میں اس کا کوئی باقی نہیں رہا۔

"آپ اگر مجھے کسی جگہ جاب کروادیں تو میری گزر بسر ہو جائے گی۔ میرے پاس تعلیم تو زیادہ نہیں ہے۔ لیکن پھر بھی...." وہ خلا میں گھورتی دردناک خیالات کی رو میں بہہ رہی تھی۔

"بیٹا....! اگر چاہو تو میں تمہاری مدد کر سکتی ہوں؟"

"جی...." اس نے امید بھری نظر سے حمیدہ بیگم کو دیکھا۔

"تم اگر راضی ہو تو میں اپنے بیٹے سے تمہارا نکاح کروا دیتی ہوں۔"

"کیا..... سلیم سے؟" وہ حیران سی ان کا چہرہ تک رہی تھی۔ سلیم بمشکل پندرہ سال کا لڑکا تھا اور میٹرک کا اسٹوڈنٹ تھا۔ "یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" وہ زیر لب بڑبڑائی۔

"بیٹا تم سوچ کر بتا دینا، اور باقی جیسی تمہاری مرضی۔"

حمیدہ بیگم فیصلہ اس پر چھوڑ کر جا چکی تھیں جبکہ وہ اس غم کو گلے لگائے بیٹھی تھی جو اس کے ہمت اور حوصلے سے باہر تھا، اس کی برداشت سے باہر تھا۔ دکھ اور مصائب اسکی صلاحیتوں کو پرکھنے کے لئے آگے بڑھ رہے تھے۔ اب یہ کڑا وقت اس سے، اس کے حوصلے کا امتحان لینا چاہتا تھا۔

فاطمہ سو مرو رات بھر کروٹیں بدلتی رہی، ایک طوفان تھا جو اس کے دل و دماغ کو جھنجھوڑ رہا تھا۔ کیا کروں، کس سے مدد لوں، کون مجھے مشورہ دے گا؟ وہ از خود بول رہی تھی، مسلسل بڑبڑا رہی تھی۔ اچانک وہ ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھی، اطراف میں گھپ اندھیرا سوچوں کو منتشر کرنے لگا۔ فاطمہ نے بستر چھوڑ دیا اور بے ساختہ سوئچ آن کیا، کمرہ روشن ہوگیا فاطمہ نے دیوار میں لگے چھوٹے سے آئینے کی طرف نظر بھر کر دیکھا اور یکلخت فیصلہ کیا کہ میں اپنی زندگی کے سب سے اہم ترین فیصلے کیلئے خود اپنی ذات سے مشورہ کرتی ہوں۔ بوجھل قدموں کے ساتھ وہ آئینے کے سامنے کھڑی ہوگئی۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں، ایسے میں دروازے پر آہٹ سی محسوس ہوئی تو اس نے بے ساختہ سوئچ آف کیا اور پھر گھپ اندھیرے کی آغوش میں چلی گئی۔ ''شاید کوئی ہے، کون ہوسکتا ہے؟'' وہ اندر ہی اندر بڑبڑائی، خوف کی ایک سرسراہٹ اس کے جسم کو لرزا رہی تھی، اس نے قدرے دبی ہوئی آواز میں پوچھا۔

''کون ہے؟''

''فاطمہ باجی.... !دروازہ کھولیے۔''

''ارے، یہ تو سلیم ہے، گزشتہ دو راتوں سے اس نے میری نیند حرام کر رکھی ہے، یہ کیوں آیا ہے؟'' وہ خود سے مخاطب تھی۔

''باجی.... !دروازہ کھولیے جلدی سے۔'' فاطمہ نے یکدم دروازہ کھول دیا۔ سلیم اندر داخل ہوا اور دروازہ بند کردیا۔

''کیوں آئے ہو؟ کس نے بھیجا ہے؟ خیریت تو ہے؟ جلدی سے بتاؤ۔'' فاطمہ نے سوالات کا ایک سلسلہ شروع کردیا۔ یہ کیفیت سلیم بھی بھانپ گیا جسے فاطمہ محض پندرہ سال کا بچہ سمجھ رہی تھی، اس نے انتہائی بردباری سے کہا۔

''باجی! ڈرنے کی کوئی بات نہیں، میں ایک اہم مسئلہ پر آپ کی رائے لینے آیا ہوں، ابھی تک میرے اور آپ کے درمیان بہن اور بھائی والا رشتہ برقرار ہے اسی لئے میں آپ کو باجی کہہ کر پکار رہا ہوں، لیکن باجی! اماں اور ابا کی سوچ اتنی بری بھی نہیں۔ میں اپنے ماں باپ کا اکلوتا بیٹا ہوں، یہ سب کچھ میرا ہی تو ہے، میں آپ کو ہر خوشی دینے کو تیار ہوں، جس کی

تمنا میں آپ نے گھر چھوڑا، ماں باپ سے جدا ہوئیں اور اب زندگی بچانے کی جدوجہد میں ہمارے گھر کی دہلیز تک پہنچ چکی ہیں۔ مجھے سمجھ نہیں آرہا کہ میں اور کیا کہوں؟ آپ سوچئے گا؟" سلیم اچانک کھڑا ہو گیا۔" باجی! میں جا رہا ہوں، مجھے امید ہے آپ میری اماں کو مایوس نہیں کریں گی۔" یہ کہتا ہوا سلیم کمرے سے نکل گیا۔

فاطمہ کچھ دیر تک گم سم اندھیرے کے درمیان کھڑی رہی اور پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ یہ آنسو اس فیصلے پر بہہ رہے تھے جو ایک کم عمر، نا سمجھ میٹرک کے طالب علم نے کر دیا تھا....اور اس فیصلے کی ندامت کی صورت میں نکل رہے تھے جو فاطمہ نے مجید کی محبت میں گھر سے بھاگ کر کیا تھا....اور شاید اپنے مسیحا حمید بلوچ کی یاد میں بھی۔

☆......☆......☆

زندگی کہاں ہے تُو

میں موت سے خوفزدہ نہیں ہوں ، نہ مجھے قبر سے ڈر لگتا ہے، موت پر میرا یقین غیر متزلزل ہے، سب کو مرنا ہے اور مجھے بھی..... ''کل نفس ذائقۃ الموت'' یہ میرے ایمان کا حصہ ہے مگر آج جب قبرستان کی پگڈنڈی سے میرا گزر ہوا اور قطار میں بنی تازہ قبریں دیکھیں تو مجھ پر دہشت طاری ہوگئی۔ قبرستان کا رقبہ وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا جا رہا ہے، نئی نئی قبریں آباد ہو رہی ہیں۔ ایک دن میں بیس سے تیس قبریں تیار ہو جاتی ہیں اور دوسری طرف جب میں نظر دوڑاتی ہوں تو دیکھتی ہوں، حکومت کی مختلف اسکیمیں تیزی سے ترقیاتی مراحل سے گزر رہی ہیں۔ فلاں گارڈن تو فلاں بنگلوز ،ان اسکیموں کے تحت لمبی لمبی اقساط بھرنی پڑتی ہیں پھر کہیں جا کر سالوں کے بعد گھر نصیب ہوتا ہے لیکن یہ قبرستان تو اتنی تیزی سے آباد ہو رہے ہیں کہ ایک پل کے لئے مجھے ڈر لگنے لگا ہے کہ ان نئی نئی اسکیموں کے تحت بنائے گئے گھروں میں کیا کوئی آباد بھی ہو سکے گا؟

آج کا اخبار میرے سامنے ہے ٹارگٹ کلنگ میں مرنے والوں کی تعداد آج چھ ہے جبکہ کل آٹھ تھی۔ اس سے پہلے دو تھی اور اس سے پہلے نو تھی۔ میں گزشتہ کچھ دنوں سے اپنے مزاج کے برخلاف کام کر رہی ہوں، مجھے حساب کتاب سے سخت چڑ محسوس ہوتی ہے کوئی مجھے بقیہ رقم دیتا ہے تو میں اس پر اعتبار کرتے ہوئے وہ رقم خاموشی سے پرس میں رکھ لیتی ہوں کیونکہ مجھے حساب کرنا اچھا نہیں لگتا، شاید یہ میری عادت ہوگئی ہے یا پھر آپ یوں سمجھ

لیجئے کہ میں حساب کتاب میں کمزور ہوں.... مگر گزشتہ کچھ ہفتوں سے جانے کیوں میرا حساب اچھا ہوتا چلا جارہا ہو اور تو اور میری یادداشت میں بھی اضافہ ہوا ہے۔

اخبارات پڑھنا میرا شوق ہے، ایک تو مختلف خبروں سے آگہی ہو جاتی ہے، شہر کے حالات پتہ چل جاتے ہیں اور سب سے بڑی بات، وقت مثبت گزر جاتا ہے لیکن جانے کیوں گزشتہ کچھ ہفتوں سے میں ٹارگٹ کلنگ سے مرنے والوں کی تعداد پر غور کر رہی ہوں، یہ تعداد پہلے انگلیوں پر شمار کرتی تھی، پھر خود بخود ہی یوں ہونے لگا کہ ذہن میں ابھرتے ہندسوں میں، میں چار سے آٹھ ہندسوں کا اضافہ کر کے ایک جوابی ہندسے کو تشکیل دینے لگی اور پھر خوفناک بات یہ ہوئی ہے کہ یہ نیا ہندسہ مجھے اگلے دن یاد رہنے لگا اور میں اس میں مزید ہندسے ملا لیا کرتی ہوں....یا میں یوں کہوں کہ جیسے جیسے گولیوں کی صورت اسلحے سے نکلا بارود زندگیوں کو موت کے حوالے کرتا جا رہا ہے اور فاتحہ پڑھنے والوں کا گراف بڑھتا جا رہا ہے، ویسے ویسے میرے خیالوں کی آماجگاہ میں خیال کی جگہ درد آباد ہوتا جا رہا ہے، میری ہر سوچ مجھے اذیت نما زنجیروں میں جکڑتی جا رہی ہے اور ان زنجیروں میں ملبوس میرا جسم مفلوج ہو کر رہ گیا ہے۔ ایک ہی پوزیشن میں دیر تک بیٹھے رہنے اور سوچنے کے عمل نے میرے ذہن کو ماؤف کر دیا ہے۔ ٹارگٹ کلنگ کے ان ہندسوں کے کھیل میں، میں انجانے میں ان گولیوں کا شمار کر رہی ہوں جو بے حسی کی بندوق سے نکل کر بے گناہ افراد کے جسموں میں پیوست ہو جاتی ہیں۔ آج کی گنتی میں ایک معصوم سی بچی دعا فاطمہ بھی شامل ہے جو بڑے ظالمانہ انداز میں قتل کر دی گئی۔

اورنگی ٹاؤن سے تعلق رکھنے والی اس معصوم بچی کے ساتھ مزید چھ افراد بھی قتل کر دیے گئے۔ قاتل کون تھے اور انہیں کیوں قتل کیا گیا اس سوال کا جواب تو ہمارے قانون نافذ کرنے والے ادارے تک دینے سے قاصر ہیں تو بھلا میں کیا بتاؤں؟

دن بھر کی محنت مشقت کے بعد لوگ اپنے گھروں کو لوٹ رہے تھے کہ پہاڑی کے قریب سے گزرتی ہوئی بس پر اچانک گولیوں کی بوچھاڑ ہونے لگی اور بس کے فرش سے خون کی دھاریں سڑک کو سرخ کر گئیں۔ ان میں معصوم دعا فاطمہ بھی بے جان پڑی تھی جس نے

اپنی ماں کی انگلی کو مضبوطی سے تھام رکھا تھا اور اس کی ماں بھی زخموں سے چور سسک رہی تھی۔

آج میرے قدم اسپتال کی راہ داریوں کو عبور کرتے ہوئے دعا فاطمہ کی ماں کو تلاش کرتے اس تک پہنچے ہیں۔ ریڑھ کی ہڈی میں گولی لگ جانے کی وجہ سے وہ بے حس و حرکت اسپتال کے بستر پر پڑی ہے۔ ماں کے بے بس وجود کا آئینہ اس کا چہرہ جس پر مجھے دعا فاطمہ کا سایہ جھلکتا نظر آیا، کرب ماں کی آنکھوں میں تھا اور چہرے کے زاویے اشک میں ڈوبے دعا کی موت پر ماتم کناں تھے۔ یقیناً اس ماں کی سوچیں دہرے عذاب سے گزر رہی ہوں گی کہ آیا، اپنے زندہ بچوں کے لئے زندہ رہے جو ماں کے منتظر بے یار و مددگار نظر آتے ہیں جن کے کملائے چہرے حسرت کی تصویر نظر آتے ہیں جو ماں کی شفقت کے منتظر ہیں یا پھر وہ دعا کی ناگہانی موت کا غم سناتی رہے اور یونہی اس روگ کو گلے لگائے دعا کے پاس چلی جائے۔

''امی...! دیکھئے، آپ سے کوئی ملنے آیا ہے؟'' قریب بیٹھی لڑکی نے آگے بڑھ کر ماں کا چہرہ میری جانب کیا۔ نظروں کے تبادلے نے مجھے سر جھکانے پر مجبور کر دیا۔ کوئی حرف تسلی ،کوئی تریاق، کیا کہتی میں؟ شاید ان کے لئے ان بہلاوؤں کا اثر زائل ہو چکا ہے۔

''امی ....! یہ دعا کے بارے میں پوچھ رہی ہیں؟'' لڑکی نے آنسوؤں میں ڈوبی آنکھوں سے ماں کو دیکھا اور آہستگی سے کہا۔ ایک زور کی سسکی کمرے کی خاموشی کا گلا گھونٹتی ہوئی بیدا ہوئی اور پھر سسکیاں اور آہیں مسلسل ہو گئیں۔ لڑکی ماں کے گلے لگے زار و قطار رو رہی تھی اور ماں ہیجان کی کیفیت میں مبتلا روتی اور پھر خاموش ہو جاتی۔ میں نے آگے بڑھ کر دونوں کو تسلی دی۔ دعا کی بڑی بہن کائنات کو دلاسہ دیتی ہوئی میں اسے راہداری میں لے آئی۔

''اصل میں امی کی طبیعت ٹھیک نہیں، وہ کچھ بھی بتانے سے قاصر ہیں۔'' کائنات نے صدمے میں ڈوبی آواز میں بتایا اور اپنے آنسو پونچھنے لگی۔

''کوئی بات نہیں، امی کو آرام کرنے دو۔'' میں نے دکھی لہجے میں کہا اور نظریں اسپتال کے فرش پر مرکوز کر لیں، عجیب ناگوار سی بو تھی جو طبیعت کو مکدر کر رہی تھی۔

''میرے ساتھ کینٹین چلو گی؟'' میں نے کائنات سے پوچھا۔

''جی، ضرور لیکن ذرا ایک منٹ۔'' یہ کہتے ہوئے کائنات وارڈ کی طرف بڑھی اور نرس کو ہدایت دیتی ہوئی واپس آ گئی۔ ہم دونوں اسپتال کی سیڑھیاں اترتے ہوئے کینٹین میں آ گئے اور ایک موزوں میز کا انتخاب کر کے بیٹھ گئے۔

''دعا کے بارے میں، میں آپ کو کیا بتاؤں، ہم سب کی آنکھ کا تارہ تھی، گھر میں سب سے چھوٹی ہونے کی وجہ سے سب کی لاڈلی تھی، امی، پاپا اور ہم بھائی بہنوں کے جینے کی امنگ جیسی۔ اس دن دعا ٹیوشن سے آ کر بضد تھی کہ وہ امی کے ساتھ ہمارے ایک عزیز کے گھر تقریب میں جائے گی۔ امی نے اسے بہت منع کیا مگر وہ نہیں مانی۔ اس کا اصرار بڑا تھا کہ وہ امی کے بغیر گھر پر نہیں رکے گی۔ بالآخر امی اسے اپنے ساتھ لے گئیں اور پھر نہ آئی واپس....'' کائنات سسکنے لگی مجھے ایسا لگا جیسے آواز اس کے گلے میں دب گئی۔

''آپ کو میں کیا بتاؤں، ہمارے گھر کا آنگن سونا ہو گیا ہے، امی کی حالت ابتر ہے اور ڈاکٹرز بھی مایوسی کا اظہار کر رہے ہیں، ہم غریب گھرانے سے تعلق رکھنے والے لوگ ماں کی بیماری کے اخراجات برداشت نہیں کر سکتے اور نہ ہی ماں کو اس تکلیف زدہ حالت میں چھوڑ سکتے۔'' اس نے اپنی ناک پونچھتے ہوئے کہا۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا اور انگلیاں میز پر رکھے کپ سے کھیل رہی تھی۔

''میں سمجھ سکتی ہوں تمہاری کیفیت، صبر سے کام لو، مجھے یہ بتاؤ، تمہارے والد کیا کام کرتے ہیں؟'' میں نے اس کی سوچوں کا رخ بدلنا چاہا۔

''میرے والد سائٹ ٹاؤن میں ایک نجی فیکٹری میں ملازم ہیں۔''

''اور بھائی....؟'' میرا جملہ ادھورا تھا۔

''بھائی چھوٹا ہے، ابھی تو وہ پڑھ رہا ہے۔'' اس نے مختصر سا جواب دیا اور بے چینی سے پہلو بدلنے لگی..... یقیناً وہ واپس اپنی ماں کے پاس جانا چاہ رہی تھی یا شاید وہ میرے سوالوں سے الجھ رہی تھی۔

''اچھا، تم پریشان نہیں ہو، بس دعا کی معصوم سی تصویر اخبار میں دیکھ کر میں تڑپ سی گئی، میرا دل چاہا کہ میں تم لوگوں سے آ کر ملوں۔'' میں نے دل گرفتگی سے کہا اور خاموش ہو گئی۔

میں اس سے اور کیا کہتی؟ مجھے اپنی ہر بات بے معنی لگ رہی تھی۔

''جی، آپ میرے گھر آسکتی ہیں؟'' اس نے مجھے پُر امید نظروں سے دیکھا۔ اس کا انداز التجائی تھا۔

''ہاں، ہاں، ہاں، ضرور، کیوں نہیں؟'' ۔ میں نے جلدی سے کہا۔

''اگر آپ گھر آجائیں تو میں آپ سے آرام سے بات کرسکوں گی، ابھی مجھے اپنی امی کی فکر لاحق ہے، وہ ہر تھوڑی دیر بعد چیخنے لگتی ہیں، زور زور سے دعا کا نام لیتی ہیں اور پھر روتے روتے خاموش ہو جاتی ہیں''۔ وہ رندھی آواز میں بول رہی تھی۔

''ہاں، ٹھیک ہے، شاباش، تم امی کے پاس جاؤ، ہم پھر بات کریں گے، میں ضرور تمہارے گھر آؤں گی، تم اپنا ایڈریس دو۔'' میں نے اپنے پرس سے ایک چھوٹی سی ڈائری اور قلم نکال کر اس کی جانب بڑھایا۔ اس نے جلدی جلدی ڈائری پر اپنا ایڈریس لکھا اور پھر ہم دونوں کے قدم وارڈ کی جانب بڑھ گئے۔ جہاں دعا کی والدہ حسرت ویاس کی زندہ تصویر بنی اپنی بے بسی کا ماتم کرتی نظر آرہی تھیں۔

O......O......O

اورنگی ٹاؤن سیکٹر ساڑھے گیارہ کی مختلف گلیوں میں دعا کا گھر ڈھونڈتے ہوئے میں بالآخر اس گھر تک پہنچ گئی جہاں دعا فاطمہ نے اپنی زندگی کے فقط سات برس گزارے تھے۔ گھر کی حالت کافی خستہ نظر آرہی تھی۔ رنگ و روغن سے بے نیاز یہ گھر سوگواریت میں ڈوبا دکھائی دے رہا تھا۔ گھر کا دروازہ کائنات کے بھائی نے کھولا تھا اور وہ مجھے بڑے ہی احترام کے ساتھ گھر میں لے آیا تھا۔ اسی دوران کائنات بھی آگئی۔

''آیئے میرے ساتھ''۔ وہ مجھے اپنے ساتھ لئے اسی کمرے میں آگئی جہاں دعا فاطمہ زیادہ وقت گزارہ کرتی تھی۔ گڑیوں اور کھلونوں سے سجی دعا کی الماری نے مجھے جھنجھوڑ دیا۔ آنسو کہیں اندر ہی سرائیت کر رہے تھے اور میں ان کھلونوں سے سجے شوکیس کے سامنے بیٹھی تھی۔ اسی اثناء میں دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز آئی اور پھر پانچ، چھ چھوٹی بچیاں یونیفارم اور بیگ شولڈر پر لٹکائے اندر داخل ہوئیں۔ میں نے حیرت سے کائنات کو دیکھا۔

"یہ بچیاں دعا کی دوست ہیں، یہ اسکول سے واپسی پر مجھ سے ملنے چلی آتی ہیں۔ آج بھی یہ بچیاں دعا کو یاد کر کے روتی ہیں۔"

بچیاں مجھے دیکھتے ہی آپس میں کھسر پھسر کرتی ہوئی جلد ہی چلی گئیں۔ مجھے دعا کے گھر جا کر یہ احساس ہوا کہ دعا کے گزر جانے اور ماں کے اسپتال میں ہونے سے یہ گھر واقعی کٹھن ایام سے گزر رہا ہے۔ کائنات سے چھوٹی بہن اور دونوں بھائی ہی سہمے سہمے نظر آئے جبکہ دعا کے والد سے میری ملاقات نہیں ہوسکی۔ میں کائنات کے اصرار پر اس کے گھر تو پہنچ گئی تھی مگر اب یہاں کی حالت دیکھ کر میرا دل گھبرانے لگا تھا اور ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوگیا تھا۔ میں نے اٹھنے کا قصد کیا اور خاموشی سے گھر سے نکل آئی۔

"دعا کیوں مرگئی؟" دعا کی ماں کے لئے یہ سوال کسی بم سے کم نہیں جو ان کے ذہن میں دھما کے کرتا رہتا ہوگا۔ آج یہ گھر اجڑا ہوا ہے، ننھی بہن کی معصوم شرارتیں، اس آنگن میں گونجنے والی اس کی ہنسی، سب ہی کچھ تو معدوم ہوگیا۔ اے کاش دعا کی والدہ جلد صحت یاب ہوکر گھر لوٹ آئیں کہ ابھی ان کے آشیانے میں زندگی کی رمق موجود ہے۔

کائنات کے چہرے سے میں جو سوال چرا کے لائی ہوں، اس کا جواب میرے پاس بھی نہیں کہ ہمارا قصور کیا تھا؟ جس دن دعا کے ساتھ یہ حادثہ پیش آیا، اس دن اسی بس میں عرفان نامی ایک نوجوان بھی سفر کر رہا تھا لیکن یہ کوئی نہیں جانتا تھا کہ یہ سفر عرفان کی زندگی کا آخری سفر ہے؟ عرفان تین ہٹی پر موجود بزرگ کے مزار پر حاضری دے کر گھر جا رہا تھا۔ وہ وہاں کے مجاور سے یہ کہہ کر نکلا تھا کہ میرے لئے دعا کرنا مگر افسوس، عرفان گھر جانے کے بجائے اپنی آخری آرام گاہ پہنچ گیا تھا۔ عرفان بھی اورنگی ٹاؤن کا رہائشی تھا وہ گھر کا واحد کفیل تھا اور ماں کی بوڑھی آنکھوں کی ٹھنڈک۔ عرفان کی ماں کا جھریوں سے اٹا چہرہ مجھے آج بھی تڑپا دیتا ہے۔ بے جان سی آواز میں وہ ماں اتنا کہہ پاتی ہے" ہائے میرا بچہ .....! میرا لال....!" میں نے پڑھا ہے صدمے بڑے ہوں تو وہ انسان کو خاموش کر دیا کرتے ہیں۔ عرفان کی ماں بھی خاموشی کی تصویر بنی خلا میں گھورتی رہتی ہے۔ کوئی آکر اس کے گلے لگ جائے تو وہ حسرت سے اس سراپے میں اپنے بیٹے کا لمس ڈھونڈتی ہے اور پھر مایوس نظریں

چاروں طرف کا جائزہ لیتی آنسو بہانے لگ جاتی ہیں۔

میں نہیں جانتی اب اس کی کون مدد کرے گا؟ کون اس ماں کی کفالت کرے گا؟ کیا کوئی اس ماں کے بڑھاپے کا سہارا بن سکے گا؟ کیا یہ ماں جوان بیٹے کی موت کا غم سہہ سکے گی؟ میں نہیں جانتی مگر دروازے کی دہلیز پر آنسوؤں میں ڈوبی اس ماں کی آنکھیں عرفان کی راہ آج بھی تک رہی ہیں اور ان آنکھوں میں یہ سوال اب بھی مچل رہا ہے کہ

''میرے بیٹے کا کیا قصور تھا؟''

بس کے اس مقتل میں ایک ننھی بچی ربیعہ بھی اپنی دادی کو ساتھ بیٹھی تھی۔ دادی اور پوتی مجلس عزاء میں شرکت کے بعد گھر جا رہے تھے اور اس فائرنگ کی زد میں آگئے۔ ربیعہ کے الفاظ درد دل رکھنے والوں کے لئے قیامت سے کم نہیں۔

''دادی....! مجھے گولی لگ گئی ہے....'' ربیعہ کے آخری الفاظ اس کی دادی کے لئے قیامت بن چکے ہیں۔ دادی کی گود میں پوتی کی میت دیکھ کر کوئی یقین نہیں کر سکتا تھا۔ ایسا لگتا ہے، ننھی ربیعہ دادی کی گود میں سو رہی ہے۔

منتوں، مرادوں، ماں کی اذیتوں، درد، تکلیفوں کا حاصل ایک ننھا وجود جب اس دنیا میں آتا ہے تو ماں کے ہر درد کا مداوا بن جاتا ہے مگر جب اس وجود کو اس بے دردی سے ختم کر دیا جائے کہ مرنے والی بچی کو خبر ہی نہیں کہ وہ کیوں ماری گئی ہے؟ مگر کوئی اس ماں کے دل سے پوچھے جس کی دنیا ہی لٹ گئی، جس کے آنگن کے پھول کو بے دردی سے خون میں نہلا دیا گیا۔

1-D کی اس بس میں نہ جانے اور کتنے چراغ گل کر دیے گئے؟ میں کس کس کے بارے میں آپ کو بتاؤں کہ میں جانتی ہوں، ضبط کا امتحان ایک وقت تک لیا جاتا ہے، بار بار نہیں، مجھے اب واپس جانا چاہیے۔ اورنگی ٹاؤن سے واپسی پر میرے دل و دماغ پر ایک لرزہ طاری تھی، من من بھر کے قدم اٹھاتی میں اسٹاپ کی جانب بڑھ رہی تھی۔ میرا ذہن خالی تھا اور قدموں کی چال بوجھل مین اسٹاپ پر دائیں جانب تھانے کی عمارت کے سامنے مجھے وہی بد قسمت بس کھڑی نظر آئی جس پر ہونے والی فائرنگ سے کتنے ہی افراد لقمہ اجل بن چکے

تھے۔ میں نے قریب جا کر اس بس کو دیکھنا چاہا، بس کا فرش خون انسانی سے رنگا ہوا تھا گو کہ خون جم چکا تھا مگر بس کی حالت زار کسی پتھر دل کو بھی موم کر دینے کے مترادف تھی۔ ''جی فرمائیں، کیا کام ہے؟'' ڈیوٹی پر موجود پولیس انسپکٹر میرے قریب آگیا۔

'' کچھ نہیں بھائی، میڈیا سے میرا تعلق ہے ریسرچ ورک کرتی ہوں، سچی کہانیوں کی تلاش میں رہتی ہوں اس لئے یہاں آئی ہوں۔'' میں نے ناگواری سے اسے دیکھتے ہوئے خود ہی صفائی پیش کر دی۔

'' جی محترمہ، وہ بہت لرزہ خیز منظر تھا جب یہ بس چل رہی تھی تو اس کے ساتھ ساتھ خون کی دھاریں بھی بہہ رہی تھیں۔ ہمارا شہر کتنا بدقسمت ہے جہاں انسان کی کوئی قدرو منزلت نہیں رہی، کوئی علاقہ محفوظ نہیں، نہ جانے میرے شہر کو کس کی نظر لگ گئی؟'' انسپکٹر نے اپنے ہاتھ پشت پر باندھتے ہوئے کہا۔

میں نے حیرانی سے انسپکٹر کو دیکھا، میرے ذہن میں بے شمار سوال شور مچانے لگے مگر میں کیا پوچھتی کہ میں جانتی ہوں، میرے ہر سوال کے جواب پر خاموشی ہوگی یا دلائل، خود کو صحیح ثابت کرنے کیلئے بھی ہم غلط بات بھی دعوے سے کرنے لگتے ہیں۔ خود احتسابی کا فن شاید ہم نے سیکھا ہی نہیں۔

'' بہت شکریہ، اب میں چلتی ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے میں نے اپنے قدم آگے بڑھا دیئے اور قریب ہی کھڑے رکشے کو دیکھ کر میں غیر ارادی طور پر رکشے میں بیٹھ گئی'' او بی بی....! کہاں جانا ہے؟'' رکشہ ڈرائیور نے مجھ سے سوال کیا۔

'' یہاں سے تو چلو پھر بتاتی ہوں۔'' میں نے جلدی سے کہا۔ جانے مجھے کیوں لگ رہا تھا، میں غلط وقت پر غلط جگہ آگئی ہوں۔ اپنے ہی شہر میں تحفظ کا احساس نہیں، اپنے ہی لوگوں سے ڈرنا معلوم مقام سے آنے والی ایک گولی کہیں مجھ سے میری زندگی ہی نہ چھین لے....؟

'' ارے بی بی....! کس طرف کو چلوں؟'' رکشہ بدستور کھڑا تھا۔

'' ناظم آباد۔'' میرے منہ سے بڑی مشکل سے یہ الفاظ نکلے۔

'' چلتا ہوں، بعد میں نہ کہنا کہ کرایہ زیادہ ہے؟'' وہ بڑبڑاتا ہوا رکشہ اسٹارٹ کر چکا

تھا۔

میرا ذہن منتشر خیالات کی زد میں تھا، میں نہیں جانتی تھی کہ میں کن راستوں سے گزر رہی ہوں؟ لیکن میں اتنا ضرور جانتی تھی کہ میرے خیالوں کے راستے اس نقطے کو ڈھونڈ رہے ہیں جہاں سے یہ خرابیاں شروع ہوئیں۔ میں اپنی قوت برداشت کا امتحان لیتی ہوئی اس خیال کی زد میں آ گئی جس کی فلم ذہن کی اسکرین پر چل رہی ہے۔

عید الفطر کا موقع تھا، میں اپنی بہن کے ساتھ حیدری مارکیٹ میں شاپنگ کے لئے آئی تھی۔ میرے ساتھ میرا چھ سالہ بھانجا حمزہ بھی تھا۔ ابھی ہماری شاپنگ مکمل نہیں ہوئی تھی کہ ایک Toy Shop دیکھتے ہی حمزہ وہاں رک گیا۔ وہ بضد تھا کہ اسے کوئی کھلونا دلایا جائے۔ شاید یہ بچوں کی فطرت ہوتی ہے، گھر میں کتنے ہی کھلونوں کا انبار کیوں نہ لگا ہو مگر کھلونوں سے سجی دکان انہیں متوجہ کر دیتی ہے۔

''آئیں میرے ساتھ۔'' وہ مجھے کھینچتا ہوا دکان تک لے آیا۔

''یہاں سے کیا لوگے؟ سبھی کچھ تو ہے تمہارے پاس؟'' میں نے ایک سرسری نگاہ دکان پر ڈالتے ہوئے کہا۔

''بھئی، کچھ دلا دیں۔'' وہ ٹھنک کر بولا۔

''مگر حمزہ! دیکھو، یہ موٹر کار بھی تمہارے پاس ہے اور ویڈیو گیم، بالکل ایسا تو ابھی پپا نے تمہیں لا کر دیا ہے؟'' میں نے اسے سمجھانے کی پوری کوشش کی۔

''مجھے یہ کلاشنکوف چاہئے۔'' حمزہ نے ایک بڑی سی کلاشنکوف کی جانب اشارہ کیا جسے دیکھ کر مجھے بالکل اصلی ہونے کا گمان ہوا۔

''یہ کیوں چاہئے تمہیں؟'' میں نے حیرت سے اپنے بھانجے سے پوچھا۔

''کلاشنکوف جس کے پاس ہوتی ہے سب اس سے ڈرتے ہیں اور تو اور اس کو دکھا کر سب کچھ چھین بھی لیتے ہیں، میں بھی اپنے دوستوں سے ٹافیاں اور چاکلیٹ چھین لوں گا......'' حمزہ مزے لے لے کر کہہ رہا تھا۔

''یہ کیا کہہ رہے ہو؟ بری بات ہوتی ہے، ایسی باتیں نہیں کرتے۔'' میں نے سخت لہجے

میں اسے ڈانٹا۔

"جی نہیں، جس کے پاس یہ کلاشنکوف ہوتی ہے، اس کی تصویریں اخبار میں آتی ہیں اور اسے ٹی وی پر بھی دکھایا جاتا ہے۔" اس نے معصومیت سے کہا۔

"حمزہ.....!" میں نے اس کی پیٹھ پر ایک زور کا تھپڑ مارا۔

"تو میں کسی کو سچ مچ تھوڑی ماروں گا" یہ تو نقلی ہے اور اس کی آواز بھی ویسی نہیں ہوگی جیسی آوازیں رات کو ہمارے محلے میں آتی ہیں۔" حمزہ نے مجھے سمجھاتے ہوئے التجائی نظروں سے میری جانب دیکھا۔

"ارے باجی.....! آپ بھی معصوم بچے سے کیسی باتیں کرتی ہیں، معصوم ذہن ہے اور پھر یہ کھلونا ہی تو ہے، دلا دیجئے اسے۔" دکان دار خوش فہمی سے جملے ادا کرتا ہوا حمزہ کو وہ کلاشنکوف دکھانے لگا۔

"نہیں چاہئے ہمیں ....." میں حمزہ کو کھینچتی ہوئی وہاں سے زبردستی لے آئی، مجھے یاد ہے، اس کی بھاری قیمت مجھے بعد میں چکانی پڑی، آئس کریم کے ساتھ اور بھی کئی فرمائشیں میں نے حمزہ کی پوری کیں لیکن حمزہ پھر بھی مطمئن نظر نہیں آرہا تھا۔

"خالہ جانی.....! بعد میں آپ مجھے کلاشنکوف خرید کر دیں گی ناں؟"

"ہاں، ہاں، جب تم اچھا پڑھو گے اور اچھے بچے بنو گے تو میں تمہیں کلاشنکوف تو کیا توپ بھی لے کر دوں گی۔" حمزہ نے مجھے غور سے دیکھا اور میں نے اس سے منہ پھیرا۔ حمزہ مطمئن ہو چکا تھا۔ لیکن اس کی معصوم سی خواہش نے مجھے بے چین سا کر دیا تھا۔ رکشے کے چلنے کی آواز میرے ذہن پر ہتھوڑے برسا رہی تھی اس نوجوان موچی کا چہرہ میرے سامنے گھوم رہا تھا جس کی خبر میں نے اخبار میں پڑھی تھی۔ خبر کے مطابق، دو موٹر سائیکل سوار ٹارگٹ فائرنگ کا نشانہ بنانے کے بعد حملہ آور بڑے فاتحانہ انداز میں واپس جا رہے تھے۔ نہیں نہیں ..... میں حمزہ کو ایسا نہیں سوچنے دوں گی، ایک حمزہ کیا، میں اپنے اردگرد کسی حمزہ کو اس راہ پہ چلنے نہیں دوں گی، یہ میرا عزم ہے، میں اس جذبے کو عام کروں گی۔ ابھی میں انہی سوچوں میں گم تھی کہ رکشہ میرے گھر کے سامنے ایک جھٹکے سے رکا۔ میرے خیالات منتشر

ہو گئے مگر میرا عزم اور جذبہ زندہ و تابندہ ہو چکا تھا۔ اورنگی ٹاؤن کی دعا فاطمہ کو تصور میں اپنے سامنے کھڑا ہوا دیکھ رہی تھی جو مجھ سے کہہ رہی تھی۔

''باجی....! آپ میرے ان بھائیوں کو سمجھائیں گی ناں جنھوں نے ہماری بس پر گولیاں برسائیں تھیں؟ آپ کے ہاتھ میں تو کوئی کلاشنکوف نہیں ہے ناں؟ آپ تو قلم سے جہاد کر رہی ہیں۔

''باجی....! آپ یہ سب کچھ میرے لئے کر رہی ہیں ناں؟ میرے جیسی بہت سی دعا فاطمہ کے لئے زندگی تلاش کر رہی ہیں ناں؟؟؟، تصور میں آئی یہ دعا فاطمہ میری آنکھیں نم کر گئی۔ میں نے قلم اٹھایا اور صفحۂ قرطاس پر میں جذبہء جہاد کے موتی بکھیرنے بیٹھ گئی۔ وہ جذبہء جہاد جس میں لوگوں کو قتل نہیں کیا جاتا، بلکہ زندہ رہنے کی امنگ پیدا کی جاتی ہے، جیو اور جینے دو کا پیغام دیا جاتا ہے۔

☆......☆......☆

زندگی سے فرار

''اف ماں! آپ یہ اتنے شوخ کلرز کیوں پہنتی ہیں؟'' فائزہ نے تنقیدی نظروں سے ماں کو دیکھا۔

''کیا مطلب؟'' اب مجھے کپڑوں کی سلیکشن میں تمہاری رائے لینی پڑے گی؟'' ملکہ بیگم نے بڑی ہی مہارت سے لپ اسٹک کا رنگ مزید گہرا کرتے ہوئے فائزہ کی جانب دیکھا۔

''ماما' آپ اتنی تیز رنگ کی لپ اسٹک کیوں لگا رہی ہیں؟ کیا آپ کہیں باہر جا رہی ہیں؟'' ایک بار پھر فائزہ نے سوالیہ نظروں سے ماں کی جانب دیکھا۔

''نو ڈیئر' آئی ایم ایٹ ہوم۔ وائے یو آسک می؟'' ملکہ بیگم نے مسکارے کا آخری کوٹ لگا کر بڑی ہی شان سے دوپٹہ گلے میں ڈالا اور اپنی شخصیت کا معائنہ ایسے کیا جیسے آئینے کے سامنے واقعی میں کسی ملک کی ملکہ کھڑی ہو۔

''ماما' جب آپ کہیں جا نہیں رہی ہیں تو پھر کیوں اتنا بن سنور رہی ہیں؟'' فائزہ کا لہجہ زچ کر دینے والا تھا۔

''اوہ نو' تم بھی نہ بالکل اپنے باپ پر چلی گئی ہو۔ اگر میں گھر میں ہوں تو کیا میں بن سنور نہیں سکتی؟ ضروری ہے کہ تیار ہو کر باہر ہی جائیں؟''

ملکہ بیگم نے غصے سے فائزہ کی جانب دیکھا' اس کے گلابی گال اور سفید رنگت کچھ سرخی مائل ہو چکی تھی یقیناً اسے بہت غصہ آ رہا تھا۔

''مگر ماما' میری دوستوں کی امیاں تو گھر میں ایسے تیار ہو کر نہیں رہتیں؟'' اس نے کھوجتی نظروں سے ماں کی جانب دیکھا۔

''تو کلاس کی فیملیز میں دوستی کرو نہ اب تم نے مڈل کلاس فیملی میں دوستیاں کر رکھی ہیں' ظاہر ہے درجن بھر بچے سنبھالنے اور کچن میں کام کرنے والی عورت کے پاس کہاں ٹائم ہوگا بننے سنورنے کا؟'' ملکہ بیگم نے اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے جواب دیا ورنہ ان کا بس نہیں چل رہا تھا ایک زوردار تھپڑ فائزہ کے گال پر رسید کر دیں۔

''لیکن مجھے پرابلم کسی اور بات سے ہے۔'' فائزہ نے سختی سے کہا' شاید وہ اصل مدعا جاننا چاہ رہی تھی۔

''کیا مطلب؟'' ملکہ بیگم نے شولڈر کٹ بالوں کو کلپ کی مدد سے جوڑے کی شکل دینے کی کوشش کی۔

''جب پاپا تبلیغی دوروں سے واپس آتے ہیں تو تب آپ کیوں سادگی کے لبادے میں ان سے ملتی ہیں؟ آپ اس وقت کیوں نہیں بنتی سنورتیں حالانکہ شوہر کے لئے تیار ہونے کا حق ہر بیوی کو ہے پھر پاپا کی موجودگی کیوں آپ کو کھلتی ہے؟ آپ اس وقت کیوں پوز کرتی ہیں کہ آپ ایک سادگی پسند بیوی ہیں؟'' فائزہ نے تیزی سے اپنی بات مکمل کی۔

''مائنڈ یور لینگویج' حد ہو گئی' بولے جا رہی ہے۔ آج کل تم کس کی صحبت میں رہ رہی ہو فائزہ؟'' ملکہ بیگم نے اپنے تیز تیز چلتے سانس پر قابو پاتے ہوئے فائزہ کو گھورا۔

''ماما' میں کس کی صحبت میں رہوں گی' پاپا کے تبلیغی دورے تین تین ماہ تک جاری رہتے ہیں۔ آپ گھر میں ہوتے ہوئے بھی نہیں ہوتیں' ابھی بھی آپ جس کے انتظار میں ہیں' آپ ان کے ساتھ باہر چلی جائیں گی پھر میں اور میری تنہائی' میں دیواروں سے باتیں کروں گی اور اپنی تنہائی سے کھیلوں گی۔'' فائزہ کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔

''کیا مطلب ہے تمہارا؟ آخر کیا چاہتی ہو؟'' چوری کا احساس ملکہ بیگم کے چہرے پہ نمایاں تھا۔ بڑے ہی سلیقے سے کیا گیا میک اپ بھی اس احساس کو چھپا نہیں سکا۔

''ماما آپ جانتی ہیں' میں کیا کہہ رہی ہوں اور کیا یاد دلا رہی ہوں؟'' فائزہ نے دونوں

ہاتھوں کی انگلیوں سے کھیلتے ہوئے ایک نظر ماں کو دیکھا ور پھر بیڈ شیٹ پر انگلی کی مدد سے دائرے بنانے لگی۔

''تم اتنی بڑی ہو گئی ہو؟'' لہجہ سوالیہ تھا۔

''جی.....'' فائزہ نے نکا سا جواب دیا۔

''آخر کیا چاہ رہی ہو؟'' ملکہ بیگم نے ٹھوڑی پر انگلی رکھ کر اس کا چہرہ اوپر اٹھایا۔

''آپ فہیم صاحب سے کیوں ملتی ہیں؟'' لہجہ زوردار اور کاٹ کھانے والا تھا' آواز اتنی بھاری اور تیز تھی کہ ایک پل کے لئے ملکہ بیگم بھی کانپ اٹھیں'وہ گومگو کی کیفیت میں گرفتار ہو گئیں جبکہ ان کے سامنے بیٹھی فائزہ جواب طلب نظروں سے انہیں دیکھ رہی تھی۔

''بتایئے ماما' فہیم صاحب کون ہیں؟ کیوں روز وہ ہمارے گھر آتے ہیں؟ آپ ان کے آنے سے قبل کیوں اتنا تیار ہوتی ہیں اور پھر ان کے ساتھ کہاں چلی جاتی ہیں؟ یکے بعد دیگرے سوالوں کی بوچھاڑ فائزہ کرتی گئی اور وہ بھاری سر لیے بیڈ کی پشت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئیں۔

''سنو فائزہ' اب ایک لفظ نہیں کہو گی تم' اس سے پہلے کہ میرا بی پی شوٹ کر جائے تم یہاں سے دفع ہو جاؤ..... نکل جاؤ میرے کمرے سے..... '' ملکہ بیگم نے انگلی سے دروازے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''مگر ماما' میں ..... '' فائزہ منمنائی ۔ ماں کی ایسی حالت دیکھ کر اس کی آنکھوں میں آنسو مزید بھر آئے تھے۔

''دیکھو' اس وقت میں اگر مگر سننے کی پوزیشن میں نہیں ہوں بہتر یہی ہے کہ تم مجھے اکیلا چھوڑ دو' پلیز' گو ٹو یور روم۔'' ملکہ بیگم کی بھرائی ہوئی آواز فائزہ کو کمرے سے نکالنے میں کامیاب ہو گئی اور وہ سسکیاں لیتی ہوئے اپنے روم میں آ کر زور زور سے رونے لگی۔

کچھ ہی دیر بعد ٹی وی لاؤنج سے سرگوشیوں کی آوازیں آنے لگیں۔ فائزہ لاکھ چاہتے ہوئے بھی ٹی وی لاؤنج میں آنے کی ہمت نہیں کر پا رہی تھی۔ ملکہ بیگم کے پُر زور قہقہے اور فہیم انکل کی گھٹی گھٹی ہنسی کی آوازیں جب مسلسل ہوئیں تو وہ بے اختیار غصے کے عالم میں اٹھتی چلی گئی۔

ٹی وی لاؤنج میں صوفے پر تشریف فرما ملکہ بیگم اور فہیم انکل ایک دوسرے سے محو گفتگو

تھے اور کسی بات پر ایک دوسرے کو قائل کرنے کی کوشش میں مگن تھے۔ فہیم انکل کا ہاتھ وقفے وقفے سے ملکہ بیگم کے بالوں سے کھیل رہا تھا جبکہ ملکہ بیگم شوخ نظروں سے ان کو دیکھتیں اور پھر کسی بات پر ان کو اپنی جانب راغب کرلیتیں۔

فائزہ نے چور نگاہوں سے دونوں کو دیکھا اور دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھامے دوبارہ بیڈ پر ڈھے گئی۔ کچھ بھی ہو جائے جیسے ہی پاپا آتے ہیں' ان کو میں ماما کے بارے میں سب بتا دوں گی۔ یہ تو بہت غلط بات ہے۔ پاپا کی غیر موجودگی میں ماما اس طرح غیر مرد کے ساتھ باتیں کرتی ہیں؟ وہ خود کلامی کے انداز میں باتیں کرتی جا رہی تھی' ساتھ ہی اس کے ذہن میں پنپنے والے خیالات اسے مزید الجھا رہے تھے۔

O......O......O

ملکہ بیگم ایک ویل ایجوکیٹڈ خاتون تھیں جن کی کم عمری میں ہی محمد بلال سے شادی کر دی گئی تھی۔ شادی کے فوراً بعد ہی فائزہ نے ان کے گھر میں آنکھ کھولی۔ ملکہ بیگم اور فائزہ کی عمر میں صرف 18 سال کا فرق تھا' یہی وجہ تھی کہ جب فائزہ نے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا تو ملکہ بیگم بھرپور جوانی کے دور سے گزر رہی تھیں مگر ستم یہ کہ ان کے شوہر بلال خالص مذہبی فطرت کے آدمی تھے' تین تین ماہ تبلیغی دوروں پر رہ کر جب گھر لوٹتے تو ملکہ بیگم اور فائزہ کو ڈنڈے کے زور پر قرآنی تعلیم اور نماز کے لئے راغب کرتے اور جونہی ان کے اگلے دورے کا وقت آتا' ملکہ بیگم واپس اپنی روش پر آ جاتیں۔ وہ شوہر کے سامنے والا جعلی لبادہ اتار دیتیں اور اپنی تسکین کی خاطر دوبارہ فہیم صاحب سے تعلق قائم کرلیتیں۔

فہیم صاحب کا شمار ان کے محلے کے معزز لوگوں میں ہوا کرتا ہے اور وہ اپنی فیملی ہونے کے باوجود ملکہ بیگم کی خوبصورتی کے آگے بے بس ہو کر ان کے پاس دوڑے چلے جاتے اور یہ حقیقت بھی ہے کہ ملکہ بیگم نام کی ملکہ نہیں بلکہ خوبصورتی میں بھی وہ اپنی ملکہ رکھتی تھیں مگر یہ ساری ملاقاتیں جو ایک لمبے عرصے سے ہو رہی تھیں' اس نے فائزہ کی بڑھتی عمر کو سوالیہ نشان بنا دیا تھا' شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ فائزہ اپنے باپ سے بہت محبت کرتی تھی اور جب وہ تبلیغی دوروں پر چلے جاتے تو انہیں وہ یاد کر کے روتی رہتی کیونکہ ملکہ بیگم اپنی ہی دنیا میں مگن رہتیں

میرے شہر کی کہانی...... ارم زہرا

اور پھر جب فائزہ کی دوست سارہ نے طنزیہ لہجے میں فائزہ سے سوال کیا کہ یہ فہیم انکل روز تمہارے گھر کیوں آتے ہیں اور پھر تمہاری ماما ان کے ساتھ کہاں چلی جاتی ہیں؟ کیا تمہارے پاپا' تمہاری ماما کو کچھ نہیں کہتے؟'' تب فائزہ نے بے اختیار سارہ کے منہ پر تھپڑ مار دیا تھا۔

''خبردار جو میری ماما کے بارے میں کچھ کہا۔ وہ کام سے ہی جاتی ہوں گی اور تم مجھ سے گندی باتیں نہیں کرو۔ آج سے تمہاری اور میری کٹی۔'' سارہ منہ بناتی ہوئی چلی گئی مگر فائزہ گھر آ کر خوب پھوٹ پھوٹ کر روئی' دل میں عجب سی ٹوٹ پھوٹ جاری تھی۔ اسے شدت سے احساس ہو رہا تھا کہ واقعی میں اس کی ماما ایسی کیوں ہیں اور کیوں وہ فہیم انکل سے ملتی ہیں؟ یہ تو وہ جانتی تھی کہ اس بات کی خبر اس کے پاپا کو بھی نہیں ہے۔ وہ تو سخت پردے کے قائل ہیں اور بلا وجہ عورتوں کا گھر سے باہر جانا بھی پسند نہیں کرتے تو ماما ایسا کیوں کرتی ہیں؟ یہ سوال اس کو مسلسل بچھو کے ڈنک کی طرح لگا رہے تھے۔ اس دفعہ پاپا جیسے ہی گھر آئیں گے' میں ان کو سب کچھ بتا دوں گی' اس نے خود سے پرامس کیا اور کمپیوٹر آن کر کے بلا مقصد مختلف "URL"Search کرنے لگی۔

O......O......O

ملکہ بیگم نے کمرے میں داخل ہوتے ہی ایک بڑا سا بیگ فائزہ کے سامنے رکھ دیا۔

''دیکھو تو میں اپنی بیٹی کے لئے کیا لائی ہوں۔'' چہرے پر شدید تھکن کے آثار تھے مگر لہجے میں نرمی گھلی ہوئی تھی۔

''کیا ہے اس میں؟'' فائزہ نے ایک نظر بیگ کو دیکھا اور پھر کتاب پر نظریں جما لیں۔

''سوئیٹ ہارٹ' کھول کے تو دیکھو۔'' ملکہ بیگم نے بڑے ہی پیار سے فائزہ کو دیکھا۔

''نو نیڈ دس' آپ آرام کریں' تھک گئی ہوں گی۔'' فائزہ نے کتاب پر نظریں جمائے ہی جواب دیا۔

''کم آن ڈیئر' ماما لوز یو ویری مچ۔ پلیز' مسکرا دو۔'' ملکہ بیگم نے فائزہ کا ہاتھ اپنی گود میں رکھا اور اس کے بالوں کو پیار سے سہلانے لگیں۔ ''دیکھو تو ماما تمہارے لئے کتنا پیارا سوٹ لائی ہیں۔''

''مجھے نہیں چاہیئے یہ۔'' فائزہ کی خفگی بدستور قائم تھی۔

''فائزہ' یہ تو کوئی بات ہی نہیں ہوئی' ماما تمہاری پسند کے کلر کا سوٹ لائی ہیں اور تم ماما کو لفٹ نہیں کرا رہی ہو؟'' ملکہ بیگم خود کو کول ڈاؤن کرنے کی بھرپور کوشش کر رہی تھیں۔

''ماما' میں نے جو آپ سے سوال کیا ہے' مجھے اس کا جواب چاہیئے' مجھے آپ یوں بہلانے کی کوشش نہیں کریں۔'' فائزہ نے بیگ باقاعدہ پٹختے ہوئے کہا۔

''فائزہ' تم کتنی بدتمیز ہوتی جا رہی ہو' اس طرح بات کرتے ہیں اپنی ماما سے؟'' لہجہ حیرت کا غماز تھا۔

''تو کیا دنیا کی ساری ماما اپنی بیٹیوں کے ساتھ ایسا ہی کرتی ہیں؟'' فائزہ نے سوالیہ نظروں سے ماں کو دیکھا۔

''دیکھو فائزہ' یہ میرا مسئلہ ہے' فہیم ایک اچھے انسان ہیں۔ اگر وہ آجاتے ہیں اور میں ان سے باتیں کرتی ہوں تو اس میں کوئی برائی نہیں' سب ہی کے گھر مہمان آتے ہیں اور وہ میرے خاص مہمان ہیں' تمہارے لئے اتنا ہی جاننا کافی ہے۔'' ملکہ بیگم نے فائزہ کو سمجھانے والے انداز میں کہا۔

''لیکن...... '' ابھی وہ مزید کچھ بولتی' ملکہ بیگم نے اس کے ہونٹوں پر انگلی رکھ دی۔

''بس اور کچھ بھی میں سننا نہیں چاہتی' چلو جلدی سے یہ سوٹ پہن کر دکھاؤ ذرا میں بھی تو دیکھوں' میری بیٹی اس ڈریس میں کیسی لگ رہی ہے؟''

''جی ماما' جاتی ہوں۔'' وہ بوجھل قدموں سے بیگ اٹھائے واش روم کی جانب بڑھ گئی۔ ملکہ بیگم اسکا موڈ بدلنے میں کامیاب تو ہو چکی تھیں مگر فائزہ کے چھوٹے چھوٹے سوالات ان کی راہ میں بڑی رکاوٹ بنتے جا رہے تھے۔

''یہ دیکھیئے ماما...... '' نیا سوٹ زیب تن کیے فائزہ کسی گڑیا سے کم نہیں لگ رہی تھی۔

''او مائی گڈنیس' کتنی پیاری لگ رہی ہے میری بیٹی''۔ ایک پل کے لئے سچ مچ ملکہ بیگم کو فائزہ پر ٹوٹ کر پیار آیا۔

''تھینکس ماما' لیکن ماما' پلیز' آپ فہیم انکل سے نہیں ملا کریں' پتا ہے سارہ نے مجھ سے کتنی

بری بری باتیں کی تھیں؟" وہ پھر ماں کو قائل کرنے کی کوشش میں اپنی جان ہلکان کر رہی تھی۔

"بالکل باپ پر گئی' جہاں بات ختم کر دی جائے' دوبارہ وہیں سے شروع کر دیتی ہے۔"
اب کی بار طیش آنا یقینی تھا۔

" فائزہ، آئندہ ہمارے ملنے پر تم کچھ نہیں کہو گی، بس یہ آخری بار میں برداشت کر رہی ہوں۔"

"تو پھر میں پاپا سے آپ کی کمپلین کر دوں گی"۔ فائزہ کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

"واٹ نان سینس، تم ایسی کوئی حرکت نہیں کرو گی۔"

"تو پھر آپ بھی ان سے نہیں ملیں گی۔" ۔لہجہ باغیانہ تھا۔

"فائزہ.....!" ملکہ بیگم اس سے آگے کچھ نہیں کہہ سکیں اور وہ تیزی سے کمرے سے نکل گئی۔

O......O......O

"فائزہ.....! فائزہ.....!" فہیم صاحب کو ڈرائنگ روم میں بٹھا کو وہ فائزہ کو آواز دینے لگیں، شاید وہ فائزہ کے بچپنے سے خوفزدہ ہو گئیں تھیں۔

"جی ماما!" گلابی رنگ کے کرتے شلوار پر سفید رنگ کا دوپٹہ سلیقے سے اوڑھ کر آنے والی فائزہ محمد بلال کی بیٹی لگ رہی تھی۔ ماں کے ساتھ رہتے ہوئے بھی ان کی پرچھائیں تک اس پر نہیں پڑی تھی۔

"ادھر میرے پاس بیٹھو" ملکہ بیگم نے فائزہ کو اپنے قریب بٹھایا۔

"سوئٹ ہارٹ .....یہ تمہارے فہیم انکل آج سے تمہیں ٹیوشن پڑھائیں گے۔" انہوں نے مسکراتے ہوئے فہیم صاحب کو دیکھا۔

"کیوں میں تو کوچنگ جاتی ہوں ناں؟" فائزہ نے دو بدو جواب دیا۔

"گڑیا.....! جب گھر میں ہی ٹیوشن مل جائے تو پھر کیا ضرورت ہے باہر جانے کی؟ چلو، جلدی سے اپنی کتابیں لے آؤ۔ میں تم دونوں کے لئے اچھی سی چائے بنا کے لاتی ہوں۔"
ملکہ بیگم نے فائزہ کو فہیم صاحب کے سامنے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود اٹھ کر چلی گئیں۔ بے دلی

سے بڑھتی فائزہ اندر ہی اندر کڑھ رہی تھی مگر فہیم صاحب بھی شاطر انسان تھے، انہوں نے پہلے ہی دن اپنی طرف سے فائزہ کا دل صاف کر لیا۔ ایک گھنٹے بعد فائزہ کی چھٹی ہو گئی اور پھر اگلے دو گھنٹے فہیم صاحب اور ملکہ بیگم ایک دوسرے کی قربت میں گم رہے۔

O......O......O

''فائزہ، آج تم فہیم انکل کے ساتھ سپر مارکیٹ تک چلی جاؤ۔'' ملکہ بیگم نے بڑی ہی محبت سے فائزہ کو منانے والے انداز میں کہا۔

''مگر ماما...... '' فائزہ کو بہت عجیب سا لگا ماما کا یوں کہنا۔

''چلو' چلو' جلدی کرو' تمہارے انکل نیچے گاڑی میں ویٹ کر رہے ہیں۔ دیکھو تو پھر مس کال آئی ہے میرے موبائل پر' شاباش جلدی سے اٹھو' بس کچھ ہی دیر میں تو تمہاری واپسی ہو جائے گی۔'' ملکہ بیگم نے باقاعدہ اس کا ہاتھ کھینچتے ہوئے اس کو اٹھایا اور وہ بے دلی سے نیچے آ کر گاڑی کی فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گئی۔

''لٹل گرل' آپ نے کیا لینا ہے؟ آپ کی ماما نے تو طویل فہرست دی ہے مگر آپ کو کیا چاہئے؟'' فہیم انکل نے شوخ نظروں سے فائزہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''نہیں انکل' تھینکس' مجھے کچھ نہیں چاہئے' بس ماما نے جو لسٹ دی ہے ہم وہ ہی لے لیں گے۔'' وہ سخت کوفت کے عالم میں سائیڈ گلاس میں بھاگتی گاڑیوں کو دیکھ رہی تھی۔

''کم آن لٹل گرل' آج پہلی بار آپ ہمارے ساتھ آئیں ہیں' آئس کریم تو چلے گی؟''

اور پھر وہ سپر اسٹور آنے تک چپ چاپ بیٹھی رہی۔ جلدی جلدی لسٹ میں درج مختلف چیزیں لے کر وہ گاڑی میں آ کر بیٹھ گئی جب کہ فہیم انکل پے منٹ کر کے کچھ دیر بعد آئے۔

بلیک پینٹ' نیوی بلو شرٹ' کلین شیو' آنکھوں پر گاگلز لگائے وہ واقعی وجیہہ شخصیت لگ رہے تھے' اونہہ ماما اس لئے ان پر مرتی ہیں ورنہ پاپا تو اونچی شلوار' لمبی قمیض' مونچھیں صاف اور داڑھی کے فریم سے کبھی باہر ہی نہیں نکلے' اس نے خود ہی جج کیا اور ماما کے حق میں رائے دی مگر اگلے ہی لمحے وہ اس رائے کو غلط گردانتی ڈرائیو کرتے فہیم صاحب کو دیکھ رہی تھی۔

''چلو جلدی سے اترو' آئس کریم پارلر آ گیا ہے۔'' فہیم صاحب نے گاڑی سائیڈ میں

لگاتے ہوئے اسے پیار بھرا آرڈر دیا تو وہ خاموشی سے اتر گئی۔ پارلر میں راؤنڈ ٹیبل کے گرد رکھی کرسیاں کھینچ کر ویٹر نے انہیں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ کچھ نروس تھی۔ فہیم صاحب اس کے سامنے بیٹھے تھے اور اس سے اس کا پسندیدہ فلیور پوچھ رہے تھے اور وہ چاکلیٹ آئس کریم کی دیوانی، کچھ بھی نہیں کہہ سکی۔

"ٹھیک ہے' تو پھر لٹل گرل کو اپنی پسند کی آئس کریم کھلاتا ہوں۔ دو Bounty فلیور کے اسکوپ لے آئیں۔" ویٹر کو آرڈر دیتے ہوئے انہوں نے اپنا موبائل جیب سے نکال کر میز پر رکھ دیا۔

"اچھا یہ بتاؤ' پڑھائی کیسی چل رہی ہے؟" فہیم صاحب نے اس کے ماتھے پر پڑی بالوں کی لٹ کو پیچھے کیا تو یکدم چونک گئی اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔

"کیا ہوا بے بی.....؟" فہیم صاحب نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"کک..... کک کچھ نہیں۔" وہ آہستہ سے بولی۔

"ڈر گئی تھیں مجھ سے؟" آہستگی سے اس کے قریب آکر کان میں سوال کیا گیا۔

"نہیں تو......" وہ مزید سمٹ گئی۔

"لو آئس کریم آگئی' چلو جلدی سے شروع ہو جاؤ ورنہ میلٹ ہو جائے گی۔" آئس کریم کا پہلا اسپون انہوں نے بڑی ہی اپنائیت سے فائزہ کی جانب بڑھایا۔ وہ اسے بچوں کی طرح ہی ٹریٹ کر رہے تھے۔

"چلو شرط لگاتے ہیں' کس کی پہلے آئس کریم ختم ہوتی ہے اور جو شرط جیت گیا اس کی بات ماننا پڑے گی۔"

"جی....." اس نے مختصر سا جواب دیا اور جلدی جلدی آئس کریم ختم کرنے لگی اور واقعی وہ شرط جیت گئی تھی۔

"اُفوہ......ہماری لٹل گرل تو شرط جیت گئی ہیں' اب بتاؤ کیا منوانا ہے تمہیں؟ جو مانگو گی' وہ ملے گا"۔ لہجہ کافی گمبھیر تھا۔

"کیا واقعی میں جو کہوں گی' وہ آپ مان لیں گے؟ پہلی بار بے ساختہ وہ فری لہجے میں

مخاطب ہوئی تھی۔ اس کی جھجک یکدم معدوم ہو گئی تھی۔

"ہاں ہاں کہو ناں تم شرط جیت چکی ہو۔"

"آپ میری مما سے نہیں ملا کریں یہ مجھے پسند نہیں۔" اس نے ہمت کر کے دل کی بات کہہ دی۔ ایک پل کیلئے فہیم صاحب بھی اس کی بہادری پر عش عش کر اٹھے۔

"او کے مجھے منظور ہے۔" انتہائی مختصر سا جواب آیا۔

"کیا سچ؟" فائزہ کی آنکھوں میں چمک آ گئی۔

"ہاں ہاں کیوں نہیں لیکن کیا آج کے بعد سے تم بھی مجھ سے نہیں ملو گی؟" فہیم صاحب نے فائزہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے پوچھا۔

یکدم وہ ٹپٹا گئی۔ "جی.... جی..... جی نہیں پتا نہیں...." اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ انکل کو کیا جواب دے؟

"چلو سوچ کے بتا دینا۔" فہیم صاحب نے ہولے سے اس کا ہاتھ تھاما اور پھر پیار سے اس کے گالوں کو چھوتے ہوئے اٹھ گئے۔ میز سے گاڑی کی چابیاں اور موبائل اٹھا کر وہ آگے بڑھ گئے جبکہ فائزہ اپنی بے ترتیب دھڑکنوں کو نئے سروں سے آشنائی دیتی ان کے پیچھے پیچھے گاڑی میں آ کر بیٹھ گئی۔ مین گیٹ پر گاڑی روکتے ہی فہیم صاحب نے اسے سامان سے بھرا بیگ پکڑایا اور ساتھ ہی اسے خوش رہنے کی تلقین کی کیونکہ بقول ان کے اس کے اندر ستر سالہ بڑھیا سانس لے رہے ہیں۔"

"کیا آپ اوپر نہیں آئیں گے؟" فائزہ نے بے اختیار سوال کیا تو وہ زیر لب مسکرا اٹھے۔

"آخر آپ شرط جیت چکی ہیں سوئٹ گرل کیا کریں اب وعدے کا پاس تو کرنا ہی پڑے گا۔"

"اوہ ہاں...." وہ سامان لے کر اوپر بھاگ آئی اور بیگ ماما کو تھما کر اپنے کمرے میں آئی اور پھر کتنی دیر تک وہ اس انجانی خوشی کو محسوس کرتی رہی بے ترتیب دھڑکنوں کو ترتیب دیتی رہی باہر سے ماما کی آواز آ رہی تھی یقیناً وہ انکل سے موبائل پر باتیں کر رہی تھیں جب

ہی ماما کی حیرت زدہ تو کبھی بے ساختہ ہنسی اسے متوجہ کر رہی تھی۔ 'جانے میں نے انکل کو منع کر کے صحیح بھی کیا یا نہیں' کبھی ایسا لگتا "انکل تو واقعی بہت اچھے ہیں' میں نے انہیں روک کر ان کے ساتھ زیادتی تو نہیں کی؟ جانے وہ کیا سوچ رہے ہوں گے میرے بارے میں؟' انہی خیالوں سے نبرد آزما جانے کب وہ سپنوں کی دنیا میں کھوگئی۔

O......O......O

اس بات کو ایک ہفتہ گزر گیا تھا' ملکہ بیگم کا مزاج گو کہ بہتر تھا مگر فائزہ کو اندر ہی اندر تڑپا رہا تھا۔ 'فہیم انکل واقعی اچھے انسان ہیں' اگر وہ گھر آجاتے ہیں تو اس میں کوئی برائی نہیں' میں خود ہی سوری کر لیتی ہوں اور اپنی شرط واپس لے لیتی ہوں۔' ابھی وہ انہی سوچوں میں الجھی ہوئی تھی کہ ملکہ بیگم نے اسے آواز دی۔

"فائزہ' جلدی سے آؤ' کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔"

"جی ماما....!" یہ کہہ کر وہ اٹھ گئی۔ کھانے کے دوران وہ مسلسل ماں کے چہرے کو پڑھنے کی کوشش کرتی رہی۔ بالآخر اس نے ماں سے پوچھ ہی لیا۔

"ماما.....! فہیم انکل کا سیل نمبر چاہیے تھا۔"

"کیوں؟" حیرت کا تاثر چہرے پر واضح تھا۔

"ماما' بات کرنا چاہتی ہوں' کتنے دن ہوگئے' وہ آئے نہیں ناں؟" فائزہ نے اپنی شرط والی بات چھپاتے ہوئے کہا۔

"کہیں مصروف ہوں گے اور پھر وہ تمہیں پسند بھی تو نہیں ہیں؟" ملکہ بیگم نے فائزہ کے چہرے کو غور سے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

"ارے' آپ دیں تو سہی....." وہ کھانا چھوڑ کر یکدم کھڑی ہوگئی۔

"او کے ڈارلنگ' میرے موبائل سے ہی بات کرلو۔" واجبی سا جواب دے کر ملکہ بیگم کچن میں آگئیں مگر تیر نشانے پر لگا تھا' فہیم صاحب اور ان کا بنایا گیا یہ چھوٹا سا پلان بالآخر موثر ثابت ہوا تھا اور پھر فائزہ نے کس انداز میں اور کیسے بات کی' یہ تو ملکہ بیگم بھی نہیں جانتی تھیں مگر شام ہی فہیم صاحب دروازے پر کھڑے تھے۔ فائزہ کمرے سے چھپ چھپ کے جائزے

لے رہی تھی۔ ماں کے چہرے پر خوشی کچھ اور نمایاں ہو گئی تھی۔ وہ آج بہت دنوں بعد پُرسکون محسوس کر رہی تھی۔

O......O......O

''فہیم! اب فائزہ کو ہماری ملاقاتوں سے کوئی پرابلم نہیں ہے یقیناً اب ہمیں کسی بہانے کی ضرورت نہیں پیش آئے گی۔'' ملکہ بیگم نے فہیم صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''نہیں! ابھی فائزہ کو مزید وقت دینے کی ضرورت ہے! ابھی پوری طرح وہ ہماری گرفت میں نہیں آئی ہے۔'' فہیم صاحب نے شاطر انداز میں چشمہ اتارتے ہوئے کہا۔

''اچھا....'' ملکہ بیگم بس اتنا ہی کہہ سکیں۔

''آج کیا کھلا رہی ہو؟ پورے ایک ہفتے تمہارے خوبصورت ہاتھوں سے بنائے گئے کھانوں سے محروم رہا۔'' لہجہ رس میں گھلا ہوا تھا۔

''جو تم کہو۔'' ملکہ بیگم نے فرط محبت سے فہیم صاحب کی طرف دیکھا۔ کچھ ہی دیر میں دونوں کمرے میں چلے گئے یہ تاثر دے کر کہ فہیم صاحب کسی نئی پراجیکٹ کے سلسلے میں ملکہ بیگم سے مشورہ کرنا چاہتے ہیں۔

فائزہ سب کچھ دیکھ رہی تھی، خلاف معمول جیسے ہی دونوں کمرے میں بند ہو گئے وہ ٹی وی آن کر کے بیٹھ گئی مگر بے چینی اس کو پہلو بدلنے پر مجبور کر رہی تھی اور اسے یہ سب کچھ نہ تو اچھا لگ رہا اور نہ ہی بہت بُرا' اپنے اندر کے اس بدلاؤ پر وہ خود بھی حیران تھی مگر اسے سمجھنے سے قاصر تھی۔

''لٹل گرل' کہاں ہو؟'' فہیم صاحب کی آواز کا جادو' ان کا اسی محبت سے اسے پکارنا اسے بہت اچھا لگا۔ وہ خاموشی سے نظر انداز کیے ٹی وی اسکرین پر نظریں جمائے بیٹھی رہی۔

''خیریت تو ہے؟ ہم سے ناراضگی ہے کوئی؟'' کمرے کے اندر داخل ہوتے ہوئے فہیم صاحب نے کہا۔

''اوہ نہیں انکل' بس یوں ہی میرا دھیان ٹی وی پر تھا۔'' اس نے چور نظروں سے انکل کی طرف دیکھا۔ ہینڈسم شخصیت' جسم سے اٹھتی پرفیوم کی خوشبو اور اس پر دل فریب

مسکراہٹ۔

"کیا بات ہے' آج ہمارا اتنی غور سے جائزہ لیا جا رہا ہے؟" فہیم صاحب نے مزید آگے بڑھ کر اس کے سر پر ہلکی سے چپت لگائی۔

"نہیں تو بس میں کچھ سوچ رہی تھی۔" وہ اگلے ہی پل پشیمان ہوگئی۔

"اچھا' میں چلتا ہوں' آپ کے کہنے سے آ گیا تھا مگر اب اگلی بار آپ ہی مجھے بلائیں گی۔" جتانے والا انداز تھا۔

"جی' ٹھیک ہے مگر آج مجھے آپ آئس کریم نہیں کھلائیں گے؟" وہ نہ چاہتے ہوئے بھی دل کی بات زبان تک لے آئی' دوسری جانب فہیم صاحب کے چہرے پر مکروہ مسکراہٹ پھیل چکی تھی۔

"وائے نوٹ' چلو جلدی سے' آئی ایم ریڈی۔"

"او تھینکس ......" وہ فوراً اسٹور روم میں بھاگی' جانے کب سے سوچا ہوا' تصور میں خود کو اسی سوٹ میں انکل کے ساتھ دیکھتے دیکھتے آخر وہ دن آ ہی گیا تھا' وہ اگلے دس منٹ میں ٹھیک ٹھاک تیار ہوگئی تھی۔

"ماما' میں انکل کے ساتھ جا رہی ہوں۔ انکل' ہم ماما کے لئے آئس کریم پارسل لے لیں گے' ٹھیک ہے ناں؟" اس نے جوش کا مظاہرہ کرتے ہوئے ماں کو بتایا۔ ایک پل کو ملکہ بیگم کا چہرہ اتر گیا مگر یہ پلان انہی کا تو بنایا ہوا تھا' وہ خاموش ہوگئیں۔ فائزہ فہیم صاحب کے ساتھ جا چکی تھی مگر ادھر ملکہ بیگم کے دل میں ماں کی ممتا تڑپنے لگی تھی' عجب وسوسے اور اندیشے سانپ کی طرح انکے سینے پر لوٹ رہے تھے۔ ایک پل کو پچھتاوہ سانس لے رہا تھا اور دوسرے ہی پل فہیم صاحب پر اندھا اعتبار انہیں دلاسے دے رہا تھا اور پھر جانے کیسے وقت گزر گیا' فائزہ گھر لوٹ چکی تھی' اس کے ہاتھ میں مختلف شاپنگ بیگ تھے۔

"اتنی دیر لگا دی؟" انہوں نے خفگی سے فائزہ کو خود سے قریب کرتے ہوئے شکوہ کیا۔

"وہ..... ماما..... انکل مجھے شاپنگ کیلئے لے گئے' دیکھئے تو میں کتنے خوبصورت سوٹ لائی ہوں۔" اور پھر وہ تیزی سے شاپنگ بیگ سے کپڑے نکال کر دکھاتی رہی' اس کے چہرے

پر عجب خوشی تھی۔اس ساری شاپنگ میں ملکہ بیگم کے لئے کچھ بھی نہیں تھا۔ان کا چہرہ آہستہ آہستہ اترتا جارہا تھا۔

''اب فائزہ اور فہیم صاحب کی دوستی بڑھنے لگی تھی۔ کالج سے واپسی پر فہیم صاحب فائزہ کو گھر ڈراپ کرتے یا کوچنگ جانے کیلئے فائزہ انہیں کال کردیتی' وہ اسے کوچنگ چھوڑ کر گھر آجاتے اور ملکہ بیگم کے ساتھ وقت گزارتے' وقت ایسے ہی گزر رہا تھا کہ اچانک جیسے کسی نے جھیل میں پتھر پھینک کر بڑے بڑے دائرے بنادیئے ہوں۔محمد بلال کی تبلیغی دوروں سے واپسی اگلے ہفتے ہورہی تھی ۔ ملکہ بیگم اب محتاط ہوچکی تھیں' فہیم صاحب کو بھی خبردی جاچکی تھی' سب کچھ گزشتہ کئی سالوں کی طرح ہی ہورہا تھا۔ملکہ بیگم واپس اپنے دائرہ کار میں آچکی تھیں مگر فائزہ کا حال بُرا تھا۔فہیم انکل کی قربت' ان کا پیار' ان کا انداز' ان کی باتیں' ان کی تعریف کرنا' ان کے ساتھ گاڑی میں گھومنا' یہ سب کچھ وہ مس کررہی تھی' اس بار پاپا کے آنے کی اسے کوئی خاص خوشی نہیں ہوئی بلکہ وہ عجب چڑچڑے پن کا شکار تھی محمد بلال کی اگلے دو ماہ بعد پھر کسی دورے کیلئے روانگی تھی اور ان دو ماہ میں فائزہ نے اپنی بے اختیاری کو ایک نیا رنگ دیا ۔ وہ چھپ چھپ کر گھر سے باہر فہیم انکل سے ملنے لگی۔ گھر سے کوچنگ اور دوستوں کے گھر کہہ کر جانے والی فائزہ مختلف جگہ انکل کے ساتھ نظر آنے لگی۔ملکہ بیگم اپنے بنائے گئے جال میں خود پھنستی جارہی تھیں' انہیں اس بات کا قطعی اندازہ نہیں تھا کہ اتنی مخالفت کرنے والی فائزہ اس قدر فہیم صاحب کے قریب ہو جائے گی ؟ مگر وہ شوہر کے سامنے کچھ نہیں کہہ سکی بلکہ وہ فائزہ کی سائیڈ لیا کرتیں۔اس دن تو ان کے سر پر پہاڑ ٹوٹ پڑا جب فائزہ نے انتہائی ڈھٹائی سے ماں سے کہا کہ وہ فہیم انکل سے شادی کرنا چاہتی ہے۔ایک پل کے لئے ملکہ بیگم سن ہو گئیں۔

''تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے؟ کیا کہہ رہی ہو تم ؟ ہوش میں تو ہو؟'' وہ سر پیٹ رہی تھیں۔

''ماما' کوئی میں آپ کی طرح گناہ نہیں کرتی ' شادی کرنا چاہتی ہوں ان سے۔'' لہجہ نفرت انگیز تھا۔

''ہوش وحواس میں بات کرو لڑکی..... تمہاری زبان تمہارے قابو میں نہیں رہی اب۔''

ملکہ بیگم غصے سے پھنکاری۔

''ماما' رائے نہیں لے رہی آپ سے' فیصلہ سنا رہی ہوں آپ کو۔'' جب انکل دبئی سے آجائیں تو ہم نکاح کرلیں گے۔'' جواب برق رفتاری سے دیا گیا۔

''کیا فہیم دبئی جا رہا ہے؟'' وہ زیر لب بڑبڑائی۔

''ماما' میں یہی بات پاپا سے بھی کروں گی اور امید ہے آپ میرا ساتھ دیں گی۔'' فائزہ نے ٹکا سا جواب دیا۔

''تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے..... '' ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کریں؟ بلال تو ان کی جان لے لیں گے' انہیں کچھ پتا چل گیا تو۔ نہیں' نہیں......... وہ خود اپنی ہی باتوں سے خوف زدہ ہو گئی تھیں۔

''فائزہ' میری جان' تم ایسا بالکل نہیں کرو گی' دیکھو' یہ غلط ہے' تم نے اپنی اور ان کی عمر میں فرق دیکھا ہے؟'' وہ اسے سمجھانے کی کوشش کر رہی تھیں۔

''ماما' میں ان سے محبت کرتی ہوں اور وہ بھی مجھ سے شادی کے لئے رضا مند ہیں۔ چھپ چھپ کے ملنا بہت مشکل ہے اور پھر میں غلط کام کیوں کروں؟ سیدھی طرح شریعت کے تحت شادی کرلوں' یہی میرے حق میں بہتر ہے۔ آپ فکر نہ کریں' میں پاپا سے خود بات کرلوں گی۔''

''فائزہ...... '' وہ زور سے سسکی لیتے ہوئے چیخیں۔

''ماما..... آپ کو مجھ سے جیلسی تو نہیں ہو رہی؟'' لہجہ طنزیہ تھا۔

''فائزہ' تم اپنی ماں سے کیسی باتیں کر رہی ہو؟'' ملکہ بیگم نے آنسوؤں سے بھری نگاہیں فائزہ پر ڈالیں۔

''ماما..... اب مزید مجھ سے بات کرنا فضول ہے' میں اب اپنے کمرے میں جا رہی ہوں' پلیز' مجھے مزید تنگ نہیں کیجیے گا۔'' فائزہ جا چکی تھی جبکہ ملکہ بیگم نیم بے ہوشی کی کیفیت میں اپنے کئے پر ماتم کر رہی تھیں۔

O.....O.....O

کہتے ہیں' انسان جوش میں ہوش کھو بیٹھتا ہے' یہی ہوا جب فائزہ نے انتہائی ڈھٹائی سے ساری بات پاپا سے کہہ دی۔ بلال کا غصہ اپنے عروج پر تھا' انہوں نے ایک نظر فائزہ کو دیکھا اور پھر اسے دھکا دیتے ہوئے ملکہ بیگم کے کمرے میں آگئے ۔ وہ ملکہ بیگم کو کوستے رہے' ان کو غلط تربیت کے طعنے دیتے رہے' دونوں کے درمیان لڑائی خوب زور وشور سے ہو رہی تھی اور اسی اثناء میں ایک دل خراش چیخ نے فائزہ کو پلٹنے پر مجبور کر دیا ملکہ بیگم کے ہاتھ میں چاقو تھا جو وہ محمد بلال کے سینے میں اتار چکی تھیں' وہ غصے سے پاگل ہو رہی تھیں' بیس سالہ شوہر کی رفاقت میں رہ کر وہ ان کی بلا وجہ پابندیوں سے تو دل برداشتہ تھیں ہی' اب فائزہ کی ایسی حرکت اور فہیم کی بے وفائی نے ان کو بے حس بنا دیا تھا..... شوہر کا قتل کر کے وہ آنکھیں پھاڑے اسے گھور رہی تھیں جبکہ فائزہ چیخ چیخ کر رو رہی تھی۔

''خبردار ..... جو تمہاری آواز بھی اب نکلی..... تمہیں جو کرنا ہے کرلو' شادی کرنا چاہتی تھیں فہیم سے تو کرلو..... مگر اس قتل کے بارے میں اگر کسی کو خبر ہوئی تو میں تمہیں بھی نہیں چھوڑوں گی۔'' ملکہ بیگم کا انداز ورویہ بھی قاتلانہ ہو گیا تھا۔ فائزہ چپ چاپ اپنے کمرے میں آگئی ۔ملکہ بیگم نے کمال ہوشیاری سے اپنے شوہر کی تدفین کروادی۔

ملکہ بیگم کے دل میں انتقام کی جو آگ بھڑک رہی تھی' اس میں مزید شدت آتی جا رہی تھی' انہیں فہیم سے ایسی امید نہیں تھی انہوں نے اپنا آپ فہیم کے لئے وقف کیا تھا' صرف اس لئے کہ ایک دن فہیم' بلال سے علیحدگی کی صورت میں انہیں اپنا لے گا مگر اب سب کچھ بدل چکا تھا' سو اب ان کا اگلا نشانہ فائزہ تھی' شاید وہ ایک تیر سے دو شکار کرنا چاہتی تھیں..... جبھی وہ فہیم کو کال کر کے بتا رہی تھیں کہ..... ''میرے اور تمہارے رشتے کی نوعیت بلال کے سامنے آگئی تھی اس لئے میں نے اسے قتل کر دیا اور اب اس واقعے کی گواہ فائزہ بن چکی ہے' اب ہمیں اسے بھی اپنے راستے سے ہٹانا ہوگا ورنہ ہم دونوں کو حوالات میں بند کر دیا جائے گا۔''

بیٹی کے لئے ایسے جذبات اور ایسے کلمات؟ یقیناً ملکہ بیگم کے اندر ماں کی ممتا کی جگہ شیطان نے لے لی تھی۔فہیم صاحب جو فائزہ کے ساتھ نئے خوشیوں بھرے سفر پہ چلنے کے لئے تیار تھے' وہ چونک گئے' بات تو واقعی ایسی تھی جس سے ان کی بدنامی ہو سکتی تھی اس لئے انہوں نے

سوچنے کا ٹائم لیا اور دوبارہ کچھ دیر میں فون کرنے کا کہہ کر موبائل آف کر دیا۔

باپ کی موت کا دکھ بہت بڑا تھا۔ فہیم صاحب' فائزہ کا دل بہلانے کے لئے اسے بہلا پھسلا کر سی ویو لے گئے اور پھر اگلے ہی دن فائزہ کی گمشدگی کا اعلان کر دیا گیا اور ٹھیک تین دن بعد فائزہ کی نعش سمندر کے ساحل سے مل گئی۔ فائزہ کے ہاتھ پیر بندھے ہوئے تھے اور نعش قابل شناخت تھی۔ بیٹی کی نعش جب ملکہ کے سامنے آئی اور باقاعدہ تفتیش شروع ہوئی تو ملکہ بیگم کچھ چھپا نہیں سکیں۔ ماں کی ممتا تازیانوں کی طرح ان پر برس رہی تھی۔ اپنے کیے پر ندامت ان کے چہرے کے اتار چڑھاؤ میں واضح تھی' شاید گناہ کا احساس' ہر احساس پر حاوی ہو چکا تھا جبھی انہوں نے شوہر اور بیٹی کے قتل کا اعتراف کر لیا اور ساتھ ہی اس بات کا انکشاف بھی کیا کہ باپ اور بیٹی کے قتل میں انہوں نے فہیم احمد کا استعمال کیا ہے۔

کہتے ہیں' محبت اندھی ہوتی ہے مگر ممتا اندھی ہو جائے' یہ پہلی بار دیکھا ہے۔ ماں کی بے حسی کا ایسا عالم اور محبت میں دیوانگی اور یہ تڑپ..... یقیناً آنکھیں کھول دینے کے لئے کافی ہے۔ گھر سے باہر تبلیغی دوروں پر جانے والا محمد بلال اپنے گھر میں وہ ماحول نہیں بنا سکا جس کی تعلیم وہ دوسروں کو دیا کرتا تھا اور فہیم احمد جیسے لوگ معاشرے کے منہ پر ایسی کائی ہیں جو صرف اور صرف گندگی میں پنپتے ہیں۔

آج ملکہ اپنی دنیا لٹا کر کراچی جیل میں اپنی زندگی کے دن گن رہی ہے جبکہ فہیم نواب شاہ جیل میں عمر قید کے کٹھن ایام کے خاتمے کی خاطر سانس لینے پر مجبور ہے۔ قصور کس کا ہے؟ حالات کا' معاشرے کا یا محض ملکہ' فہیم اور بلال کا.....؟

ہم دوسروں کی اصلاح کا بیڑا تو اٹھا لیتے ہیں لیکن اپنی ذمے داریاں جو شرعی طور پر بھی ہماری ذمہ داری ہوتی ہے' پوری کرنے سے کتراتے ہیں۔ بیوی اور بیٹی کا نان و نفقہ کس کی ذمہ داری تھی؟ ملکہ کے گھر پر فہیم احمد کی آزادانہ آمد و رفت کیوں نظر انداز کی گئی؟ اس سوال کا جواب دینے کے لئے بلال دنیا میں موجود نہیں۔ یہ عبرتناک کہانی اپنی ذمہ داریوں سے فرار کا شاخسانہ نہیں تو اور کیا ہے؟

☆......☆......☆

اُف یہ درندے؟

زندگی حیرتوں کا سفر ہے اور مجھے تو ویسے بھی اپنی فطرت میں شامل تجسس بھلا چین سے کہاں بیٹھنے دیتا ہے۔ میرا تجسس مجھے ہمیشہ اضطراب میں مبتلا رکھتا ہے اور کچھ الگ کرنے اور سوچنے کی جستجو ہمہ وقت میرے اندر کروٹ لیتی رہتی ہے' یہی بے کلی جب سائنس دان کے اندر جاگتی ہے تو نت نئی ایجادات ہو جاتی ہیں۔ صوفی کے اندر جاگ جائے تو کشف کے ذریعے قطرۂ سمندر کی حقیقت کو پانے کی کوشش کرنے لگ جاتا ہے اور اگر کسی شیطان صفت انسان کے دل میں بیدار ہو جائے تو وہ اپنے آپ کو خدا سمجھتے ہوئے اپنی طاقت سے پوری دنیا کو بھسم کرنے کے دعوے کرنے لگتا ہے۔ تجسس اور اسرار کے یہ بھید جاننے کی خواہش ہمیشہ میرے دل میں جاگتی رہتی ہے اور اسی حوالے سے میں اس بار "میرے شہر کی کہانی" کے لیے شہر کراچی کی گلیوں سے ایک ایسی کہانی آپ کے لیے ڈھونڈ کے لائی ہوں جسے پڑھ کر آپ کا انسان اور انسانیت پر سے یقین اٹھنے لگے گا' یہ اسرار بھری' روح فرسا کہانی آپ کی آنکھیں نم کر دے گی اور ہاں' یہ پُر اسرار کہانی جاننے کے لیے آپ کو کسی خوفناک حویلی میں جانے کی ضرورت نہیں اور نا ہی آپ کو کسی روح سے ملاقات کی زحمت کرنی ہوگی۔ نہ ہی کسی کفن پوش لاش کو دیکھ کر آپ کے اوسان خطا ہونگے کیونکہ یہ سارے قصے کہانیاں تو آپ سنتے چلے آرہے ہیں جبکہ میں آج ایک ایسی ہولناک حقیقت سے پردہ اٹھا رہی ہوں جو ہمارے معاشرے کا حصہ ہے اور اس کی پراسراریت کی اس سے بڑی اور کیا گواہی ہے کہ کالے

لبادے میں ملبوس یہ کہانی کار ہمارے اردگرد موجود ہیں لیکن ہماری آنکھوں پر تو جیسے پردے پڑ چکے ہیں یا پھر ہم جانتے بوجھتے' سمجھتے ہوئے بھی اس سے صرف نظر کرتے ہیں۔ میں آج اسرار کے وہ بھید آپ پر کھولنا چاہ رہی ہوں جو ہماری آنکھوں کے سامنے ہوتے ہوئے بھی ہمیں نظر نہیں آتے۔

یہ ایک ویران بستی ہے۔ کراچی کے مضافات میں سپر ہائی وے سے متصل اس بستی کا ہر مکیں اپنا گھر بار چھوڑ کر نامعلوم منزل کی طرف روانہ ہو چکا ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ یہ خوف کی علامت ہے' یہاں جنم لینے والی ایک خوفناک کہانی نے ہر گھر کو متاثر کیا' ہر فرد کو متاثر کیا اور پھر لوگوں نے اس بستی سے فرار میں ہی عافیت جانی۔

O......O......O

سپر ہائی وے کے قریب افغان خیمہ بستی کی ایک چھوٹی سے جھگی میں بیٹھا بوڑھا شخص زاروقطار رو رہا تھا۔ عمر دین نامی یہ شخص کچرا چنتا تھا۔ تین سال قبل عمر دین کی پوتی شفیقہ افغانستان سے آئی تھی۔ بچی کی ضد اور دادا کے اکیلے پن کی وجہ سے شفیقہ کو اس کے والدین عمر دین کے پاس چھوڑ کر واپس افغانستان لوٹ گئے اور یوں شفیقہ اپنے دادا کے ساتھ رہنے لگی۔ عمر دین ہر صبح شفیقہ کو گھر پر رہنے کی تلقین کرتا اور خود کچرا چننے نکل جاتا' سہ پہر تک وہ کچرا چنتے چنتے کچرا کنڈی پہنچ جاتا اور پھر اپنی اجرت لیکر وہ کچھ کھانے پینے کا سامان خریدتا اور گھر لوٹ آتا جہاں معصوم شفیقہ اس کی منتظر ہوتی مگر آج جب عمر دین گھر لوٹا تو اس نے شفیقہ کو گھر میں نہیں پایا۔ عمر دین پوری بستی میں شفیقہ کو تلاش کرتا رہا مگر شفیقہ کو شاید کسی نے اغوا کر لیا تھا۔ افغان کیمپ میں شفیقہ کی پراسرار طور پر غائب ہونے کی خبر پھیل چکی تھی' ہر شخص شفیقہ کو ڈھونڈ رہا تھا اور عمر دین کے لبوں پر یہی الفاظ مچل رہے تھے۔ ''میری بچی کھیلتے کھیلتے کہاں لاپتہ ہوگئی؟ وہ تو صبح سے بھوکی بیٹھی میری منتظر تھی کہ کب میرے دادا آئیں گے اور مجھے کچھ کھانے کو ملے گا؟ ہائے میری پوتی.........! کوئی ڈھونڈ کر لاؤ میری پوتی کو' کوئی ڈھونڈ کے لاؤ۔''

لوگوں کا وہ پورا دن شفیقہ کو ڈھونڈتے ہوئے گزرا تھا اور اب رات ہو چکی تھی مگر اس بچی کا

کچھ پتا نہیں چلا تھا۔ عمر دین اپنی چھ سالہ پوتی شفیقہ کی گمشدگی پر آنسو بہا رہا تھا' اسے رہ رہ کر معصوم شفیقہ کی یاد ستا رہی تھی۔ رات ہوتے ہی وہ اپنے ننھے ننھے ہاتھ دادا کے گلے میں ڈالے اُن سے کہانیاں سنتی تھی۔ کبھی کبھی دادا کے تھکے ہارے گھر لوٹنے پر وہ اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے اُن کے پیر بھی دبا دیتی تھی۔ عمر دین کی کل کائنات معصوم شفیقہ تھی جس کی بدولت اُس کی زندگی میں خوشیوں کی رُت لوٹ آئی تھی اور اُس کا دل گھر میں لگنے لگا تھا ورنہ تو وہ رات ہوتے ہی گھر لوٹتا تھا۔ شفیقہ کی اچانک گمشدگی پر وہ رات عمر دین پر عذاب بن کر ٹوٹی تھی۔

O......O......O

امیر علی کا تعلق اندرون سندھ سے تھا۔ وہ ایک وڈیرہ تھا۔ دو سال پہلے وہ شازیہ سے شادی رچا کر اسے اپنے عالیشان حویلی میں لایا تھا۔ شازیہ اس کی چوتھی بیوی تھی۔ امیر علی اولاد سے محروم تھا اور شازیہ سے اس کی شادی کی وجہ اولاد کا حصول تھی مگر ستم ظریفی یہ تھی کہ شازیہ بھی شادی کے دو سال تک اسے کوئی خوشخبری نہیں سنا سکی تھی۔

''تم نے ابھی تک مجھے باپ بننے کی خوشخبری نہیں سنائی''؟ وہ شازیہ سے شکوہ کر رہا تھا اور شازیہ کوئی جواب نہیں دے سکی' بس وہ خاموشی سے امیر علی کے رعب و دبدبے کے آگے مجرموں کی طرح سر جھکائے بیٹھی تھی۔

''لیکن تم کان کھول کر سن لو' مجھے اولاد چاہیے۔ تمہاری ماں نے مجھ سے تمہاری جوانی کی ٹھیک ٹھاک قیمت وصول کی ہے۔ اب اگر تم مجھے اولاد نہیں دے سکیں تو میں تمہارا گلا گھونٹ دوں گا..... '' پچاس سالہ امیر علی غصے سے پاگل ہو رہا تھا' اس کا دل چاہ رہا تھا' اپنی سترہ سالہ خوبصورت بیوی کا نازک گلا اپنے مضبوط ہاتھ کی گرفت میں لے کر اس کا حلقوم انگوٹھے سے دبا دے۔ شازیہ سہم گئی تھی اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے امیر علی کو دیکھ رہی تھی۔ اس کے حلق سے منمناہٹ والی آواز نکل رہی تھی۔

''رحم سائیں' رحم۔'' وہ ہاتھ جوڑے رحم طلب نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

''ہاں بول' ہوگئی اس بنگالی سے بات ؟''۔ امیر علی بیوی کو چھوڑ کر اب موبائل فون پر گفتگو کر رہا تھا۔ شازیہ کے اوسان کچھ بحال ہوئے تھے۔

"ٹھیک ہے' کل صبح اس کے پاس پہنچ جائیں گے۔ ارے وہ ایک بار ہمارا کام کر دے' بس ہم اسے مالا مال کر دیں گے"۔ مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے امیر علی بہت غرور سے بولا اور پھر موبائل بند کرتے ہی وہ شازیہ کی جانب مڑا۔

"کل صبح صبح تیار رہنا؟ ہم جلدی نکلیں گے۔"

"مگر میں وہاں نہیں جانا چاہتی۔" شازیہ نے ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں کہا۔

"کیوں؟" امیر علی کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔

"مجھے اس بنگالی سے خوف آتا ہے۔" شازیہ کے جسم پر لرزہ طاری ہو رہا تھا۔

"میں کچھ نہیں جانتا' تجھے جتنا کہا گیا ہے' اتنا ہی کر۔" امیر علی اپنی جگہ سے اٹھا اور شازیہ کے قریب آ گیا۔

"سائیں.....وہ انسانی ڈھانچے کو سامنے رکھے عملیات کر رہا تھا' وہ اس ڈھانچے سے شیطانی طاقت مانگ رہا تھا' جو خود ڈھانچے سے شیطانی قوت مانگ رہا ہو وہ ہمیں کیسے اولاد دے گا؟" شازیہ نے شوہر کو سمجھانے کی کوشش کی۔

"وہ بنگالی بابا اسی طرح علاج کرتا ہے اور جو چاہتا ہے' وہ ہو جاتا ہے۔ اس کا کہنا ہے' انسان تو مٹی کا بنا ہوا ہے' اس کا علم تو پتھر کو پھاڑ کر رکھ دیتا ہے۔ میرے پاس اتنی دولت ہے' زمینیں ہیں' جاگیریں ہیں اور ان سب کا مجھے وارث چاہیے' وارث اور اس کے لیے میں کسی بھی حد تک جا سکتا ہوں۔"

"لیکن اسلام میں جادو ٹونہ حرام ہے اور میں اس کام میں آپ کی حصہ دار نہیں بن سکتی۔" شازیہ کے چہرے پر عزم تھا۔

"تیری اتنی ہمت؟ تُو مجھے جواب دے گی؟" امیر علی نے ایک زنانے دار تھپڑ شازیہ کے گال پر رسید کر دیا۔

"میں سچائی بیان کر رہی ہوں' آپ کیوں اپنے ساتھ مجھے بھی گناہ اور سزا کا مرتکب بنا رہے ہیں؟ حالانکہ آپ جانتے ہیں کہ میڈیکل رپورٹ کے مطابق آپ ہی......" وہ آگے کچھ نہ کہہ سکی۔

"تیری زبان بہت چلتی ہے مگر تجھے خبر نہیں ہے کہ پُر اسرار علم جاننے والا وہ بنگالی بابا بدروحوں سے ملاقات کرتا ہے' سفلی اور کالا علم' یہ سب اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ وہ کوئی ایسا عمل کرے گا کہ ہمارے یہاں اولاد ہو جائے گی......."

" یہ جانتے ہوئے بھی کہ سفلی اور کالا جادو حرام ہے' اس شیطانی طاقت سے مانگ رہے ہیں؟" شازیہ نے سوالیہ نگاہوں سے شوہر کو دیکھا۔

" مجھے اپنا مقصد عزیز ہے اور اس کے لیے میں اس بنگالی بابا کو ٹھیک ٹھاک پیسے دے چکا ہوں' اب وہ کسی کی بھی قبر کھودے' لاش نکالے' ڈھانچے سے بات کرے' یہ اس کا کام ہے ۔ مجھے تو بس اولاد چاہیے اور کان کھول کر سن لے تو اگر مجھے وارث نہیں دے سکتی تو میں تجھے بہت جلد اپنے خاندانی قبرستان میں بھیج دوں گا۔"

شازیہ کی زبان گنگ ہو چکی تھی' ڈر اس پر اتنا حاوی ہو چکا تھا کہ وہ جنبش کرنے کے قابل بھی نہیں رہی تھی' بس نفرت بھری نگاہوں سے وہ وڈیرے امیر علی کو کمرے سے باہر نکلتے ہوئے دیکھتی رہی' سلگتی' کڑھتی شازیہ کا یہ دل چاہ رہا تھا کہ وہ آگے بڑھ کر شوہر کا سارا خون چوس لے' اپنے ناخنوں سے اس کی آنکھیں نوچ لے۔

O......O......O

منہاج نامی بنگالی بابا کے پاس سے آنے کے بعد سے شازیہ کو اپنے بڈھے شوہر امیر علی سے شدید نفرت ہو گئی تھی' میڈیکل ان فٹ اس کا شوہر اولاد کے حصول کے لیے اس پر ظلم ڈھا رہا تھا۔ اس نے ایک بڑی رقم دے کر اسے اس کی ماں سے خریدا تھا۔ غربت کی ماری ماں کے بڑھاپے کے لیے اس کی ذات سیونگ ڈپازٹ تو بن گئی تھی مگر قدم قدم پر اس کے ارمانوں کا جو خون ہو رہا تھا' وہ اس کی ماں کی بوڑھی آنکھیں دیکھنے سے قاصر تھیں اور جب سے اس کا شوہر امیر علی کسی بنگالی بابا کے چنگل میں پھنسا تھا' اس کا دل چاہ رہا تھا' وہ اس کا یا اپنا گلا خود اپنے ہاتھوں سے گھونٹ دے۔

O......O......O

چاند کی آخری راتیں تھیں' درختوں کے سبب وہاں اتنی گہری تاریکی تھی کہ چند فٹ سے

زیادہ فاصلے کی ہر چیز بھی واضح نظر نہیں آ رہی تھی۔ درختوں سے گھرا یہ مکان دو کمروں اور بڑے سے صحن پر مشتمل تھا۔ صحن کے درمیانی حصے میں لکڑیوں کو جلا کر روشنی کی گئی تھی۔

"بابا' اس مردے کو کفن سے آزاد کر دیا ہے' اب آگے کیا حکم ہے؟"

"تم اور مختار اس مردے کے گوشت کو ہڈیوں سے الگ کر لو تاکہ ہمیں ہڈیاں مل جائیں۔" بنگالی بابا منہاج اپنے کارندوں کو اتنا لرزہ خیز کام کرنے کا حکم دے رہا تھا۔ دونوں کارندے سعادت مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے لاش کا پوسٹ مارٹم کرنے کے لیے واپس کمرے میں لوٹ گئے۔

"جا' جا کر لے آ اُس بچی کو' یقیناً اسے اب ہوش آ گیا ہوگا۔" بنگالی بابا نے اپنی سرخ آنکھوں کو پھیلاتے ہوئے اپنے دوسرے کارندوں کو حکم دیا۔

چھ سالہ شفیقہ کا بند کمرے میں خوف سے دم گھٹنے لگا تھا' ہوش میں آنے کے بعد وہ مسلسل روئے جا رہی تھی۔ مختار اور بلراج نامی کارندوں نے اس بچی کے دونوں بازوؤں کو تھاما اور اسے صحن میں لے آئے۔

"ٹھیک ہے' میرا کام اب شروع ہونے جا رہا ہے' آج کی رات میں خصوصی چلہ کاٹ رہا ہوں اور تم دونوں کو میرا آخری وقت تک ساتھ دینا ہوگا۔"

"ایک بار سوچ لیجیے۔" مختار منمنایا۔

"میں اپنے استاد عملیات کے شہنشاہ کے ہر عمل کو سیکھنا چاہتا ہوں اور یہ عمل بھی میں مکمل کروں گا۔" منہاج نے گرج دار آواز میں کہا۔

"کک..... کو..... کون..... ہو..... تم لوگ؟" خوف سے ہکلاتی شفیقہ کے منہ سے لفظ ہوا ہو گئے تھے اور پھر زار و قطار روتی اس کی آواز اور چیخیں دل دہلانے لگیں۔

"چپ ہو جا........" بچی کے رونے سے بنگالی بابا کا دماغ خراب ہو گیا تھا۔

"بابا.....! بابا.....! اماں.....! دادا.....! دادا.....!" جیسی گھٹی گھٹی آوازیں مسلسل اس بچی کے لبوں سے پھوٹ رہی تھیں۔

"چپ ہوتی ہے یا.....۔" بنگالی بابا نے لوہے کا سریا اس کے سر پر مارا تھا تو وہ تکلیف

سے دہری ہوتی زمین پر گرگئی۔

''چل چھری لے کر آ اور اس مردے کا ڈھانچہ بھی صحن میں لے آ' وقت تیزی سے برباد ہوتا جارہا ہے۔'' بنگالی بابا نے اپنے ماتحتوں کو حکم دیا تھا۔

'' مردے کا جسم ایک ڈھانچے میں تبدیل ہو چکا تھا' وہ دونوں اس ڈھانچے کو کھینچتے ہوئے صحن میں لے آئے تھے' صحن کے درمیان نارنجی رقص کرتے شعلوں کی روشنی میں ایک ڈھانچے کو دیکھتے ہی زخمی سر کے ساتھ فرش پر پڑی شفیقہ کے حلق سے بے ساختہ ایک چیخ نکل گئی تھی' خون اور پسینے سے تر اس کا جسم اب ہلنے کی طاقت سے بھی محروم ہو چکا تھا' وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے ڈھانچے کو دیکھتی بے ہوش ہو چکی تھی۔

''چلو' شکر ہے' ہمارا کام تو آسان ہو گیا۔'' یہ کہہ کر بنگالی بابا نے دونوں کارندوں کو شفیقہ کے ہاتھ اور پاؤں پکڑنے کے لیے کہا اور پھر تیز چاقو لیے اس کا سر اپنے زانو پر رکھ لیا۔ اب وہ مستقل کوئی منتر پڑھ رہا تھا۔ مختار اور بلراج نے بچی کے ہاتھوں اور پیروں کو مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا اور پھر یکا یک قدرے ہلکی چیخ کے ساتھ خون کا لاوا بچی کے گلے سے ابلنے لگا۔ بنگالی بابا کی آنکھوں میں چمک اور چہرے پر خوشی آگئی جبکہ مختار' شفیقہ کا دھڑ سے جدا سر دیکھ کر دہشت زدہ انداز میں بچی کے پاؤں چھوڑ کر پیچھے ہو گیا تھا جبکہ بلراج بھاگتا ہوا کمرے میں گیا تھا اور پھر پلک جھپکتے ہی وہ ایک بڑی سی دیگ لے آیا تھا' اس دیگ کو آدھا پانی سے بھرنے کے بعد بنگالی بابا نے انتہائی برق رفتاری سے شفیقہ کا سر اور دھڑ اس دیگچی میں ڈالا تھا اور اسے آگ پر رکھ دیا تھا' تقریباً دو گھنٹے بعد بنگالی بابا اور بلراج نے شفیقہ کے ابلے ہوئے جسم اور کھوپڑی سے گوشت اتار لیا تھا۔ مختار کی حالت اب نہایت غیر ہو چکی تھی۔

شفیقہ کے جسم کی کچھ خاص ہڈیاں اور کھوپڑی بنگالی بابا نے ایک خاص عمل کے لیے اپنے پاس رکھتے ہوئے کہا تھا۔ ''جاؤ جا کر اس کا جسم باہر پھینک آؤ' یہ ہمارے کسی کام کا نہیں۔''

بنگالی بابا نے یہ حکم مختار کو دیا تھا جو اس طرح کے کاموں کا عادی تھا مگر ایک معصوم اور ننھی سی جان کے ساتھ ایسا سلوک دیکھ کر آج اس کی اپنی روح لرزنے لگی تھی۔

''جو آپ کا حکم......'' وہ منمناتا ہوا اٹھا۔ اس نے شفیقہ کا دھڑ ایک چادر میں باندھا

تھا اور دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔

قبر سے نکالے گئے مردے کا ڈھانچہ اور شفیقہ کی تازہ کھوپڑی' بنگالی بابا کے سامنے رکھی تھی۔ وڈیرے امیر علی کی اولاد کے لیے کیے جانے والا یہ خاص چلہ مسلسل سات گھنٹے کا تھا جو علی الصباح ہی ختم ہوتا تھا۔

''بلراج' تم اس بات کا دھیان رکھنا کہ آگ نہ بجھنے پائے۔'' بنگالی بابا' بلراج کو حکم دیتے ہی آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا تھا۔ کالے رنگ کے لبادے' گلے میں منکوں کا ہار ڈالے وہ دونوں ہاتھ جوڑے آنکھیں بند کیے بیٹھا تھا' اس کے لب مسلسل ہل رہے تھے۔ ایسے میں ہلکی سی آواز کے ساتھ دروازہ کھلا تھا۔ مختار مرے ہوئے قدموں سے چلتا ہوا بلراج کے قریب بیٹھ گیا۔ اب وہ دونوں اکڑوں بیٹھے منہاج بنگالی بابا کو تک رہے تھے۔

O......O......O

بنگالی بابا کے پاس وڈیرہ امیر علی اور اس کی بیوی شازیہ پہنچ چکے تھے۔

''ہم کالے علوم کے ماہر ہیں' ہمارے ایک رات کے عمل سے تمہاری پوری زندگی سنور جائے گی' جا' جا کر ہمارے اس خاص تیر بہدف نسخے کا استعمال کر' تجھے اولاد ہو جائے گی۔'' بنگالی بابا نے ہاتھ ہوا میں لہراتے ہوئے معنی خیز نظروں سے امیر علی کو دیکھا تھا جبکہ شازیہ نے نفرت سے بھرپور نظر اس بنگالی بابا کے سراپے پر ڈالی۔

''تمہیں اس خاص پانی سے نہانا ہے۔'' اب وہ شازیہ کی طرف مڑا تھا۔ ''جاؤ' جا کر ابھی غسل لے لو۔'' بنگالی بابا نے غسل خانے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''نہیں...... میں نہیں......'' شازیہ تیزی سے کھڑی ہو گئی تھی' خوف کے سائے اس کے چہرے پر منڈلا رہے تھے۔

''ٹھیک ہے' اس دیگ کا پانی ان کے ساتھ کر دو۔'' بنگالی بابا نے بلراج کو حکم دیا تھا اور خود امیر علی کے چہرے پر نظریں جمائیں۔

''بابا جی...... بس کام پکا ہونا چاہیے۔'' امیر علی نے نوٹوں سے بھرا لفافہ بنگالی بابا کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔

"ارے سائیں...... بے فکر رہو میرا علم تو سانپ کے زہر کی طرح اثر رکھتا ہے' وہ لوگ جو جگہ جگہ عاملوں کے پاس جا کر مایوس ہو چکے ہیں' وہ ہتھیلی پر سرسوں جمانے اور دل کی مراد پانے میرے در پر آتے ہیں' تمہارا کام جلدی ہو جائے گا۔" بنگالی بابا نے ہوا میں ہاتھ لہرایا۔ وہ دونوں میاں بیوی اس اشارے کا مطلب بخوبی سمجھ گئے تھے' سو خاموشی سے باہر نکل آئے تھے۔

O......O......O

بکریوں کے ریوڑ پر پتلی لمبی سی چھڑی چلاتا ایک چرواہا صبح ہوتے ہی اپنے مخصوص راستوں پر رواں تھا۔ کچھ ہی دیر میں دور تک پھیلی ہری جھاڑیوں کو دیکھ کر اس کے چہرے پر اطمینان کے آثار نمایاں ہو گئے تھے۔ وہ قریب ہی پڑے بڑے سے پتھر پر بیٹھ گیا تھا۔ اس نے اپنے فرنٹ پاکٹ سے سگریٹ نکالی اور پھر قمیص کی سائیڈ پاکٹ سے ماچس نکال کر سگریٹ سلگائی۔ اب وہ لمبے لمبے کش لے رہا تھا جبکہ اس کی نظریں بکریوں پر تھیں۔ کچھ ہی دیر میں اس نے ناک کو سکیڑ کر گہرا سانس لیا تھا اور پھر وقفے وقفے سے سانس لیتے ہوئے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا تھا۔ وہ ماحول میں موجود عجیب سڑاند کو محسوس کر چکا تھا اور پھر یکدم اس کی نظریں ذرا دور جھاڑیوں میں الجھی انسانی ہڈیوں' سنہرے بالوں اور رنگین کپڑوں پر گئی تھیں۔ خوف کے مارے اس کی گھگھی بندھ چکی تھی۔ وہ پریشانی کے عالم میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگا' اس کا دل گھبرا رہا تھا اور پھر وہ یکدم تیزی سے بھاگنے لگا جیسے پلٹ کر دیکھے گا تو پتھر کا ہو جائے گا۔

O......O......O

سپر ہائی وے کے نزدیک افغان کیمپ غریب آباد کے علاقے میں گزشتہ دن پوری بستی پر بھاری گزرا تھا' پولیس اسٹیشن پر چکر لگاتا عمر دین اپنی پوتی کے لیے پریشان تھا جو دن دیہاڑے اچانک غائب ہو چکی تھی اور اب صبح ہوتے ہی قبرستان کا رکھوالا ایک قبر کی کھدائی اور مردے کی چوری کی اطلاع دینے آیا تھا۔ ابھی پولیس سب کے بیان نوٹ کر رہی تھی کہ ایک چرواہا ہانپتا کانپتا آیا.... اور اب وہ جھاڑیوں میں چھپی ایک سربریدہ لاش کی نشاندہی کر رہا تھا جو کسی بچی کی تھی۔

O......O......O

پولیس کی تفتیش جاری تھی اور بہت سارے شواہد کی روشنی میں وہ منہاج نامی بنگالی بابا کو تلاش کرتی آخر اس تک پہنچ گئی ......اور پھر جلد ہی اس کالے علم کے ماہر نے پولیس کے سامنے یہ اقرار کرلیا تھا کہ یہ جو کچھ اس نے کیا' وہ اس کے عمل کا حصہ تھا اور اس نے یہ خاص عمل ایک بے اولاد وڈیرے کے لیے کیا ہے۔

کیا شفیقہ کو قتل کر کے پانی میں ابال کر اس پانی سے نہانے سے اولاد ہو جائے گی؟

کم بخت بنگالی بابا نے ایک ماں کی گود بھرنے کے لیے دوسری ماں کی گود اجاڑ دی ہے۔ اس پھول سی بچی شفیقہ کی معصومیت پر بھی ترس نہ آیا۔ ایسے گھناؤنے کردار والے لوگ ہمارے معاشرے کو جونک کی طرح چاٹ رہے ہیں' کبھی کالا علم تو کبھی جادو ٹونہ' دولت کے یہ پجاری جب تک جڑ سے نہیں اکھاڑ پھینکے جائیں گے' معصوم شفیقہ جیسی نہ جانے کتنے پھول جیسے چہرے کمہلاتے رہیں گے؟

پولیس یقیناً تفتیش کے سارے مراحل طے کرے گی اور بنگالی بابا کو اس کے کیے کی سزا بھی مل جائے گی لیکن اس سارے قصے میں ایک پہلو اپنے اندر پراسراریت لیے ہوئے ہے کہ شفیقہ کس کی بیٹی تھی؟ اس کے باپ کا نام کیا تھا؟ وہ دادا کے پاس کیوں مقیم تھی؟ عمر دین کیا واقعی اس کا دادا تھا؟ یا اسے افغانستان سے اغوا کر کے لایا گیا تھا؟ افغان مہاجرین کے کیمپوں میں ایسی لڑکیاں اچھی خاصی تعداد میں موجود ہیں جن کے ماں باپ یا تو جنگ کی نذر ہو گئے یا جرائم پیشہ عناصر پاکستان کی جانب نقل مکانی کرتے ہوئے انھیں اغوا کر کے لے آتے ہیں اور یہاں پر منہ مانگے داموں ان معصوم لڑکیوں کو فروخت کر دیا جاتا ہے۔ افغان مہاجرین کے کیمپ جرائم کا گڑھ سمجھے جاتے ہیں جہاں اسلحہ' منشیات' دھماکہ خیز مواد اور مغوی بچوں سمیت ہر شے دستیاب ہے لیکن مجھے افسوس تو اس بات کا ہے کہ میرا قلم سائنسی افکار پر یقین اور چلنے کے باوجود ایک ایسے واقعے کو قلم بند کر رہا ہے جو بالکل ایسا ہے جیسے حال میں ماضی کی قبر کھود کر فرسودہ روایات کی نشاندہی کرنا۔

☆......☆......☆

جنگل میں جمہوریت

صبح سویرے کی ہواؤں نے جیسے ہی کروٹ لی تو پُر مست ہو کر بنفشے، گلاب، کیکر نے جنگل میں دور تک پھیلی ہریالی کی مہک اپنے اندر سمولی۔ جنگل اب پوری طرح جاگ چکا تھا۔

دھند کا آنچل جیسے ہی سمٹا، شبنم کے ننھے، ننھے قطرے گلابوں کے کٹوروں سے ٹپکنے لگے، ہرے، ہرے پتے شبنم سے غسل کے بعد کچھ اور نکھر سے گئے۔ آج دھرتی کی گود اس طرح خوش تھی جیسے نوزائیدہ بچے کی آمد پر پہلی بار ماں کی گود خوشی سے لبریز ہو جاتی ہے۔ جنگل کی سرزمین پر ہر جاندار وجود، آج خوشی کے ترانے گا رہا تھا۔ چرند پرند زمین اور ہوا میں رقص کرتے نظر آرہے تھے۔

پھول، پتے، بیل، بوٹے، شجر دور تک پھیلا سبزہ یوں لہرا رہا تھا جیسے جنگل میں آج شادمانی کا سامان ہو۔

آج کی صبح کچھ نرالی صبح تھی۔ گہرے ہرے طوطے نے اپنی نظریں اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا اور پھر جلد ہی پھدکتا ہوا بڑے سے برگد کے درخت کی اوٹ میں چلا گیا۔ بوندہ باندی شروع ہو چکی تھی جیسے ہی بارش مسلسل ہوئی۔ طوطا آہستہ، آہستہ باہر آگیا اور رم جھم، رم جھم بارش میں بھیگنے لگا۔

پہاڑیوں سے پھسلنے والی گیلی مٹی سدا سہاگن دھرتی کی آغوش میں سمانے لگی۔ پہاڑیوں کے درمیان ندی میں شور وغل آج غیر معمولی تھا۔ پورے جنگل کو موسم کی پہلی بارش کی اطلاع

مل چکی تھی۔ ندی میں گہرے پانیوں میں اترے ہاتھی صبح کے غسل کے ساتھ، ساتھ موسم کی پہلی بارش کا مزہ بھی لے رہے تھے۔

پانی بھر، بھر کے ایک دوسرے پر اڑاتے ہاتھی آج شرارت کے موڈ میں تھے۔ بطخوں کا ٹولہ کنارے سے قریب ہی ندی میں چھپ، چھپ کرتا اور پھر اپنے پروں کو پھیلا کر ہلکی سی اُڑان لے کر واپس کنارے پر آجاتا۔

پگڈنڈی کو چیرتا زیبرے کا گروہ اپنی پیاس کی تسکین کیلئے ندی کنارے آچکا تھا۔ ان کے جسم کی کالی اور سفید دھاریاں پہاڑیوں کے پس منظر میں خوب نکھر رہی تھیں۔

بے ضرر چوپائے بھی سہمے، سہمے اس سنہری موسم میں ندی کے کنارے آنے کی جرات کر چکے تھے۔ سہمے، سہمے ان کے خاموش قدموں تلے آتی گھاس بھی مسکرا رہی تھی۔ پرندے بھی اپنے اپنے خول سے نکلنے لگے اور اتراتے ہوئے ندی کنارے پر پھیلا کر فضا میں چند ثانیوں کیلئے معلق ہو جاتے اور پھر دھیرے سے زمین پر اتر آتے۔ ندی کے کنارے پرندے پانی پر گرتے ہی جہازوں کی طرح لنگر انداز ہو جاتے۔ سب اپنی، اپنی بساط پر جنگل میں ہونے والی پہلی بارش سے فیض یاب ہو رہے تھے۔

ریچھ اور گینڈے کا گروہ، پگڈنڈی کے اس پار اپنے، اپنے گروہ کو ترتیب دے رہا تھا۔ ننھے۔ ننھے گینڈے کے بچے چلتے، چلتے آنکھ مچولی کھیل رہے تھے اور گینڈوں کا سربراہ خفگی انداز میں کچھ بڑے گینڈوں کو حکم دیتا کہ بچوں کو ڈھونڈ لیں اور ساتھ لے کر چلیں۔

اسی اثناء میں جنگل کے سکون کو چیرتی آوازوں نے سب کو اپنی، اپنی جانب متوجہ کر لیا۔ زور آزماتے ہاتھیوں کی چنگھاڑ، پرندوں کی لہک اور ترانے اور سارے جانوروں کی اپنی، اپنی بولیوں میں اظہار رائے..... پُرسکون جنگل آوازوں سے بھر گیا۔ فضا حیرت سے شور مچاتی، پھلتی پھولتی اور پروان چڑھتی اس دنیا کو دیکھ رہی تھی۔ شب باشی کی انگڑائیوں اور کسل مندیوں سے جنگل میں نیند کا خمار ٹوٹ رہا تھا۔ پیڑوں کے ابھار اور زخموں میں نئی نویلی کونپل سر ابھار رہی تھی، زمین کی کوکھ میں جگہ، جگہ بن جانے والے گڑھے بارش کے پانی سے بھر چکے تھے۔ ہاتھیوں کے قدموں تلے روندھی گھاس سر اٹھا چکی تھی۔

ابھی سورج تو نہیں نکلا تھا لیکن صبح کے ستارے معدوم ہو چکے تھے اور روشنی اتنی پھیل گئی تھی کہ سارے مناظر نظر آنے لگے تھے۔

معمول سے زیادہ شور وغل کی آواز پر بندر جاگ گیا، بندر نے ڈالی پر لٹکے، لٹکے ایک ہاتھ بڑھا کر میٹھی بیل توڑنے کی کوشش کی اور اگلے ہی پل وہ بیل کو پانے کی سعی میں پھسلتا چلا گیا۔ بندر نے دونوں ہاتھوں سے ڈالی مضبوطی سے پکڑ لی اور ڈالی کے بل جھولنے لگا۔

ندی کنارے بیٹھی بندریا چلو میں پانی لے کر بدن پر ڈال رہی تھی ٹھنڈی ہواؤں کے مزے لیتی مٹی میں رچی ہوئی اپنی جلد کو ندی کے شفاف پانی سے بھگوتی اور دھوتی جا رہی تھی اور اپنی تسکین کی خاطر ہتھیلی کے دباؤ سے اپنے پنجوں کو دہاتی غسل کو طول دیتی رہی۔ پھر بندریا آہستہ، آہستہ ندی سے باہر آگئی اور ہاتھیوں کے پیروں سے بنے والی کیچڑ سے بچنے کیلئے اپنی ایڑھیاں اٹھا کر پنجوں کے بل لپے، لپے ڈگ بھرتی ہوئی ٹہنیوں کے پیچھے غائب ہوگئی۔ ڈالی پر بیٹھا بندر وہیں مبہوت ہو چکا تھا اور بندریا کے جانے کے بعد سرد آہیں بھرتا اس کے تعاقب میں وہ ہری ہری ٹہنیوں کے آگے ٹہلنے لگا۔ دور پہاڑیوں کے پیچھے سورج کا گھیرا اُبھر آیا تھا۔ روشنی اور چمکیلی دھوپ آہستہ، آہستہ پورے جنگل کو اپنی لپیٹ میں لے رہی تھی۔ جنگل کے وسط میں ایک خوبصورت بڑا سا غار تھا جسے ہری، ہری خوش رنگ پھولوں سے لدی بیلوں اور گلاب وموتیا کے پھولوں سے سجایا گیا تھا۔ اس غار کے دونوں اطراف دو موٹے، موٹے ریچھ براجمان تھے۔ اس غار کے منہ کے بالکل اوپر خوبصورت سفید کبوتر ہوائی فوج کی ڈیوٹی انجام دے رہے تھے۔ وہ غار کے اوپر ہوا میں دائرے کی صورت میں گھوم رہے تھے۔ کچھ ہی وقفے بعد ان کی جگہ دوسرے کبوتر لے لیتے اور وہ کچھ دیر کے لئے ستا لیتے۔

غار کے اندر بادشاہ سلامت مٹی کے ڈھیر سے بنے ایک اونچے تخت پر براجمان تھے۔

آج بادشاہ بہت افسردہ نظر آرہے تھے۔

موسم کی پہلی بارش اور جنگل میں پھیلی خوشیوں کی خبر ان تک پہنچ چکی تھی۔ بادشاہ اپنی رعایا کی خوشی میں تو خوش تھے لیکن اکیلے پن کے احساس نے ان کو اندر ہی اندر ختم کر دیا تھا۔ کچھ ہی دنوں پہلے ان کی محبوب ملکہ شیرنی گذری تھیں۔ بادشاہ سلامت اپنی شیرنی کی

غیر موجودگی پر سخت رنجیدہ تھے اور ان کو اس بات کا اور بھی زیادہ دکھ تھا کہ ان کے تخت کا کوئی وارث نہیں۔ ان کے بعد بادشاہت کی ذمہ داری کون سنبھالے گا؟ کون اس جنگل کو اس طرح خوشیاں دیتا رہے گا؟ رعایا کو امن وامان کی ترغیب کون دے گا؟

اگر میں نہیں رہا تو کیا یہ جنگل یونہی مسرتوں سے پھلتا پھولتا رہے گا؟ ایک دوسرے کے ساتھ ہمدردی سے پیش آنا، اعلیٰ اور ادنیٰ کا فرق مٹا کر، برتری بھلا کر کیا مساوات یونہی قائم رہے گی۔

اپنی سوچوں میں گم بادشاہ سلامت شیر نے پہلو بدلا اور اضطراب کی کیفیت میں ٹہلنے لگے۔

O......O......O

لومڑ کا اگلا نشانہ بادشاہ سلامت ہی تھے، غار سے دور لومڑ اپنے گھر میں یہ منصوبہ بنا رہا تھا کہ اگر وہ بادشاہ سلامت کو ختم کر دے تو اس کا راج ہو جائے گا۔ کیونکہ وہ بادشاہ سلامت کے بہت قریبی ساتھیوں میں سے ایک تھا۔ اور جنگل میں جنم لینے والی سازشوں کی خبریں بادشاہ سلامت تک پہنچایا کرتا۔ اس لئے سارا جنگل لومڑ سے خوفزدہ رہتا۔ تو اگر میں بادشاہ سلامت کو مار دوں اور ان کی جگہ آجاؤں تو میری حاکمیت ہو جائے گی۔ خود کو بادشاہ کے تصور میں دیکھتا لومڑ، لومڑی کے انتظار میں بیٹھا تھا۔ جو اس کے لئے ناشتے کا انتظام کرنے باہر گئی تھی۔

اور پھر اس خوفناک سازش نے جیسے ہی لومڑ کے دماغ میں جنم لیا وہ دور پہاڑیوں کی طرف تیزی سے بڑھنے لگا۔ وہ بہت تیزی سے چلتا جا رہا تھا اور اپنے تیز، تیز قدموں سے لمبے لمبے ڈگ بھر رہا تھا فاصلہ تیزی سے کم ہو رہا تھا اور پھر وہ جنگل سے دور اک مقام پہ پہنچا جہاں پیلی، پیلی جھاڑیوں کا انبار تھا۔ لومڑ مکروہ انداز میں مسکرایا اور اس نے بڑی ہی حفاظت کے ساتھ چند ٹہنیاں توڑیں اور ان کو پیپل کے بڑے سے پتے میں لپیٹا اور سنبھال کے اپنی کمر پر باندھ لیا۔

واپسی پر لومڑ اپنے قدموں کے نشان مٹاتا جیسے ہی جنگل میں داخل ہوا تو اندھیرا اپنے پر

پھیلا چکا تھا۔ وہ آہستہ، آہستہ اپنے گھر پہنچا اور لومڑی کے سونے کا انتظار کرنے لگا۔ لومڑی جو لومڑ کے انتظار میں بیٹھی تھی وہ جلد ہی اس کی واپسی پر پُر سکون نیند کی آغوش میں چلی گئی۔

لومڑ نے زہریلی جھاڑیوں کو پیسنا شروع کیا اور ان کا عرق نکال کر رکھ لیا اور پھر اگلی صبح کا انتظار کرنے لگا۔

اگلی صبح جنگل میں خلاف معمول تھی۔ لومڑ نے زہریلی جھاڑیوں کا عرق لیا اور بادشاہ سلامت کی خدمت میں لے آیا۔

''کیا احوال ہیں ہماری رعایا کے؟'' بادشاہ نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''حضور سب ٹھیک ٹھاک ہے سارے جانور خوش ہیں۔ کل کی بارش نے زراعت پر گہرا اثر مرتب کیا جنگل میں موجود درختوں اور بیلوں پر اب پھلوں کی آمد تیزی سے متوقع ہے اور تو اور کل کی بارش کے بعد پیلی پڑتی اور سوکھی گھاس تیزی سے ہری ہونے لگی ہے۔''

''بہت خوب، یہ بتاؤ کوئی نئی سازش، کوئی لڑائی جھگڑا......''

''نہیں، نہیں حضور'' لومڑ نے بادشاہ کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''سب ٹھیک ہے حضور، آپ کی بادشاہت میں رعایا بہت خوش ہیں۔''

''اونہہ'' یہ سنتے ہی بادشاہ گہری سوچ میں ڈوب گئے۔

''حضور آپ کی صحت کی فکر مجھے کھائے جا رہی ہے۔ یہ جڑی بوٹیوں کا عرق لایا ہوں۔ تھوڑا کڑوا ضرور ہے لیکن آپ کی صحت اور طاقت کے لئے تیر بہدف ہے۔'' لومڑ نے عرق آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''بہت شکریہ میاں لومڑ رکھ دو اسے ہم دوپہر کے کھانے کے بعد لیں گے۔''

''جیسی حضور کی مرضی۔'' لومڑ گھبرایا سا عرق رکھ کر باہر آ گیا۔

O......O......O

اگلے دن پورے جنگل میں یہ خبر آگ کی طرح پھیل چکی تھی کہ راتوں رات بادشاہ سلامت کی طبیعت بگڑی اور وہ گزر گئے۔

چرند، پرند افسردہ تھے اور اپنے بادشاہ کی وفات پر آنسو بہا رہے تھے۔

"بادشاہ کا تو کوئی فرزند بھی نہیں جسے اب تخت پر بٹھایا جائے" ریچھ اپنے برابر میں بیٹھے گیدڑ سے مخاطب تھا۔

"کچھ سمجھ میں نہیں آتا، اب کون بادشاہی کے فرائض انجام دے گا۔"

"تو کیا بادشاہ سلامت نے اپنی زندگی میں کوئی وصیت بھی نہیں کی؟" گینڈا آگے بڑھ کر بولا۔

"ارے نہیں بھائی بادشاہ سلامت کو کیا پتا کہ وہ اتنی جلدی رخصت ہو جائیں گے۔" ریچھ افسردگی سے بولا۔

"ارے تو یہ میاں لومڑ ہی طے کریں گے کہ مستقبل کا بادشاہ سلامت کون ہوگا کیوں کہ وہ بادشاہ سلامت کے قریبی ساتھیوں میں ایک ہیں شاید وہ جانتے ہوں۔" گیدڑ نے لقمہ دیا۔

"ویسے بہت افسوس ناک بات ہے شیر کی نسل کا ختم ہو جانا کہیں یہ کسی دشمن کی چال تو نہیں۔" زرافے نے اپنی لمبی گردن جھکاتے ہوئے تجزیہ پیش کیا۔

شہد کی مکھیوں کا جھنڈ جو وہاں سے گزر رہا تھا وہ بھی رک گیا" ہمارے خیال میں زرافہ بھائی صحیح کہہ رہے ہیں، ہمیں جاننا چاہئے اس بارے میں"

اور یوں سب کی سوچ بیچاری، اپنی عقل و شعور کے اندر غوطے لگانے لگی۔

ابھی سب غم سے نکل بھی نہیں پائے تھے کہ حیراں رہ گئے، جب کوا اعلان کرتا ہوا گزرا۔" ہمارے نئے بادشاہ لومڑ میاں ہیں اور انہوں نے اپنا وزیر ریچھ کو چنا ہے جو بادشاہ سلامت کے محافظوں میں سے ایک ہیں۔"

"یہ کیا بات ہوئی، یہ تو سراسر زیادتی ہے، یہ کیسے ہو سکتا ہے، یہ غلط ہے، یہ تو قبضہ ہے، جتنے منہ اتنی ہی باتیں تھیں۔ لیکن اب تو جنگل پر قبضہ ہو چکا تھا وہ بھی شاطر لومڑ کا.....

O.....O.....O

"خبردار اب اس ندی پر کوئی نظر نہیں آئے" ریچھ نے سر جھکا کر مری ہوئی آواز میں کہا تو ایک پل کو سب نے حیرت سے ریچھ کو دیکھا اور پھر ندی میں نہانے لگے۔

"میں نے کہا اب یہ ندی کوئی استعمال نہیں کر سکتا، یہاں بادشاہ لومڑ نہانے آئیں گے

اور ان کا حکم ہے یہاں کوئی جانور نظر نہیں آئے۔"

پھر کوئی کچھ نہیں کہہ سکا آہستہ، آہستہ ہاتھیوں کا ٹولہ مرے ہوئے قدموں سے ندی سے باہر آ گیا۔ بطخیں بھی کنارے پر آ کر رُوپوش ہو گئیں اور تو اور ندی کے اوپر ہواؤں میں رقص کرنے والے پرندے بھی غائب ہو گئے۔

پھر تو یہ معمول کی بات ہو گئی ہر صبح جنگل میں ایک نیا اعلان ہونے لگا کبھی حکم سنا دیا جاتا کہ جنگل کے وسط میں جو پھل دار درختوں کا جھنڈ ہے وہاں پہرہ لگا دیا گیا ہے اور بادشاہ کی اجازت کے بغیر وہاں کوئی نہیں جا سکتا۔

کبھی حکم ملتا کہ جتنے بڑے بڑے جانور ہیں وہ جنگل کے اطراف بس جائیں اور سارے چھوٹے جانور جنگل کے بیچ و بیچ۔

لومڑ چالاک تھا وہ جانتا تھا چھوٹے جانور اس سے ڈرتے ہیں اور اس پر روک ٹوک نہیں کر سکیں گے اور بڑے جانوروں کو کناروں پر بھیجنے سے جنگل کی حفاظت اچھی طرح ہو سکے گی۔

اب صبح سویرے ہو یا ڈھلتی شام کا سہانا منظر، جنگل میں سارے جانور بے بس ہو چکے تھے کوئی ندی کے شفاف پانی کیلئے ترس رہا ہوتا تو کوئی گداز میٹھے پھلوں کیلئے۔ ہر جگہ پہرہ، ہر جگہ ایک نئی باڑ..... پہلے تو باڑ کے باہر پہرہ دینے والے بھالو اور ریچھ اپنے رویے پر نادم نظر آتے مگر اب وہ عادی ہو چکے تھے وہ سختی سے خلاف ورزی کرنے والے کو کھا جانے کی دھمکی دیتے اور معصوم جانور ڈر کر اپنی چھوٹی جسامت پر خوفزدہ ہو کر بھاگ جاتے۔

وہ ریچھ جو بادشاہت کے حامی تھے ان کا اپنی حاکمیت کے حامی ریچھوں سے جھگڑا ہو گیا اور اس جھگڑے کا نقصان یہ ہوا کہ جنگل کے آدھے ریچھ جنگل میں قیدیوں کی سی زندگی گزارنے لگے۔

"آج ایک ریچھ ہرن کو کھا گیا" "کیا.....!"

ادھر چوری چھپے ندی میں جانے کی وجہ سے ندی نہر فرات بن گئی۔

جنگل میں جگہ، جگہ قبضوں اور پہروں نے جنگل میں رہنے والے جانوروں کے درمیان

پھوٹ ڈال دی۔ سب ایک دوسرے کے دشمن ہو گئے۔ جہاں جس کو موقع ملتا ایک دوسرے کے شکار میں لگ جاتا۔ گھروں پہ قبضہ ہونے لگا۔

جنگل میں تیزی سے نقل مکانی کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ معصوم رعایا جو امن کے باسی تھے وہ جنگل چھوڑ، چھوڑ کے جانے لگے۔ پرندوں کی آوازوں سے محروم جنگل اب ایک پُراسرار جنگل کی طرح نظر آنے لگا۔

جہاں دھاڑیں، غرائیں، کراہ کی آوازیں اور ملکیت و حاکیت پر لڑائی اپنے عروج پر تھی اسی اثناء میں اک معصوم خرگوش آہستہ، آہستہ اپنے بل سے نکلتا اور بڑے دیو ہیکل جانوروں کو لڑتا دیکھ کر پھر اس ڈر سے بل میں گھس جاتا کہ مبادا کہیں ان کے پیروں تلے روندھ نہ دیا جائے۔ جب لڑائی تھمی تو وہ پھر دوبارہ اپنے بل میں گھس گیا ننھے سے بچے کو ساتھ لیا اور جنگل کی انتہائی حدود کی جانب بڑھنے لگا۔

''ہم کہاں جا رہے ہیں'' خرگوش کے معصوم بچے نے جواب طلب نظروں سے خرگوش کو دیکھا۔

''بیٹا اب ہم یہاں نہیں رہ سکتے، یہاں کے حالات بہت خراب ہو گئے ہیں''۔ تیزی سے بھاگتے خرگوش نے کہا۔

''مگر حالات پہلے تو خراب نہیں تھے۔ جب بادشاہ سلامت تھے تو سب کچھ تو ٹھیک تھا۔'' خرگوش کے بچے نے معصومیت سے سوال کیا۔

''تم چپ رہو اور جلدی سے نکلو یہاں سے'' خرگوش نے اپنے بچے کو گھورتے ہوئے کہا۔

اسی اثناء میں وہ جنگل کے انتہائی حصے پر پہنچ چکے تھے۔

جہاں ایک فاختہ ہوا میں نگرانی کے فرائض انجام دے رہی تھی۔

''بولیں نا ہم کیوں اتنے اچھے جنگل سے جا رہے ہیں یہاں میرے بہت سے دوست ہیں مجھے یہاں بہت مزہ آتا ہے۔''

خرگوش کا بچہ بضد تھا یہ جاننے کیلئے کہ وہ کیوں جنگل چھوڑ رہے ہیں۔ شاید اس نے شعور

کی دہلیز پر پہلا قدم رکھا تھا۔لیکن خرگوش کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا وہ تو بس راستہ ڈھونڈ رہا تھا کہ کسی طرح باڑ کو عبور کرے اور خود کو جنگل سے آزاد کرے۔

''میں نہیں جاؤں گا یہاں سے جب تک آپ بتائیں گے نہیں مجھے'' خرگوش کا بچہ ضد میں آکر وہیں بیٹھ گیا۔

فاختہ جو اتنی دیر سے یہ گفتگو سن رہی تھی وہ نیچے اتری اس نے آہستہ سے اپنی چونچ سے باڑ کی پہلی رسی اوپر اٹھائی اور کہا۔

''بیٹا میں تمہیں بتاتی ہوں۔تمہارے بابا جنگل اس لیئے چھوڑ رہے ہیں کیوں کہ اب کی دفعہ جنگل میں بادشاہت نہیں جمہوریت آئی ہے.....یقیناً یہ وہ جمہوریت نہیں جس کا تم نے خواب دیکھا تھا وہ جمہوریت تو ابھی بہت دور ہے جس میں ہم سب کیلئے ایک ہی قانون ہوگا۔کوئی طاقتور کسی کمزور کا شکار نہیں کرے گا جنگل میں جنگل کا قانون نہیں ہوگا تو تمہارے بابا بھی لوٹ آئیں گے۔

☆......☆......☆

تاریک راستے

قتل بھیانک جرم ہے اور وہ بھی اس معمار قوم کا۔ اس قسم کے جرم سے پوری نسل کا خاتمہ ہو جاتا ہے لیکن ہمارے معاشرے میں معماران قوم کو چن چن کر ختم کیا جا رہا ہے۔

سیریل کلنگ کے ایسے ایسے لرزہ خیز واقعات ہوتے ہیں جنہیں ضبط تحریر میں لاتے ہوئے قلم بھی خون کے آنسو رونے لگتا ہے کبھی ڈاکٹروں کو نشانہ بنایا جاتا ہے تو کبھی وکلاء کو۔ کبھی سیاسی کارکنوں کو موت کے گھاٹ اتارا جا رہا ہوتا ہے تو کبھی قوم کے یہ معمار فرقہ واریت کے بھینٹ چڑھ رہے ہوتے ہیں۔ کس، کس واقعے کو میں یاد کروں، کس عزیز شخصیت کے قتل سے اپنی بات شروع کروں۔ لرز جاتی ہوں۔ جب میں یہ سوچتی ہوں کہ بلوچستان یونیورسٹی کی پروفیسر ناظمہ طالب کو محض اس لیے قتل کر دیا گیا کہ جائے شہادت ان کی جائے پیدائش نہیں تھی۔

وہ اس ملک سے تعلق رکھتی تھیں جس کے افکار سے انتہا پسندوں کو اتفاق نہیں ہے۔

یہ پروفیسر ناظمہ طالب کا ایسا جرم ہے کہ انہیں موت کے گھاٹ اتار دیا جائے۔ ان واقعات کو نہ میں نظر انداز کر سکتی ہوں اور نہ ارباب اختیار۔ ارباب اختیار کے پاس انصاف کا ترازو ہے اور میرے پاس قلم کی طاقت ہے۔ میں اپنے اس فرض کو پورا کر رہی ہوں۔

کیا ہوا جو میرا قلم لرز رہا ہے۔ میرا جسم تھر تھر کانپ رہا ہے۔ میں موت سے خوفزدہ نہیں ہوں مگر میں پروفیسر ناظمہ طالب کی طرح بے گناہ نہیں مرنا چاہتی۔ مجھے خوف ہے تو صرف اس بات کا کہ میں بھی تو ایک معمار قوم ہوں۔ شعور سے نابلد معصوم بچوں کو انگلی پکڑ کر منزل کی جانب

پہلا قدم اٹھانے کا درس دیتی ہوں۔ ظالموں کیلئے یہ بھی تو ایک جرم ہے۔ بس یہی خوف ہے کہ نہ جانے میری باری کب آجائے۔ لیکن میں آواز اٹھاتی رہوں گی، میرے قلم میں روانی مرتے دم تک برقرار رہے گی۔ آج میں پروفیسر ناظمہ طالب کا قرض چکانے کی ناکام سعی کر رہی ہوں۔

کوئٹہ سے آنے والے خصوصی طیارے نے جیسے کراچی ایئر پورٹ پر لینڈ کیا تو ایک ہجوم محمود طالب کی سربراہی میں آگے بڑھا۔ فضاء سسکیوں اور آہ و بکا سے سوگوار تھی۔ مختلف یونیورسٹی اور تعلیمی اداروں سے تعلق رکھنے والے طلباء اپنے بازوؤں پر سیاہ پٹی باندھے اپنی معلم کو خراج تحسین پیش کرنے کیلئے آگے بڑھ رہے تھے۔ کراچی ایئر پورٹ پر ایک ہجوم برپا تھا۔ ہر آنکھ اشکبار تھی، ہر سینے میں درد کا طوفان کروٹ لے رہا تھا۔ ہر آواز نوحہ کناں تھی۔

علم کے پیاسے اپنے کندھوں پر ایک معلم کا جنازہ انتہائی عقیدت و احترام کے ساتھ لا رہے تھے، بے شمار نوجوانوں میں جنازے کو کاندھا دینے والا ایک چوبیس سالہ نوجوان جو سب سے آگے تھا اور زار و قطار رو رہا تھا وہ معلمہ کا بیٹا تھا۔ جو ماں سے محروم اپنی محرومی پر ماتم کرتا نظر آرہا تھا۔ قریب ہی کھڑے اس کے ماموں محمود طالب نے اسے سینے سے لگایا تو وہ بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے لگا۔

طلباء نے تابوت اپنے کاندھوں سے اتار کر نیچے رکھ دیا، ارد گرد کھڑے طلباء کی دل خراش چیخیں فضاء میں بلند ہو گئیں۔

پروفیسر ناظمہ طالب کی ناگہانی موت پر ہر آنکھ نم تھی۔ سندھی، پنجابی، بلوچی، ہر قوم، ہر فرقے اور ہر مذہب سے تعلق رکھنے والے طلباء وہاں موجود تھے۔ کوئی معلمہ کے شاندار کیریئر کی تعریف کر رہا تھا تو کوئی ان کے گولڈ میڈلسٹ ہونے کے اعزاز پر تبصرہ کر رہا تھا۔ کوئی ان کی نرم مزاجی کا ذکر کرتا نظر آرہا تھا تو کوئی ان کی شفیق طبیعت کے بارے میں بتا رہا تھا۔

مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے افراد ان پُر سوز لمحوں پر آنسو بہا رہے تھے۔ ہجوم میں شامل ہر فرد کا دماغ سوالیہ نشان بنا ہوا تھا۔ آخر پروفیسر ناظمہ طالب کا کیا قصور تھا؟ کیوں کوئٹہ میں انہیں گولیوں کا نشانہ بنایا گیا۔ سندھ کی بیٹی ہی نہیں بلکہ ایک معلم کا قتل کر دیا گیا۔

آخر کیوں......؟

آہوں، سسکیوں اور چیخ و پکار کے ساتھ جنازہ ایدھی ہوم لایا جا چکا تھا اور پھر کچھ ہی دیر بعد ایدھی ہوم سے ملحقہ مسجد میں مرحومہ ناظمہ طالب کی نماز جنازہ ادا کر دی گئی، جس کے بعد ان کو محمد شاہ قبرستان میں تدفین کیلئے لے جانے کی تیاری شروع ہو گئی۔

کوئٹہ سے تابوت کے ساتھ جو طلباء آئے تھے وہ زاروقطار رو رہے تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے ان کی ماں ان سے چھین لی گئی ہو۔ کہتے ہیں معلم کا درجہ ماں کے درجے کے برابر ہوتا ہے۔ انہیں دیکھ کر یوں محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے حقیقت میں ان کی ماں ان سے ہمیشہ کے لیئے دور ہو گئی ہو۔ میری نظر ہجوم میں اس لڑکی کی جانب اٹھ رہی تھی۔ جو کالی چادر میں ملبوس، اپنی آنکھوں میں امڈ آئے آنسوؤں کو چادر کے کونے سے صاف کرتی اور اگلے ہی پل کرب اور اذیت سے آباد اس کا چہرہ پھر آنسوؤں سے تر ہو جاتا۔

"آپ کوئٹہ سے آئیں ہیں....؟" میں نے آگے بڑھ کر تسلی دینے والے انداز میں اس لڑکی کا ہاتھ تھاما۔ تو وہ پھر سے بے اختیار ہو گئی۔

"کیا نام ہے آپ کا....؟" میں بھی افسردہ تھی۔

"نازیہ بلوچ" اس نے سسکتے ہوئے کہا۔

"پروفیسر ناظمہ طالب کی شخصیت کیسی تھی....؟" میں نے کڑوا گھونٹ نگلتے ہوئے سوال کیا۔ شاید میرا یہ سوال بے معنی تھا ایک معلم کی شخصیت تو نور کی مانند ہوتی ہے جس سے اس کا شاگرد ہر لمحے فیض حاصل کرنے کی سعی میں رہتا ہے۔ ایسے معلم کی شخصیت یقیناً معتبر ہوتی ہے۔ مگر میں اس سے بات کرنا چاہتی تھی۔

"آج میری ماں مجھے چھوڑ گئی" اس کے منہ سے الفاظ ٹوٹے "میرا تعلق جہاں سے ہے وہاں پر لڑکیوں کو تعلیم کو ترجیح نہیں دی جاتی۔ مگر میری ٹیچر کی بدولت، ان کی محبتوں کی وجہ سے میرے ماں باپ میری تعلیم کیلئے راضی ہو گئے۔" اس کے الفاظ ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھے مگر وہ بولنے میں محو تھی۔ "اصل میں میرے جیسے قبائلی معاشرے میں لڑکیوں کی تعلیم کا تصور بھی محال ہے۔ لیکن میں حصول علم کیلئے تمام مخالفت مول لے کر جامعہ بلوچستان کی دہلیز پر پہنچی۔ میرے اہل خانہ نے جب پروفیسر ناظمہ طالب سے ملاقات کی تو ان کے دل میں نرمی

پیدا ہو گئی اور یوں علم کے دروازے مجھ پر کھل گئے۔ اگر معلمہ ناظمہ طالب نہ ہوتیں تو مجھ جیسی بے شمار پہاڑوں کی بیٹیاں ان پڑھ اور جاہل معاشرے کا حصہ بنتی چلی آ رہی ہیں۔ میں بھی شاید ان میں سے ایک ہوتی۔ اس لیے مجھے معلمہ ناظمہ طالب بہت اچھی لگتی تھیں۔ وہ ہمارا اپنے بچوں کی طرح خیال رکھتی تھیں۔ ہمیں کوئی بھی پریشانی ہوتی اسے سنتی، سمجھتیں اور ہماری مدد کیا کرتیں۔ ان کا رویہ ہمارے ساتھ دوستانہ تھا۔ آج وہ دنیا میں نہیں رہیں تو یوں لگتا ہے ہماری علم کی پیاس اب ہمیشہ کے لیے پیاسی رہ جائے گی۔ میں اور میری طرح کی بہت ساری لڑکیاں جو ہماری کلاس فیلو بھی ہیں اور دوسری وہ جن کا دوسرے ڈیپارٹمنٹ سے تعلق ہے۔ ہم سب ان کی شیدائی تھے۔ ہر دلعزیز ٹیچر ہونے کے ساتھ وہ ہر دل عزیز شخصیت بھی تھیں۔ تدریس کے ساتھ، ساتھ شعر و ادب کی آبیاری میں بھی ان کا اپنا ایک کردار تھا۔

''اور آپ کو ایک بات بتاؤں..... کہ جب اکبر بگٹی کا قتل ہوا تھا تو ان کی آنکھوں میں آنسو تھے، انہیں اس بات کا دلی افسوس تھا کہ اکبر بگٹی کا قتل محض اس وجہ سے کر دیا گیا تھا کہ وہ کسی کی سیاست سے اتفاق نہیں کرتا تھا۔''

یقیناً انہیں اس وقت خبر بھی نہیں ہوئی ہو گی کہ ایک دن ان کا بھی قتل کر دیا جائے گا محض اس لیے کہ وہ اپنے ارد گرد رہنے والوں کی زبان نہیں سمجھتیں۔'' وہ ہچکیاں لے لے کر رو رہی تھی۔ ہم دونوں کے سینے درد سے پُر ہو چکے تھے۔ اسی دوران ایک خوبرو نوجوان ہماری جانب آیا، اس کا رنگ سفید تھا۔ اور چہرہ ہلکی، ہلکی داڑھی سے ڈھکا ہوا تھا۔ کالے رنگ کے لباس میں ملبوس اس نوجوان نے بھی اپنے بازو پر سیاہ پٹی باندھی ہوئی تھی۔

''یہ میرے بھائی ہیں۔'' نازیہ نے اپنے بھائی کی آمد پر مجھ سے تعارف کرایا۔

''اسلام علیکم! آپ کا نام.....؟'' میں نے اس نوجوان کو مخاطب کیا۔ جو غالباً اپنی بہن کو لینے آیا تھا۔

''سعید بلوچ کہتے ہیں مجھے'' لہجہ کوئٹہ کے پہاڑوں کی طرح مضبوط اور سخت جبکہ آواز میں ایسی گرج جیسے اندر کا غصہ اور درد کی شدت اس کی آواز میں سمٹ آئی ہو۔

''سعید! معلمہ ناظمہ طالب ہمارے درمیان نہیں رہیں۔ میرا بھی ان سے وہی تعلق

ہے جو آپ کا تھا۔ وہ جب بھی کراچی آتیں تو میں خوش ہو جاتی۔ میں ان سے اپنی study کے حوالے سے مدد لیا کرتی تھی اور وہ بہت ہی محبت کے ساتھ مجھے سمجھایا کرتیں۔ جتنا ممکن ہوتا میرے لیے وقت وقف کر دیتیں۔ ان کے بعد اب یہ خلاء کبھی پر نہیں ہو سکتا یقیناً اتنی اچھی معلمہ اب مجھے نہیں مل سکیں گی۔" میری باتوں سے دونوں بھائی بہن اتفاق کر رہے تھے۔ تبھی سعید بولا۔

"میرا تعلق ماس کمیونیکیشن ڈیپارٹمنٹ سے ہے۔ میری اکثر معلمہ ناظمہ طالب سے بحث ہوتی۔ میں کہتا تھا اپنے حق کے لئے بندوق اٹھانا میرا حق ہے۔ جبکہ وہ مجھے سمجھاتی تھیں کہ اپنے حقوق کی جنگ میں بندوق کے بجائے قلم سے لڑو..... پڑھو ..... پڑھو..... اور پڑھو ..... بندوق کو کھلونہ نہ سمجھو بلکہ قلم کو اپنی طاقت سمجھو۔ لیکن میں انہیں بتایا کرتا کہ بلوچستان معدنی وسائل سے مالا مال ہے۔ اگر یہاں پر توجہ دی جائے تو صرف بلوچستان ہی نہیں بلکہ پورا ملک ان معدنیات سے فیض یاب ہو سکتا ہے۔ مگر یہاں کے وڈیرے، سردار اور قبائلی لوگ چاہتے ہی نہیں، وہ تو ترقی کے خلاف ہیں، اسکول، کالج، اسپتال اور سڑکیں بنانے نہیں دیتے، وہ ہمیں اپنا محتاج بنا کے رکھنا چاہتے ہیں۔ اس لیے مخالف سے لڑنے کے لیے، اپنے حقوق کی سربلندی کے لیے بندوق کا استعمال اب میں اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ مجھے اپنے معلمہ کے جانے کا ہمیشہ دکھ رہے گا۔" سعید جذباتی انداز میں گفتگو کر رہا تھا اور پھر وقت کی کمی اور جنازے کی تدفین نے ہماری سوچوں کو منتشر کر دیا۔

میں نے ان دونوں کے نمبرز لیئے اور ان سے دوبارہ ملنے کی خواہش ظاہر کی جسے دونوں نے ہی بخوشی قبول کر لیا۔ جنازے کی تدفین میں ہر شعبے سے تعلق رکھنے والے افراد شامل تھے، ہر آنکھ برس رہی تھی۔ میں نے اپنے مردہ دل کو بیدار کرنے کی کوشش کی اور گھر آ کر قلم اور کاغذ لے کر بیٹھ گئی شاید کہ دل کا بوجھ کاغذ کے سینے پر رقم کر سکوں مگر میرے قلم کا نوحہ مجھے افسردگی سے نکالنے پر تیار نہیں۔

اللہ تعالیٰ نے مرد اور عورت کو الگ، الگ فطرت دے کر پیدا کیا ہے۔ چونکہ عورت فطرتاً کمزور رہی ہے۔ اس لیے اس پر جبر، ظلم اور نا مناسب رویہ روا رکھا گیا.....! اور ایسی

عورت جس کا وجدان اپنے اندر علم کا وسیع سمندر لیئے ہو۔ تو پھر ایسی عورت کا معاشرتی کردار بلندیوں کو چھونے لگتا ہے ایک معلم کی حیثیت سے، ایک ماں کی حیثیت سے اور ایک اچھی شہری اور اپنی ذات میں ایک معتبر انسان ہونا، یہ ساری خاصیت جب ایک عورت میں جمع ہو جائیں تو اسے معلمہ ناظمہ طالب کہتے ہیں۔

معلمہ ناظمہ طالب کے بارے میں، میں اتنا جانتی ہوں کہ وہ خوش نصیبی کے لباس پر بد نصیبی کی چادر اوڑھے ہوئے تھیں۔ شوہر سے علیحدہ ایک بیٹے کا ساتھ۔ زمانے کے تھپیڑے سے خود کو بچانا اور اپنی اولاد کے لیے صحیح راہ متعین کرنا یقیناً ایک مشکل امر ہے۔

معلمہ ناظمہ طالب کی دوسری بد نصیبی، پچیس سال پہلے ان کی موت کا اعلان کرتی، کراچی یونیورسٹی میں سرگرداں تھی۔ جب معلمہ ناظمہ طالب کو پتا چلا کہ ایک گولڈ میڈلسٹ ہوتے ہوئے بھی کراچی یونیورسٹی میں ان کے لیے کوئی جگہ نہیں تو وہ اپنے شوق کی تسکین اور علم کے پیاسوں کی پیاس بجھانے کی خاطر کراچی سے بلوچستان کی جانب سفر کرنے پر مجبور ہوگئیں۔ شاید تعلیمی مافیا کی سرگرمیوں کے آگے وہ کمزور پڑ چکی تھیں۔ حالانکہ کراچی یونیورسٹی کے شعبہ ابلاغ عامہ میں انہیں آسانی سے اکوموڈیٹ کیا جا سکتا ہے۔ مگر افسوس جیت سیاسی بھرتیوں کی ہوگئی اور ایک گولڈ میڈلسٹ یعنی میرٹ کا قتل ہوگیا۔

تعلیمی قابلیت کا اتنا بلند گراف ان کی اسناد میں تھا کہ بلوچستان یونیورسٹی میں انہیں فوراً ہی درس و تدریس کے شعبے میں فائز کر لیا گیا۔ اور یوں کرچی دل کو آنسوؤں کی سوغات سونپتے ہوئے معلمہ ناظمہ نے بلوچستان کے پہاڑیوں کا رخ کر لیا۔

میری انگلیاں انجانے خوف سے ہراساں قلم کو تھامے ہوئے اپنی جگہ تھم گئی ہیں۔ میں مزید کیا لکھوں اور لفظوں کو سلیقے سے کیسے برتوں، میری سمجھ میں نہیں آرہا۔ میں نے بوجھل آنکھیں بند کر لیں تو بند پلکوں کی چلمن ہٹاتے ہی مختلف دریچوں اور کھڑکیوں میں یہی ہنگامہ خیزیاں تھیں کہ کوئٹہ میں استاد کیوں دہشت گردی کی ہٹ لسٹ پر ہیں......؟

آخری بار جب میری معلمہ ناظمہ طالب سے ملاقات ہوئی تھی تو انہوں نے مجھے بتایا کہ پچھلے دو سال کے دوران دو اساتذہ کا قتل ہو چکا ہے جن کا تعلق بلوچستان یونیورسٹی سے ہی

ہے۔ تب میں نے انہیں روکنے کی کوشش کی تو وہ مسکرا کر بولیں۔

"علم کا پرچار جہاد سے کم نہیں۔ ایک معلم کا قتل ایک عالم کا قتل ہے۔ جہالت کلاشنکوف اٹھائے پہاڑیوں میں روپوش ہو یا دندناتی پھرے، ایک دن انہی ظالموں کے افق سے علم کے دمکتے سورج نے ضرور پھوٹنا ہے۔ دیواریں کتنی ہی مضبوط اور فولادی کیوں نہ ہوں، ہواؤں کا راستہ نہیں روک سکتیں۔ اور کبھی یوں بھی ہوتا ہے خونخوار عقاب فاختہ کو نوچنے کی خواہش دل میں لیئے تپتے صحراؤں کا لقمہ بن جاتا ہے۔ ہر فرعون کے لیے ایک موسیٰ ضرور اترتا ہے۔ اور ہر آہ جب عرش سے ٹکراتی ہے تو عرش بھی قہرِ الٰہی سے ہل جاتا ہے۔ اس لیے ڈر کیسا؟ یہ تو ایک جہاد ہے۔"

"بلوچستان کے طلباء کو تعلیم سے روشناس کرانا ظلم ہے؟" میں سوالیہ انداز میں ان سے پوچھتی تو وہ بڑے ہی شفیق لہجے میں جواب دیتیں۔

"علم کے بغیر شعور کی دہلیز پر قدم رکھنا ممکن نہیں۔ اور ایک ترقی پسند معاشرہ شعور اور آگہی کے ذریعے ہی اپنی پہچان کرواتا ہے اور ہر میدان میں اپنا لوہا منواتا ہے۔ علم مومن کی میراث ہے اور میراث کا مطلب یہ نہیں کہ وہ بلوچستان کے طلباء کی ہے یا سندھ کے طلباء کی۔ علم اور ظلم تو دو متضاد باتیں ہیں۔ علم قلم کی نوک سے جنم لیتا ہے جبکہ ظلم تو تلوار کی دھار پر رقم ہوتا ہے۔

"آپ کی ساری باتیں درست ہیں۔ لیکن پھر بھی آپ واپس آجائیں۔ مجھے بلوچستان میں ہونے والے واقعات خوفزدہ کر رہے ہیں۔ کیا وہاں آپ کا دل نہیں گھبراتا....؟" میں بے تابی سے ان سے سوال کرتی اور انہیں روکنے کی کوشش کرتی۔

"اب تو وہاں کی فضاء بھی مجھے اپنی سی لگتی ہے۔ مجھے یوں لگتا ہے جیسے بلوچستان ہی میری جائے پیدائش ہو..... بلوچستان کے حالات پریشان کن ضرور ہیں مگر مجھے یقین ہے ویرانے میں جو پھول میں کھلانے کی کوشش کر رہی ہوں۔ وہ ایک دن بڑی تبدیلی لائیں گے۔ قتل و غارت کے واقعات ایک دن ختم ہو جائیں گے اور ان کی جگہ ترقی اور عروج کی خبریں ہوں گی۔ مجھے اس شہر سے محبت ہوگئی ہے۔ وہاں میرا ہر فرقے سے بلا امتیاز تعلق ہے، زمین

بنجر سہی فضاء ناساز گار سہی ۔ لیکن میرا وجدان علم کی دولت سے مالا مال ہے۔ جس کے ذریعے میں علم کا پرچار کرتی رہوں گی۔'' ان کی باتیں میرے سینے میں ہلچل مچا دیتی تھیں اور آج جب ان کی معصوم مسکراہٹ میں نے کفن میں لپٹی ہوئی دیکھی تو میں بے اختیار ہوگئی۔ کوئٹہ کے پہاڑوں کے درمیان رکشے کے اطراف سے گولیوں کا نشانہ بننے والی معلمہ کا چہرہ پرسکون تھا۔ یقیناً ہمارے ضمیر مردہ ہو چکے ہیں شاید ہم بے حسی کی اس منزل پر فائز ہو چکے ہیں جہاں ہماری سوچ بھی ہمارا ساتھ چھوڑ دیتی ہے۔ ہماری ہر چیخ، ہر سسکی، ہر شکایت، ہر آہ اور ہر پکار سماعتوں سے محروم ہو چکی ہے۔ میں یوں محسوس کرتی ہوں کہ اشکوں کا بیکراں سمندر اندر ہی اندر گرتا جا رہا ہے اور ایک دن میں اسی میں ڈوب جاؤں گی۔ میری آنکھیں قومی بے ضمیری کے تماشے دیکھ، دیکھ کر کمزور ہونے لگی ہیں۔ اور یہ جو اہل علم ہیں جنہیں بے دردی سے موت کے گھاٹ اتارا جا رہا ہے۔ میں سمجھتی ہوں یہ ہماری قوم کے لیے ایٹمی دھماکوں سے بھی زیادہ خوفناک اور ہولناک دھماکے ہیں۔ آج معلمہ ناظمہ طالب تو ہمارے درمیان موجود نہیں لیکن ان کی صورت ان کا صاحبزادہ ہمارے درمیان موجود ہے......

موت کے بعد صبر آ جانا عین قانون فطرت ہے۔ معلمہ ناظمہ طالب منوں مٹی کے نیچے مدفون ہوگئیں۔ آہیں اور سسکیاں بھی دم توڑ جائیں گی ان کا صاحبزادہ بھی گردشِ دوراں میں گم ہو جائے گا۔ اسی کا نام دنیا داری ہے۔ بے شمار اچھے لوگ آئے زندگی کا قرض چکایا اور موت کی آغوش میں پہنچ گئے۔ یہ سلسلہ ازل سے ہے اور ابد تک رہے گا۔ لیکن معلمہ ناظمہ طالب جیسی اموات تاریخ کے اوراق پر نقش ہو جاتی ہیں۔ شرط یہ ہے کہ تاریخ کا تسلسل برقرار رہے۔ آئندہ نسل یاد رکھے کہ کوئی ناظمہ طالب تھیں جس نے اپنی زندگی کو مشن بنایا، اپنا شہر چھوڑا، اپنا گھر چھوڑا اور اپنے پیاروں سے دوری اختیار کر کے بلوچستان کے سنگلاخ پہاڑوں میں علم کی شمع روشن کرنے پہنچ گئیں۔ کاش یہ جذبہ جاری وساری رہے۔ میں بھی ایک معلمہ ہوں۔ معلمہ ناظمہ طالب کی زندگی ان کے تجربات میرے لیے مشعل راہ ہیں اور میں اپنے وقت سے عہد کرتی ہوں کہ میں بھی اس علم کے پرچم کو بلند سے بلند تر کرتی رہوں گی۔

☆......☆......☆

نامۂ اعمال ہے یہ

اس کے زرد چہرے پر کرب کے سائے تھے اور پلکوں سے آنسو ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہے تھے۔ وہ پسینے میں نہایا ہوا تھا اور تواتر سے آتی ہچکیوں کے باعث وہ وقفے، وقفے سے گہرا سانس لے رہا تھا۔ مگر اس کے ہاتھ اندھیرے کمرے میں تیزی سے چیزیں الٹ، پلٹ رہے تھے اور بالآخر اس کو اپنی مطلوبہ شے مل گئی وہ تیزی سے پلٹا اور اپنے کمرے میں آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک پھٹی پرانی ڈائری تھی جو وہ آدھے گھنٹے کی محنت کے بعد ڈھونڈنے میں کامیاب ہوا تھا جیسے، جیسے وہ ڈائری کے صفحے پلٹتا جا رہا تھا۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے کسی نے رات کے سرد سینے میں خنجر اتار دیا ہو۔

O......O......O

آج میں بہت ڈری ہوئی ہوں میں ایک ایسے غم کا عذاب سہہ رہی ہوں جو کبھی مندمل نہیں ہو سکتا۔ بابا نے لوہے کی سلاخ گرم کر کے میری چھوٹی بہن شمائلہ کا ہاتھ جلا دیا مگر اس کے باوجود میں اپنی بہن کے حوصلے کی داد دیتی ہوں اس کا قصور صرف اتنا تھا کہ ایک بار پھر اس نے بابا کو ٹھیک ٹھاک باتیں سنائیں تھیں وہ بابا کے سرجیکل آلات کے کاروبار کے سخت خلاف تھی۔ بابا نے گھر کے اندرونی حصے میں سرجیکل آلات کا غیر قانونی کام شروع کیا ہوا ہے۔ جب بابا ہم دونوں بہنوں سے زور زبردستی کر کے کام کرنے کے لیے کہتا تو میں تو خاموشی سی اٹھ جاتی مگر شمائلہ پیر پٹختی رہتی۔ بابا کو الٹی سیدھی باتیں سناتی اور ڈھیٹ بنی رہتی وہ

تو امی کی آمد پر وہ کچھ لحاظ کر لیتی۔ شاید وہ امی سے ہی ڈرتی ہے وہ بات، بات پر مجھے بزدل کہا کرتی کہ میں بابا کے ظلم چپ چاپ سہتی رہتی ہوں میں کیوں کچھ نہیں بولتی۔

"لیکن میں کیا بولوں؟ اگر ہم بابا کا ہاتھ نہیں بٹائیں گے تو کون بٹائے گا؟" میں اس کے چہرے پر پھیلی اداسی کو نظر انداز کرتے ہوئے بول رہی تھی۔

"بجو تم تو پاگل ہو جاتی ہو بابا جو کام کرتے ہیں وہ غیر قانونی ہے جعلی سرنج بنانا، جعلی ڈرپ کی بوتلیں نلکیاں اور دیگر پلاسٹک کا سامان یہ سب غلط ہے، ہم کیوں ایسا کام کریں جس سے لوگوں کی زندگیاں موت کے شکنجے میں پھنس جائیں۔ بجو یہ ناجائز ہے" شائلہ میری محویت کو نظر انداز کرتے ہوئے تاسف سے گردن ہلا رہی تھی۔ اور میں دل میں سوچ رہی تھی کہ یہ کہہ تو سچ رہی ہے لیکن یہ بات بھی سو فیصد درست تھی کہ میں اپنے بابا سے بہت ڈرتی ہوں۔ بابا کی آمد پر میرے رونگٹے کھڑے ہو جایا کرتے ذرا سی غلطی پر وہ ہم دونوں بہنوں کو دھنک کر رکھ دیتے۔ وہ اتنا مارتے کہ ہماری پیٹھ پر نشان بن جاتے اور جب وہ نشے کی حالت میں گھر لوٹتے تو میرا دل چاہتا مجھے سلیمانی ٹوپی مل جائے جسے پہن کر میں بابا کی نظروں سے اوجھل ہو جاؤں۔

O......O......O

آج پڑوس والی خالہ میرا رشتہ لے کر آئیں تھیں۔ اماں خوش، خوش ابا کو بتا رہی تھیں کہ ہماری امبر کا بر آیا ہے۔ مگر یہ سنتے ہی ابا طیش میں آگئے۔

"خبردار جو ابھی شادی کا سوچا، ابھی مجھے ان دونوں کی ضرورت ہے ذرا غیب کو بڑا ہونے دو پھر امبر کی شادی کر دیں گے، ابھی تو مجھے اپنا کاروبار پھیلانا ہے۔"

"لیکن بیٹیاں تو پرایا دھن ہوتی ہیں، آپ کوئی ملازم کیوں نہیں رکھ لیتے؟" امی نے ڈرے بجھے سے لہجے میں سوال کیا۔

ہاں، ہاں تُو، تو یہی چاہتی ہے، یہ بتا کس پر بھروسہ کروں، اگر کسی غیر کو ملازم رکھا اور اس نے باہر جا کر تھانے میں اطلاع دے دی کہ میں غیر قانونی کام کرتا ہوں تو مجھے تو جیل ہو جانی ہے، تیرا کیا جائے گا؟"

بابا نے اماں کو گھورتے ہوئے دیکھا تھا اور تلخ لہجے میں سوال کیا تھا اور اماں سے کچھ بن نہ پڑا بس وہ تو خاموش سی نظریں جھکائے اپنے شوہر کے اعمالوں کا سنگین ردعمل دیکھ رہی تھیں۔

O......O......O

آج پھر شائلہ نے مجھے ڈانٹا یا شاید وہ اپنی دانست مجھے سمجھا رہی تھی۔

''بجو تم پاگل ہو احتجاج کیوں نہیں کرتیں اتنا اچھا بر آیا ہے۔ شادی کرو اور اس جہنم سے نکلو، کاش کہ یہ رشتہ میرے لیئے آتا تو میں پہلی فرصت میں حامی بھر لیتی۔ بابا کا کیا ہے وہ خود تو نوٹوں کی بارش میں بھیگ رہا ہے اور ہمیں اذیت ناک زندگی میں مبتلا کیئے رکھا ہے۔ صبح و شام ہم سے کام لیتا ہے اور چھ، چھ ماہ میں ایک جوڑا بنا کر دیتا ہے۔ کھانے پینے کا خیال نہیں رکھتا، روکھی، سوکھی کھا کر زندہ ہیں ہم اور تو اور مارتا پیٹتا ایسے ہے جیسے ہم اس کی اولاد نہیں بلکہ غلام ہیں۔ ظالم کہیں کا۔''

''جب ماں میں ہمت نہیں تو میں کیا بولوں؟'' میں آنسو آنکھوں میں چھپانے کی کوشش کر رہی تھی۔

''یہی تو المیہ ہے تم اور اماں دونوں ہی بابا سے ڈرتے ہو، جس دن تم دونوں کا ڈر نکل جائے گا، یقین کرو بجو اس دن ان کے منحوس سائے سے ہمیں چھٹکارا مل جائے گا ورنہ وہ یونہی ہماری زندگیاں مسخ کرتے رہیں گے'' شائلہ بولڈ انداز میں کہتی سرخ پلاسٹک کی تھیلیوں میں بھرنے لگی جب کہ اس کی باتوں نے میری نیندیں اڑا دیں۔ میں شاید روبوٹ ثابت ہوئی تھی ، بابا اور اماں کے ایک اشارے کی منتظر، جس نے جو کام کہہ دیا بس گردن ہلا کر میں اس کام میں جت جایا کرتی۔ شاید گھر کے حالات نے میرے احساسات اور جذبات کو مردہ کر دیا تھا۔

یہ موسموں کا بھی عجیب چکر ہے۔ آج بہت دنوں بعد لکھنے کا موقع مل رہا ہے۔ آج دل کا موسم بے حال ہے اور پھوٹ کر رونے کا دل کر رہا ہے۔ ایک تو شدید گرمی نے طبیعت میں الجھن پیدا کر دی ہے اوپر سے لوڈ شیڈنگ کا بھوت ، اصلی بھوتوں سے زیادہ خطرناک اور مصیبت زدہ لگنے لگا ہے۔ اس وقت رات کے دو بج رہے ہیں۔ وقت کو گھڑی میں بند کر کے

شاید ہم یہ بھول گئے کہ ہم نے خود کو قید کر لیا ہے، بھلا اس سے کیا حاصل؟ کاش بابا مجھے اور شمائلہ کو اسکول سے نہیں نکلواتے۔ یہ اچھی بات ہوئی کہ ہماری اور امی کی ضد کی بدولت غیب ریگولر اسکول جا رہا ہے، خیر سے اسی سال میٹرک کر لے گا میرا بھائی، پھر اس کو میں کالج کی تعلیم دلواؤں گیا اور اچھی پڑھی لکھی جاب کرواؤں گی۔ اسے بابا کے کاروبار کے قریب پھٹکنے بھی نہیں دوں گی۔ یہ کاروبار بس ہم دونوں بہنوں کی قسمت تاریک کرنے کے لیئے کافی ہے۔ بابا کا غصہ کب اپنی حدیں پار کر جائے پتا ہی نہیں لگتا۔ آج پھر وہ نشے کی حالت میں اماں پہ بہت گرم ہوا ہے۔ میری اماں بے مروت یا سنگ مرمر سے بنی نہیں ہے۔ وہ بھی ایک جیتی جاگتی انسان ہے، متعدد جذبوں اور احساسات کا مرکب ہیں۔ بابا نے ان کو جس طرح سے مارا ہے وہ ساری چوٹیں میں اپنے جسم پر محسوس کر رہی ہوں۔ میں اور شمائلہ اماں کو بچاتے رہے مگر بابا باز نہ آیا۔ بات تو صرف اتنی سی ہے کہ روٹی بنانے میں کیوں دیر ہو گئی؟"

جب گھر میں راشن نہیں ہوگا تو اماں کہاں سے وقت پر کھانا تیار کرے گی، بیچاری میری ماں دن بھر گھر کے کام کرتی اور ساتھ، ساتھ بابا کی بک، بک، جھک، جھک سنتی اور مار سہتی رہتی۔ شمائلہ سچ کہتی ہے میں بالکل ماں پر چلی گئی ہوں۔ بس مجھے بڑ بڑانا آتا ہے یا خود پر غصہ نکالنا اس سے زیادہ مجھ میں زبان استعمال کرنے کی ہمت نہیں۔ عزیزوں، رشتہ داروں سے بیزار، قطع تعلق تو ہوں ہی، ساتھ ہی زخمی دنوں کو محض خیال کر کے اور خوشنما خواب کی خواہشوں سے رفو کرنے کی ماہر بھی ہوں۔

"بجو جب تک عملی طور پر کچھ نہیں کرو گی کہاں سے بنی سنوری زندگی پاؤ گی؟ سب کچھ اللہ پر نہیں چھوڑا جاتا۔ ہمت، محنت اور جستجو کے ذریعے زندگی بدلی جاتی ہے۔ تم کیوں دوسری اماں بنتی جا رہی ہو؟ برائی کے خلاف آواز نہیں اٹھاؤ گی تو، برائی تمہارا وجود ختم کر دے گی۔"

شمائلہ کی ساری باتیں درست ہیں، جانے کب اور کیسے وہ یہ سب باتیں سیکھ گئی ہے اور اتنی بڑی، بڑی باتیں کرنے لگی ہے۔ مگر میری وہ ڈھارس بن گئی ہے۔

میں نہ سہی مگر اللہ میری چھوٹی کی زندگی سنوار دے اسے وہ سب عطا کر دے جس کی وہ خواہش کرتی ہے۔ مجھے اپنے دل کا حال سنانا نہیں آتا۔ البتہ دل کی باتیں ڈائری پر لکھنے کی

عادی ہو گئی ہوں۔

O......O......O

آج کی پوری رات روتے ،دھوتے، سسکیوں اور آہوں میں گذر رہی ہے۔ برابر والے کمرے سے شمائلہ کی سسکیاں ابھی بھی مجھ تک آ رہی ہیں لیکن میری ہمت نہیں کہ جا کر اسے دلاسا دوں کیوں کہ وہ سچ کہتی ہے" میری ہمت اور قوت بابا نے سلب کر دی ہے۔

کل رات کے واقعے نے ہماری زندگیوں میں ہلچل مچا دی ہے۔ بابا کے دماغ میں ایک اور شیطانی خیال آیا۔ جس کو انجام دینے کے لیے انہوں نے ہم دونوں بیٹیوں کا سہارا لیا۔ دو ہفتے کی مشقت کے بعد جتنا مال تیار ہوا تھا وہ بابا نے ہمارے ذریعے مارکیٹ میں پہنچایا۔ خریدار نے مال کی جانچ پڑتال کم کی اور ہماری زیادہ، ایکسرے جیسی اس کی نظریں ہمارے جسم پر فکس تھیں، ہمارے متناسب جسم چادر میں چھپے ہونے کے باوجود خود کو غیر محفوظ سمجھ رہے تھے۔

" کیا چکنی گوری رنگت ہے" وہ دوکاندار شمائلہ کے انتہائی نزدیک آتے ہوئے سرگوشی کے انداز میں بولا۔

"ذلیل" شمائلہ نے منہ بگاڑ کر اس کو گھورا اور میرا ہاتھ پکڑ کر کھینچنے لگی۔

" ارے رانی پیسے تو لیتی جا۔" نوٹوں کی گڈی اس نے ہماری جانب بڑھائی جسے میں نے مضبوطی سے تھامتے ہوئے پرس میں رکھ لیا تھا اور پھر ہم تیزی سے وہاں سے بھاگ آئے۔

" ارے گڑیا پھر آنا، اگلی بار تمہیں اچھا کھانا اور کولڈ ڈرنک پلاؤں گا" ایک قہقہے کے ساتھ ہماری سماعتوں تک پہنچتی اس دکاندار کی آواز ہمارے قدموں کو مزید تیز کر گئی۔

نہ اس نے نوٹ گن کر دیئے تھے اور نہ ہم نے گننے کی زحمت کی تھی مگر اندازاً وہ بہت سارے تھے۔ گھر پہنچتے ہی وہ نوٹوں کی گڈی ہم نے بابا کے حوالے کر دی تھی، یقیناً بابا کو پوری رات خوشی سے نیند نہیں آئی ہوگی اور ہمیں ضمیر کے بوجھ سے نیند نہیں آئی، اپنی قسمت کو کوستے ہوئے، بابا کے بے رحم رویے اور ماں کی خاموشی کا ماتم کرتے ، کرتے پوری رات گزر گئی۔

پہلی بار شدت سے میرا دل چاہا کہ کاش منیب ہم دونوں کا بڑا بھائی ہوتا تو یقینا آج ہمیں بھرے بازار میں نہیں جانا پڑتا۔

O......O......O

کافی دن بعد میں آج پھر ڈائری اور قلم لے کر بیٹھی ہوں۔ آج شمائلہ نے مجھے بہت باتیں سنائیں ہیں۔

"بجو اگر تمہیں اللہ نے گونگا پیدا کیا ہوتا تو میں صبر کر لیتی مگر تم نے جو چپ کا قفل اپنے لبوں پر سجایا ہوا ہے، یہ کوئی اچھی بات نہیں۔ سن لیا بابا پھر چاہتا ہے کہ ہم مارکیٹ جائیں اور مطلوبہ دکان تک سارا مال پہنچائیں۔ میں نے تو صاف منع کر دیا ہے۔" وہ انتہائی ڈھٹائی سے بول رہی تھی۔

"بابا مان گیا؟" میں نے چونک کر پوچھا تھا۔

"پتا نہیں" میں منع کرتی اوپر آ گئی، ابھی وہ مجھے بتا ہی رہی تھی کہ بابا تیزی سے اوپر پہنچا اس نے مٹھی میں شمائلہ کے بال بھرے اور اسے کھینچتا ہوا زمین پر لے آیا۔

"زبان دراز تیری ہمت کیسے ہوئی مجھے منع کرنے کی، اب تُو مجھے بتائے گی کہ مجھے کیا کرنا چاہیے، اس گھر میں رہنا ہے تو میرے حساب سے چلنا ہوگا۔ سالی مجھے دھمکی دیتی ہے۔"

"ہاں، ہاں میں پولیس میں اطلاع دے دوں گی، کوئی بیٹیوں کے ساتھ ایسا سلوک کرتا ہے۔ باپ کے نام پر ایک ظالم شخص ہو آپ" شمائلہ نے خود کو چھڑاتے ہوئے کہا تھا جبکہ میں سہمی ہوئی ایک جگہ بیٹھی تھی۔ "گھر کے ہر فرد کو ذہنی مفلوج کر دیا ہے آپ نے، بیٹیاں نہیں باندیاں سمجھا ہے ہمیں۔" وہ چیخ چلاتی بول رہی تھی جبکہ میں سہمی سی اسے روکنے کی ناکام سعی کر رہی تھی۔

"چل تیری زبان کاٹنی پڑے گی، بہت اول فول بکے جا رہی ہے تُو، وہ دروازے کے باہر سے چیختے ہوئے بولا۔ اور خبردار جو کسی نے دروازہ کھولنے کی کوشش کی" وہ یہ کہتا ہوا تیزی سے نیچے اتر گیا تھا اور میں کمرے کے باہر اور شمائلہ کمرے کے اندر اپنی، اپنی بے بسی کی زندہ

لاش کو کاندھا دیتے رہے۔

O......O......O

آج کی صبح میں اور شائلہ پہلے سے طے شدہ پروگرام کے تحت چپ چاپ گھر سے نکل گئے تھے، ہم دونوں اپنی رشتے کی خالہ کے گھر آئے تھے۔ ماں کو ہم نے بتا دیا تھا، ہم بھرے بازار میں غیر قانونی سرجیکل آلات کی سپلائی نہیں کر سکتے۔ پولیس کی سخت چیکنگ کے پیش نظر بابا خود کو بچا رہا ہے اور ہماری آڑ میں وہ اپنا کام نکالنا چاہتا ہے۔

یقیناً ہمارے مارکیٹ جانے سے، کوئی ہم سے پوچھ گچھ نہیں کرتا مگر اس دکاندار کی ہوس بھری آنکھیں......

خیر ماں کی خاموشی ہمارے لیے نیم رضامندی ثابت ہوئی تھی۔ پورا دن خالہ کے گھر میں بہت اچھا گذرا، ہم نے اپنی مرضی سے ٹی وی پر مختلف چینل دیکھے، خالہ کے گھر کی چھت پر ان کی بیٹیوں کے ساتھ پتنگ اڑائی۔

خوب انجوائے کیا۔ مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ زندگی میں سکون کتنا ضروری ہے۔ بابا کا رویہ اور ڈنڈے کے زور پر ہم سے کام لینا ہمارے سر پر لٹکتی تلوار جیسا تھا۔ مغرب کے بعد غیب کی آمد نے ہمارے رونگٹے کھڑے کر دیے۔ یقیناً بابا شدید غصے میں تھا جبھی اس نے غیب کو ہماری طرف بھیجا تھا۔ یہ بات تو ہم اچھی طرح سے جانتے تھے کہ بابا ہمیں بری طرح مارے گا، پیٹے گا مگر یہ بات اطمینان بخش تھی کہ ہم اس مکروہ بڈھے سے محفوظ ہیں۔

O......O......O

زندگی صورتیں بدلتی رہتی ہے لیکن زندگی کا یہ بھیانک روپ میری رگوں میں موت کا زہر گھول رہا ہے۔ آج کا دن ہمارے گھر پر قہر بن کر ٹوٹا، یہ کیا ہو گیا؟ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ شائلہ تو اوپر والے پورشن میں چائے بنا رہی تھی پھر کس نے اس پر گولی چلائی، کس نے اسے قتل کر دیا۔ بیڈ پر پڑی شائلہ کی نعش میرے حواسوں پر چھائی ہے بابا کہتا ہے شائلہ نے خودکشی کر لی ہے لیکن میں جانتی ہوں شائلہ کبھی خودکشی نہیں کر سکتی اس کو ضرور کسی نے مار دیا ہے کہیں بابا نے تو نہیں......؟"

لیکن کیا کوئی باپ اپنے لخت جگر کو جان سے مار سکتا ہے؟ لاکھ بابا ظالم سہی، لیکن بیٹی کو اپنے ہاتھ سے قتل کر دینا، ایسا تو دنیا کا کوئی باپ نہیں کر سکتا، چاہے وہ کتنا ہی سفاک کیوں نہ ہو؟ مگر شمائلہ کے ساتھ کیا ہوا؟

آہ! میری چھوٹی بہن تم مجھے اکیلا چھوڑ گئیں۔ ماں کی حالت بہت خراب ہے۔ وہ رو، رو کر ہلکان ہو گئی ہے۔ منیب بھی گم صم بیٹھا ہے جیسے اندر ہی اندر کسی کشمکش میں مبتلا ہو، اور میرے اندر جو جنگ چل رہی ہے اس سے فرار ممکن نہیں۔ آج پولیس گھر آئی تھی، وہ اس پُر اسرار قتل پر حیران تھی مگر بابا کا غیر معمولی ردعمل میرے لیے تشویش ناک تھا اور شاید پولیس والوں کے لیے ایک جذباتی فعل...... بابا چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا کہ شمائلہ نے خودکشی کر لی، نہ معلوم میری بچی کے دل میں ایسا کون سا دکھ تھا جو اس کو موت کے حوالے کر گیا۔ بابا کی باتوں میں مکاری تھی جسے صرف میں ہی اچھی طرح سمجھ سکتی تھی۔ مگر میری معصوم بہن جب، جب کفن میں اس کا ملبوس چہرہ میری نظروں کے سامنے آتا ہے تو دل ڈوبنے لگ جاتا ہے وہ تو ہنستے کھیلتے چائے بنانے گئی تھی پھر ایسا کیا ہوا کہ اس کی چیخ نے ہمیں دہلا دیا اور ہمارے اوپر پہنچنے پر وہ حرف آخر بھی نہیں کہہ سکی، بس بے بس پتھرائی آنکھیں شکوہ کناں تھیں۔

O......O......O

آج بہت دن بعد لکھنے بیٹھی ہوں، جب سے شمائلہ کا ساتھ چھوٹا ہے، مجھے اکیلے کام کرنا پڑ رہا ہے۔ کبھی، کبھی منیب بھی میرا ساتھ دے دیتا ہے۔ آج چھت کی صفائی کرتے ہوئے مجھے ایک پستول شاپر میں لپٹا ملا تھا۔ میرے اوسان خطا ہو گئے، پولیس والوں کو یہ شبہ تھا کہ شمائلہ کی موت گولی لگنے سے ہوئی ہے مگر اماں اور بابا نے شمائلہ کا پوسٹ مارٹم کروانے سے انکار کر دیا تھا۔ پولیس کا خدشہ درست تھا۔ یقیناً شمائلہ کو اسی پستول سے مارا گیا تھا جسے بعد میں کاٹھ کباڑ میں پھینک دیا گیا تا کہ کسی کی نظر اس پر نہیں پڑے، یہ حرکت یقیناً بابا کی ہی ہے۔ کیوں کہ یہ پستول وہی ہے جسے اکثر اوقات بابا صاف کرتا تھا۔

اوہ خدایا! بابا تم نے یہ کیا کیا، اپنی بیٹی کو اپنے ہاتھوں سے ختم کر ڈالا۔ میں نیچے بھاگتی ہوئی آئی تھی اور پھولے ہوئے سانس کے ساتھ میں نے یہ بات امی اور منیب کو بتائی تو امی

نے جوابا مجھے خاموش رہنے کو کہا اور پھر میں واقعی خاموش ہوگئی، مجھے چپ لگ گئی، میں بابا سے تو ڈرتی ہی تھی اب مجھے بابا کے نام سے بھی وحشت ہونے لگی۔ میں بیمار پڑ گئی تھی اب بابا کا سارا کام امی نے سنبھال لیا تھا اور زینب نے باقاعدہ امی کا ہاتھ بٹانا شروع کر دیا تھا۔ بابا نشے میں دھت گھر میں گھستا گالی گلوچ، مار پیٹ کے بعد سو جاتا اور امی پورے دن کی محنت اور مشقتوں کے بعد جو مال تیار کرتیں وہ اگلے روز بابا بیچ آتا اور سارا پیسہ اپنے نشے میں لگاتا۔

O......O......O

تاریخ اور دن کا مجھے خاص اندازہ نہیں، میرے لیے تو سارے دن ایک ہی جیسے ہیں۔ آج بابا نے بہت عرصے بعد مجھے مخاطب کیا تھا۔ بابا کی آواز میں نرمی تھی اور قدرے سنجیدگی۔

''جی بابا'' میں نے کانپتی آواز میں پوچھا تھا۔

''کل تُو مال لے کر جائے گی، بہت آسان ہے مالک کو تُو تھیلے دے گی اور وہ تجھے رقم دے دے گا۔ اگر وہ تجھے بٹھائے اور کچھ کھلانے پلانے کی کوشش کرے تو اسے قبول کر لینا۔ دکان کا مالک اچھا آدمی ہے بس وہ لڑکیوں کی خاطر مدارت کر کے اور ان سے باتیں کر کے بہت خوش ہوتا ہے۔ کمبخت مجھ سے ٹال مٹول کرتا ہے اور پیسے بھی وقت پر نہیں دیتا۔ تُو سمجھ گئی ناں!''

بابا نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے پوچھا تھا۔ کاش کہ میں شمائلہ کی طرح بہادر ہوتی اور بابا کی اس بات کا ترخ کر جواب دیتی کہ وہ دکاندار نہیں ہوس کا بھیڑیا ہے۔ مگر میں چپ رہی۔

''ٹھیک ہے اب تم صبح کی تیاری کر لو۔ سرنج اور بوتلوں کی مارکیٹ ویلیو کافی بڑھ چکی ہے۔ پوری رقم لے کر آنا۔ وہ بڈھا بہت شاطر ہے۔'' بابا نے مجھے تنبیہ کر دی تھی اور میں مرے ہوئے قدموں سے ان کے کمرے سے نکل آئی تھی۔ وہ پوری رات میری کرب کے عالم میں گذری ماں کا وجود مہربان سایہ ہوتا ہے اولاد کے سروں پر، مگر میری ماں کتنی مجبور ہے۔ بابا دولت کے لالچ میں، جوان بیٹی کا سہارا لے رہا ہے، میں شو پیس تو نہیں۔ جیتی جاگتی

لڑکی ہوں، مجھے اچھی طرح یاد ہے جب میں شائلہ کے ساتھ اس دکان پر گئی تو وہ بڈھا ہمیں اپنی ہوس بھری نظروں سے نگلنے پر تلا ہوا تھا۔

آخ....! مجھے ہمت کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔ عزت کی موت سے اچھی بات کیا ہو سکتی ہے۔ ذلت کی زندگی سانپ بن کر ڈستی رہے اس سے بہتر ہے میں اپنی ہمت کو مجتمع کروں، شائلہ سچ کہتی تھی، میں بزدل ہوں، مگر اب ایسا نہیں ہوگا۔ میں صبح ہی بابا کو صاف منع کر دوں گی۔

آج بابا کی دھمکی مجھے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر رہی ہے۔ مگر کیا کروں میں بابا کے بتائے راستے پر نہیں چل سکتی، کاش کے میں اپنی ماں سے شکوہ کر سکتی، مگر میں جانتی ہوں یہ بے سود ہے۔ بابا نے آج مجھے جتنا مارا ہے۔ میں کیسے لکھوں.....؟

شاید وہ میرے سگے بابا ہی نہیں ہیں یا پھر ان کی نظر میں بیٹیوں کی کوئی حیثیت نہیں۔ کیا وہ نہیں جانتے کہ اللہ کے رسولﷺ تو اپنی بیٹی کے استقبال کے لیے کھڑے ہو جایا کرتے تھے، پھر وہ کیوں ایسے ہیں؟

کیا ان کو آخرت سے ڈر نہیں لگتا؟ کیا انہیں مرنا نہیں ہے؟ دل کی ویرانی مجھے رُلا رہی ہے۔ بابا سے نفرت کی آگ مجھے جلا رہی ہے لیکن اب میں جان گئی ہوں، زندگی جتنی ہی صورتیں کیوں نہ بدل لے، موت اپنا جامہ کبھی نہیں بدلتی۔ شاید میرے انکار نے ان کے اندر کا شیطان جگا دیا ہے۔

O......O......O

عوامی چوک منظور کالونی کے رہائشی شکیل عرف سلمان کے گھر آٹھ ماہ قبل پندرہ سالہ شائلہ کو دیگر گھر والوں کی موجودگی میں پراسرار طور پر گولی مار کر قتل کر دیا گیا تھا اور آج ٹھیک آٹھ ماہ بعد اٹھارہ سالہ امبر اسی گھر میں پراسرار طور پر موت کا شکار ہوئی اور اس کی وجہ موت زہر خورانی بتائی گئی ہے۔ جس بیڈ پر پندرہ سالہ شائلہ قتل ہوئی تھی اسی بیڈ پر امبر کی لاش ملی ہے۔ امبر نے مرنے سے قبل اپنے ہاتھ پر موت کی وجوہات کے بارے میں لکھا تھا جو اس کے ظالم باپ شکیل نے مٹا دیا۔ اور جب اسے پوسٹ مارٹم کے لیے لے جایا جانے لگا تو اس

کے بازو پر لکھا تھا کہ اس کی ڈائری پڑھ لی جائے جو اس نے اپنے کمرے میں چھپائی ہوئی ہے۔ یہ لکھائی بھی شکیل نے مٹا دی تھی مگر غیب کی نظریں اس دن سے اس ڈائری کی تلاش میں سرگرداں تھیں۔

پولیس ایک بار پھر اس پُر اسرار قتل پر حیران ہے۔ امبر کی والدہ کا الزام اپنے شوہر پر ہے کہ اس نے اپنی دونوں بیٹیوں کو قتل کر دیا ہے۔ پولیس کی تفتیش ابھی تک نامکمل ہی ہے۔ شاید پولیس کے بانکے سجیلے سپاہیوں نے ان دونوں بہنوں کی موت کا سراغ لگانے کی جستجو ہی نہیں کی۔ اس واقعے کے کچھ ہی دن بعد شکیل عرف سلمان ملک چھوڑ کر فرار ہو گیا اور پولیس نے واقعے کو خودکشی قرار دے کر فائل بند کر دی اور یوں شمائلہ اور امبر کی موت کا معمہ حل نہیں ہو سکا۔

مگر غیب کی تلاش جاری رہی اور آخر وہ ڈائری ڈھونڈنے میں کامیاب ہو گیا جس پر لکھی عبارت نے یہ سچائی عیاں کر دی کہ واقعی دونوں بہنوں کا قاتل ان کا اپنا سگا باپ ہی تھا جو جبر اور تشدد کے ذریعے ان کے ساتھ زبردستی کرتا رہا۔

شمائلہ اور امبر کی پراسرار موت قانون نافذ کرنے والے اداروں اور انصاف کرنے والوں کے منہ پر طمانچہ ہے گو کہ پولیس اپنی تفتیش میں ناکام رہی مگر غیب کے دل میں یہ عزم پختہ ہو چکا ہے کہ جس دن اس کا باپ ملک واپس لوٹے گا یقیناً وہ دن اس کی زندگی کا آخری دن ہوگا......!!!!

☆......☆......☆

ہاں! میں قاتل ہوں

''اوہ ہو' آج تو غضب ڈھا رہی ہو' جیج' یہ بلیک کلر تم پر بہت جچتا ہے۔'' ریحان نے سامنے بیٹھی جیسمین کو مخاطب کیا تو وہ جواباً مسکرا دی۔

''یار' آج بہت تھک گئی ہوں' ریمپ پر چلنا اتنا آسان نہیں۔'' جیسمین نے اونچی ہیل کا سینڈل ہوا میں لہراتے ہوئے دوسری طرف اچھالا۔

''کیسی رہی ریہرسل؟'' ریحان اب جیسمین کے قریب آ گیا تھا اور اس کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔

''آج کی کیٹ واک زبردست رہی' ارے اس اجالا کے چہرے کی رنگت ہی بدل گئی' جب انسٹرکٹر نے میرے اسٹائل سے چلنے کی تعریف کی۔ یو نو' شی لو ہائی فگر۔''

''اوہ یس مائی بے بی ڈارلنگ' یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے' تمہاری خوبصورتی اور فگر کے آگے وہ اجالا کچھ بھی نہیں۔'' ریحان نے شوخی سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

''اچھا یہ تو بتاؤ' تمہارا شوٹ کیسا رہا؟'' جیسمن اپنے شولڈر کٹ بالوں کو سنوارتے ہوئے بولی۔

''اوئے ہوئے' نہ پوچھو' آج تو میں نے ڈائریکٹر کو لاجواب کر دیا' کہہ رہا تھا' اگلے ڈرامے میں تم ہی میرے ہیرو ہو گے۔'' ریحان نے ڈریسنگ ٹیبل پر نظریں گاڑتے ہوئے جیسمین کی شبیہ کو آنکھ ماری تو جواباً وہ بھی مسکرا دی۔

"ویسے سائیڈ رول کرنے سے امیج خراب ہوتا ہے' تم بھی فول ہو' ڈائریکٹ ہیرو آتا تھا ناں۔" جیسمین' ریحان کے کان کھینچتے کھینچتے اس کے کندھے پر اب سر رکھ چکی تھی۔

"اگلی بار ڈائریکٹر سے پہلے ہی سیٹنگ بنالوں گی' ویسے یہ تو سنگل پلے ہے' ذرا مکمل ہونے دو پھر دیکھنا' اگلے پلے میں ہم دونوں ہی ہیرو اور ہیروئن ہوں گے۔"

"ہم دونوں؟" جیسمین نے حیرت سے ریحان کو کن انکھیوں سے دیکھا تو وہ بے ساختہ مسکرا دیا۔

"رئیل لائف کے ہیرو' ہیروئن' ڈرامے میں اپنی پرفارمنس دیتے ہوئے اور بھی نیچرل لگیں گے۔"

"یہ تو ہے۔" جیسمین نے ریحان کا کان تقریباً کھینچتے ہوئے کہا تو وہ چلا اٹھا۔

"اتنے نازک سے بدن میں اتنی جان کہاں سے آجاتی ہے؟ کم آن یار عاشق ہوں تمہارا' تم سے محبت کرنے کی ایسی سزا ملے گی' یہ تو میرے گمان میں بھی نہیں تھا۔" مصنوعی مسکراہٹ چہرے پر سجائے ریحان' جیسمین سے اپنا کان چھڑوانے کی تگ و دو میں تھا جبکہ وہ شوخی میں اپنے عروج کو چھو رہی تھی اور کان کی لو کو اور مضبوطی سے کھینچتی اس کے سرخ پڑتے چہرے کو خوب انجوائے کر رہی تھی۔

"محبت میں شدت پسندی کی قائل ہوں' تمہاری طرح سرد جذبے نہیں رکھتی۔" کان میں سرگوشی کرتی اب وہ کھڑی ہو چکی تھی۔

"اچھا بی سیریس' یہ بتاؤ کل میرے ساتھ شوٹ پر چلو گی؟ میں تمہیں اپنے ڈائریکٹر صاحب سے بھی ملوادوں گا۔" ریحان نے پُر شوق نظریں اس کے سراپے پر ڈالیں تو وہ اترا گئی۔

"پہلے یہاں سے تو پیک اپ ہو جائے پھر جو حکم ہو سرکار کا' آپ جدھر لے چلیں' ہم بھی ادھر ہی چلیں گے۔" جیسمین نے بیگ شولڈر پر ہینگ کیا اور دور پڑی ہوئی سینڈل میں اپنا پیر پھنسایا۔ اب وہ چلنے کے لیے مکمل تیار تھی۔

"تم نے بھی مجھے ڈرائیور بنا ڈالا ہے۔" ڈریسنگ ٹیبل سے گاڑی کی چابی اٹھا کر وہ

انگلی پر گھما رہا تھا۔

"تمہاری ماڈلنگ' ایکٹنگ سے اچھی میری جاب ہے' یہاں کم از کم تمہیں فرضی باتیں تو نہیں کرنی پڑتیں' جیسے ہو' جو ہو' اس سمیت مجھے قبول ہو' آئی مین' ڈرائیونگ کے لیے' میرا مطلب ہے' تم ایک اچھے ڈرائیور ثابت ہوئے ہو۔"

"کیا میں تمہاری نظر میں صرف ایک اچھا ڈرائیور ہوں؟ اور وہ....."

جیسمین کے برجستہ قہقہے نے ریحان کی بات کاٹی تھی۔ "یہ تو وقت بتائے گا کہ تم لائف ٹائم کے لیے ڈرائیور بنتے ہو یا اگلے کچھ گھنٹوں تک۔" جیسمین نے سیٹی کے انداز میں لب سکیڑے تھے اور رقص کرنے والے انداز میں گھوم گئی۔

"تم کبھی نہیں بدلو گی' تمہاری یہی ادائیں تو مجھے بے چین رکھتی ہیں۔" ریحان نے اسے دونوں ہاتھوں سے تھامتے ہوئے کہا تو وہ خوشدلی سے مسکرا دی اور پھر دونوں ہی پارکنگ لاٹ کی طرف بڑھ گئے۔

O......O......O

کہاں ہیں تمہارے ڈائریکٹر صاحب؟" جیسمین نے سیٹ پر چاروں طرف نظریں دوڑاتے ہوئے پوچھا۔

"ارے وہ صرف نام کے ہی نہیں' کام کے بھی راجہ ہیں۔" ریحان نے طنزیہ جواب دیا۔

"یہ بھلا کیا بات ہوئی؟" جیسمین نے منہ بسورتے ہوئے سامنے بیٹھی ہوئی لڑکی کو کڑی نظروں سے دیکھا جو اسکرپٹ رٹنے میں مشغول تھی۔

"یہ بھی کوئی خوبصورتی ہے' اس سے لاکھ درجے اچھی میں ہوں۔" جیسمین' ریحان کے کان میں سرگوشی کرتی اسے سرتاپا حقارت کی نظر سے دیکھ رہی تھی۔

"جبھی تو تمہیں یہاں لایا ہوں' دیکھنا' تمہیں ایک ہی نظر میں پسند کر لیا جائے گا۔" ریحان نے اس کی حوصلہ افزائی کی۔

"ماڈل ہوں میں' ماڈل' ریجیکٹ ہونے کا تو سوال ہی نہیں' فٹنس کا خیال رکھنا آسان

نہیں ہوتا' خیر یہ ساری باتیں تو انڈر اسٹوڈ ہیں۔"

"ارے ریحان' کیسے ہو؟" ہال میں داخل ہوتے ہی ربجہ مغل نے معنی خیز نظروں سے جیسمین کو دیکھتے ہوئے سوال کیا تھا۔

"جی سر' بالکل ٹھیک' زبردست' آپ ان سے ملیے' یہ میری منگیتر ہیں' جیسمین نام ہے ان کا' بہت اچھی ماڈل بھی ہیں۔" ایک ہی سانس میں تعارف کراتے ریحان نے جیسمین کے سراپے پر طائرانہ نظر ڈالی۔

"حیرت ہے' یہ ماڈل ہیں لیکن میری نظروں سے کیوں نہیں گزریں؟ کب آئی ہیں اس فیلڈ میں؟" ربجہ مغل نے سوال کیا۔

"کچھ زیادہ عرصہ نہیں ہوا' ایک مشہور ڈیزائنر ہیں' آج کل ان کے ویڈنگ ملبوسات کی نمائش جاری ہے۔ اس میں دیگر نامور ماڈلز کے ساتھ مجھے بھی موقع ملا۔" جیسمین نے معلومات مفصل طریقے سے بہم پہنچائی۔

"اوہ اوکے' اوکے' اچھا' چلو ریحان' ڈریس اپ ہو' میک اپ کرواؤ اور جلدی سیٹ پر آجاؤ' ٹائم جا رہا ہے۔" ربجہ مغل اب ریحان سے مخاطب تھا۔

"آپ چلیے بس میں آیا۔" ریحان نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

"تم اس فضول سی لڑکی کے ساتھ کام کر رہے ہو؟" جیسمین نے اسکرپٹ کا بغور جائزہ لیتی لڑکی کی جانب اشارہ کر کے ریحان سے سوال کیا۔

"اب اتنی بری بھی نہیں ہے۔" ریحان نے اسے ترچھی نظروں سے دیکھا۔

"تو ٹھیک ہے' تم اس کے ساتھ مزے کرو اور ہاں' یہ خیال رکھنا' میں تمہاری منگیتر نہیں ہوں' ہم صرف اچھے دوست ہیں۔" سخت لہجے میں جملہ ادا کرتی جیسمین اب نخوت سے کبھی اس لڑکی کو تو کبھی ریحان کو تک رہی تھی۔

"یار' سمجھا کرو ناں۔" ریحان منمنایا۔

"ہاں' میں بھی تو تمہیں یہی سمجھا رہی ہوں کہ پلیز' سمجھا کرو۔" وہ دونوں ہاتھ اس کے آگے جوڑتی جارحانہ انداز میں بولی۔

''مس عینی' ان کا میک اپ ابھی باقی ہے۔'' ڈائریکٹر راجہ مغل ایک خوبصورت سی لڑکی کے ساتھ ہال میں داخل ہوا تو ریحان اور جیسمین سنبھل کر بیٹھ گئے۔ ریحان فوراً میک اپ روم میں چلو۔'' راجہ مغل' ریحان کو آرڈر دینے کے بعد اب سیٹ پر دوسری چیزوں کا جائزہ لے رہا تھا جبکہ جلتی کڑھتی جیسمین اسے نخوت سے دیکھ رہی تھی' اس کے وجود کو نظر انداز کرنا اتنا آسان نہیں تھا لیکن ڈائریکٹر راجہ مغل شاید جان بوجھ کر ایسا کر رہا تھا۔

'' اونہہ' میں اپنی اور انسلٹ برداشت نہیں کر سکتی۔'' وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور اب وہ ریحان کا نمبر ڈائل کیے اسے انفارم کر رہی تھی کہ ہاں ریحان' اوکے' آئی ایم بیک' تم مزے کرو۔'' اور پھر ریحان کی کچھ بھی سنے بنا اس نے کال کاٹی اور موبائل پرس میں ڈالتی اس پروڈکشن ہاؤس سے باہر نکل گئی۔

O......O......O

'' اپنے آپ کو منوانے کا یہ کون سا طریقہ ہے کہ دوسروں کو کم تر گردان کران کی تذلیل کر کے ہم خود کو بہتر ثابت کریں؟'' دوسرے دن ریحان' جیسمین کے پاس بیٹھا اسے سمجھانے کی بھرپور کوشش کررر ہا تھا۔

'' بند کرو اپنا لیکچر..... ٹو دی پوائنٹ بات کرو مجھ سے۔ تمہارا سنگل پلے کچھ زیادہ ہی طویل نہیں ہو گیا؟'' جیسمین غصے سے پوچھ رہی تھی۔

'' بس کل لاسٹ کے سین ہیں لیکن اچھی بات یہ ہے کہ تم ڈائریکٹر صاحب کی نظروں میں آ گئیں' اگلے پلے کی کاسٹ اور اور سلیکشن میں' میں انہیں تمہارے لیے راضی کرلوں گا۔'' ریحان جذباتی انداز میں بولتا اسے قائل کرنے کی کوششوں میں تھا۔

'' ہاں' ہاں جب کی جب دیکھی جائے گی' بس آج کل میں فری ہوں تو دماغ خراب رہنے لگا ہے' سوچ رہی ہوں کہیں جاب کے لیے اپلائی کر دوں؟'' وہ آہستگی سے بولی۔

'' نو..... ضرورت نہیں' بس آرام کرو' تمہارے لیے اچھا سا رول میں ڈھونڈ کر لاؤں گا' ویسے تم اپنی ماڈلنگ جاری رکھو' کوئی کمرشل وغیرہ پکڑو یار.....'' ریحان نے اسے دونوں کندھوں سے جھنجوڑا۔

"ایک تو ہر جگہ پی آر چلتی ہے' کب تک میں اپنے مفادات کی قربانی دیتی رہوں گی؟ ویسے بھی اتنی ماڈلز میں سے خود کو منوانا مشکل امر تو ہے؟" جیسمین نے ایک پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔

"ارے مجھے تم پر پورا بھروسہ ہے اور تمہاری کامیابی کا یقین بھی ہے۔" ریحان نے آہستگی سے اس کے گال کھینچتے ہوئے کہا۔

"بائی دا وے' وہ اداکارہ.... کیا نام ہے اس لڑکی کا؟" جیسمین نے دماغ پر زور ڈالتے ہوئے سوال کیا۔

"نور...." ریحان نے بلا تامل جواب دیا۔

"ہاں نور' جب اس کے لیے تمہارا ڈائریکٹر راضی ہے تو پھر میں تو کسی سے کم نہیں ہوں ناں؟" وہ فخریہ انداز میں خود کو سراہتے ہوئے کہہ رہی تھی جبکہ ریحان اس کی ہاں میں ہاں ملا رہا تھا۔

O......O......O

ہوٹل کی لابی میں وہ دونوں رات کا کھانا تقریباً کھا چکے تھے' اب آخری شغل چائے کا ہو رہا تھا' ساتھ ساتھ ہلکی پھلکی نوک جھونک بھی جاری تھی۔

"آج سردی کچھ زیادہ نہیں ہے؟" جیسمین نے شال کو شانوں سے لپیٹتے ہوئے کہا۔

"بھئی مجھے تو سردی کا موسم بہت پسند ہے' خاص کر سردی سے سرخ پڑتے تمہارے یہ رخسار جن پر شریر لٹیں مسلسل اٹھکیلیاں کر رہی ہیں۔" ریحان نے بے اختیاری میں اپنا ہاتھ اس کے رخسار سے مَس کیا تھا۔ "کچھ تو خیال کر لیا کرو؟" وہ ریحان کی اس حرکت سے بوکھلا کر بولی۔

"ارے بھئی دل کے ہاتھوں مجبور ہو جاتا ہوں۔"

"اف....." جیسمین نے یکدم ایک گہری سانس بھری۔ "پتا ہے ریحان' میری بچپن سے خواہش تھی کہ میں ایک نامور ماڈل اور ایکٹر بنوں' میں امی کے دوپٹے کو ساڑی کے انداز میں لپیٹ کر خوب ڈانس کرتی' کمرے کا دروازہ بند کر کے ماڈلز کو ریمپ پر چلتا دیکھ کر بالکل

انہی کے انداز میں چلنے کی کوشش کرتی۔ مجھے یاد نہیں کہ کب سے میں اپنی یہ منزل تلاش کر رہی ہوں" جیسمین کی آنکھوں کی شفاف سطح امید کی روشنی سے منور نظر آ رہی تھی۔

"ہوں' سمجھ سکتا ہوں کیونکہ میرے اندر بھی یہ شوق جوانی کے ساتھ پنپتا چلا جا رہا ہے لیکن ایک بات سے میں اختلاف رکھتا ہوں۔" ریحان نے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔

"کس بات سے؟"

"ہم مصنوعی روشنی سے زیادہ دیر تک بہل نہیں سکتے' شوبز کی دنیا' چمک دمک' فلیش لائٹنگ' کٹ ٹو کٹ سین' کیو کی آواز کے پیچھے زندگی کتنی افسردہ ہے' یہ رنگینیاں تو وقتی ہیں' عروج کی خواہش یقیناً دل کو بڑا اور بہت بڑا کر دیتی ہے لیکن اس سچائی سے ہم کبھی پیچھا نہیں چھڑا سکتے کہ ہر عروج کو زوال ہے۔"

"آہ..... ایک تو تم اور تمہارا فلسفہ..... بھئی' مجھے تو روشنیاں عزیز ہیں' ٹپ ٹاپ نظر آنا' میک اپ' نئے ڈیزائن کے کپڑے' واہ' کیا رنگینیاں ہیں' یہی تو زندگی ہے میرے یار' جب تک اپنے آپ کو ایکسپوز نہیں کریں گے' کوئی پیچھے نہیں بھاگے گا ہمارے۔"

"خیر' یہ تمہاری منطق ہے' میرا نظریہ ذرا مختلف ہے مگر جو حکم سرکار کا' جیسے آپ راضی۔"

وہ بغیر حیل و حجت اس کی تائید میں سر ہلا رہا تھا۔

"ایک تو میں اس اجالا سے پریشان ہوں' پتا نہیں' ایسا کیا جادو کیا ہے اس ماڈلنگ انسٹرکٹر پر کہ اسے اس کے علاوہ کوئی اور چہرہ بھاتا ہی نہیں؟" جیسمین الجھتے ہوئے بولی۔

"اوہ لیواٹ' میں آج راجہ صاحب سے بات کرتا ہوں پھر اگر تمہیں مین رول مل جاتا ہے ناں تو تم دیکھنا' سارے کمرشل بنانے والے تمہارے آگے پیچھے ہوں گے' تمہاری خوبصورتی پر جو پردہ پڑا ہے' وہ جلدی ہٹ جائے گا' مجھے بس اپنی بات کرنے کا ڈھنگ بدلنا ہے۔" ریحان نے براہ راست اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

"مجھے اپنی لاحاصل خواہشات کی تکمیل کے لیے اب آگے بڑھنا ہوگا ورنہ اگر دیر ہو گئی تو یہ جوانی پہلے ساتھ چھوڑ دے گی اور شوبز کی دنیا تو....." پُرسوچ نظروں سے وہ گلاس میں بچے نیپکن کو ایک جھٹکے سے نکال چکی تھی۔

"کل پھر تیار رہنا' ایک نئے پلے کے اسکرپٹ پر راجہ صاحب مجھ سے بات کرنے والے ہیں' تم بھی ساتھ چلو گی۔" ریحان کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔

"ہاں' ٹھیک ہے' اپنے آپ کو منوانے کی خواہش اندر ہی اندر جو تباہی مچا رہی ہے' اس کے خاتمے کے لیے جدوجہد تو کرنی پڑے گی۔" کھوکھلی سی ہنسی کے ساتھ وہ بھی کھڑی ہو گئی۔

"تو اب میڈم کو گھر ڈراپ کیا جائے؟" ریحان نے اس کے نرم گداز ہاتھ کو تھامتے ہوئے کہا تھا تو جواباً اس نے ایک شاہانہ انداز میں ہاں کے اشارے کی صورت اثبات میں سر ہلایا۔

O......O......O

بھئی راجہ صاحب' آپ اپنے نئے ڈرامے کی کاسٹ میں جیسمین کو نہیں بھول جایئے گا۔ مجھے تو حیرت ہے جبکہ اس کے پاس اسکرین بیوٹی ہے' فگر بھی ہے۔ گوری رنگت بھی پھر نجانے کیوں آپ دیر کر رہے ہیں؟" ریحان نے بلا جھجک اپنی بات راجہ صاحب تک پہنچائی۔

"ارے' میں جانتا ہوں مگر وقت لگتا ہے۔ تم لوگ تو جلد باز نظر آ رہے ہو۔" شاطر سی مسکراہٹ آنکھوں میں لیے راجہ مغل' جیسمین کی جانب متوجہ ہو گیا۔

"یہ میرا کارڈ رکھ لو' اب تمہیں آنے کی زحمت نہیں کرنی پڑے گی' بس مجھ سے فون پر رابطہ رکھو' جیسے ہی تمہارے لائق کوئی رول نکلا' میں تمہیں انفارم کر دوں گا۔"

"یہ ٹھیک ہے۔" جیسمین نے کارڈ فوراً ہی پرس میں رکھ لیا۔ "اچھا' آپ میرا نمبر بھی نوٹ کر لیں۔" پھر وہ اپنا موبائل نمبر بتانے لگی جو راجہ مغل برق رفتاری سے اپنے موبائل میں save کر رہا تھا۔

"چلو میرا کام تو ختم ہوا' اب تم دونوں ڈائریکٹ ہو گئے ہو۔" ریحان نے معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ جیسمین اور راجہ کو دیکھا۔

"اوکے' اب مجھے اجازت دیں۔" جیسمین نے دونوں کو نظر بھر کر دیکھا اور راجہ مغل کے وزیٹنگ کارڈ کا بغور جائزہ لیتی باہر نکل آئی۔

O......O......O

ٹھیک پندرہ روز بعد جیسمین نے پہلی بیل پر ہی راجہ مغل کی کال ریسیو کر لی۔

"اوہ راجہ صاحب، لگتا ہے، ہماری قسمت خوش نصیبی کی طرف گامزن ہو گئی ہے۔" جیسمین نے آواز میں ترنم پیدا کرتے ہوئے کہا۔

"پندرہ روز پہلے آپ سے ہونے والی ملاقات نے مجھے بہت مرعوب کیا تھا۔ اصل میں 'میں کھری اور سچی بات کرنے کا عادی ہوں' آپ جب پہلی بار میرے پروڈکشن ہاؤس آئی تھیں تو مجھے کچھ مغروری سی لگی تھیں اور مغرور لڑکیاں مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتیں' صرف حسن ہی تو سب کچھ نہیں ہوتا' کیمرے کی آنکھ ہر فن مولا شخصیت کی تابع ہوتی ہے۔" راجہ مغل نے جیسمین کو بہت اہم بات سمجھائی۔

"جی' یہ تو ہے۔ اصل میں ماڈلز کی پہلی تربیت یہی کی جاتی ہے کہ وہ اپنے انداز ..... آئی مین' اداؤں سے' نخروں سے' حسن سے سامنے والے کو لبھائیں۔"

"واقعی ماڈلز کو ایسی ہی اداؤں کی ترغیب دی جاتی ہے؟" راجہ صاحب نے جیسمین کی بات سن کر معنی خیز انداز میں سوال کیا۔

"ارے راجہ صاحب' یہ ساری باتیں آپ سے کہاں پوشیدہ ہیں لیکن ہائے' یہ آپ کی معصومیت۔" پینترے بدلتی جیسمین ایک گہری سانس لیتی ہوئی بولی۔

"اچھا جیسمین' اس روز تمہارے جانے کے بعد میری ملاقات میرے قریبی دوست فہیم سے ہوئی تھی' ہم دونوں مل کر ایک ٹیلی فلم بنانے کا سوچ رہے ہیں تو کیوں ناں' تم کل آ کر مل لو یوں فہیم بھی تم سے مل لے گا اور ڈسکشن بھی ہو جائے گی۔"

"ٹھیک ہے' میں تیار ہوں' کب آنا ہے؟ اسی پروڈکشن ہاؤس میں؟"

"نو' نو' تم یوں کرو' میرے ڈیفنس والے فلیٹ میں آ جاؤ۔ اس ٹیلی فلم میں زیادہ تر سین indoor ہیں اس لیے مجھے اس کی لوکیشن کے لیے اپنا فلیٹ زیادہ بہتر لگ رہا ہے۔ خیر' تم رکو' باقی باتیں پھر کرتے ہیں۔"

"اچھا جناب' بس آپ مجھے ایڈریس میسج کر دیں۔" جیسمین شوخی سے بولی۔

"ہاں' ایک خاص بات' ریحان کو ساتھ مت لانا۔ دیکھو' سچی بات یہ ہے کہ ہر ڈائریکٹر

ن یہی خواہش ہوتی ہے کہ وہ بولڈ لڑکی کے ساتھ کام کرے' یہ دوستوں اور گھر والوں کے ساتھ آنے والی لڑکیاں ہمیں اپیل نہیں کرتیں۔" راجہ مغل نے انتہائی صفائی سے اپنی بات مکمل کی۔

جیسمین اتنی بے وقوف نہیں تھی' وہ معاملہ فہم تھی' فوراً ہی بات کی تہہ میں پہنچ گئی۔" sure کیوں نہیں' ایسا ہی ہوگا۔" وہ ہنستے ہوئے بولی۔

"ٹھیک ہے' میں کل تین بجے سہ پہر تمہارا انتظار کروں گا۔" یہ کہہ کر راجہ مغل نے لائن کاٹ دی تھی مگر جیسمین کا دل بلیوں اچھل رہا تھا۔ وہ خود کو تصویر میں بڑے بڑے پینا فلیکس پر مسکراتی دیکھ رہی تھی' یہ سب ہی تو اس کا خواب تھا اور اب وہ اپنے خواب و خیال کی منزل کی پہلی سیڑھی چڑھنے جا رہی تھی۔ اس موقع پر نہ ہی اس کے دل میں کوئی خوف تھا اور نہ قدموں میں لرزش۔

'کیا میں ریحان سے اس بات کا ذکر کروں؟' اس نے اپنے دل اور ذہن سے یہ سوال ضرور کیا تھا لیکن نفی میں جواب آنے پر مطمئن ہو کر بیٹھ گئی۔

O......O......O

"ریحان' آج میں اپنے ایک ماڈلنگ اسائنمنٹ کے سلسلے میں بہت مصروف ہوں' تم اپنے کام جاری رکھو' آج ہماری ملاقات ممکن نہیں ہوگی۔" جیسمین نے ریحان کو یہ میسج کرتے ہوئے کال بیل پر انگلی رکھی۔

قدرے توقف کے بعد دروازہ خود راجہ مغل نے کھولا۔" اوہ زہے نصیب .... آپ نے تو بالکل بھی انتظار نہیں کروایا۔" راجہ مغل ہاتھ کے اشارے سے اندر بلاتے ہوئے بولا۔

"مجھے تو اس ملاقات کا بہت انتظار تھا' بے صبری تو خیر میں سدا کی ہوں' یہ بتائیے' فہیم صاحب کہاں ہیں' وہ نہیں پہنچے؟" جیسمین خالی فلیٹ میں مختلف کمروں میں جھانکتی ہوئی صوفے پر نیم دراز ہوگئی۔

"ارے سوری یار' بالکل اینڈ ٹائم پر اس نے آنے سے انکار کر دیا' کوئی ضروری کام اسے یاد آ گیا' کہہ رہا تھا' کل کا ٹائم رکھ لو' میں تمہیں بتانے ہی والا تھا۔ مجھے لگا' تم مطلوبہ

وقت سے ایک آدھ گھنٹے لیٹ ہی آؤ گی۔" راجہ مغل ٹھنڈے پانی کی بوتل جیسمین کی جانب بڑھاتے ہوئے بولا جسے وہ منہ سے لگا کر غٹا غٹ پینے لگی۔

"چلیں، کوئی بات نہیں، آج پہلا موقع ہے کہ ہم فرصت سے ایک دوسرے سے بات کر رہے ہیں ورنہ ہماری ملاقات جلد بازی میں ہی ہوتی ہے۔" جیسمین پانی کی بوتل دوبارہ راجہ مغل کی جانب بڑھاتی ہوئی بولی۔

"جیسمین، کیا واقعی ریحان تمہارا منگیتر ہے؟" راجہ مغل نے تنقیدی نظروں سے اسے دیکھا۔

"ارے نہیں، وہ میرا بوائے فرینڈ ہے، بس یونہی ہر کسی سے کہتا پھرتا ہے، بے چارہ میری خوبصورتی پر مرتا ہے، ڈرتا ہے مجھے کھونے سے....." وہ استہزائیہ سی ہنسی کے ساتھ بولی۔

"اچھا، یہ بات ہے۔" راجہ مغل نے بے ساختہ انداز میں جیسمین کے کاندھے پر ہاتھ مار کر قہقہہ لگایا۔

"اچھا، ذرا یہ اسکرپٹ پڑھو اور اس پر ایکٹ کر کے دکھاؤ۔" راجہ مغل نے ذرا دیر بعد ایک اسکرپٹ جیسمین کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔

"کیوں نہیں، ضرور۔" راجہ مغل کے ہاتھ سے اسکرپٹ لے کر جیسمین بلند آواز میں پڑھنے لگی۔

"اس میں ایک گانے پر ڈانس بھی کرنا ہے، تمہیں ڈانس کرنا آتا ہے؟" راجہ مغل نے بہت گہری نظروں سے اس کے سراپے کا جائزہ لیتے ہوئے سوال کیا۔

"کیوں نہیں، یہ بھی کوئی مشکل کام ہے، پلیز میوزک پلے کریں۔" وہ ایک ادا سے صوفے سے اٹھی۔

"واہ بھئی واہ، خوب، بہت خوب۔" راجہ مغل نے ان تعریفی الفاظ کے ساتھ میوزک پلے کیا ایک بے ہودہ گانے کے بول اس کمرے میں گونجنے لگے۔

"ارے..... آپ تو میرے ساتھ آئیے....." جیسمین نے راجہ مغل کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا اور پھر اس بے ہودہ گانے پر تھرکتی جیسمین اور راجہ مغل کب جسمانی تسکین کا ڈرامہ پیش کرنے

لگے یہ خود انہیں بھی پتا نہیں چلا تھا۔ جیسمین نے رابعہ مغل کو خوب آئینے میں اتارا تھا' وہ جان گئی تھی' اگلے ڈرامے کی ہیروئن وہی ہوگی جبکہ رابعہ بھی ذہنی طور پر یہی منصوبہ بندی کر رہا تھا کہ وہ جیسمین کو ہیروئن کی حیثیت سے کاسٹ کر ہی لے گا' اس کی توقع کے برعکس آج کی اس چھوٹی ملاقات کا رزلٹ اسے بہت بڑا ملا تھا۔

O......O......O

''ارے یار' کمال ہو گیا' وہ رابعہ مغل' سنگل پلے تو دور کی بات تمہیں ایک ٹیلی فلم میں کاسٹ کرنے کا سوچ رہا ہے۔'' ریحان کے لہجے میں حیرت تھی۔

''اچھا......'' جیسمین کچھ گڑبڑاتی سی سر اٹھائے ریحان کو تکنے لگی۔

''خیریت' تم کچھ ڈسٹرب سی کیوں ہو؟'' ریحان نے اس کے قریب آتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں .... بس .... یونہی کچھ سر میں درد ہے' تم بتاؤ' کب بات ہوئی تمہاری؟ رابعہ..... مغل..... سے.....؟'' وہ آہستگی سے گویا ہوئی۔

''کل رات ہی یار' میں تو حیران ہوں اب تک لیکن تم خوش کیوں نظر نہیں آ رہیں؟'' ریحان نے اسے ٹوکا تو وہ پل بھر میں جیسے چونک سی گئی۔

''نہیں' کچھ خاص نہیں۔''

''اچھا جلدی سے تیاری پکڑو' ہمیں ابھی چلنا ہے پروڈکشن ہاؤس' وہ کیا ہے نہ کہ پوری رات میں تمہیں یہ خبر سنانے کے لیے بے تاب تھا تمہارا نمبر بدستور بند مل رہا تھا اس لیے یہ خوش خبری سنانے میں گھر چلا آیا۔ ابھی تیاری پکڑو۔'' وہ بے تابی سے بتا رہا تھا۔

''اتنی جلدی؟'' وہ کچھ کنفیوز سی کھڑی ہو گئی۔

''چلو یار ٹائم نہیں ہے' کوئی فہیم صاحب ہیں' وہ بھی پہنچ رہے ہیں۔ یہ نہ ہو کہ اتنا اچھا چانس ہم مس کر دیں۔'' ریحان اسے سمجھا رہا تھا اور پھر وہ ریحان کے سامنے تو منہ بناتی ہوئی کھڑی ہو گئی مگر دل خوشی سے بے حال تھا' شدید خواہش حقیقت کا روپ دھارنے جا رہی تھی۔

"ٹھیک ہے' میں ڈریس اپ ہو کر آتی ہوں۔" وہ تیزی سے کہتی واش روم میں گھس گئی ۔جبکہ ریحان وہاں رکھے ایک میگزین کی ورق گردانی کرنے لگا۔

O......O......O

"تم سمجھ نہیں رہے' مل کر تو دیکھو لڑکی واقعی بہت اچھی ہے' سچ کہہ رہا ہوں' خوبصورت ہے۔" راجہ مغل بھاری بھرکم صوفے پر بیٹھے فہیم سے مخاطب تھا۔

"میں نے تمہاری کبھی کوئی بات ٹالی ہے جو یہ بات ٹالوں گا؟ مگر مسئلہ یہ ہے کہ اس ٹیلی فلم کے لیے جو مجھے بڑی بڑی کمپنیوں کے اسپانسرز ملے ہیں' ان کی یہی خواہش ہے کہ اس ٹیلی فلم کی ہیروئن کوئی مشہور لڑکی ہو۔یار' ہم ایک نئی لڑکی کو لے کر رسک نہیں لے سکتے' سارا پیسہ ڈوب جائے گا۔" فہیم اپنے دلائل پیش کر رہا تھا۔

"ارے' اچھا کام لینا میرے دائیں ہاتھ کا کام ہے۔تم ان سے ایک بار رابطہ تو کرو' ان سے پوچھو نہیں بلکہ ان کو بتاؤ کہ ہم ایک نئی ماڈل کے ساتھ ٹیلی فلم بنانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ہم جیسمین کا پورٹ فولیو انہیں بھیج دیتے ہیں' یقیناً وہ دیکھ کر مطمئن ہو جائیں گے۔" راجہ مغل اپنی دانست میں فہیم کو بہت سمجھا رہا تھا مگر وہ سمجھنے کے لیے راضی نہیں تھا۔

گلاس ڈور کے پاس سانس روکے کھڑی جیسمین نے ان کی یہ گفتگو خاصی حد تک سن لی تھی' تبھی ریحان نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے کھینچا تھا اور کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولا۔

"سر' ہاؤ آر یو؟ ہم آ گئے ہیں۔" اور پھر وہ دونوں بھی صوفوں پر براجمان ہو گئے۔

"یہی جیسمین ہے' جس کے بارے میں' میں آپ کو بتا رہا تھا۔" راجہ مغل نے قدرے برہم سے لہجے میں جیسمین کا فہیم سے تعارف کرایا۔

"جی' ماشاءاللہ......!" فہیم' جیسمین پر ایک نظر ڈالتا پھر راجہ مغل کی طرف مڑ گیا۔

"ارے بھئی' انہیں ہم اگلی بار موقع دے دیں گے' تم سمجھ کیوں نہیں رہے؟"

"ہاں' ہاں' خوب سمجھ رہا ہوں۔" راجہ مغل نے ترش لہجے میں کہا۔

"ٹھیک ہے' جیسی تمہاری مرضی' اگر جیسمین کو ہی لینا ہے تو میری طرف سے یہ ڈیل ختم سمجھو۔" فہیم برہم سے لہجے میں یہ کہتا کھڑا ہو گیا۔

''عینی.....'' فہیم میک اپ آرٹسٹ کو آوازیں دیتا ہوا میک اپ روم میں چلا گیا جبکہ رانجہ مغل افسردہ سا' تاسف کے انداز میں جیسمین اور ریحان سے معذرت کر رہا تھا۔

''کوئی بات نہیں سر' اس بار نہیں تو اگلی بار صحیح۔'' ریحان نے جیسمین کو زبردستی اٹھاتے ہوئے کہا تھا مگر جیسمین کی آنکھوں میں جو آنسو تھے وہ اسے تڑپا گئے تھے۔

''کم آن یار' بزدل تو نہ بنو' یہ اتنی بڑی بات نہیں ہے پھر موقع مل جائے گا۔'' جیسمین کو کھینچتا ہوا سمجھا رہا تھا مگر جیسمین کے دل و دماغ میں اس وقت رانجہ مغل اور فہیم کے لیے صرف اور صرف نفرت تھی۔

O......O......O

''اچھی بے عزتی کی ہے آپ نے میری۔'' جیسمین موبائل پر ہونے والی گفتگو کے دوران میں تلخی سے بولی تھی۔ اس کی آواز رندھی ہوئی تھی۔

''ارے یار' یہ فہیم کچھ سمجھ ہی نہیں رہا' تم ہی بتاؤ' میں کیا کروں؟ کیسے اسے راضی کروں؟'' رانجہ مغل نے موبائل دوسرے کان سے لگاتے ہوئے کہا۔

'جب دم خم نہیں ہے تو پھر...... بے غیرت.....' دل ہی دل میں رانجہ مغل کو برا بھلا کہتی وہ خود کو بھی کوس رہی تھی۔

''ارے' خاموش کیوں ہو؟ کچھ تو بولو؟'' رانجہ مغل نے جذباتی سے لہجے میں کہا۔

''ہوں..... کچھ سوچ رہی ہوں.....'' وہ آہستگی سے بولی۔

''چھوڑو غصے کو' اگلی سیریل میں صرف تم ہی تم ہوگی' یقین کرو مجھ پر۔''

''یقین؟'' جیسمین بے ساختہ ہنسی۔

''اچھا ایک کام کریں' آپ اس فہیم کو اسی فلیٹ میں بلائیں' میں اور ریحان بھی پہنچتے ہیں۔ ایک آخری بار ٹرائی کرتے ہیں۔ اگر مان جائے زبردست ورنہ اپنی قسمت.....'' جیسمین نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''ہاں' یہ بھی ٹھیک ہے۔ چلو' یوں کرتا ہوں' فہیم کے ساتھ میں عینی کو بھی بلا لیتا ہوں بلکہ عینی بھی اسے راضی کرنے میں معاون ثابت ہوگی۔'' رانجہ مغل چہکتے ہوئے بولا۔

''اب یہ یمنیٰ کون ہے؟'' جیسمین کا لہجہ سوالیہ تھا۔

''ارے' میری میک اپ آرٹسٹ اور فہیم کی منگیتر۔''

''اوہ...... ''جیسمین زیر لب بڑبڑائی۔

''چلیں' ٹھیک ہے پھر آج ہی رات کا پروگرام رکھتے ہیں۔ اب آپ مجھے فون کر کے کنفرم کریں' جب تک میں ریحان سے بھی بات کر لیتی ہوں۔'' جیسمین کی آواز اب قدرے نارمل تھی۔

''ٹھیک ہے ڈارلنگ میں تمہیں بتا رہا ہوں۔'' یہ کہتے ہی لائن ڈراپ ہو گئی تھی اور پھر اگلے آدھے گھنٹے میں آناً فاناً یہ پروگرام طے ہو گیا تھا کہ سارے کاموں سے فراغت پا کر یہ سارے ہی لوگ ڈیفنس والے فلیٹ میں جمع ہو جائیں گے اور اکھٹے ڈنر کریں گے۔

O......O......O

''راجہ مغل ...... تم نے میرے ساتھ اچھا نہیں کیا' اگر آج وہ فہیم راضی نہیں ہوا' تم نے اسے منایا نہیں تو پھر تم میری نفرت کی آگ میں جھلس جاؤ گے' میں تمہیں ایسا مزہ چکھاؤں گی کہ تم اٹھتے بیٹھتے خود کو گالیاں دو گے اور دیکھتی ہوں فہیم' تم یہ ٹیلی فلم کیسے بناتے ہو؟ جب میں نہیں تو پھر کوئی بھی نہیں ....'' جیسمین کے دل و دماغ میں انتقامی آگ کے شعلے بھڑک رہے تھے جو ایک بڑے طوفان کا پیش خیمہ تھے۔

7 ستمبر 2011 کی شام ڈیفنس فیز ٹو کے رہائشیوں کی نشاندہی پر پولیس دوسری منزل پر قائم فلیٹ پر پہنچ گئی جہاں ٹی وی لاؤنج میں ایک نوجوان کی نعش پڑی تھی جبکہ دو نامعلوم افراد جن میں ایک لڑکی اور دوسرا نوجوان تھا' ان کی نعشیں بستر پر پڑی تھی۔

پولیس نے قانونی کارروائی کے بعد تینوں مقتولین کی نعشیں ان کے لواحقین کے حوالے کر دیں۔ پولیس کا کہنا تھا تینوں ملزمان کو شراب کے نشے میں دھت کر کے سفاک ملزمان نے باری باری گلا گھونٹ کر قتل کیا ہے۔ مقتول راجہ مغل کی نعش ٹی وی لاؤنج سے جبکہ فہیم الکریم ایڈووکیٹ اور یمنیٰ کی نعشیں بیڈ روم سے ملی تھیں۔

قتل کی واردات کی تفتیش کے لیے مقتولین سے تعلق رکھنے والوں کے بیانات ریکارڈ

کرنا شروع ہوئے جس میں پولیس کو جیسمین اور ریحان نیازی پر شک ہوا اور اس شک کی بنا پر پولیس نے دونوں کو حراست میں لے لیا۔ جیسمین اور ریحان نیازی کو اگلے روز کراچی سٹی کورٹ کی ایک ماتحت عدالت میں پیش کیا گیا۔ پولیس نے عدالت سے درخواست کی کہ ملزمان سے مزید تفتیش اور آلہ قتل کی برآمدگی کے لیے دس روزہ جسمانی ریمانڈ دیا جائے مگر عدالت نے ملزمان کو تفتیش کی خاطر چار روز کے لیے پولیس کی تحویل میں دے دیا۔

چار روز کے بعد ایک بار پھر جیسمین اور ریحان نیازی کو کمرہ عدالت میں پیش کیا گیا تو یہاں ایک عجیب ہی منظر تھا' جیسمین کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے' وہ آپے سے باہر تھی اس نے ایک وکیل کے گریبان کو مضبوطی سے تھام رکھا تھا اس کے ہونٹوں پر یہ الفاظ تھے۔

''ہاں .... میں قاتل ہوں.... میں نے قتل کیا ہے....ایک نہیں' تین افراد کی جان لی ہے....میں کب تک ہوس کی بھینٹ چڑھتی؟ شوبز کے لٹیرے اور ان کی ہوس بھری نظریں مجھے اپنے جسم کے آر پار محسوس ہو رہی تھیں' لاکھ جتن کے باوجود میں پھر سے بھیڑیوں کی خواہشات کا شکار ہو گئی ..... اور میں نے ...... انہیں مار دیا..... میں نے سب کا گلا گھونٹ دیا..... میرا بس چلے تو معصوم لڑکیوں سے زیادتی کرنے والے تمام افراد کو قتل کر دوں.... اپنی زندگی بنانے کے لیے گھر سے قدم نکالنے والی لڑکیوں کو میں یہ نصیحت کروں گی کہ وہ اگر کچھ کرنا چاہتی ہیں تو سب سے پہلے اپنے اندر مجھ جیسا حوصلہ پیدا کریں اور کسی لڑکی کی زندگی برباد کرنے والوں کو نشانِ عبرت بنا دیں....''

اس وقت جیسمین اور ریحان نیازی جیل میں ہیں اور اپنی قسمت کے فیصلے کے منتظر ہیں۔

☆......☆......☆

نفرت کی آندھی

''کیوں اشارے کر کے بلا رہا ہے مجھے، اگر ماں کی آنکھ کھل گئی تو..... ''
سونیا نے خوف سے اپنی آنکھوں کو سکیڑ کر بستر میں سوئی ماں کو نظر بھر کے دیکھا اور پھر ظہیر کو گھورا۔
''یاد ستا رہی ہے تیری، مجھ سے باتیں کیے بنا تجھے نیند کیسے آجاتی ہے۔ ظہیر نے سرگوشیوں میں اپنی بات اس تک پہنچائی۔
''نیند کہاں میں تو خود کروٹیں بدل رہی تھی، یہ بتا صبح کا پروگرام تو پکا ہے ناں؟'' سونیا نے اس کا بازو تھامتے ہوئے اس کو کمرے سے باہر دھکیلا اور خود بھی دروازے کے پیچھے ہو گئی۔
''ہاں، ہاں اک بات جب کہہ دی تو اس پر عمل کرنا مجھ پر فرض ہو گیا ہے، ظہیر اپنی بات سے کبھی نہیں پھرتا۔ البتہ تیرا کچھ نہیں پتا؟'' ظہیر نے معنی خیز انداز میں جملہ ادھورا چھوڑا۔
''میں گھر سے کالج کے لیے دیر سے نکلوں گی اور پھر کالج جانے کے بجائے تیرے ساتھ گھوموں گی' سچ کل ہم خوب انجوائے کریں گے۔'' سونیا نے پُر شوق نظریں ظہیر کے سراپے پر ڈالیں۔
'' خالہ کو اگر کچھ پتا چل گیا.....؟'' ظہیر نے اچٹتی سی نظر سر تک چادر اوڑھی خالہ پر

ڈالی، اس کے چہرے پر یک دم ہی خوف کے سائے نمودار ہوئے۔

"ارے اماں کو چھوڑ، ان کو تو میں سنبھال لوں گی، بس تُو اپنی فکر کر، صبح اچھا سا تیار ہو کر آنا، آخر ہم ڈیٹ پر جا رہے ہیں اور جیب تو تیری گرم ہے ناں؟" سونیا شوخی سے ہنستے ہوئے بولی۔

"ارے جانی تیری خاطر تو اپنی ساری کمائی حاضر ہے۔"

"ٹھیک ہے اب چپ کر کے سو جاؤ، اگر اماں جاگ اٹھیں تو صبح سارے پلان کا ستیاناس ہو جائے گا۔"

"اچھا ایک گلاس پانی تو پلا دے۔" ظہیر نے اسے چمکارتے ہوئے کہا اور اس کے گال کو آہستگی سے چھوا۔

"وہ باورچی خانہ تیرے سامنے ہے، جا جا کر وہاں سے پی لے، میں کیوں لانے لگی تیرے لیے پانی، سب جانتی ہوں تیرے نخرے اور تیور۔" سونیا نے مصنوعی غصے سے منہ چڑاتے ہوئے اسے دیکھا اور کمرے کے اندر مڑ گئی۔

"ارے سن تو......؟" مڑتی سونیا کو ظہیر نے برق رفتاری سے پکڑا تو وہ طیش میں آ گئی۔

"زیادہ اپنی کی تو اماں کو اٹھا دوں گی؟"

"کمال ہے غصہ کیوں کرتی ہے اتنا، یہ لے میں تو تیرے لیے مونگ پھلیاں لایا تھا۔"

سائیڈ پاکٹ سے اخباری لفافہ سونیا کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا تو وہ نرم پڑ گئی۔

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے، سیدھی طرح بات نہیں کرتا ناں، اک دن مجھے بھی مروائے گا تُو، تو جانتا ہے ناں، اماں مجھ پر کتنی کڑی نظر رکھتی ہے، میرے ہر اک فعل پر اس کی نظریں جمی رہتی ہیں۔ بس اس لیے محتاط رویہ اختیار کرنا پڑتا ہے۔" وہ آہستگی سے ظہیر کے کان میں بولتی جا رہی تھی۔

"اب تیری ماں نہیں اٹھے گی؟" ظہیر نے چڑ کر اسے بیچ میں ہی ٹوکا تو وہ بوکھلا گئی۔

"اچھا، اچھا صبح ملتے ہیں، میں اسٹاپ پر آجاؤں گی، تو مجھے مس کال مار دینا، میرے

پاس بیلنس نہیں ہے" وہ بڑبڑاتی ہوئی واپس کمرے میں مڑ گئی۔

"پھر بیلنس ختم کر دیا، یہ کرتی کیا ہے اتنے سارے بیلنس کا؟ ابھی تو ڈلوایا تھا۔" ظہیر اپنی سوچوں میں غلطاں آہستگی سے اپنے کمرے کی طرف بڑھنے لگا۔

O......O......O

"تجھ سے کتنی بار کہا ہے، یہ ظہیر مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتا اسے واپس پنجاب بھیج دے۔" احمد عباس اپنی بیوی زینب سے مخاطب تھا۔

"میرا بھانجا ہے، مجھے اس میں کوئی برائی نظر نہیں آتی۔ جانے تُو کیوں اس سے خائف رہتا ہے۔" زینب بی بی نے بستر طے کرتے ہوئے اوپر تلے رکھے اور احمد عباس کی بات کی نفی کرتے ہوئے اس کے سامنے چائے کا مگ بڑھایا۔

"کل رات بھی ظہیر صحن میں منڈلا رہا تھا، وہ کمرے میں کیوں نہیں رکتا اپنے، نوکری بھی اس کی رات تک کی ہے مگر وہ سہ پہر ہی لوٹ آتا ہے، میری سمجھ میں نہیں آرہا یہ سب کچھ، گھر میں جوان لڑکی ہے، زیادہ کچھ کہوں گا تو سوتیلا کہلاؤں گا، مگر سن لے مجھے سونیا سگی بیٹی جیسی ہی عزیز ہے۔" احمد عباس نے چائے کا مگ لبوں سے لگایا اور سڑ کی آواز کے ساتھ ایک طویل سپ لی۔

"جانتی ہوں میں۔" زینب بی بی نے مسہری کے کونے پر ٹکتے ہوئے کہا۔

"سونیا بہت چھوٹی سی تھی جب ٹیوشن پڑھانے آیا کرتے تھے تب ہی سے اسے جانتے ہو، یقیناً اس کی رگ، رگ سے واقف ہو، مگر ظہیر کو میں نے اپنی گود میں کھلایا ہے۔ پیدا ہوتے ہی میری گود میں آگیا تھا۔ میں جانتی ہوں وہ غلط نہیں، بس تم احمد عباس اپنے دیکھنے کا نظریہ بدل لو، تو بات بن جائے۔" زینب بی بی نے ٹرے سے چائے کا مگ اٹھایا اور پراٹھے کی پلیٹ احمد عباس کے سامنے رکھ دی تو وہ منہ بناتا ہوا کھڑا ہو گیا۔

"تُو کھا پراٹھے اور اپنے بھانجے کو کھلا، میں چلا اپنی ڈیوٹی کرنے اور آج تیری شہزادی کالج نہیں جائے گی کیا؟ اس کی فیس کے پیسے آسمان سے نہیں اترتے بلکہ میں اپنی کمائی سے بھرتا ہوں۔ اس سے کہہ کہ ناغہ نہیں کیا کرے، پڑھائی میں پیچھے رہ جائے گی۔" احمد عباس

نے سر سے پاؤں تک چادر اوڑھی سونیا کے سر پر صلواتیں سنانی شروع کی تو زینب کا دل مچل گیا۔

"رہنے دے ابھی اٹھاتی ہوں، کالج میں دیر سویر تو چلتی ہے، جائے گی کیوں نہیں جائے گی۔"

"ٹھیک ہے میں نکلتا ہوں، تُو اپنے شہزادے کو بھی ناشتہ کرا دے، ورنہ وہ برا مان جائے گا۔" احمد عباس نے منہ بسورتے ہوئے کہا اور کمرے سے نکل گیا۔

O......O......O

"تجھے کتنی دیر سے مس کال مار رہا ہوں، اب پہنچی ہے تُو۔" ظہیر نے منہ بگاڑتے ہوئے کہا۔

"ارے ابا صبح ہی صبح غصہ کر کے گیا ہے تو اماں نے ساری کسر مجھ پر نکالی، صبح ہی صبح شروع ہو گئیں، وقت پر کالج جایا کر، جلدی اٹھا کر، اب بڑی ہو گئی ہے، گھر کے کاموں میں بھی تیرا دھیان نہیں، پکا دیا اس نے اور اوپر سے تیری مس کال پر مس کال، اماں کے سامنے جواب دیتی تو شک کرتی، یہاں تک آنا بھی محال ہو جاتا میرا۔" سونیا نے برقعے کا آخری بٹن لگاتے ہوئے دوپٹہ سر پر جمایا۔

"چل اچھا ٹھیک ہے، اب یہاں سے رکشہ لے لیتے ہیں، لیکن یہ بتا جانا کہاں ہے؟ اتنی صبح تو کچھ بھی نہیں کھلتا؟" ظہیر نے قریب کھڑے رکشے کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"پہلے یہاں سے تو نکلتے ہیں پھر دیکھتے ہیں کہاں چلنا ہے۔" سونیا نے رکشے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

"بے وقوف رکشے والے سے کیا کہیں گے؟" ظہیر نے سونیا کو گھورا۔

"اچھا سفاری پارک چلتے ہیں، میں نے کالج کی بہت سی لڑکیوں کو وہاں اپنے بوائے فرینڈز کے ساتھ آتے دیکھا ہے۔ پھر وہاں سے تُو مجھے شاپنگ مال لے جائے گا، یاد ہے ناں شاپنگ والی بات" سونیا نے آنکھیں مٹکاتے ہوئے ظہیر کو دیکھا اس کا چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا۔

''ہاں، ہاں یاد ہے، چل تو پھر رکشے والے سے بات کرتے ہیں۔'' ظہیر نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی اور پھر دونوں ہی رکشے کی طرف بڑھ گئے۔

O......O......O

''ارے زینب، شہر میں دھماکے کی اطلاع ہے۔ سونیا گھر آ گئی کیا؟ اس کی دوست ردا ابھی مجھے اسٹاپ پر ملی تھی، کہہ رہی تھی کالج کی چھٹی ہو گئی، میں نے سونیا کے بارے میں دریافت کیا تو اس نے لاعلمی کا اظہار کیا۔'' احمد عباس پھولے ہوئے سانس کے ساتھ بول رہا تھا۔

''کیا کہہ رہے ہو؟ سونیا تو آج دیر سے کالج گئی تھی اور ابھی تک لوٹی بھی نہیں، اس کے موبائل پر کال کرو۔'' زینب بی بی نے تقریباً روتے ہوئے کہا۔

''ارے موبائل پر بیل ہو رہی ہے وہ اٹھائے تو سہی، میں تو سارے راستے اس کو کال کرتے ہوئے گھر پہنچا ہوں۔ میں تو سمجھا تھا وہ گھر پہ ہے اس لیے کال ریسیو نہیں کر رہی۔'' احمد عباس کا سانس تیز، تیز بولنے کی وجہ سے پھول چکا تھا۔

''تم آرام سے بیٹھو میں ذرا باہر سے پتا کر کے آتا ہوں، ابھی زیادہ دیر نہیں ہوئی' ہو سکتا ہے رش میں پھنس گئی ہو۔'' احمد عباس زینب بی بی کو دلاسہ دیتے ہوئے باہر بھاگا جب کہ روتی چیختی زینب بی بی کی حالت غیر ہوتی جا رہی تھی۔

''یا الٰہی میری بچی خیریت سے گھر پہنچ جائے، اللہ اسے اپنی امان میں رکھے، آج کا دن ہی منحوس تھا۔ صبح ہی صبح بحث مباحثے شروع ہو گئے تھے، نہیں بھیجنا چاہیے تھا مجھے سونیا کو، مگر وہ تو باپ کے غصے کی وجہ سے لیٹ بھی چلی گئی، کوئی مصلحت ہی تھی جو میری بچی کا آج کالج جانے کا من نہیں تھا، اللہ اسے جلدی سے اپنے گھر کی راہ دکھا۔

O......O......O

''واہ آئسکریم تو مزے دار تھی لیکن ابھی مجھے برگر بھی کھانا ہے، بچ جلدی کے چکر میں ناشتہ بھی نہیں کر پائی۔'' سونیا نے انگلیاں لیتے ہوئے ظہیر کو دیکھا۔

''کیا تو مجھے ساری زندگی ایسے ہی ستائے گی؟'' بڑے سے درخت کے سائے میں،

ہری، ہری گھاس پر بچھی بینچ پر بیٹھا ظہیر ناراض نظروں سے سونیا کو دیکھتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

''نہیں تو آج میں ابا کی وجہ سے پریشان ہوگئی، بہت تاک جھانک میں لگا رہتا ہے، جانے کیوں ہر وقت اسے میری فکر کھائے رہتی ہے۔'' سونیا نے دونوں پیروں کو اوپر کیا اور آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی۔

''سچ بتا کبھی تجھے تنگ تو نہیں کیا۔ آخر سوتیلا باپ ہے۔ جہیز میں جوان جہان ۱۶ سالہ لڑکی ملی ہے۔'' ظہیر نے سونیا کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا تو وہ گڑبڑا گئی۔

''نہیں، پتا نہیں۔ تنگ تو کرتا ہے ابا، اب پتا نہیں اس کی نیت کیا ہے۔ ہر وقت اماں کو میرے خلاف بھڑکاتا رہتا ہے۔ حالانکہ اس کی اور اماں کی پسند کی شادی ہے۔'' سونیا نے تاسف کے انداز میں گردن ہلائی۔

''ایک تو خالہ کو دوسری شادی کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ جوان لڑکی کی ماں دوسری شادی تھوڑی کرتی ہے۔ شوہر کو مرے سال بھی نہیں ہوا۔ بیٹی کو ٹیوشن پڑھانے والے سر سے عشق کر کے اس سے شادی رچالی، سچ سونیا مجھے یہ بات بہت چبھتی ہے۔'' ظہیر نے اپنے دل میں پلنے والے خدشے کا برملا اظہار کیا۔

''ہوں چھوڑ، چل نہ برگر خریدتے ہیں۔ کیا چٹ پٹا برگر بنا رہا ہے۔ سلاد تو دیکھو، بالکل فریش ہے اور میرے والے برگر میں خوب ساری چٹنی ڈلوانا۔'' سونیا نے باتوں کا سارا رخ قریب کھڑے برگر والے کی طرف موڑ دیا۔

''چٹوری کہیں کی، جیسی چٹ پٹی باتیں کرتی ہے، ویسا ہی چٹ پٹا کھانے کی بھی شوقین ہے۔'' چل برگر کھاتے ہوئے مارکیٹ کی طرف چلتے ہیں، ایک بجنے والا ہے۔'' ظہیر نے کلائی میں بندھی گھڑی میں ٹائم دیکھتے ہوئے کہا تو سونیا اچھل کر بیٹھ گئی۔

''واقعی ایک بجنے والا ہے؟''

''ہاں تو اور کیا۔ لیٹ جو نکلے تھے، اب تو سارے بازار بھی کھل گئے ہوں گے، تجھے تیری پسند کا سوٹ دلا دوں پھر گھر کی راہ لیں گے، خالہ انتظار کر رہی ہوں گی۔'' ظہیر نے برگر والے کو دو پارسل دینے کا کہا۔

اور اتنی دیر میں سونیا نے پرس سے لپ اسٹک نکال کر مزید گہری کی اور گلے میں پڑے دوپٹے کو اچھی طرح سے سر پر لپیٹ لیا۔

''میں جارجٹ کا اچھا سا سوٹ لوں گی۔'' سونیا اب چلنے کے لیے بالکل تیار تھی۔

''ہاں مارکیٹ چل تو رہے ہیں جو پسند آئے لے لینا، لیکن یہ بتا جس بات کو تو مسلسل ٹالے جا رہی ہے، وہ میری بات کب مانے گی؟'' ظہیر نے پُرشوق نظروں سے سونیا کو دیکھا۔

''کہا تو انٹر کر لوں، پھر خالہ کو ماں کے پاس بھیج دینا، تم مجھے پسند ہو، بس ابا راضی ہو جائے۔'' سونیا کے کہنے کی دیر تھی کہ ظہیر کا لہجہ بگڑ گیا۔

''ایک تو تیرا ابا مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتا، خیر دیکھی جائے گی، نہیں مانا تو تجھے اغوا کر کے لے جاؤں گا۔'' بتیسی نکالے اب وہ برگر والے کو پیسے دیتا سونیا کی طرف مڑا تھا۔

''اس کی ضرورت ہی نہیں پڑے گی، میں تیرے ساتھ خود ہی بھاگ جاؤں گی۔'' سونیا نے ایک ادا سے کاغذ میں لپٹے برگر کا اوپری حصہ پھاڑا اور ایک بڑا سا لقمہ لیا۔

''ذرا قدم جلدی بڑھا، ابھی مارکیٹ بھی تجھے گھومنا ہے اور تُو سوٹ پسند کرنے میں کتنی دیر لگائے گی یہ تو اللہ بہتر جانتا ہے۔'' ظہیر نے اس کو کھاتا دیکھ کر ٹوکا۔

''نہیں جلدی پسند کروں گی، اماں گھر میں انتظار کر رہی ہوگی ان سے بھی جھوٹ بولنا پڑے گا، کہہ دوں گی میں اپنی دوست کے گھر چلی گئی تھی اور تیرا تو مسئلہ ہی نہیں، تُو تو کام سے شام ہی لوٹتا ہے۔'' سونیا نے شام تک کا نقشہ کھینچا۔

''ہاں، ہاں جو تجھے ٹھیک لگے۔'' اور پھر دونوں تیزی سے داخلی دروازے کی طرف بڑھ گئے۔

O......O......O

'' کچھ پتا چلا؟'' احمد عباس کو گھر میں داخل ہوتے دیکھ کر زینب بی بی تیزی سے ان کی جانب لپکی۔

''نہیں...... کالج سے بھی ہو آیا ہوں، وہاں تو چوکیدار تالا لگا کر جا چکا ہے، مجھے تو لگتا ہے وہ ظہیر کے ساتھ نکلی ہوئی ہے۔'' احمد عباس نے غصے سے زینب بی بی کو گھورا۔

''بے کار میرے بھانجے اور بیٹی پر الزام لگا رہے ہیں آپ، وہ تو صبح کا نکلا ہوا ہے اس معصوم کو......''

''بس، بس معصوم سمجھنے کی ضرورت نہیں، وہ آج کام پہ گیا ہی نہیں، اس کے مالک سے ابھی مل کر آرہا ہوں بہت شکایت کر رہا تھا اس کی، بلکہ کہہ رہا تھا اسی طرح چلتا رہا تو اسے فارغ کر دوں گا۔ زینب تو عقل کے ناخن لے اور اسے اس کے گھر بھیج دے۔'' احمد عباس نے پر زور مخالفت کی۔

''ارے ابھی میری بچی کی فکر کریں، جانے وہ کہاں بھٹک رہی ہوگی، شہر کے حالات پتا نہیں کیسے ہیں۔ میرا تو دل ڈوبا جا رہا ہے۔ ایک بجے گھر آجاتی ہے اب تو تین بج گئے ہیں۔'' زینب بی بی کا رو، رو کر برا حال تھا۔

''ارے تیری لاڈلی فون تو اٹھائے، کتنے فون کر چکا ہوں۔ میسج بھی کیے۔ مگر وہ کسی کا جواب نہیں دے رہی۔ کیا فائدہ ایسے موبائل کا۔ بس شو مارنے کے لیے رکھا ہوا ہے۔'' احمد عباس نے غصے سے دوبارہ نمبر ڈائل کیا مگر بیل بدستور بجتی رہی۔

O......O......O

''پورے ایک ہزار کا سوٹ دلایا ہے تجھے، اب تو، تُو میری بات مانے گی ناں؟'' ظہیر نے آنکھ مارتے ہوئے آہستگی سے اس کا ہاتھ تھاما۔

''ایک ہزار کا نہیں، آٹھ سو کا، بچت ہوگی تیری۔'' ظہیر کی بات ٹالتے ہوئے سونیا بولی۔

''اچھا ناں وعدہ کر تُو رات مجھ سے دیر تک باتیں کرے گی، مجھے نیند نہیں آتی، بس تیرے ہی بارے میں سوچتا رہتا ہوں۔'' ظہیر نے لہجے میں مٹھاس گھولتے ہوئے کہا۔

''بابا کو تو جانتا ہے ناں، مروائے گا کیا؟'' سونیا نے کمال مہارت سے بابا کی تڑی دی۔

''ایک تو تیرا بابا، بس مجھ سے صبر نہیں ہوتا، میں کل ہی اماں کو فون کر دوں گا کہ وہ خالہ سے تیرا ہاتھ مانگ لے، ایک بار میرے نام کی انگوٹھی تیری انگلی میں آئی، پھر تیرا بابا میرا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔''

''اونہہ اس بارے میں سوچا جا سکتا ہے، ذرا ٹو رک میں باتوں باتوں میں ماں کی مرضی بھی جان لوں۔'' سونیا نے خود کو دوپٹے میں چھپاتے ہوئے کہا۔ اب رکشہ مانوس راستوں پر آ چکا تھا۔

''ٹھیک ٹھاک دیر ہوگئی، ماں کو کیا جواب دوں گی؟'' سونیا نے قریب آتے مطلوبہ اسٹاپ کو دیکھتے ہوئے ظہیر کی جانب دیکھا۔

''شام کے پانچ بج رہے ہیں، بڑی بہادر بن رہی تھی اب نمٹنا اماں سے، میں تو یہاں اتر رہا ہوں تُو گلی کے نکڑ پر اتر جانا۔'' ظہیر رکشے سے اترتے ہی کرایہ دے کر اپنی راہ چل دیا۔ جبکہ سونیا گلی میں اپنے گھر کے سامنے اتری۔

''کس کے ساتھ آئی ہے؟ کہاں ہے ظہیر؟'' زینب اور احمد عباس نے دروازے سے اندر آتی سونیا سے بیک وقت سوال کیے۔

''مم، مم ماں میں دوست کے گھر چلی گئی تھی، اسے شاپنگ پر جانا تھا وہاں دیر ہوگئی۔'' وہ جھجکتے ہوئے بولی۔

''فون کہاں ہے تیرا؟ ایک بار بھی اپنے موبائل پر نظر نہیں ڈالی تُو نے؟'' احمد عباس نے آگے بڑھ کر اسے بازو سے جھنجوڑا۔

''کک، کک نہیں اس نے بے اختیار نفی میں گردن ہلائی اور پھر وہ موبائل پر نظر ڈالتی ہی کیوں سارا وقت تو وہ ظہیر کے ساتھ ہی تھی۔

''کمبخت تیری وجہ سے میں اور تیرا باپ قریبی پولیس اسٹیشن پر چلے گئے۔'' زینب بی بی روتے ہوئے بولیں۔

''کیوں اماں، پولیس اسٹیشن کیوں؟'' خوف سے سونیا کی آنکھیں ابلنے لگیں۔

''ارے تیرے باپ کو لگا، ظہیر تجھے بھگا کر لے گیا ہے اس لیے۔'' زینب بی بی نے سسکیاں لیتے ہوئے سونیا کو گلے سے لگایا۔

''حد ہوگئی، آپ لوگوں کا تو دماغ خراب ہوگیا ہے، مجھے تو بس شاپنگ میں دیر ہوگئی، یہ دیکھیے یہ سوٹ لیا ہے۔'' وہ ماں کے سامنے سوٹ کا شاپر پھینکتی اب کمرے میں آ چکی تھی اور

اپنے حواس بحال کر رہی تھی۔

''اس احمد عباس کا تو کچھ کرنا پڑے گا، میرا باپ کیا بن گیا ہے میرا جینا حرام کر دیا ہے اس نے۔ ماں کو ورغلاتا رہتا ہے۔ جانے کیا چاہتا ہے۔ ہر بات میں میری کاٹ کرتا ہے۔ ظہیر سچ ہی کہتا ہے اس کی نیت ہی خراب ہے۔ جبھی اسے میری خوشی عزیز نہیں ۔ ماں سے بات کرنی پڑے گی، اگر یہ ایسے ہی ہمارے سروں پر مسلط رہا تو بس سنور گئی میری زندگی۔

O......O......O

''میں تو کہتا ہوں اچھا موقع ہے، اس سے جان چھڑانے کا، تیرا جواز بھی کڑا ہے اور اس طرح اماں مان بھی جائے گی اور تجھے جلدی رخصت کر دے گی۔'' ظہیر نے پوری بات سمجھاتے ہوئے موبائل دوسرے کان پر منتقل کیا۔

''نہیں، نہیں مجھے کچھ اچھا نہیں لگ رہا۔'' سونیا نے کہا۔

''ارے تو سمجھا کر، ایسے خالہ ہماری شادی کے لیے راضی ہو جائیں گی، سوچ تو سہی خالہ نے احمد عباس سے پسند کی شادی کی ہے جیسے تُو میری اور میں تیری ہر بات مانتا ہوں۔ ویسے خالہ بھی احمد عباس کی ہر بات مانتی ہے۔اور احمد عباس ہماری شادی کے لیے ہرگز راضی نہیں ہوگا۔ بس ایک یہی طریقہ ہے جس کی وجہ سے خالہ حامی بھر سکے گی۔'' ظہیر نے اسے سمجھانے کی پوری کوشش کی۔

''ہاں ایک ابا کی بات پر وہ تیرے خلاف پولیس اسٹیشن پہنچ گئیں۔

''دیکھ میں ابھی تک پیشیاں بھگت رہا ہوں۔''

''کہہ تو، تُو ٹھیک رہا ہے، میں سوچ کر بتاتی ہوں۔'' سونیا نے آہستگی سے کہا۔

''ارے میری مینا، سوچنے کے چکر میں نہ پڑ مجھ پر بھروسہ ہے ناں اور میں تیرے بھلے کے لیے ہی سوچ رہا ہوں، میں تیرا سگا ہوں سگا اور وہ تیرا سوتیلا ہے سوتیلا۔'' ظہیر نے لفظ سوتیلا پر زور دیتے ہوئے لائن کاٹ دی۔ جبکہ سونیا خلاء میں غیر مرئی نقطے کو گھورتے ہوئے موبائل کا فلیپ گرا چکی تھی۔

O......O......O

''بتا خالہ کو، پاگل ہے جو تو ان سے چھپا رہی ہے؟'' ظہیر نے پاس بیٹھی سونیا کو کریدا۔

''کیا بتائے گی یہ مجھے، کیا ہوا ہے اسے کل شام کہاں تھی، اس کے باپ نے تو مجھے ایسی پٹی پڑھائی کہ میں اس کے ساتھ پولیس اسٹیشن پہنچ گئی۔'' زینب بی بی نے تشویش بھرے لہجے میں اپنی بات مکمل کی۔

''وہ احمد عباس، خالہ وہ دشمن ہے میرا، میں کیوں سونیا کو لے کر بھاگنے لگا، یہ میری عزت ہے اور پھر وہ خود ٹھیک نہیں ہے۔ یہی تو میں کہہ رہا ہوں سونیا سے کہ تجھ سے کچھ نہیں چھپائے۔'' ظہیر نے خالہ کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے تسلی دی۔

''کیا چھپا رہی ہے تُو، بتا مجھے کیا ہوا ہے تجھے؟'' زینب بی بی نے اب سونیا کو جھنجھوڑا۔

''ہاں خالہ کو نہیں تو کسے بتائے گی؟' شاباش بتا دے۔'' ظہیر نے سونیا کو آنکھیں دکھائیں۔

''وہ اماں، بابا مجھے مختلف بہانوں سے تنگ کرتا ہے۔'' یہ کہہ کر وہ سر گھٹنوں میں چھپا کر پھوٹ، پھوٹ کر رونے لگی۔

''کیا کہہ رہی ہے تُو، دماغ تو صحیح ہے تیرا، کب کیسے؟'' خالہ ہونقوں کی طرح کبھی ظہیر تو کبھی سونیا کا چہرہ تک رہی تھی۔

''سچ خالہ میں اس حرام زادے کی تکہ بوٹی کر دوں گا، سالہ باپ کی عمر کا، شرم نہیں آتی بڈھے کو......''

''ارے چپ کر جا، بول سونیا کیا سچ کہہ رہی ہے تُو؟'' زینب بی بی زارو قطار رو رہی تھیں جبکہ سنی ان سنی کرتی سونیا کے نہ آنسو تھم رہے تھے اور نہ ہی دلخراش آوازیں۔

O......O......O

''میں کہہ رہا ہوں نکال اس ظہیر کو گھر سے۔ لاکھ چھپائے وہ اور سونیا لیکن اس دن دونوں ساتھ ہی تھے۔ کل کو یہ لڑکی لے کر بھاگ گیا تو، تو ہاتھ ملتی رہ جائے گی۔'' احمد عباس نے نفرت بھری نظر زینب بی بی پر ڈالی۔

''جانتی ہوں میں تو کیوں چاہتا ہے کہ اسے میں گھر سے نکال دوں، وہ تیرے راستے

میں رکاوٹ بن رہا ہے، مجھے سب بتا دیا ہے سونیا نے، تجھے شرم نہیں آئی......" زینب خونخوار نظروں سے احمد عباس کے سراپے کو گھور رہی تھی۔

"کیا مطلب ہے تیرا؟" احمد عباس پلٹا۔

"بس، بس تجھے قسم ہے میری بچی سے دور رہ، میں اس کا اچھا برا سب سمجھتی ہوں۔ کوئی ضرورت نہیں اس کے معاملات میں بولنے کی۔" زینب بی بی نے دھمکی دی۔

"تُو کیا کہہ رہی ہے میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا ہے؟" احمد عباس کچھ الجھے سے لہجے میں بول رہا تھا۔

"ہاں، میں تیری سمجھ کو سلام پیش کرتی ہوں اتنا عرصہ جانے کیسے میری عقل اور نظر پر پردے پڑے رہے۔ یہ تو ظہیر کی آمد پر میں، سب جان گئی، تُو کیوں اس کے پیچھے پڑا ہے؟" زینب بی بی نے دوپٹے کے آنچل سے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا جبکہ احمد عباس اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔

"تیری عقل تو گھاس چرنے گئی ہے، میں خود دیکھتا ہوں اس معاملے کو......"

"کہا ناں خبردار، جو میری بیٹی کے بارے میں تُو نے کچھ سوچا بھی....." زینب بی بی نے برق رفتاری سے احمد عباس کا بازو پکڑا جسے وہ چھڑاتا ہوا آگے نکل گیا۔

O......O......O

"خالہ یہ نجیب ہے، رقیہ ماسی کا بیٹا۔ تجھے یاد ہے ناں یہ؟" ایک دبلے پتلے اور قدرے خوش شکل لڑکے کو ظہیر رقیہ ماسی کا بیٹا بتاتے ہوئے زینب بی بی سے ملا رہا تھا۔

"ہاں، اچھا ماشاللہ بڑا ہو گیا ہے، کیا کرتا ہے یہ؟"

"ارے خالہ یہ دبئی میں رہتا ہے آج کل آیا ہوا تھا پنجاب، تو میں نے اسے کراچی بلا لیا ہے۔" خالہ کے ساتھ ساتھ سونیا بھی نجیب کے سراپے میں الجھ چکی تھیں۔

"یہ میں چار سوٹ، کچھ پرفیوم، چاکلیٹ اور رسٹ واچ لایا تھا آپ کے لئے۔" نجیب نے مسکراہٹ چہرے پر سجاتے ہوئے سونیا کی طرف شاپرز بڑھائے جسے اس نے جھجکتے ہوئے تھام لیا۔

''رکھ لے، میں نے ہی اس سے تیرے لئے منگوائے ہیں۔'' ظہیر نے سونیا کو آنکھ ماری تو وہ خوش دلی سے مسکرادی۔

''ارے جب اگلی بار آؤں گا تو میں آپ کے لئے نیو برانڈ کا موبائل بھی لا دوں گا۔ یہ تو مجھے ظہیر نے راستے میں بتایا کہ آپ کا موبائل خراب ہو گیا ہے۔'' نجیب نے بات آگے بڑھائی۔

''جی اچھی بات ہے۔'' سونیا نے خوش دلی سے جواب دیا۔

''اچھا بیٹے بیٹھ جاؤ میں تمھارے لیے چائے بناتی ہوں اور ہاں رات کا کھانا کھا کر جانا۔'' زینب بی بی اٹھ کر کچن کی طرف مڑی تھیں کہ ظہیر کی آواز پر رک گئیں۔

''خالہ، نجیب کچھ دن میرے ساتھ، میرے کمرے میں رہے گا، بس اسے کراچی گھمانا ہے۔

''نہیں بچے، سونیا کے باپ کو پتا چلا تو وہ سخت خفا ہوں گے۔'' زینب بی بی نے فوری انکار کیا۔

''ارے خالہ بس ایک ہفتے کی بات ہے میں انہیں سنبھال لوں گا۔ آپ بے فکر رہیں اس کی نوبت نہیں آئے گی۔'' ظہیر نے نجیب کی طرف مکاری سے دیکھا اور پھر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتا اسے اپنے کمرے میں لے گیا۔ جب کہ خالہ کے چہرے پر حیران، پریشان تاثرات کا ایک ہالہ تھا۔

O......O......O

''خالہ احمد عباس مر گیا تو اس کی پینشن تو تجھے ملتی رہے گی، کیوں نہ ہم اس کا کام ہی تمام کر دیں، سونیا کو بھی اس سے چھٹکارا ملے گا اور اس کے مرنے کے بعد تیرا بھی بھلا ہوگا ،میں نے اسی مقصد کے لیے نجیب کو یہاں بلایا ہے۔'' ظہیر نے آہستہ، آہستہ خالہ کے کان میں سرگوشی کی۔

''کہہ تو، تو صحیح رہا ہے کم بخت جب سے میں نے اپنی پھول سی بیٹی کو روتا دیکھا ہے مجھے اس کے سراپے سے بھی نفرت ہو رہی ہے۔''

''بس خالہ اب مزید کیا سوچنا، میں تجھے نشہ آور گولیاں لا دیتا ہوں، تو بس چائے میں

احمد عباس کو پلا دے، باقی کام میں اور نجیب سنبھال لیں گے۔'' ظہیر نے سمجھاتے ہوئے خود کو خالہ کے اور نزدیک کر لیا۔

'' لیکن اس کے بعد ہم اکیلے ..... میرا مطلب سونیا جوان جہان لڑکی ہے، میں کیسے اسے اکیلے سنبھالوں گی؟''

'' ارے خالہ، سونیا کے لئے لڑکے بہت، خود میں کیا کسی سے کم ہوں؟'' ظہیر نے دانت نکالے۔

'' ارے، تُو، تو، میری اپنی اولاد ہے۔'' خالہ نے ایک گہری سانس بھری۔

'' سونیا بتا رہی تھی بچپن سے اسے پریشان کر رکھا ہے۔ ایک بار ٹھکانے لگ گیا کم بخت، ساری دنیا کا سکون مل جائے گا۔ خالہ تجھے بھی اور سونیا کو بھی.....''

ظہیر خالہ کے کانوں میں زہر اگلتا رہا اور وہ اثبات میں سر ہلاتی رہی۔

O......O......O

'' کیا تمہیں پتا ہے ظہیر نے مجھے یہاں کیوں بلایا ہے۔'' نجیب نے براہ راست سونیا کو مخاطب کیا۔

'' وہ چاہتا ہے کہ ہم دونوں تیرے باپ کو ختم کر دیں اس طرح تیرا اس کے ساتھ نکاح آسان ہو جائے گا، کیا تُو واقعی اپنے باپ کو مار کر، اس کے ساتھ نکاح کے لیے رضامند ہے؟'' نجیب نے حیرت سے اسے تکا۔

'' نہیں تو..... پتا نہیں..... '' سونیا گڑبڑائی۔

'' ایک قاتل کو تم اپنا شوہر بنا لوگی؟ آخر پڑھی لکھی لڑکی ہو۔ شکل وصورت سے سمجھدار بھی لگتی ہو۔'' نجیب نے بڑی گہری بات کی تھی۔

'' یہ ظہیر کا پلان ہے میرا نہیں'' وہ ڈری سہمی سی نجیب کو جواب دے رہی تھی۔

'' ٹھیک ہے اگر تمھاری مرضی ہے تو سہی، میں اس کام میں اس کی مدد نہیں کر سکتا۔ مجھے تمھارا باپ اچھا آدمی لگا میں کل ہی چلا جاؤں گا۔''

'' کیا آپ یہاں سے سیدھے دبئی چلے جائیں گے؟'' سونیا نے رازدارانہ لہجے میں

پوچھا۔

"نہیں پہلے پنجاب جاؤں گا پھر وہاں سے ..... کیوں؟"

"کیا آپ مجھے اپنے ساتھ دبئی لے جا سکتے ہیں، مجھے یہاں بہت ڈر لگ رہا ہے"

سونیا نے کمال مہارت اور معصومیت سے سوال کیا، وہ نجیب جیسے امیر اور خوبرو شکل وصورت کے وجیہہ انسان کو کھونا نہیں چاہتی تھی۔

"ہاں لیکن کیا تمھاری ماں راضی ہو جائے گی؟" نجیب نے سوال کیا۔

"ارے ہم انہیں کچھ نہیں بتائیں گے خاموشی سے نکل جائیں گے۔" سونیا نے دلچسپی لیتے ہوئے جواب دیا۔

"سوچ لو اچھی طرح....." نجیب نے کہا۔

"ہاں میں سب کچھ سمجھ گئی ہوں، بس آپ راضی ہیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔"

"مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا" نجیب نے کندھے اچکائے۔

O......O......O

۲۳ اور ۲۴ نومبر کی رات دس بجے شاہ فیصل کالونی میں چائے میں نشہ آور گولیاں ملا کر زینب بی بی نے اپنے شوہر احمد عباس کو بے ہوش کر دیا اور بے ہوشی کے بعد نائیلون کی رسی کی مدد سے احمد عباس کو پھانسی کا پھندا لگا کر موت کے گھاٹ اتار دیا۔ یہ سب کچھ اس نے ظہیر کے کہنے پر کیا تھا۔ اب جبکہ احمد عباس مر چکا تھا تو اس کو ٹھکانے لگانے کی انہیں فکر ستائی۔

"کیوں خالہ کیا اب اس کو ٹھکانے لگا دوں؟" ظہیر نے خالہ کو کریدا۔

"مجھے کیا خبر تو بتا؟" خالہ کی پھٹی آنکھیں احمد عباس کی لاش سے ہٹ نہیں رہی تھیں۔

"دیکھ تیرے کہنے کے مطابق میں نے اپنا کام کر دیا۔ اب تو نجیب کے ساتھ مل کر اس کی نعش کو ٹھکانے لگا دے۔" خالہ ڈرے لہجے میں کہہ رہی تھیں۔

"میں نجیب کو بلاتا ہوں۔" ظہیر تیزی سے اپنے کمرے کی طرف دوڑا۔ مگر وہاں نجیب نہیں تھا۔

"ارے نجیب کہاں گیا؟" ظہیر حیرت سے بڑبڑاتا ہوا دوبارہ صحن میں آیا۔

"کمرے میں سونیا بھی نہیں ہے۔" زینب بی بی بھی متعجب پلٹیں۔

"کیا کہہ رہی ہو خالہ؟" ظہیر کا ماتھا ٹھنکا۔

"اسی دوران زینب بی بی کا موبائل بجا۔

"لو یہ لو سونیا کے نمبر سے کال ہے" یہ کہتے ہوئے زینب بی بی نے کال ریسیو کر لی اور پھر قدرے توقف کے بعد کیا کہہ کر بند کر دی۔

"سونیا نجیب کے ساتھ بھاگ گئی ہے، اس نے کہا ہے میں اس کی فکر نہ کروں۔" یہ کہہ کر زینب بی بی غش کھا کر گر گئیں۔ جب کہ ظہیر کا غصے سے برا حال تھا۔ وہ سونیا کی بے وفائی کا بدلہ احمد عباس سے لینے کے لیے اس پر ٹوٹ پڑا۔

"کہاں ٹھکانے لگاؤں میں تجھے، اکیلے تو میں پکڑا جاؤں گا، کیوں ناں تیری لاش کے ٹکڑے کر کے میں دفنا دوں" پھر وہ چیختا رہا، روتا رہا اور احمد عباس کی لاش کے ٹکڑے کرتا رہا۔" خالہ میں اس کی تکہ بوٹی بنا کر جانوروں کو کھلا دوں گا، پہلے اس احمد عباس کا سراغ مٹا دوں پھر دیکھنا سونیا کو ڈھونڈوں گا، اس سے پوچھوں گا، اس نے ایسا کیوں کیا؟"

زینب بی بی پھٹی آنکھوں سے ظہیر کو دیکھ رہی تھیں تو کبھی لاش سے جدا اس سر کو جو اس کے محبوب شوہر کا تھا۔

O......O......O

سونیا کہاں ہے، نجیب کے ساتھ ہے یا اسے بھی احمد عباس کی طرح کہیں ٹھکانے لگا دیا گیا ہے۔ تادم تحریر پولیس کھوج لگانے میں ناکام ہے مگر اس لرزہ خیز واردات نے نفرت اور انتقام کا جو بھیانک منظر رقم کیا ہے وہ تادیر لوگوں کے دلوں پر نقش رہے گا۔

عورت کے انتقام کو عملی شکل دینے والی زینب اپنے شوہر سے نفرت کی تمام منازل طے کر چکی ہے۔ اس نے اپنے شوہر کی تکہ بوٹی کر کے عورت کے انتقام کو عملی نمونہ بنا دیا ہے جو بدکردار مردوں کے لیے بھی نشانِ عبرت ہے اور انتقام میں جلتی ہوئی خواتین کے لیے بھی درسِ عبرت۔

☆......☆......☆

گدھ نما انسان

غروب آفتاب کا وقت تھا۔ شہر کراچی میں واقع پاپوش نگر قبرستان میں بھیڑ تھی۔ حسرت و یاس کا سماں تھا' اداسی کی کیفیت ہر چہرے سے عیاں تھی۔ سورج ڈھلنے کے ساتھ ساتھ یہ کیفیت بڑھتی ہی جاتی تھی۔ یہ سب لوگ اپنی ایک عزیزہ کی تدفین کے لیے جمع تھے۔ قبر کھودی گئی' متوفیہ کا آخری دیدار ہوا' ہر آنکھ اشکبار تھی' جسے زندگی بھر خود سے قریب رکھا تھا' آج اسے پاک کر کے' کفن لپیٹے آخری آرام گاہ میں اتارا گیا' ڈھیروں دعاؤں کے ساتھ لحد کے حوالے کیا گیا کہ اب اس نے وہیں رہنا ہے۔ اس سور کے پھونکے جانے تک جب سب اپنے رب کے سامنے جواب دہ ہوں گے' جزا پائیں گے اپنے نیک اعمال کی اور سزا پائیں گے اپنے گناہوں کی۔ اس وقت تک یہ قبر ہی وہ ٹھکانہ ہے جو اس فانی دنیا سے لافانی دنیا کی طرف سفر میں اس بے جان جسم کو اپنی آغوش میں لے لے گا۔ اس عورت کو لحد میں اتار کر سلیب رکھی گئی' مٹی ڈالی گئی' پھول رکھے گئے' قبر پر ڈھیروں انوار و رحمت اور مغفرت کی دعائیں کی گئیں پھر تھکے ہارے قدم نہ چاہتے ہوئے بھی واپسی کو پلٹے اور دور ہوتے ہوتے بالآخر اوجھل ہو گئے۔

قبر کے اندر اب ایک نئے سفر کا آغاز تھا' ایک نیا امتحان ہونا تھا' زندگی کے ہزاروں سوالوں کے بعد موت صرف تین سوالوں کے جواب چاہتی تھی۔

''تمہارا رب کون ہے؟ تمہارا دین کیا ہے؟ تمہارا نبی کون ہے؟''

''مگر یہ کیا' دور بیٹھا ایک شخص چھپ کر اس قبر کی تاک لگائے بیٹھا ہے۔ رات یونہی اپنی تاریکی میں ڈوبتی گئی' شہر نیند کی آغوش میں بے خبر سوتا رہا' مردوں سے آباد یہ قبرستان وحشت کا سماں پیش کر رہا تھا۔ رات کی بڑھتی تاریکی اس شخص کے حوصلے بلند کر رہی تھی۔ وہ چپکے سے اٹھا' اپنے قدم اس قبر کی جانب بڑھاتا رہا' چلتے چلتے کبھی دائیں' کبھی بائیں دیکھتا کہ کہیں کوئی نظر اس کا تعاقب تو نہیں کر رہی؟ اس حقیقت سے بے نیاز کہ اس تاریکی میں بھی اس کو تخلیق کرنے والا اس کے ہر عمل کو دیکھ رہا ہے۔ قبر کے پاؤں والی جانب سے وہ مٹی ہٹاتا گیا اور پھر وہ اس قبر میں موبائل کی روشنی اور گناہوں کی تاریکی سمیت داخل ہوا۔ اپنے ناپاک عزائم کو حتمی شکل دینے کے لیے جب اس نے لاش کو دیکھا تو وہ مردہ آنکھیں اس وقت بھی نور کا ہالہ بنے روشن تھیں' بکھرے بال اور ظاہر دانت اسے مقصد میں ناکام کرنے کے در پے تھے۔ وہ آنکھیں مرنے کے بعد بھی اپنا تحفظ چاہتی تھیں اور پوچھتی تھیں کہ کیا اس طے شدہ امتحان کے بعد بھی کوئی امتحان باقی ہے؟ کیا حوا کی بیٹی کو مرنے کے بعد بھی ''تحفظ'' میسر نہیں؟ وہ شخص یہ منظر دیکھ کر لرزا' ڈرا اور بھاگا۔ اگلے چند لمحوں میں قبرستان ''بچاؤ..... بچاؤ.....'' کی چیخوں سے گونج اٹھا۔

انسانوں کی آخری آرام گاہ کے لیے بنائے جانے والے قبرستان اب جرائم پیشہ افراد کی پناہ گاہوں کے طور پر استعمال ہو رہے ہیں پھر چاہے معاملہ اسلحہ چھپانے کا ہو' منشیات کے اڈے چلانے کا' کالے جادو ٹونے کے لیے انسانی ہڈیاں اور کھوپڑیاں چرانے کا' پیسوں کے حصول کے لیے قبر کشائی کر کے مردے بیچنے کا یا پھر مجرموں کے چھپنے کے لیے محفوظ مقام کا حصول ہو' یہ قبرستان ہر جرم میں سرفہرست استعمال ہو رہے ہیں شاید اس لیے کہ یہاں کے مکین اب سدا کے لیے خاموش ہو چکے' وہ دنیا کے سامنے ان جرائم کا راز فاش نہیں کر سکیں گے اور شاید اس لیے بھی کہ پولیس اور انتظامیہ جب زندہ لوگوں کا تحفظ ممکن نہیں ہو رہا تو ان مردوں کی طرف کس کی توجہ جاتی؟ قبرستان میں ان جرائم کے وجود سے تو کوئی بھی ناواقف نہیں مگر 29 اکتوبر 2011ء کو شہر کے وسط میں واقع ایک قبرستان میں ہونے والے ایک واقعہ نے لوگوں کے دل دہلا دیے۔ برق رفتار میڈیا نے اس دردناک خبر کو جنگل کی آگ کی

طرح پھیلا دیا جس نے سننے والوں کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ انسانیت اپنے پست مقام تک پہنچ چکی ہے؟ ہوا کچھ یوں تھا کہ 29 اکتوبر کو کراچی میں واقع پاپوش نگر قبرستان میں ایک شخص چیختا ہوا بھاگ رہا تھا۔ حقیقت دریافت کرنے کے لیے کئی لوگ اس کے پیچھے دوڑے اور جب اسے پکڑ کر تفصیلات معلوم کی گئیں تو اس نے بتایا کہ وہ ایک عورت کی قبر میں میت کی بے حرمتی کی نیت سے گھسا تھا مگر قبر کے اندر لاش کی کھلی آنکھوں سے نکلتی روشنی' بکھرے بال اور دانتوں کو دیکھ کر ڈر گیا اور باہر آ گیا۔ وہ شخص یہ غیر معمولی منظر دیکھ کر اس قدر خوف زدہ تھا کہ برملا اپنے جرم کا اعتراف کر بیٹھا۔ لوگوں نے اسے پولیس کے حوالے کر دیا جہاں تفتیش کے بعد کئی حقائق کھل کر سامنے آئے۔ انکشاف ہوا کہ اس قبیح گناہ کا ارتکاب کرنے والے 28 سالہ مجرم ریاض کا تعلق سرگودھا سے ہے اور وہ بچپن میں اپنے والدین کے ساتھ کراچی آ گیا تھا۔ ریاض کے 4 بھائی اور 3 بہنیں ہیں جبکہ والدین نصرت بھٹو کالونی میں رہتے ہیں اور اسے اپنے ایک رشتہ دار نوشاد کی مدد سے پاپوش نگر قبرستان میں کام پر رکھا گیا تھا جہاں مجرم قبروں پر پانی ڈال کر لوگوں سے اجرت لیتا تھا مگر کچھ ہی عرصے میں اس نے قبرستان کو ہی اپنا ڈیرہ بنا لیا اور گھر جانا چھوڑ دیا۔ قبرستان میں اس کی دوستی نشہ کرنے والے ایک شخص وزیر عرف وزیرا سے ہوئی جس نے خواتین کی قبروں کی بے حرمتی کے طریقے بتائے۔ دونوں مل کر یہ کام کرتے تھے۔ مگر کچھ عرصے قبل وزیرا زیادہ ہیروئن پینے کی وجہ سے قبرستان میں ہی مر گیا اور ریاض تنہا ہی یہ فعل کرتا رہا۔ مجرم نے 8 سال کے عرصے میں 50 سے زیادہ خواتین کی لاشوں کی بے حرمتی کرنے کا اعتراف کیا ہے۔ ریاض نے بتایا کہ وہ قبرستان میں تدفین کی نگرانی کرتا تھا اور جب کسی خاتون کو دفنایا جاتا تو وہ رات کو موقع دیکھ کر قبر کشائی کرتا اور موبائل کی ٹارچ جلا کر قبر میں گھس کر لاشوں کی بے حرمتی کرتا۔ یہ گناہ اسی طرح جاری رہتا اگر اس رات قبر کا دل دہلانے والا منظر اسے خوف زدہ نہ کرتا اور مجرم وہاں سے بھاگنے پر مجبور نہ ہوتا۔

ناظم آباد پولیس نے ملزم ریاض کے خلاف مقدمہ نمبر 2011/ 516 زیر دفعات 297 (مردوں کی بے حرمتی)' 376 (مردہ خواتین سے زنا)' 4' 3/A اور 377 کے

تحت درج کر لیا ہے۔ ملزم نے یہ بھی انکشاف کیا کہ قبرستان جرائم کے گڑھے بنے ہوئے ہیں۔ یہ قبیح گناہ ہوتا رہا اور پولیس بے خبر تھی' شہر کے وسط میں موجود قبرستانوں کے اردگرد پولیس بہت کم نظر آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سالوں تک قبرستان میں لاقانونیت کی یہ حالت ہے تو دوردراز کے علاقوں میں کیا صورت ہوگی۔ کراچی میں واقع 189 قبرستانوں میں تدفین کا ریکارڈ تک نہیں رکھا جاتا' تاہم شہری حکومت کے شعبہ قبرستان کے انچارج محمود عالم صدیقی نے ہر قبرستان میں ایک رجسٹر رکھوا دیا ہے جس میں انٹری کر کے رسید کاٹ دی جاتی ہے۔ ابراہیم حیدری' عیسیٰ نگری' کورنگی' پاک کالونی قبرستان' علی اکبر شاہ گوٹھ' شیر شاہ' مواچھ گوٹھ اور میوہ شاہ قبرستانوں میں انسانی ہڈیاں چوری کرنے کے واقعات' منشیات کا استعمال اور فروخت بھی عام ہے اور کئی افراد پکڑے بھی گئے ہیں مگر صورت حال پھر بھی وہیں کی وہیں ہے۔ یہ تمام گناہ ایک طرف مگر خواتین کی لاشوں کی بے حرمتی کا واقعہ انسانی عقل اور فطرت سے ماورا ہے۔ ذہن یہ سوچنے پر مجبور ہے کہ کیا اس دنیا میں صنف نازک کو بھی کبھی "تحفظ" مل پائے گا؟ وہی عورت جو ماں کے روپ میں جنت' بہن کی شکل میں محبت و شفقت' بیوی ہو تو نصف ایمان کی حفاظت اور بیٹی کے روپ میں رحمت بن کر برستی ہے' نجانے پھر بھی تحفظ کے لیے کیوں در بدر بھٹکتی ہے؟ دنیا میں اس حق کے لیے جدوجہد کرتے کرتے جب وہ تھک ہار کر قبر میں سوتی ہے کہ شاید یہاں اسے سکون مل پائے گا مگر اب لگتا ہے کہ اس دنیا میں مرنے کے بعد بھی اس کی یہ خواہش پوری نہ ہو سکے گی۔

O......O......O

اس شخص کو درندہ کہوں یا شیطان' نہیں نہیں' درندہ تو نہیں' یہ شخص تو درندگی کے وضع کردہ اصولوں سے بھی نیچے جا گرا' یہ تو بے غیرتی اور کمینگی کی انتہاؤں پر ہے۔ میں جوں جوں اس گدھ نما شخص کی کہانی میں الجھتی جا رہی ہوں' میرے اعصاب شل ہوتے جا رہے ہیں۔ جسم پر کپکپاہٹ طاری ہے کہ چند سطریں لکھنے کے بعد قلم میرے ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے۔ یہ چند ماہ پہلے کی بات ہے کہ ٹی وی چینلز اور اخبارات میں قبروں سے مردے نکال کر ان کے گوشت کو پکا کر کھانے والے انسان نما درندوں کی داستانیں پیش کی جا رہی تھیں جنہیں دیکھ کر

اور سن کر میرے ذہن میں ایک طوفان برپا ہو رہا تھا اور پھر میرے علم میں یہ بات آئی تھی کہ بعض لوگ قبروں سے مردوں کی ہڈیاں چرا کر لے جاتے ہیں۔ ابھی میں "سچی کہانیاں" کے سلسلے "میرے شہر کی کہانی" میں انسانی ہڈیوں کے ان بیوپاریوں کا پردہ چاک کر کے فارغ ہی ہوئی تھی کہ پاپوش نگر کے قبرستان میں ایک ایسا بدبخت' ننگِ انسانیت شخص پکڑا گیا ہے جس نے پاکستان کی پوری سوسائٹی کے چہرے پر سیاہی مَل دی ہے۔ یہ شخص دنیا میں مسلمانوں کی جگ ہنسائی کا سمبل بن گیا ہے اور آج میں اس شخص سے گفتگو پر مجبور ہوئی ہوں جس کی میں شکل تک دیکھنا نہیں چاہتی مگر میں اپنے پیشہ ورانہ ذمہ داریوں کی خاطر حوالات کے دروازے پر کھڑی ہوں اور اس بے غیرت' کمینے شخص سے مخاطب ہوں۔

"میری طرف دیکھو...." میں نے اس کے جھکے سر کو مخاطب کیا تھا۔ "مجھے" سچی کہانیاں" کے سلسلے "میرے شہر کی کہانی" کے لیے تمہارے غلیظ خیالات جاننے کی ذمہ داری دی گئی ہے۔ کیا نام ہے تمہارا؟"

" ریاض۔" وہ بغور میرا جائزہ لیتے ہوئے بولا۔

"تمہیں شرم نہیں آئی کہ جن قبروں کی رکھوالی کا کام تمہیں سونپا گیا تھا' تم انہی قبروں کی بے حرمتی کرنے لگے؟" میرے آنسوؤں سے لبریز آنکھوں میں اس کا سراپا دھندلا نظر آرہا تھا۔

"ہاں' بس غلطی ہوگئی پہلے تو میرا دوست وزیر عرف وزیرا یہ کام کرتا تھا' اسی نے مجھے اس لت میں مبتلا کیا' اسے کیوں نہیں پکڑا تمہاری پولیس نے؟ کہاں تھیں تم اس وقت؟" وہ اپنی لال بھبوکا آنکھوں سے مجھے گھور رہا تھا۔ اس کی نظریں کھا جانے والی تھیں۔

"وزیرا....؟" میں نے نفرت سے اس کے سراپے پر سوالیہ نظر دوڑائی تھی۔

"ہاں' ہاں' وہی وزیرا جو ہیروئن کے نشے کا عادی تھا' وہ دن بھر نشہ کر کے وہیں قبرستان میں پڑا رہتا تھا۔ اسی نے تو مجھے اس کام کی طرف راغب کیا تھا۔ وزیرا اور میں دن میں یہ نوٹ کرتے تھے کہ دفن ہونے والی میت مرد کی ہے یا عورت کی اور جب کسی عورت کی میت دفنائی جاتی تو ہم دونوں رات میں اس کی قبر کے پیروں کی طرف سے قبر کی مٹی ہٹا کر....."

احساسات سے عاری وہ شخص مجھے ذہنی مریض لگا تھا جو اس وقت سپاٹ چہرہ لیے سلاخوں کے پیچھے کھڑا تھا۔

''وزیرا کہاں ہے اب؟'' میں نے اگلا سوال کیا۔

'' وہ سالا تو نشے کی زیادتی کی وجہ سے کب کا مر گیا.... '' وہ بڑے اطمینان بھرے لہجے میں بولا تھا۔

''اتنا قبیح گناہ کرنے کے باوجود تم کتنے اطمینان سے کھڑے ہو اور ڈھٹائی سے سب کچھ بتا رہے ہو؟ رات کے اندھیرے میں لوگ قبرستان کی طرف رخ کرنے سے ڈرتے ہیں اور تم اسی اندھیرے کا فائدہ اٹھا کر.....''

''ہم تو قبرستان کے باسی ہیں' ہمیں یہ اندھیرا نہیں ڈراتا اور پھر موبائل فون ٹارچ کی روشنی میں قبر کے اندر اترنا آسان ہے اور پھر مردہ عورتوں سے کیا ڈرنا؟'' اس نے سپاٹ لہجے میں کہا تھا۔'' میں گزشتہ آٹھ سالوں سے یہ کام کر رہا ہوں' اب تک 48 سے زائد خواتین کی قبریں چاک کر چکا ہوں۔'' وہ ڈھٹائی سے بتا رہا تھا۔

''کیا تمہیں موت کا خوف نہیں؟ تمہیں مخصوص قبریں کھودتے ہوئے ذرا بھی ڈر محسوس نہیں ہوا کہ تم کتنا گھناؤنا کام کر رہے ہو؟ تم تو جنگل میں رہنے والے جانوروں سے بھی بدتر ہو' تم خود کو انسان سمجھتے ہو' تم حیوان ہو' حیوان.... '' میں غصے میں چیخ پڑی تھی۔ ''کتنی بہنیں ہیں تمہاری؟''

''تین بہنیں ہیں میری۔'' وہ آہستگی سے بولا۔

''اگر کل تمہاری بہن کا انتقال ہوتا ہے اور کوئی اس کی قبر چاک کر کے اس کے مردہ جسم کے ساتھ یہ قبیح عمل کرے تو تم کیا کرو گے؟''

''میں اسے قتل کر دوں گا...... '' یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھیں ابلنے لگیں تھیں اور چہرہ جذبات کی حدت سے تپنے لگا تھا۔'' ایسے شخص کو جان سے مار دینا چاہیے۔''

''اچھا اپنی بہن کی بات آئی تو اسے جان سے مار دینا چاہیے اور تمہارے لیے کیا سزا تجویز کرنی چاہیے؟''

"میں پھانسی کے لیے تیار ہوں لیکن میں توبہ کر چکا ہوں اس لیے مجھے معافی مل جائے گی۔" وہ بہت اطمینان سے بولا۔

"تمہیں تو اتنی عبرت ناک سزا ملنی چاہیے کہ پھر کوئی ایسا عمل کرنا تو دور کی بات' ایسا سوچنے کے بھی قابل نہ رہے۔"

"کہہ تو دیا کہ اب دوبارہ ایسا گناہ نہیں کروں گا۔ انسان سے غلطی ہو جاتی ہے۔" وہ بے ساختہ بولا تھا۔

"تم ہوش میں ہو؟ کیا کہہ رہے ہو تم؟ تم خود کو انسان کہتے ہو؟ بے غیرت آدمی' تم عورت کی تدفین کے بعد وہ وقت جب مردہ فشارِ قبر' وحشتِ قبر کے مراحل سے گزر رہا ہوتا ہے' اس وقت تم اس کے کفن کو ہٹا کر اس کے جسم کی بے حرمتی کرتے ہو؟ ایسا کرتے ہوئے تمہارے اندر خدا کا خوف بیدار نہیں ہوا؟" میں شدتِ غم اور اور غصے سے بے حال ہو چکی تھی ۔دل چاہ رہا تھا' اس کا چہرہ طمانچوں سے سرخ کر دوں۔

"اللہ معافی دے۔ مجھے اس کام کی لت وزیرا نے لگائی تھی ورنہ میں ایسا نہیں تھا۔ پولیس کو بھی میں نے یہ بیان دیا ہے کہ میں یہ کام دوبارہ نہیں کروں گا۔" وہ بے خوفی سے بول رہا تھا۔

"وزیرا کو مرے ہوئے کتنا عرصہ ہوا ہے؟"

"دو سال کا عرصہ ہو گیا ہے۔"

"کبھی تم پر کسی کو شک نہیں ہوا کہ تم قبرستان میں کس قبیح جرم کا ارتکاب کر رہے ہو؟"

"ایک رات میں قبر کو بند کرنا بھول گیا تھا۔ وہ ایک بیس' بائیس سالہ لڑکی کی قبر تھی۔ دوسرے دن جب اس لڑکی کے گھر والے قبر پر فاتحہ پڑھنے آئے تو قبر کھلی ہوئی تھی اور کفن ہٹا ہوا تھا۔ یہ ناقابلِ برداشت حالت دیکھ کر انہوں نے شور مچایا تو کچھ لوگوں نے مجھ پر شک کرنا شروع کر دیا' تب میں یہاں سے بھاگ گیا اور پھر میں ڈیڑھ سال سرگودھا رہ کر واپس آیا تھا۔"

"اور تم نے واپس آتے ہی دوبارہ یہ کام شروع کر دیا' لعنت ہو تم پر۔"

"ہاں لیکن میں نے کہا تو ہے کہ اب میں یہ کام نہیں کروں گا میں بہت ڈر گیا ہوں۔" وہ کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بولا۔

"آخری بار جب تم قبر میں گھسے تھے تو کیا ہوا تھا؟"

"میں مغرب کے بعد اس قبر کی پاؤں کی طرف سے مٹی ہٹا کر سلیب سرکا کے اندر گھسا تو موبائل روشنی میں' میں نے دیکھا کہ اس عورت کے دانت باہر نکلے ہوئے ہیں اور اس کی آنکھوں سے روشنی نکل رہی ہے' بس میں ڈر کر وہاں سے بھاگ گیا۔ اب تو میں نے توبہ کر لی کہ آئندہ قبر کھودنا تو دور' میں قبرستان میں کام کرنا ہی چھوڑ دوں گا۔"

"تم کتنے سفاک ہو' اتنا بڑا جرم کر کے کتنی آسانی سے اعتراف کر رہے ہو؟ تمہیں تو کتوں کے آگے ڈال دینا چاہیے کہ وہ تمہارے جسم کی بوٹی بوٹی کر دیں۔"

"بس اب کیا کیا جائے' ہو گئی غلطی' مان تو لیا میں نے اپنا قصور۔" وہ ڈھٹائی سے بولتا ہوا سلاخوں سے پیچھے ہٹ گیا تھا۔ میں اس پر نفرت بھری نظر ڈالتی باہر آ گئی تھی جہاں ڈی ایس پی صاحب میرے منتظر تھے۔

"ڈی ایس پی صاحب! میں نے ٹارگٹ کلنگ' چوری' ڈاکے' بوری بند لاشیں' یہ سارے ہی قصے سنے ہیں لیکن ایسی بربریت' ایسی سفاکیت اپنی نوعیت کا بالکل عجیب ہی کیس ہے یہ' آپ اس کے بارے میں کیا کہیں گے؟" میں نے ڈی ایس پی کو کریدنا چاہا۔

"میں نے اپنی زندگی میں اس طرح کا واقعہ پہلی بار دیکھا ہے' کفن چور' مردے کی ہڈیاں چوری کرنا اور اسی طرح کی اور بھی واردات تو میں نے دیکھی ہیں لیکن یہ......"

"یہ شخص کہیں پاگل تو نہیں ہے؟" میں نے ان کی بات کاٹی۔

"نہیں' یہ بالکل نارمل ہے' پہلے اپنے عیب چھپانے کی کوشش کرتا رہا' بعد میں اس نے اعتراف کر لیا۔"

"اچھا یہ بتایئے کہ آپ کا قانون اس کے لیے کیا سزا تجویز کرتا ہے؟"

"اس پر پہلی دفعہ 297 لگائی گئی ہے جو مردے کی بے حرمتی کرنے کی ہے جس کی سزا ایک سال ہے۔"

"صرف ایک سال؟" حیرت میرے چہرے پر نمایاں تھی۔

"جی' دوسری دفعہ اس پر 375 لگائی گئی ہے جو زنا بالجبر کے تحت ہے۔ تیسری دفعہ 377 اَن نیچرل یعنی انسان کی فطرت کے برعکس کام کرنے کی ہے اور چوتھی دفعہ 354 A ہے' اس میں خواتین کے ساتھ زبردستی کرنا شامل ہے۔"

واپسی کے سفر میں بہت سارے سوالات میرے دماغ میں کھولن پیدا کر رہے تھے۔

"کیا ریاض کو اپنے گھناؤنے کرتوت کی سزا ملے گی؟"

"کیا ہمارا قانون اندھا ہی رہے گا؟"

"ریاض جیسے گدھ نما انسان کب تک اپنا گھناؤنا کھیل کھیلتے رہیں گے؟"

"ایک ظالم درندے کی حرکت پر' ایک عورت کی آنکھوں سے پھوٹنے والی روشنی نے اس معاشرے کے گھناؤنے چہروں کو بے نقاب کر دیا ہے۔ یہ یقیناً اسی عورت کی سسکتی ہوئی روح ہے جس نے سینکڑوں سال پہلے اپنی عزت کو محفوظ رکھنے کے لیے محمد بن قاسم کو پکارا تھا اور جس کی روح آج ہمارے جاگیردارانہ معاشرے میں بھٹکتی پھر رہی ہے جہاں ہر روز زندہ خواتین کے ساتھ وہی سلوک ہوتا ہے جو مردہ خواتین کے ساتھ اس بد بخت ریاض نے کیا۔ جاگیردار اور وڈیرے خواتین کو کاروکاری کے نام پر قتل کروا دیتے ہیں' باپ اور بھائی غیرت کے نام پر خواتین کے خون سے ہاتھ رنگنے سے دریغ نہیں کرتے اور جن کے پاس یہ مواقع نہ ہوں' وہ اپنی ہوس مردہ خواتین کی حرمت کو پامال کر کے پوری کر دیتے ہیں۔

یاالٰہی! اب محمد بن قاسم کے روپ میں کون نمودار ہوگا جو آج کی زندہ خواتین کے ساتھ ساتھ مردہ خواتین کی عزتوں کا محافظ بنے گا؟

☆......☆......☆

یہ کیسا کاروبار ہے؟

اس اندھیری رات میں ہر سو سناٹا تھا۔ کہر اس قدر گہری تھی کہ قبرستان میں درختوں کے جھنڈ بھی واضح دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ یوں معلوم ہوتا تھا لمبے قد کی بلائیں بانہیں پھیلائے کھڑی ہیں۔ بھٹائی آباد کورنگی کے قبرستان کی چار دیواری کے باہر داخلی دروازے پر پولیس موبائل کھڑی تھی۔ یہ پولیس اہلکار جو معمول کے گشت پر تھے' قبرستان کے قریب ستانے کے لیے رک گئے تھے۔ اس وقت ڈرائیور اسٹیرنگ پر سر رکھے اونگھ رہا تھا جبکہ پچھلی سیٹ پر بیٹھے دو سپاہی اپنے اپنے موبائل فون سے کھیل رہے تھے۔

''اوئے یار اکرم' ایک سگریٹ تو پاس کرنا.....'' کانسٹیبل انور نے پلے لسٹ سے اپنا پسندیدہ گانا پلے کرتے ہوئے کہا۔ کچھ ہی دیر میں ''منی بدنام ہوئی ڈارلنگ تیرے لیے'' رات کی خاموشی کا گلا گھونٹتا پولیس موبائل میں گونجنے لگا۔

''تجھ سے کہا ہے ایک سگریٹ پاس کر، تیری سمجھ میں نہیں آتا؟'' کانسٹیبل انور نے قہر آلود نظر موبائل پر انگلی چلاتے کانسٹیبل اکرم پر ڈالی۔

''یار' صبر کر' میری والی کا میسج آیا ہے۔ ذرا جواب دے دوں۔'' کانسٹیبل اکرم پھر موبائل پر جھک گیا۔

''دیتا ہے کہ ایک کنپٹی کے نیچے دوں؟'' کانسٹیبل اکرم نے آگے بڑھ کر اس کا دایاں ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا تو وہ اچھا' اچھا کر کے رہ گیا۔

''یہ لے۔'' اکرم نے سگریٹ کا پیکٹ انور کی جانب اچھالا۔

''اور ماچس تیرا باپ دے گا؟''

''یار' تو ماچس سے سگریٹ جلائے گا یا آگ لگائے گا؟'' سائیڈ پاکٹ سے ماچس کی ڈبیا نکال کر وہ اس کی طرف بڑھا چکا تھا اور اب سیٹ پر پیر پھیلا کر لیٹ گیا تھا۔ اس کا بایاں ہاتھ اس کے سر کے نیچے تھا جبکہ دائیں ہاتھ سے وہ مسلسل میسج ٹائپ کر رہا تھا۔

''یہ بھارتی حسینائیں اپنی سندرتا سے لوگوں کو خوب پاگل بناتی ہیں۔'' انور نے خیال میں آئی رقص کرتی ماڈل کو سگریٹ کے دھوئیں میں اڑاتے ہوئے کہا تو کانسٹیبل اکرم پہلو بدل کر رہ گیا۔

''ہائے کیا یاد دلا دیا تو نے اس وقت، ارے نشہ کہو میرے یار' نشہ۔'' بے چینی کانسٹیبل اکرم کو بیٹھنے پر مجبور کر گئی۔

''یار رات کو جو ملزم تفتیش کے لیے دیا تھا' سالے کو خوب مار لگائی لیکن وہ بھی بڑا پکا نکلا' ابھی تک کچھ اگل نہیں رہا۔'' کانسٹیبل اکرم نے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔

''ابے گھامڑ' ملزم سے پیار سے بھی ڈیل کر لیا کر کبھی کبھی' ملزم سے جتنا پیار کرے گا' اس کے وارث پیسے بھی زیادہ دیں گے۔ کبھی ہمارا والا نسخہ بھی آزما لیا کر۔''

''اچھا؟'' اکرم نے بے ساختہ کہا۔

''لڑکی کے اغوا میں کیماڑی سے ملزم آیا تھا میرے پاس۔ اس ملزم کا میں اتنا بڑا ہمدرد بن گیا کہ سالہ خود ہی مجھے لڑکی کے پاس لے گیا۔ لڑکی بھی برآمد کر لی میں نے اور ملزم کے گھر والوں سے ڈھائی لاکھ روپے بھی جھاڑ لیے، لڑکی کو بھی سمجھا بجھا کر اس کے گھر بھیج دیا۔ بڑی آئی تھی عشق لڑانے۔''

''اوئے ہوئے استاذ' مان گئے تمہیں۔'' کانسٹیبل اکرم نے کانسٹیبل انور کے کندھے کو تھپتھپایا۔

''چل' بہت ہوئی' ایک چکر باہر کا لگا کر آ۔'' کانسٹبل انور نے آنکھیں دکھائیں۔

''یار' یہ وقت حشرات الارض اور کتوں کے راج کا ہے اور مجھے تو یقین ہے بڑی بڑی

چمگادڑیں ابھی اس وقت..... ”اکرم نے جملہ ادھورا چھوڑا اور منہ بگاڑ کر جیب سے ٹارچ نکالنے لگا۔

”ارے، تو بھی تو انہی میں سے ایک ہے۔ چل جا کر جائزہ لیتے ہیں پھر آگے بڑھتے ہیں۔“ کانسٹیبل انور نے جمائی لیتے ہوئے کہا۔

”میں تو نائٹ ڈیوٹی کے خلاف ہوں۔ مجھے بھیج بھی کہاں رہا ہے۔ قبرستان میں اگر کوئی مردہ چلتا پھرتا نظر آیا تو میرے مردہ بننے میں کتنا ٹائم لگے گا؟“ کانسٹیبل اکرم نے بڑبڑاتے ہوئے موبائل سے چھلانگ لگائی۔ بیلٹ کو اپنی موٹی سی توند پر درست کیا جیکٹ میں پستول کی موجودگی کو چیک کرتا ٹارچ کی روشنی میں قبرستان کے داخلی دروازے سے اندر داخل ہوگیا۔

”صاحب، سب خیریت تو ہے ناں؟“ چوکیدار کانسٹیبل اکرم کی جانب بڑھا۔

”ہاں، ہاں، ذرا ایک چکر لگا کر آتا ہوں۔“ کانسٹیبل اکرم قبرستان کی حدود میں داخل ہوگیا۔

O......O......O

سردی اپنے پورے شباب پر تھی۔ ایک عجیب سی اداسی وحشت اور ویرانی دل کے ڈر کو بڑھا رہی تھی مگر وہ نڈر تھا۔ مضبوط قدموں سے قبروں کو پھلانگتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں پلاسٹک کا بیگ تھا جسے مضبوطی سے تھامے وہ ذہن نشین رستوں کو کھوج رہا تھا مگر خالی ذہن مستقل مایوسی کے سگنل دے رہا تھا مگر وہ مایوسی کو پرے کرتا، دھندلی، دھندلی موہوم سی امید کی کرنوں کے سہارے آگے بڑھ رہا تھا۔ اس نے اپنے خالی ذہن پر زور ڈالا اور الجھن بھرے قدم اٹھاتا دائیں جانب مڑ گیا۔ قطار سے بنی قبروں میں اس کی مطلوبہ قبر آٹھویں نمبر پر تھی۔ اگلے ہی لمحے اس نے اطمینان بخش سانس لیا اور قبروں کی گنتی کرتے ہوئے آٹھویں قبر پر رک گیا۔ اس قبر کے کتبے پر مٹی کی تہہ جمی ہوئی تھی اور جن خاردار جھاڑیوں نے قبروں کو اپنی آغوش میں لیا ہوا تھا ان پر مکڑی کے جالے تنے ہوئے تھے۔ ایک پل کے لیے وہ چکرا سا گیا۔ باہر کا ماحول اور دل کا ڈر اسے وحشت زدہ سا کرنے لگا مگر وہ اس سنہرے موقع کو تاریکی کے عمیق گڑھے میں دفن نہیں کرنا چاہتا تھا' سو وہ ہمت کر کے آگے بڑھا۔ سخت سردی

کے باوجود اس کے جسم پر پسینے چھوٹ رہے تھے۔ اس نے آناً فاناً پلاسٹک کے بیگ سے اوزار نکالے اور جھاڑیاں کاٹنی شروع کر دیں۔ کچھ ہی دیر میں وہ قبر کا بھی پیٹ چاک کر چکا تھا۔ گوشت پوست کا انسان مردہ اور پھر مردہ ڈھانچے میں کیسے تبدیل ہو جاتا ہے؟ یہ سوچ اس کے دماغ میں کھولن پیدا کر رہی تھی مگر اسے اس بات کی زیادہ خوشی تھی کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہونے جا رہا ہے۔ انسانی ہاتھ اور ٹانگوں کی ہڈیاں اس نے تیزی سے پلاسٹک کے تھیلے میں ڈالیں۔ کھوپڑی کا زیادہ تر حصہ حشرات الارض کی غذا بن چکا تھا اس لیے اس نے اب قبر کو بند کرنے کا فیصلہ کیا۔ تیزی سے قبر بند کرتا اب وہ اپنے کرتے کی جیب سے ایک پلاسٹک کا پیکٹ نکال رہا تھا جس میں سفید رنگ کا سفوف تھا۔ اس نے وہ سفوف ہڈیوں پر ڈالا تاکہ ان ہڈیوں سے بدبو نہ اٹھے۔ اس کا کام ابھی مکمل نہیں ہوا تھا۔ ابھی اسے دو اور ایسی ہی قبروں کی تلاش لینی تھی۔ قبر کی کھدائی سے لے کر ہڈیاں نکالنے تک کے عمل نے اس کی ہمت باندھ رکھی تھی۔ اب وہ مزید وقت برباد نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ اپنے دوست ناصر کے بتائے اور سمجھائے گئے راستے پر دوبارہ اپنے قدم بڑھا چکا تھا۔ وسیع العریض رقبے پر پھیلا یہ قبرستان بہترین پناہ گاہ بھی تھی۔ برگد کے بڑے بڑے درختوں کے سائے میں بنی قبروں کا آپریشن کوئی مشکل امر نہیں تھا۔ بس اندر کے ڈر اور پر اسراریت بھرے ماحول میں کتوں کے بھونکنے کی آوازوں پر دل کو قابو میں رکھتے ہوئے ان درختوں کی آڑ میں چھپنا اصل مہارت کا کام تھا ورنہ اگر کتوں کو اس کی موجودگی کا علم ہو جاتا تو وہ اس کی بوٹی بوٹی کرنے میں دیر نہیں لگاتے۔ اس کے نزدیک ماورائی واقعات ذہن کی اختراع تھی۔ وہ سمجھتا تھا کہ مردہ لوگوں کی روحیں، انسانوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتی ہیں اور پھر ڈھانچہ وہ تو خود مثال عبرت ہے۔ وہ کیا مجھے کچھ کہے گا؟

گہرے سناٹے میں وہ کیڑے مکوڑوں اور جھینگروں کی آوازیں سنتا بڑھ رہا تھا اور پھر اس کے چہرے پر ایک فتح آمیز مسکراہٹ آ گئی۔ اس کی بے چین روح کو ایک اور قبر کا نشان مل گیا۔ وہ اس وقت قبر کے کیڑوں سے زیادہ خطرناک بن چکا تھا۔ یقیناً روحیں اپنی پنہائیوں کا یہ حال دیکھ کر تڑپ رہی ہوں گی اور سوچ رہی ہوں گی لوگ جس زندگی کو بدترین حالات

اور حادثات کہہ کر پکارتے ہیں' وہ یہ نہیں جانتے کہ اصل میں زندگی اتنی بری نہیں وہ تو خود اپنے ہاتھوں سے اپنی زندگیوں میں زہر گھول رہے ہیں۔ شاید وہ یہ بھول گئے۔ ایک دن ان کا مقام آخر بھی یہی قبر ہے' یہی حشر ہے۔

بالآخر اپنی مطلوبہ قبر کو اس نے کسی مشاق گورکن کی طرح کھولا مگر.. گلے ہی لمبے چیخیں اس کے گلے میں دم توڑ چکی تھیں۔ قبر میں مردے کا ڈھانچہ لیٹا ہوا نہیں تھا بلکہ بیٹھا ہوا تھا۔ اسے لگا قبرستان کی زمین نے اس کے قدموں کو جکڑ لیا ہے۔ اس نے ہاتھ میں پکڑے پلاسٹک بیگ کو مضبوطی سے سینے سے لگایا اور اپنے قدموں میں بجلی بھرنے کی کوشش کی۔ ایک ہاتھ اپنے منہ پر رکھے چیخ کو دبانے کی سعی کرتا تو کبھی پسینے سے آلود کرتے کو جھٹکتا وہ قبرستان کے داخلی دروازے کی طرف تیزی سے بھاگا۔

O......O......O

''ارے یار' یہاں نہ آدم ہے نہ آدم زاد، سوائے چوکیدار کے۔'' کانسٹیبل اکرم نے ٹارچ کی روشنی پولیس موبائل میں بیٹھے کانسٹیبل انور کے منہ پر ڈالی تو وہ الجھ گیا۔

''تو کیا اس کا تعلق دوسری مخلوق سے ہے؟ تو صحیح سے چیک کر کے آیا ہے نا یا پھر موبائل پر محبوبہ کو جھینگروں کی آواز سناتا رہا ہے۔ گزشتہ بیس منٹ سے تیرا نمبر بزی مل رہا ہے۔ سالا' یہ پیکیج سسٹم والوں نے سب کا بیڑہ غرق کیا ہوا ہے۔'' کانسٹیبل انور خفگی سے بولا۔

''مم..... مم......''

''ارے' اپنی میں .... میں بند کر۔ زیادہ ہوشیاری دکھائی تو یہ پولیس کی وردی اتار کر مجرموں والا سلوک کروں گا تیرے ساتھ۔'' کانسٹیبل انور نے اسے آنکھیں دکھائیں۔

''یار' بولے چلا جا رہا ہے۔ سمجھا کر۔'' کانسٹیبل اکرم نے آنکھ مار کر کانسٹیبل انور کو رام کرنے کی کوشش کی۔

''چل جا کر ڈرائیور کو ہلا، صبح کے چار بجنے والے ہیں۔ کسی ہوٹل پر چل کر چائے پیتے ہیں۔ کم بخت، مچھروں نے کاٹ کاٹ کر منہ سجا دیا ہے۔'' انور نے تڑی دیتے ہوئے کہا اور پھر اکرم کے گاڑی میں بیٹھنے اور ریورس کرنے تک انور کا موڈ آف رہا۔

ایک تو سردی کے مارے برا حال دوسرا اکرم کا لاابالی پن۔

"تو نیا نیا بھرتی ہوا ہے، کام میں دل لگائے گا تو بات بنے گی ورنہ کسی ہوٹل کا بیرا بن جا۔"

ایک بار پھر کانسٹیبل انور نے غصے سے اکرم کو گھورا اور منہ موبائل سے باہر نکال کر دور تک تھوکا۔

"ارے صاحب، یہاں دیکھیے، کوئی بھاگا ہے یہاں سے۔" ڈرائیور نے ایک جھٹکے سے گاڑی روک دی۔ ہیڈ لائٹ کی روشنی میں مشکوک حالت میں بھاگتا لڑکا صاف دکھائی دے رہا تھا اور پھر یکے بعد دیگرے وہ دونوں بھی موبائل سے چھلانگ لگا کر باہر نکل آئے۔ قبرستان کی حدود سے روڈ کراس کرتا نوجوان تیزی سے بھاگ رہا تھا۔ اس کے قدموں کی چال میں بجلی بھری تھی۔

"یہ کوئی وارداتی لگ رہا ہے۔ ہمیں دیکھ کر بھاگا ہے۔ یار، جلدی چل اس کا پیچھا کر۔"

"رک جا، ارے رکتا ہے یا نہیں؟" کانسٹیبل نے آواز لگائی اور پھر اکرم نے کانسٹیبل انور کو مخاطب کیا۔

"جب میں کہوں تو فائر کرنا اور پھر ایک فائر اس لڑکے کی ٹانگ چھوتا ہوا آگے نکل گیا پھر کانسٹیبل، لڑکے کے سر پر پہنچ گیا۔ اس نے پستول واپس بیلٹ میں پھنسائی اور گرے ہوئے نوجوان کو پکڑ لیا۔

"کون ہے؟ کیوں بھاگ رہا تھا؟" کانسٹیبل اکرم نے غصے سے اس کی کمر پر لات ماری۔ "اتنی رات کو قبرستان میں کیا کر رہا تھا؟" اس نے لڑکے کو گریبان سے پکڑ کر کھینچا۔

"کیا ہے اس تھیلے میں؟" کانسٹیبل انور نے اب لڑکے کے پاس سے برآمد ہونے والا پلاسٹک بیگ کھولا تو اس کے اوسان خطا ہو گئے۔ انسانی کھوپڑی ہاتھوں اور ٹانگوں کی ہڈیوں سے بھرے تھیلے سے عجب سی بساند اٹھ رہی تھیں۔" نوجوان کے چہرے پر خوف کے سائے تھے۔

"یہ تو قبر سے نکال کر لایا ہے؟" اکرم نے تھوک نگلتے ہوئے اس نوجوان کو دیکھا۔

"اور کون کون ہے تیرے ساتھ؟" انور نے ایک زوردار تھپڑ اس کے منہ پر رسید کیا مگر وہ بدستور خاموش ہی رہا۔

"نام کیا ہے تیرا؟ بتاتا ہے یا......؟" کانسٹیبل انور نے پستول اس کے سینے پر رکھ دی

تو وہ بمشکل بولا۔ ”مجید نام ہے میرا۔“

”اور کون ہے تیرے ساتھ؟“

”کک.... کک.... کوئی نہیں۔“ وہ رندھی آواز میں بولا۔

”چل پولیس اسٹیشن۔“ کانسٹیبل انور نے ہتھکڑی اس کے دونوں ہاتھوں میں لگائی اور پھر وہ دونوں اسے کھینچتے ہوئے پولیس موبائل تک لے آئے۔

O......O......O

مجید کو تھانے لاتے ہی تفتیش کا آغاز ہوا۔ مجید کی نشاندہی پر تین مقامات ایسے تھے جہاں پولیس نے چھاپے مارے اور ملزم حیات، مانی اور رزاق کو گرفتار کرلیا گیا۔ ان تینوں کا تعلق سرائیکی علاقوں سے تھا۔

”کیوں بے' جلدی جلدی سب کچھ بتادو۔ کیا دھندا کرتے ہو تم لوگ؟“ سب انسپکٹر عزیز غصے سے دہاڑا۔

”کوشش کرو کہ مجھے چھترول نہ کرنی پڑے، ایک لفظ بھی جھوٹ بولا تو نانی یاد کرا دوں گا۔ بول بے' مردے کی ہڈیاں کیا اپنی ماں کے لیے لے جا رہا تھا؟“ ایک زوردار تھپڑ مجید کے منہ پر پڑا۔

”چل شاباش' ایک ایک کرکے تم سب بولتے جاؤ۔“

”مجید مجھ پر جھوٹا الزام لگا رہا ہے، میرا ان لوگوں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔“ ملزمان میں سے رزاق بولا۔ اس کے چہرے پر دہشت کے سائے نمایاں تھے۔

”کیوں بے' جھوٹا نام اس کا کیوں لے رہا ہے؟“ انسپکٹر عزیز نے مجید کو گھورا۔

”نہیں صاحب' میں جھوٹ نہیں بول رہا۔ اس کے گھر کی آپ تلاشی لیں۔ صحن میں رکھے ڈرم سے وہ ساری ہڈیاں برآمد ہوجائیں گی جو ہم چاروں کی ایک ہفتے کی محنت ہے۔“

”اور تم دونوں بھی یہی گھناؤنا کام کرتے ہو؟“ سب انسپکٹر عزیز نے حیات اور مانی کی جانب خونخوار نظروں سے دیکھا۔

”صاحب' یہ لوگ ہمارے ساتھ زبردستی کرتا ہے۔ ہم ضرورت مند تھا' بس انہوں نے

زبردستی ہمیں اس کام میں لگا دیا۔" حیات رندھی ہوئی آواز میں بولا۔

"کیا کرتے ہو تم لوگ ان انسانی ہڈیوں کا؟"

"یہ ہڈیاں جادو ٹونے اور عطائیوں اور عاملوں کو سپلائی کرتے ہیں۔ وہ لوگ ان سے نسخے تیار کرتے ہیں۔" دوسرا ملزم مانی بتا رہا تھا۔

"تم لوگوں کے ساتھ اور کون شامل ہے؟" سب انسپکٹر نے پھر سوال کیا۔ اب کی بار لہجے میں کچھ نرمی کا عنصر تھا۔

"ہمارے لوگ پورے پاکستان میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ہم پشاور سے کراچی تک سینکڑوں قبروں سے مردوں کی ہڈیاں نکال چکے ہیں۔"

"کیا.....؟" سب انسپکٹر کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

"اوئے تُو بتا، یہ جو تُو آج ہڈیاں چرا کر لے جا رہا تھا' اس کا کیا کرتا؟" کانسٹیبل انور نے مجید کو گریبان سے پکڑا۔

"صاحب' مجھے ایک بڑا کانٹریکٹ ملا ہے۔ میں یہ ہڈیاں ایک نجی اسپتال میں سپلائی کرتا ہوں۔ وہاں یہ میڈیکل کے اسٹوڈنٹس کے کام آتی ہیں۔" مجید کی خوف سے گھگھی بندھی ہوئی تھی اور وہ آہستہ آہستہ بتا رہا تھا۔

"بے رحم کہیں کا۔" سب انسپکٹر نے اسے گھورا۔

"اور تُو کیوں خاموش کھڑا ہے۔" اب سب انسپکٹر نے رزاق کو جھنجوڑا۔

"بتا' ڈرم میں اتنی تعداد میں جو ہڈیاں جمع ہیں' اس کا کیا چکر ہے؟"

"یہ ہڈیاں زیادہ تر جادو ٹونہ کرنے والے عاملوں کی مانگ ہے۔ ان کی خواہش تو ہوتی ہے کہ انہیں تازہ مردوں کی ہڈیاں ملیں تاکہ وہ مریض کے سامنے ہڈی سے گوشت اتاریں، ایسا کرنے سے مریض کے ورثا منہ مانگے دام دیتے ہیں۔" یہ بتاتے ہوئے رزاق کا سر جھک گیا۔

"چل تُو بھی شروع ہو جا؟" سب انسپکٹر عزیز نے حیات کے کندھے پر رائفل کا بٹ مارتے ہوئے کہا۔

"انسپکٹر صاحب' دراصل ان عاملوں کو بے اولاد خواتین سے جادو ٹونہ اور مختلف نسخوں

کے بہانے سے منہ مانگے دام مل جاتے ہیں۔ خواتین کی ہڈیاں زیادہ قیمتی ہوتی ہیں۔ یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ان سے بے اولاد خواتین کا علاج معالجہ اچھا ہو جاتا ہے۔'' حیات نے بہ مشکل اٹکتے اٹکتے جواب دیا۔

''یہ کھوپڑی اور ہڈیاں قبروں سے نکالتے ہوئے تمہاری کھوپڑی میں یہ نہیں آیا کہ یہ کتنا شیطانی کام ہے؟'' سب انسپکٹر نے مجید کو گھورا اور پلاسٹک بیگ میں سے انسانی کھوپڑی اور ہڈیاں نکال کر میز پر رکھنے لگا۔

''صاحب' بتایا نا' ہم مجبور ہے بہت، یہ سب کچھ ہم پیٹ کے لیے کرتا ہے۔ اپنے بچوں کو پالنے کے لیے کرتا ہے۔ اب ہم کیا کریں' انسانی کھوپڑی کی ڈیمانڈ بھی تو بہت ہے۔ جن بھوت اتارنے کے لیے عامل اس کو ہاتھوں ہاتھ خرید لیتے ہیں۔ انسانی کھوپڑی اور بچوں کی ہڈیاں ہم سے ڈیمانڈ پر منگوائی جاتی ہیں۔'' حیات نے تفصیل بتائی۔

''قبروں کی نشاندہی کون کرتا ہے؟ تم لوگوں میں سے کون اس کام کا ماہر ہے؟'' سب انسپکٹر کا چہرہ غصے سے لال تھا۔

''گورکن قبروں کی نشاندہی کرتا ہے۔ سب سے زیادہ اندرون سندھ کے قبرستان سے ہڈیاں چرائی جا چکی ہیں۔ ہم اس کام کے لیے گورکن کو بھی بھاری رقم دیتے ہیں۔'' حیات نے خوف زدہ نظروں سے اپنے ساتھیوں اور پھر سب انسپکٹر کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''تم لوگوں کے بقیہ ساتھی کہاں کہاں رہائش پزیر ہیں؟'' سب انسپکٹر نے اب مجید پر قہر آلود نظر ڈالی۔

''ہم ٹوٹل بیس کے قریب لوگ ہیں مگر سب کے ٹھکانے ہمیں نہیں پتا اور میں تو بالکل نیا ہوں۔ صاحب جی' بہت مجبور۔'' مجید نے سب انسپکٹر عزیز کو نظر بھر کر دیکھا اور پھر سر جھکا لیا۔

''ایسی بھی کیا مجبوری ہے تم لوگوں کے ساتھ جو اتنا شیطانی مکروہ کام انجام دے رہے ہو۔''

''ہم سب نشہ کرتے ہیں اور اس نشے نے ہمیں یہ کام کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔'' رزاق نے اپنے کرتے کے دامن سے آنکھوں میں آئی نمی صاف کرتے ہوئے کہا۔

''لیکن صاحب' میں ایسا نہیں، میں تو تلاش معاش کی خاطر در بدر بھٹک رہا تھا۔ ان

لوگوں نے مجھے اس کام کے لیے مجبور کر دیا۔ دولت کمانے کی ہوس مجھے قبرستان تک لے گئی۔" مجید منمنایا۔

"لے جاؤ ان سب کو اور بند کر دو۔" سب انسپکٹر عزیز دونوں ہاتھوں سے سر تھامے کرسی پر ڈھے گیا۔

O......O......O

قارئین! ملزمان گرفتار ہو گئے ہیں۔ انہوں نے اعتراف جرم بھی کر لیا ہے لیکن ہمارے ملک کے رائج الوقت قانون میں ایسا کون سا قانون ہے جس کے تحت ان ملزمان کو نشان عبرت بنا دیا جائے گا؟ ہمارے معاشرے میں انسانی مردے کی ہڈیاں فروخت کرنے والا کوئی قانون وضع نہیں کیا گیا۔ ہاں' موجودہ قانون کے تحت ان ملزمان کو چوری کی سزا دی جا سکتی ہے جو سات سال کی قید سے زیادہ نہیں ہے۔ اگر ملزمان سزا کے مستحق ٹھہرائے گئے تو پھر یہ چند سال بعد معاشرے کا حصہ ہوں گے اور شاید وہ دوبارہ پورے پورے مردے فروخت کر رہے ہوں گے؟

انسانی ہڈیوں کا کاروبار کرنے والے اس کتے سے سبق سیکھیں جو اپنے ساتھی کتے کی موت پر آنسو بہاتا ہے مگر اس کا گوشت نہیں کھاتا لیکن آج کا انسان اپنے جیسے انسان کا گوشت کھانے سے بھی گریز نہیں کرتا۔ اپنی ضروریات کی تکمیل کے لیے کہیں مردے جلائے جاتے ہیں تو کہیں ان کی ہڈیاں نسخوں اور ادویات کے بہانے استعمال کرنے کے لیے چرائی جا رہی ہیں۔ یہ زندہ و جاوید انسانوں کا زندہ کارنامہ ہے جس کی وجہ اس کی معاشرتی ضرورتیں ہیں اگر اس بدترین صورت حال پر قابو نہ پایا گیا تو وہ دن دور نہیں جب انسان، انسان کا گوشت کھانے سے بھی دریغ نہیں کرے گا۔ گزشتہ سال لیہ میں ایک ایسا دلدوز واقعہ پیش آچکا ہے جب ایک آدم خور خاندان قبروں سے مردے نکال کر پکا کر کھاتا رہا ہے۔ غربت اور افلاس کے اس دور میں اب کوئی بعید نہیں رہی کہ لوگ عملی طور پر ایک دوسرے کا گوشت نوچنے پر آمادہ نہ ہو جائیں!!

☆......☆......☆

جینے کا حق ادا کر دیا

وہ اتنی تیزی سے بھاگ رہا تھا جیسے اس کی چال میں بجلی کوندگئی ہو۔ پاک کالونی کی مختلف گلیوں کو عبور کرتا ہوا وہ تیزی سے آگے بڑھ رہا تھا۔ اس کے پیچھے فائر کرتے لڑکے اس کے تعاقب میں تھے۔ وہ بہت مضبوط اعصاب کا لڑکا تھا' موت اس کے تعاقب میں تھی اور وہ زندگی کو بچانے کی کشمکش میں دلیری اور چابک دستی سے بھاگتا چلا جا رہا تھا۔

''ارے' تیزی سے بھاگو..... الٹے ہاتھ کی گلی میں مڑ گیا ہے وہ.....'' یہ جملہ اس کے کانوں میں بم کی طرح بلاسٹ ہوا' اس نے اپنے بھاگتے قدموں کو بریک لگائے اور سیدھے ہاتھ کی طرف مڑ گیا۔ فائرنگ کی آوازیں مسلسل گونج رہی تھیں۔ علاقہ مکین اپنے اپنے گھروں میں مقید تھے۔ لمحہ بھر اس نے اطراف کا جائزہ لیا اور پھر تیزی سے سامنے والے گھر کے ادھ کھلے دروازے کو دھکیلتا اندر داخل ہو گیا۔

''کک.... کون ہو تم؟ نکلو یہاں سے....'' تیس سالہ خاتون اپنی چیخ دباتی اسے ہراساں نظروں سے دیکھ رہی تھیں.... ''میں نے کہا' نکل جاؤ یہاں سے ورنہ ابھی میں شور مچا دوں گی۔'' وہ پریشان کن انداز میں اس سے مخاطب تھیں۔

''دیکھیے' اس وقت میں آپ کی مدد کا طلب گار ہوں' آپ بس مجھے پندرہ بیس منٹ دے دیجیے' میں خود ہی یہاں سے چلا جاؤں گا۔'' وہ سرعت سے دروازہ بند کرتا اب اپنی پشت دروازے سے لگائے کھڑا تھا۔

''ابھی فوراً نکلو یہاں سے' میں کچھ نہیں جانتی۔'' وہ خاتون تیزی سے اس کی جانب بڑھیں اور دروازہ کھولنے لگیں مگر فائرنگ کی آواز سے یکدم ٹھٹک کر رک گئیں۔

''دیکھیے' میرے حال پر رحم کیجئے' یہ لڑکے مجھے اغوا کرنے کی کوشش میں ہیں' میں اپنی جان بچا کر بھاگا ہوں۔ محترمہ' مجھے کچھ وقت دے دیجئے' یقین جانیے' آپ میری بہن جیسی ہیں۔'' وہ الجھن بھرے انداز میں آہستہ آہستہ بول رہا تھا۔

''اچھا ٹھیک ہے' یہاں آجاؤ۔'' وہ خاتون اسے صحن سے ملحقہ کمرے میں لے گئی تھیں۔

''بہن' میرا نام شاہ زیب ہے' ہم پانچ لڑکوں کو مختلف مقامات سے اغوا کیا گیا تھا اور ایک ایک کر کے میرے ساتھ کے لڑکوں کو تشدد کا نشانہ بنا کر مختلف مقامات پر پھینک دیا گیا۔'' یہ بتاتے ہوئے اس کے پورے بدن پر لرزہ طاری تھا۔'' آج میری باری تھی' مجھے موقع مل گیا تو میں بھاگ کھڑا ہوا۔'' شاہ زیب کے اعصاب ابھی تک منتشر تھے۔

''لیکن اگر وہ تمہیں ڈھونڈتے ہوئے یہاں تک پہنچ گئے تو؟'' وہ خاتون اب تھر تھر کانپنے لگیں' شاید خوف کا' دہشت کا نادیدہ ہاتھوں کا ڈر ان پر طاری ہو چکا تھا۔

''بہن....! آپ تسلی رکھیے' مجھے یقین ہے' وہ یہاں تک نہیں پہنچ سکیں گے۔'' شاہ زیب قدرے سپاٹ لہجے میں گویا ہوا۔

''اللہ کرے' ایسا ہی ہو۔'' وہ خاتون دل ہی دل میں سرزنش کرتی بیڈ کے کونے پر ٹک گئیں۔ ان کے تینوں بچے گہری نیند سو رہے تھے اور اس طرح کی سچویشن میں وہ یقیناً رو رو کر گھر سر پر اٹھا لیتے۔

''بہن.....! آپ کا نام کیا ہے؟'' شاہ زیب نے نرمی سے پوچھا۔

''شوکت بی بی.....!''

''ایک گلاس پانی مل جائے گا؟'' وہ اب سینے پر ہاتھ رکھے اپنی منتشر سانسیں بحال کر رہا تھا۔

''ہاں' ہاں' ضرور۔'' وہ کچھ پریشان سی باورچی خانے کی طرف بڑھ گئیں۔

"یہ لیجیے۔" پانی کا گلاس وہ شاہ زیب کی طرف بڑھاتے ہوئے دل ہی دل میں اس کی جرات اور حوصلہ مندی کی داد دے رہی تھیں۔

"شکریہ' ایک گلاس اور ملے گا؟" پانی نے فوری توانائی کا کام کیا تھا جبھی اس کی آواز میں جان سی پڑ گئی۔

"جی ضرور' معاف کیجیے گا میں آپ سے پانی کا پوچھ نہیں سکی۔" وہ متانت سے کہتی ہوئیں دوبارہ باورچی خانے کی طرف بڑھ گئیں۔

اگلے ایک گھنٹے میں گلی کی رونقیں واپس لوٹ آئیں۔ تڑتڑاتی گولیوں کی آوازوں نے علاقے کے جن مکینوں کو بدحواس کردیا تھا' اب ان کے چہروں پر زندگی کی رمق لوٹ آئی تھی۔ اس دوران میں شاہ زیب کو یہ ضرور معلوم ہوگیا تھا کہ شوکت بی بی کا گزارا بہت تنگدستی سے ہورہا تھا۔ ان پر چھ ماہ کا کرایہ چڑھا ہوا تھا۔

"شکر ہے خدا کا' وہ لوگ آپ کو ڈھونڈنے میں ناکام رہے۔" شوکت بی بی آہستگی سے بولی تھیں۔

"جی...." وہ جیسے عالم خود فراموشی سے عالم خود شناسی میں آگیا۔" میں آپ کا یہ احسان کبھی نہیں بھولوں گا۔ اگر آپ آج میری مدد نہیں کرتیں تو یقین کریں' میری بوری بند لاش کسی جگہ پھینک دی جاتی' آپ نے میری جان بچائی ہے' میں آپ کا شکر گزار ہوں اور میری پوری کوشش ہوگی آپ نے جو مجھ پر احسان عظیم کیا ہے' میں اس کو اتار دوں بشرطیکہ یہاں سے نکلنے کے بعد بھی یہ زندگی مجھ سے وفا کرتی ہے تو میں اپنا وعدہ ضرور پورا کروں گا ورنہ آپ مجھے معاف کردیجیے گا۔" شاہ زیب صحن عبور کرتا اب داخلی دروازے کی طرف بڑھ رہا تھا۔

"بھائی....! اپنا خیال رکھنا۔" شوکت بی بی گھر کا دروازہ کھولے اسے رخصت کررہی تھیں اور شاہ زیب بشرط زندگی دوبارہ آنے کا وعدہ کرتا باہر پھیلی اندھیرے کی چادر میں گم ہوگیا۔

O......O......O

ایک صبح شاہ زیب کی دوبارہ اپنے گھر آمد پر شوکت بی بی اسے اپنی زندگی کی یہ کہانی سنا رہی تھیں..... ایک روز میرے میاں رفیق نے مجھے آ کر کہا۔

"جانتی ہو پی ٹی سی ایل کو پرائیویٹائز کر دیا گیا ہے اور ہم سب کو ادارہ گولڈن ہینڈ شیک کے ذریعے ڈبل رقم دے رہا ہے یعنی اگر میں گولڈن ہینڈ شیک کے ذریعے ریٹائرمنٹ لیتا ہوں تو مجھے سولہ سترہ لاکھ گریجویٹی مل جائے گی۔" چالیس سالہ رفیق اپنی بیوی شوکت بی بی سے مخاطب تھا۔

"سولہ سترہ سال کی سروس پر سولہ سترہ لاکھ....." شوکت بی بی کی آنکھیں حیرت سے پھٹ گئیں۔

"ہاں میں تو سوچ رہا ہوں ریٹائرمنٹ لے کر اپنا بزنس شروع کر دوں۔ یقین کرو اس سے ہماری تینوں اولادوں کی زندگی سنور جائے گی۔ اللہ نے ہمیں دو بیٹوں سے نوازہ ہے۔ ماشاءاللہ آگے چل کر میرا بزنس یہ دونوں سنبھال لیں گے پھر چین سکھ کی زندگی گزاروں گا۔" رفیق کی آنکھوں میں مستقبل کے سہانے خواب تھے۔

"جیسے آپ کو بہتر لگے بس مجھے تو اپنی اکلوتی بیٹی کی فکر ستاتی ہے اس کے لیے میرے دل میں بہت ارمان ہیں۔ میرا خیال ہے اگر ہم بیٹی کے نام کچھ پیسے فکس کر دیں تو اس سے اس کی شادی کے وقت ہمیں ہی آسانی ہوگی۔" شوکت بی بی بڑے ہی رسان سے بولیں۔

"ارے ابھی تو وہ بہت چھوٹی ہے ایک بار میرا بزنس جم جائے پھر دیکھنا ہم اسے کیسے شان و شوکت سے رخصت کرتے ہیں۔ ابھی تو میرا سارا دھیان اپنے کاروبار پر ہے کہ میں کس طرح ریٹائرمنٹ کے بعد اپنے بزنس کی شروعات کرتا ہوں؟" رفیق کی پُرسوچ نظریں خلا میں کسی غیر مرئی نقطے کو گھور رہی تھیں۔

"آپ اللہ کا نام لے کر کام شروع کیجیے مجھے امید ہے آگے سب بہتر ہوگا یقیناً اضطراب پریشان کرتا ہے لیکن کوشش اور زندہ دلی اضطراب سے نکال بھی دیتی ہے۔ آپ قدم بڑھایئے میں آپ کے ساتھ ہوں۔" مستقبل کے سہانے خوابوں سے آباد شوکت بی بی نے بہت یقین اور اعتماد سے کہا..... اور یوں رفیق نے گولڈن ہینڈ شیک کی صورت ریٹائرمنٹ

کے بعد بھیم پورہ اولڈ سٹی ایریا میں جانوروں کا چارہ بنانے والی مشین لگائی۔

آہستہ آہستہ رفیق کا کاروبار بہتری کی طرف گامزن ہونے لگا' وہ روز بروز اپنے کاروبار کی ترقی پر بہت خوش تھا کہ اچانک ایک دن بھتہ خوروں نے اسے گھیر لیا اور بھتے کا مطالبہ کیا۔ اس نے انکار کیا تو جواب میں مار کٹائی شروع ہوگئی اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ رفیق اپنی جان بچانے کے چکر میں بھتہ خوروں کا منہ بند کرنے لگا اور یوں گزرتے وقت کے ساتھ رفیق کی مشکلات میں اضافہ شروع ہوگیا۔ کبھی چارہ رکھنے پر پڑوسیوں سے جھگڑا تو کبھی چارہ وقت پر نہ پہنچنے کی وجہ سے ڈیلر سے لڑائی جو تھوڑا بہت پرافٹ ہوتا' وہ بھتہ خوروں کی نذر ہوجاتا تو کبھی کسی نقصان کے ازالے کی صورت ختم ہوجاتا۔ رفیق کے دونوں بیٹے بھی اس قابل نہیں تھے کہ وہ اس کاروبار میں اس کا ہاتھ بٹاتے' پی ٹی سی ایل کی آرام دہ نوکری چھوڑ کر اب چارے کے کاروبار میں بری طرح پھنس گیا تھا۔ گزرتے وقت کے ساتھ حالات کی خرابی نے اس کے کاروبار کا بیڑہ غرق کر دیا تھا اور اب سوائے نقصان کے اسے کچھ بھی حاصل نہیں تھا۔

O......O......O

''میں بہت جلد اپنا یہ چارے والا کاروبار سمیٹ رہا ہوں۔'' رفیق نے بہت غور و فکر کے بعد اپنی بیوی کو یہ خبر سنائی۔

''ارے اتنے دن کی محنت آپ چار دن میں سمیٹنے کی بات کر رہے ہیں؟ اتنی جلدی نہیں کریں' کچھ صبر کریں۔ مجھے پوری امید ہے کہ گزرتے وقت کے ساتھ یہ ساری مشکلات دور ہوجائیں گی۔'' شوکت بی بی نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

''نہیں' مجھے نہیں لگتا ایسا ہو۔'' رفیق کا فرسٹریشن سے آباد لہجہ شوکت بی بی کی سماعتوں سے ٹکرایا۔

''اصل میں آپ ہمت ہار گئے ہیں۔ تھوڑی سی ہمت کریں۔''

''کتنی ہمت کروں' کب تک میں اپنے کاروبار کو اپنے لہو سے جلاتا رہوں گا؟ دل جلتا ہے میرا جب مفت خورے میری کنپٹی پر پستول رکھ کر مجھ سے ٹھیک ٹھاک پیسے لے جاتے ہیں'

مجھے اکیلا سمجھ کر فائدہ اٹھاتے ہیں' نقصان کرتے ہیں' اب میری اتنی استطاعت تو نہیں کہ میں چار پانچ ملازم رکھ سکوں۔'' آواز کا تعلق براہ راست دل سے ہوتا ہے جبھی رفیق کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔

'' آپ جذباتی ہو کر اپنا نقصان نہ کر بیٹھیں' میں بس اسی بات سے ڈرتی ہوں' اچھا خاصا کاروبار پھیلایا' اب اچانک ساری محنت پر پانی پھیرنا کہاں کی عقل مندی ہے' میری سمجھ میں تو یہ نہیں آ رہا کہ یہ کاروبار سمیٹنے کے بعد آپ کریں گے کیا؟'' شوکت بی بی کی آنکھوں میں سوال تھا۔

'' ہاں' یہ بات غور طلب ہے' میں بھی یہی سوچ رہا ہوں کہ مجھے اب کیا کرنا چاہیے؟ لیکن اس کاروبار سے چھٹکارہ حاصل کرنا تو بہت ضروری ہو گیا ہے اب کہیں کل پیسوں کے چکر میں بھتہ خور مجھے جان سے ہی نہ مار جائیں.....''۔ رفیق کی آنکھوں میں موت کا خوف نمایاں تھا۔

'' لیکن اس بار آپ ایک معقول رقم سیونگ ڈپازٹ کی شکل میں ہمارے لیے رکھیں گے۔'' شوکت بی بی نے سوالیہ نظروں سے رفیق کو دیکھا۔

'' دیکھتے ہیں' میں پوری کوشش کروں گا' میری ضرورتوں' امیدوں اور خواہشوں کا سلسلہ تو ایسے تھا ہے جیسے اب کچھ شروع ہی نہیں ہو سکے گا۔ شادی سے پہلے میرے کتنے ارمان تھے لیکن تم سے شادی کے بعد ضرورتوں کے انبار لگنا شروع ہو گئے اور پھر ایک کے بعد ایک بچے کی ولادت نے مجھے خواہشوں سے عاری کر دیا' میری ہر خواہش پس پشت جاتی رہی اور میں تمہاری اور بچوں کی ضرورتوں کو پورا کرتا گیا مگر اس بار میں اپنے مطلب کا کام ڈھونڈوں گا جس سے سکون قلب بھی حاصل ہو اور دولت کا راستہ بھی ہموار ہو۔'' رفیق کے انداز میں فکر تھی اور آواز میں تشویش۔

''اس کا مطلب آپ اپنے بارے میں سوچ رہے ہیں صرف؟'' شوکت بی بی نے بے ساختہ پلٹ کر دیکھا۔

'' ارے' تم سب بھی تو میرے ہو اور میری خوشی تم لوگوں کی خوشیوں میں ہے' بس دعا

کروں میں نے جیسا سوچا اور جیسا چاہتا ہوں سب ویسا ہی ہو جائے۔" رفیق نے ایک سرد آہ بھری اور شوکت بی بی کے سراپے سے اپنی نظریں ہٹالیں۔

O......O......O

"کیا کہا آپ نے چھ لاکھ؟" شوکت بی بی کی آنکھیں حیرت سے وا ہو گئیں۔

"ہاں میں نے ٹریول ایجنسی سے بات کر لی ہے یہاں سے یونان جانے میں چھ لاکھ کا خرچ آرہا ہے۔ میں نے ہامی بھر لی ہے ایک بار یونان چلا جاؤں پھر زندگی سنورنی شروع ہو جائے گی۔ مجھے لگ رہا ہے میری زندگی کا یہ فیصلہ ہمارے لیے سب سے زیادہ کارآمد ثابت ہوگا۔" رفیق کے چہرے سے خوشی نمایاں تھی۔

"سارے پیسے آپ اس ٹریول ایجنسی کی نذر کر کے یونان چلے جائیں گے اگر خدا نخواستہ وہاں سیٹ نہیں ہو سکے تو پھر؟"

"منہ سے اول فول مت نکالو...... میرا ایک دوست وہاں موجود ہے اس کے ساتھ اس کے بزنس میں پارٹنر شپ پر کام شروع کروں گا۔" خیالات کے تانے بانے بنتا رفیق شوکت بی بی کو راضی کرنے کی کوششوں میں جتا ہوا تھا۔

"آپ ہمیں اکیلا چھوڑ کر چلے جائیں گے کرائے کا گھر ہے ہمارا میں یہ سب کچھ اکیلے کیسے دیکھوں گی؟" شوکت بی بی کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

"اُفوہ...... بس دیکھتی جاؤ۔ دو تین مہینے کی بات ہے میں وہاں جاتے ہی تمہیں معقول رقم بھجوانا شروع کر دوں گا پھر ہمارے مسائل خود بخود حل ہونا شروع ہو جائیں گے۔"

"نہیں میرا دل نہیں مان رہا ہے بہت گھبرا رہا ہے جب اپنے ملک میں اپنوں نے ہمیں ڈسنے کی کوئی کسر نہیں چھوڑی تو پھر آپ بیرون ملک میں کیسے کس پر اعتبار کریں گے؟" شوکت بی بی کی آنکھوں سے آنسو تواتر سے بہہ رہے تھے مگر رفیق کی آنکھوں میں شاید سنہرے خوابوں کی چکا چوند تھی جبھی اسے بیوی اور تین بچوں کو اکیلا چھوڑ دینے پر ذرا بھی ملال نہیں تھا۔

O......O......O

"پھر اس کے بعد کیا ہوا' رفیق صاحب کیا فوراً ہی چلے گئے تھے؟" شاہ زیب نے شوکت بی بی کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا تھا۔

"جی' چلے تو گئے تھے مگر ایران سے جس کشتی کے ذریعے وہ یونان جا رہے تھے' آدھے راستے میں ہی اسے یونانی پولیس نے قبضے میں لے لیا تھا' کشتی میں سوار آٹھ دس افراد مارے گئے جبکہ رفیق سمیت کچھ افراد کو پولیس نے گرفتار کر لیا' بس وہ دن ہے اور آج کا دن' مصیبت ہمارا دروازہ تھام کر بیٹھ گئی ہے....." شوکت بی بی نے زاروقطار روتے ہوئے کہا تھا۔

"ارے' آپ تو بہت مخلص خاتون ہیں' جانتی ہیں آپ نے میری زندگی بچائی ہے۔ میں جس مکان کے تہہ خانے میں قید تھا' وہاں میرے جیسے تین افراد کو قتل کر کے بوری میں بند کر کے مختلف علاقوں میں پھینک دیا گیا۔ جس دن میرا نمبر تھا' اس دن میں اس تہہ خانے میں بنے روشن دان کو توڑ تا گلی میں چھلانگ لگا چکا تھا مگر بس بدقسمتی سے لڑکوں نے مجھے دیکھ لیا اور پھر بھاگتے بھاگتے میں ان گلیوں میں بھٹکتا آپ کے دروازے تک پہنچ گیا' یقین جانیے' آپ میری محسن ہیں' میں آپ کے لیے ایک کمرے کا مکان ڈھونڈ چکا ہوں' آپ فوراً وہاں شفٹ ہو جائیں تاکہ مکان کے کرائے کا بوجھ آپ کے اوپر سے اتر جائے' یہ چھوٹا سا کمرہ میری بہن کے گھر کا اوپری پورشن ہے' وہاں آپ کو میری بہن کی بھرپور مدد حاصل ہوگی۔" شاہ زیب انتہائی خلوص سے کہہ رہا تھا۔

"میں فیڈرل بی ایریا کا رہائشی ہوں۔ الیکٹرک سسٹم کا مکینک ہوں۔ مجھ سے جہاں تک ممکن ہوگا' میں آپ کی مدد کروں گا۔ آج کے بعد سے میں آپ کا حقیقی بھائی ہوں' جب بھی آپ کو کسی چیز کی ضرورت ہو' بلاجھجک آپ مجھ سے کہہ سکتی ہیں۔" ابھی یہ باتیں چل ہی رہی تھیں کہ شاہ زیب کے موبائل پر یہ اطلاع آئی کہ آپ کو تفتیش کے لیے پولیس' تھانے بلا رہی ہے۔ شاہ زیب جو کہ بازیاب ہوتے ہی پہلے ہی علاقہ مکین کے سوالوں سے ہراساں تھا' اب ایک بار پھر پریشان ہو گیا۔ وہ شوکت بی بی سے رخصت لے کر پولیس اسٹیشن پہنچا تھا۔

"کتنے لوگ تھے تمہارے ساتھ؟ اغوا کہاں سے ہوئے؟ حبس بے جا میں رکھنے کی مکمل

تفصیل سے ہمیں آگاہ کریں۔" یوں ایک گھنٹے کے سوال و جواب کے بعد شاہ زیب کو گھر جانے کی اجازت مل گئی۔

O......O......O

" بھائی' آپ نے آج کا اخبار دیکھا؟" کلثوم بھاگنے والے انداز میں کمرے میں داخل ہوئی تھی۔اس کے چہرے سے پریشانی ہویدا تھا۔

" کوئی خاص خبر؟" شاہ زیب نے برجستہ سوال کیا۔

" بھائی ....! بازیاب ہو جانے والے افراد سے وفاقی وزیر داخلہ ملاقات کرنا چاہتے ہیں۔"

" اوہ یعنی ایک امتحان کے بعد دوسرا امتحان؟" شاہ زیب نے چبھتی نظر سے اخبار کو دیکھا۔

" بھائی....! اب کیا ہوگا؟" کلثوم بھائی کی محبت سے لبریز لہجے میں پوچھ رہی تھی۔

" کچھ نہیں ہوگا' یقیناً یہ کڑا وقت بھی گزر جائے گا۔ محلے' رشتہ دار' گھر والوں کے بعداب وزیر داخلہ صاحب بھی مجھ سے پوچھ گچھ کریں گے تو کوئی بات نہیں۔ اگر خدانخواستہ میری لاش کسی گلی میں بوری سے برآمد ہوتی پھر؟ اف ..... میں وہ بھیانک منظر کبھی بھول نہیں سکتا جب وہ سفاک' شقی القلب لوگ ڈرل سے جسم میں سوراخ کرتے تھے....." ابھی شاہ زیب کی سوچ بھچار جاری تھی کہ شاہ زیب کے موبائل پر کال آئی تھی۔

" السلام علیکم!" شاہ زیب نے ان نون نمبر اٹینڈ کرتے ہوئے کہا۔

" میں محکمہ داخلہ سندھ کے آفس سے بات کر رہا ہوں' آپ شاہ زیب بول رہے ہیں؟"

" جی....!" اس نے مختصر سا جواب دیا۔

" کیا آپ کو ہی اغوا کیا گیا تھا؟" دوسری طرف سے پوچھا گیا۔

" جی میں ہی ہوں۔" اس نے آہستگی سے جواب دیا۔

" آپ سے وفاقی وزیر داخلہ بات کرنا چاہتے ہیں' آپ جتنی جلدی ہوسکے' سندھ سیکریٹریٹ میں وزارت داخلہ کے دفتر کرائسس مینجمنٹ سیل آفس میں آجائیں۔"

"جی ٹھیک ہے۔" خوف اس کی آواز میں نمایاں تھا۔

"مقررہ وقت پر پہنچ جایئے گا۔" یہ کہہ کر لائن ڈراپ کر دی گئی تھی۔

O......O......O

شاہ زیب جب وہاں پہنچا تو دو تین لڑکے اور بھی موجود تھے جو شاہ زیب کی طرح بچ گئے تھے۔ شاہ زیب فرداً فرداً ان سے ہاتھ ملاتا ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور پھر جب وزیر داخلہ نے اس سے اس کے بارے میں مکمل تفصیل دریافت کی تو اس نے شوکت بی بی کا تذکرہ من وعن بیان کیا اور ساتھ ہی اپنے ساتھ پیش آنے والی ساری روداد بھی سنائی کہ کس طرح وہ اپنی جان بچا کر بھاگا تھا۔

وزیر داخلہ سمیت وہاں موجود بھی لوگوں نے شوکت بی بی کے اس جرات مندانہ فعل کو سراہا تھا اور پھر ان کو بڑے ہی احترام سے محکمہ داخلہ سندھ کی گاڑی میں سندھ سیکریٹریٹ لایا گیا تھا۔ وفاقی وزیر داخلہ کی طرف سے جو مغویان بازیاب ہوئے تھے ان کو پچاس ہزار روپے کیش کی صورت میں پیش کیے تو شاہ زیب نے شوکت بی بی کی طرف پچاس ہزار بڑھا دیئے اور کہا کہ "ان کی زیادہ حقدار یہ ہیں۔" شاہ زیب کی اس بات سے وزیر داخلہ بھی متاثر ہوئے اور انہوں نے شوکت بی بی کے لئے ڈیڑھ لاکھ روپے کا اعلان کر دیا۔

اور یوں شوکت بی بی کی زندگی میں ایک بہار کا جھونکا آ گیا۔ شاہ زیب نے یہ ثابت کر دکھایا کہ ابھی ہمارا معاشرہ بانجھ نہیں ہوا۔ کراچی کے کلچر میں پیار، محبت اور خدمت کی وہ روایات اب بھی برقرار ہیں جنہیں دیکھ کر یہ حوصلہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ دن دور نہیں جب شاہ زیب جیسے کراچی کے نوجوان اپنی اعلیٰ وارفع روایات کا پرچم ایک بار پھر بلند کریں گے۔

☆......☆......☆

زندگی بے اعتبار ہے

رات اپنے شباب پر تھی، ستاروں سے سجا آسمان بالکل ایسا لگ رہا تھا جیسے آسمان کے طاقچوں میں دیئے ٹمٹمار ہے ہوں۔ سجاد نے جاگتی آنکھوں کے ساتھ ہولے سے کروٹ لی اور پھر آنکھیں بند کر لی تھیں۔ اس کا تصور ایک بار پھر حسنِ بے مثال سے آباد ہو چکا تھا جسے وہ چاہ کے بھی بھلا نہیں پا رہا تھا۔ ثانیہ کی حشر ڈھاتیں غزال آنکھیں، لب ایسے کہ گلاب جل اٹھیں، زلفیں ایسی دراز کہ لیل بھی اس کی جھلک کو ترسے، ایسا ملکوتی حسن جیسے کوئی اپسرا آسمان سے اتری ہو۔

"اف...... میں بھی پورا شاعر بن گیا ہوں، جب سے ثانیہ کو دیکھا ہے، شاعرانہ خیالات کا غلبہ مجھ پر طاری ہے۔" سجاد نے آنکھیں زبردستی کھولتے ہوئے تاحدِ نظر پھیلے آسمان کو دیکھا۔

"جی، آپ ٹھہریے، میں بس ابھی پانی لائی۔"

اف لبوں سے پھول جھڑتے اس کے الفاظ، بے خودی کے عالم میں وہ کشن سینے سے لگائے ایک بار پھر اپنے خیالوں میں محو ہو گیا۔

"اے پیارے چاند...... ! تجھے تیری چاندنی کی قسم، میں جس چاند چہرے کا تمنائی ہوں، مجھے اس سے ملا دے۔" سجاد کی نظریں دوبارہ چاند پر ٹک گئی تھیں اور لب خود کلامی کرنے لگے تھے۔ "لگتا ہے، آج کی رات بھی رت جگا کرتے گزرے گی۔ تم...... تم میرے

حواسوں پر کیوں چھا گئی ہو؟ تم میں ایسا کیا ہے جو مجھے پاگل بنا رہا ہے؟ کیوں، میرا دل کہہ رہا ہے، تم میرے لیے ہی بنی ہو اور......"

"سجاد، لائٹ آ گئی ہے، نیچے آ جاؤ۔" نیچے سے آتی ماں کی آواز پر وہ فوراً اٹھ گیا۔ اب وہ چٹائی کو پیروں سے رول کرنے کے بعد دیوار کے سہارے کھڑا اسٹریٹ لائٹ کی روشنی میں دور تک گلی کو دیکھ رہا تھا۔ اسی گلی کے اختتام پر ہی تو ثانیہ کا گھر تھا۔

"صبح جاب پر نہیں جانا؟ کب سے آوازیں دے رہی ہوں پھر آنکھ دیر سے کھلے گی تو......" ماں اب اوپر آ چکی تھی۔

"جی اماں! چلیں......" سجاد مصنوعی جمائی لیتا ہوا بولا۔

"چل، ٹھیک ہے، میں الگنی پر پڑے کپڑے لے کر آتی ہوں۔" یہ کہہ کر وہ الگنی سے کپڑے اتار کر اپنے بائیں کندھے پر رکھنے لگیں جب کہ سجاد خاموشی سے آڑے ترچھے قدم اٹھاتا سیڑھیاں اترتا چلا گیا۔

O......O......O

"اتنے سارے پیسے، نا بابا، ناں، میں نہیں دے سکتی، صرف تین اسٹاپ کی تو بات ہے۔" ثانیہ کا چہرہ غصے سے لال ہو چکا تھا۔

"محترمہ، لمبا سفر ہے اور پھر سی این جی بھی تو اتنی مہنگی ہو گئی ہے۔" رکشہ ڈرائیور نے ملتجی لہجے میں دلیل پیش کی۔

"پھر بھی صرف تین اسٹاپ کے میں ڈیڑھ سو روپے ہرگز نہیں دوں گی، اتنے میں تو میں نئی سینڈل خرید لوں۔" ثانیہ نے اپنی ٹوٹی ہوئی سینڈل کو گھورتے ہوئے کہا۔ "یہ کم بخت، اگر ٹوٹتی نہیں تو بے کار رکشے والے کی بکواس نہیں سننی پڑتی۔"

"بی بی، چلنا ہے تو چلو ورنہ میں اپنی راہ لوں۔" رکشے والا منہ بسورتے ہوئے بولا۔

"اتنی سی دور کے ڈیڑھ سو روپے تو میں نہیں دیتی، سو روپے لو گے؟" سخت کوفت کے عالم میں ثانیہ نے پوچھا۔

"رہنے دو بی بی، سی این جی کے دام آسمان سے باتیں کر رہے ہیں۔ میں نہیں لے

جاسکتا۔''

''تو سی این جی میں نے مہنگی کی ہے؟'' ثانیہ نے بڑبڑاتے ہوئے اس کے پیلے دانت دیکھے اور بے چارگی سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ وہ کالج کے لیے لیٹ ہو رہی تھی اور پھر ابھی وہ رکشے میں بیٹھنے کا سوچ ہی رہی تھی کہ پیچھے سے آتی بائیک ہارن کی آواز پر پلٹ گئی تھی۔

''آیئے، میں آپ کو کالج تک چھوڑ دیتا ہوں۔'' سجاد نے بائیک اس کے قریب لاتے ہوئے پیشکش کی تھی۔

''جی...... جی...... نہیں...... شکریہ......'' ثانیہ نے اس کی مبہوت نظروں کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا تھا۔

''ارے، میں آپ کا پڑوسی ہوں، اس میں پریشان ہونے والی کیا بات ہے؟ میں آپ کو کالج تک چھوڑ سکتا ہوں۔'' سجاد نے اسے قائل کرنے کی بھرپور کوشش کی تھی۔

''نہیں......نہیں...... آپ کا بہت شکریہ...... چلو بھائی، پہلے ہی بہت دیر ہو گئی ہے۔'' ثانیہ جھٹ رکشے میں بیٹھی اور مڑ کر سجاد کو دیکھنے لگی مبادا کہیں اس کے پیچھے تو نہیں آ رہا؟ رکشہ اسٹارٹ ہو چکا تھا اور ڈھیر سارا دھواں چھوڑتا ہوا بہت دور نکل چکا تھا مگر سجاد جوں کا توں کھڑا تھا۔ اسے ثانیہ سے ایسی بے رخی کی امید نہیں تھی۔

''تمہیں ایک نہ ایک روز میری بات سننی ہی ہو گی ثانیہ! میرا دل تو چاہ رہا ہے کہ اماں کو آج ہی تمہارے گھر بھیج دوں مگر نہیں، میں جب تک تمہیں اپنا حالِ دل پہلے خود نہ سنا دوں، اماں کو کچھ نہیں بتاؤں گا۔ دیکھتا ہوں، تم کب تک میری بات نہیں سنتیں۔'' اس نے زندگی میں کبھی بھی ہار ماننا سیکھا ہی نہیں تھا۔

O......O......O

''سجاد......! تو ثریا کی شادی میں نہیں جائے گا ناں؟ اس لیے میں نے تیرے لیے آلو قیمہ پکا کر رکھ دیا ہے۔'' اماں نے بستر پر لیٹے سجاد کو ہلاتے ہوئے کہا تھا۔

''کیوں، میں کیوں نہیں جاؤں گا؟'' سجاد نے ماں سے سوال کیا تھا۔

''ارے، تُو پہلے کبھی محلے کی ٹینٹ والی شادیوں میں گیا ہے جو آج جائے گا؟ تجھے تو وہ سوئے لان روز ہوٹل میں جانا پسند ہے ناں؟'' اماں نے چادر تہہ کرتے ہوئے کہا تھا۔

''محلے کی شادی ہے تو پھر ثانیہ تو ضرور آئے گی، مجھے ایسا کوئی بھی موقع رائیگاں جانے نہیں دینا چاہیے۔''

''ارے، یہ تُو کیا بڑبڑا رہا ہے؟ اور یہ تُو کچھ دنوں سے مجھے بدلا بدلا سا کیوں لگ رہا ہے؟'' اماں نے اسے کھویا کھویا دیکھ کر سوال داغا تھا۔

''ارے نہیں ماں، بس یونہی سوچ رہا تھا، میں بھی آج شادی میں شرکت کرلوں۔ اب کتنے دن ہوگئے ہیں، محلے کے یار دوستوں سے ملاقات نہیں ہوسکی۔''

''واہ بھئی، تُو ایسا کب سے سوچنے لگا ہے؟'' اماں نے معنی خیز انداز میں بیٹے کو گھورا تو وہ ٹپٹا گیا۔ آخر وہ اس کی ماں تھیں۔

''بات دراصل یہ ہے کہ کل کو اگر میری شادی ہوگی تو بھلا کون آئے گا جب میں ہی کہیں نہیں جاتا؟'' سجاد نے ادھورے جملے کے ساتھ ہی اپنے لب دانتوں میں دبا لیے تھے۔

''تو اصل بات تیری زبان پر آ ہی گئی، مجھے پہلے ہی پتا تھا کہ تُو کوئی لڑکی پسند کر کے مجھے بتائے گا۔''

''ارے نہیں ماں......! تُو بات کو کہاں سے کہاں لے جارہی ہے۔ ایسی کوئی بات نہیں، بس میں تو......'' سجاد نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا تھا۔

''ہاں، یہی بات تو قابل غور ہے کہ میں دیکھ رہی ہوں، کچھ دنوں سے نا تیرا کمپیوٹر میں دل لگتا ہے اور نہ ٹی وی میں۔ اب مجھے گھر میں تیری دلچسپی کا سامان ڈھونڈنا ہی پڑے گا۔ اچھا چل، اب شادی کے لیے جوڑا نکال دے تاکہ میں استری کردوں۔''

''نہیں ماں......! میں خود ہی استری کرلوں گا۔'' وہ منمنایا تھا۔

''ٹھیک ہے، جیسی تیری مرضی۔'' اماں نے پیار بھری ایک مسکراہٹ کے ساتھ کہا تھا۔

O......O......O

"دیکھو، یہی تو موقع ہوتا ہے لڑکیوں کے بننے سنورنے کا۔ اچھی طرح تیار ہو کر جانا ایسی تقریبات میں خواتین اپنے بھائی، بیٹوں کے لیے لڑکیاں دیکھتی ہیں، بس اسی عمر میں لڑکی اپنے گھر کی ہو جائے تو بہت ہوتا ہے۔" ثانیہ کی ماں نے ثانیہ کے بالوں کو سنوارتے ہوئے کہا۔

"نہیں امی! میں نہیں جا رہی۔ سچ، میرے پیروں میں سخت درد ہے، بالکل موڈ نہیں ہو رہا۔" ثانیہ نے جھلاتے ہوئے انداز میں کہا۔

"تیری یہ گز بھر کی زبان اور مرضی زیادہ نہیں چلنے لگی؟ بس میں کچھ نہیں جانتی، ٹائم پر تیار ہو جانا اور پھر جانا بھی کتنی دور ہے، اپنی گلی کے نکڑ پر تو شامیانہ لگا ہوا ہے۔ کون سا دور تک پیدل چلنا ہے؟"

"اب میں امی کو کیا بتاؤں کہ وہاں خالہ رقیہ کا لڑکا سجاد بھی ہوگا، جانے کیوں ہفتہ بھر سے وہ میرے حواسوں پر چھایا ہوا ہے؟" پھر اسے اچانک ہی سجاد سے ملاقات یاد آ گئی تھی۔

سجاد کی بائیک خراب ہو گئی تھی اور وہ اسے پیدل لیے اپنے گھر کی طرف جا رہا تھا۔ ثانیہ اس وقت گیٹ پر کھڑی ماں کی راہ تک رہی تھی کہ اچانک اس نے دیکھا تھا کہ سجاد کے پیر لڑکھڑائے تھے اور وہ بائیک کو سنبھالتا ہوا، بس گرتے گرتے ہی بچا تھا اور بے اختیار اس کی نظریں ثانیہ کی جانب اٹھ گئی تھیں۔ پہلے تو اس صورت حال پر ثانیہ کو ہنسی آ گئی تھی مگر پھر وہ سجاد کی حالت دیکھ کر سیریس ہو گئی تھی۔ تپتی دھوپ نے اس کے رنگ کو لال انگارہ کر دیا تھا اور بائیک کھینچنے کے باعث وہ مسلسل ہانپ رہا تھا۔

"جی، آپ ٹھہریئے، بس میں ابھی پانی لاتی ہوں۔" ثانیہ کے یہ جملے بے اختیاری میں ادا ہوئے تھے۔

"کن سوچوں میں پڑ گئی ہو؟"

"کچھ نہیں ماں...... وہ...... وہ......" ثانیہ جیسے گڑبڑا سی گئی تھی۔

"میں سوچ رہی ہوں، تم چوڑی دار پاجامہ پہن لو۔ اس میں تم جچتی بھی بہت ہو اور پھر

فیشن میں بھی ان ہے۔" ماں اس کے اچھے سے بُر کے سپنے دیکھتی اسے سنوارنے کی باتیں کر رہی تھیں جب کہ وہ کھوئی کھوئی سی بیٹھی تھی۔ اسے ماں کا دل توڑنا کبھی بھی پسند نہیں تھا۔ اس نے فوراً ہی یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ آج کی شادی میں ضرور جائے گی اور اگر سجاد بھی وہاں پہنچا اور اس نے کوئی ایسی ویسی بات کی تو پھر وہ اس کو مزہ چکھا کر ہی دم لے گی۔

O......O......O

"اللہ......! نظر نہ لگائے، کیا کمال بندی ہے۔" اس وقت اپنی زلف کے پیچ وخم سنوارتی ثانیہ کچھ سہیلیوں کے ساتھ محو گفتگو تھی۔ "ذرا اس لمبے بالوں والی لڑکی کو بلا کر تو لانا۔" سجاد نے قریب کھڑی گول مٹول سی بچی کو اشارے سے بتایا تھا۔ بچی مسکراتی ہوئی ثانیہ کی طرف بڑھ گئی تھی۔

"سنیے، آپ کو وہاں کوئی بلا رہا ہے۔" بچی نے ثانیہ کا ہاتھ پکڑ کر مخاطب کیا تو بے اختیار اس کی نظریں سجاد کی جانب اٹھ گئی تھیں۔ سجاد کی آنکھوں میں سارے جہاں کا پیار نمایاں تھا۔ وہ محویت سے ثانیہ کی طرف دیکھ رہا تھا مگر ثانیہ اس دخل در معقولات پر سخت خفا سی منہ پھیر کر کھڑی ہوگئی تھی۔

"بھئی، خیریت تو ہے، وہ کیا کہنا چاہ رہا تھا اور تم......" عروسہ نے ثانیہ کو چھیڑا تھا۔

"نہیں، تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے، ایسی کوئی بات نہیں۔" ثانیہ نے عروسہ کو خاموش کرانا چاہا تھا۔

"ویسے وہ پورے محلے کا سب سے قابل لڑکا ہے، اپنی رشتہ کرانے والی آنٹی تو خالہ رفیعہ کے پیچھے پڑی ہیں کہ ایک سے ایک لڑکی ان کے بیٹے کے ساتھ شادی پر آمادہ ہے۔ سچ ثانیہ، تُو لکی ہے جو سجاد نے تجھے پسند کیا ورنہ تو وہ محلے کی لڑکیوں کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔" عروسہ نے تو جیسے ثانیہ کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا تھا اور اس بات کے جواب میں ثانیہ نے زندگی سے بھرپور قہقہہ لگایا تھا۔

O......O......O

اس رات شادی سے واپسی کے بعد ثانیہ کے دل میں یہ خیال گھر کر گیا تھا کہ سجاد کے

گھر سے اس کے لیے رشتہ ضرور آئے گا مگر ایسا ہوا نہیں تھا اور دن تیزی سے گزرتے جا رہے تھے۔ ہر روز ثانیہ منتظر رہتی تھی کہ اب سجاد کی طرف سے کوئی پیغام آئے اور وہ اس کے جواب میں ہامی بھرے لیکن لگتا تھا کہ سجاد نے اسے اپنے دل سے نکال دیا ہے۔

دوسری طرف سجاد نے ثانیہ کے رشتے کے سلسلے میں خود کو اس خیال سے روکا ہوا تھا کہ کہیں انکار نہ ہو جائے کیوں کہ شادی والی تقریب میں سجاد کی جانب سے ایک بچی کے ذریعے بلانے پر ثانیہ نے جس ردعمل کا اظہار کیا تھا، اس نے سجاد کو ہزار اندیشوں میں مبتلا کر دیا تھا اور پھر کافی دن تک بہت پریشان رہنے اور بہت کچھ سوچنے کے بعد سجاد نے ثانیہ کے رشتے کے لیے اپنی ماں سے بات کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

O......O......O

''بھئی رفیعہ، آج کل تو لڑکا اور لڑکی جب تک ایک دوسرے کو دیکھ نہ لیں، اس وقت تک رشتہ پکا کرنا مناسب نہیں، تم رشتہ لینے اکیلے نہیں آنا، سجاد کو بھی لیتی آنا، میں ثانیہ کو سامنے کردوں گی، دونوں نے اگر ایک دوسرے کو پسند کر لیا تو ہماری طرف سے رشتہ پکا۔ مجھے تو تم اپنی بہنوں جیسی ہی عزیز ہو۔'' ثانیہ کی ماں شمسہ نے بہت رسان سے کہا تھا۔

''لو بھلا اس سے اچھی اور کیا بات ہو سکتی ہے۔'' رفیعہ فوراً ہی شمسہ کی بات کی قائل ہو گئی تھیں اور پھر وہ دن بھی آ ہی گیا تھا جب ثانیہ اور سجاد ایک دوسرے کے آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ وہ دونوں ہی ایک دوسرے سے کم نہیں تھے، سجاد اقرار کا خواہش مند تھا اور ثانیہ تو پہلے سے ہی منتظر تھی کہ کب یہ لمحہ آئے اور وہ ہامی بھر لے۔

ثانیہ کی والدہ نے فوراً ہی مٹھائی منگوائی تھی تو سجاد کی والدہ نے آگے بڑھ کر ثانیہ کی انگلی میں نازک سی انگوٹھی پہنا دی تھی، یوں ثانیہ اب سجاد سے منسوب ہو چکی تھی۔

O......O......O

شادی کی تیاریاں اپنے عروج پر تھیں، دونوں گھروں میں خوشیوں کے شادیانے بج رہے تھے اور پھر محلے کے ہی دو گھروں میں شادی تھی اس لیے سب ہی اس خوشی میں نہال نظر آ رہے تھے۔ بارات بڑی شان سے آئی تھی اور یوں سجاد، ثانیہ کو اپنے گھر اپنی دلہن کے روپ

میں لے آیا تھا۔

''جانتی ہو ثانیہ، تمہاری پہلی نظر نے مجھے گھائل کر دیا تھا۔ تمہیں کیا پتا، تم سے ملنے کے بعد رت جگا میرا مقدر بن گیا تھا لیکن میں تمہارے انکار سے ڈرتا تھا، جانتی ہو جس دم میں نے یہ سوچا کہ تم میری، فقط میری ہو اور تمہیں دنیا کی کوئی طاقت مجھ سے چھین نہیں سکتی تو میں نے اماں کو تمہارے گھر بھیج دیا۔ ویسے اگر تمہاری طرف سے انکار بھی ہوتا تو تم تب بھی میری محبت رہتیں لیکن آج اقرار کی صورت میں تم میری شریک زندگی بن کر میرے ساتھ ہو۔'' سجاد کہے جا رہا تھا اور ثانیہ شرم کی لاج میں کٹی بس سنتی جا رہی تھی۔

''تم کچھ نہیں کہو گی؟'' سجاد نے سوال کیا تھا۔

''میں بس اتنا جانتی ہوں کہ میں خوش قسمت ہوں، مجھے اپنے نصیب پر فخر ہے۔'' یہ کہہ کر ثانیہ نے آہستگی سے سجاد کے بازو پر اپنا سر ٹکا لیا تھا۔

O......O......O

سجاد نے ثانیہ کے ساتھ ہنی مون منانے کے لیے پاکستان کے پُرفضا مقامات مری وغیرہ جانے کا پروگرام بنایا تھا اور اس روز جانے کی تیاری ہو رہی تھی۔

''بیٹا...... سامان پیک کر لیا ہے نا؟'' رفیعہ نے سجاد کے کان کھینچتے ہوئے پوچھا۔ ''ہمیشہ کچھ نہ کچھ بھول جاتا ہے، یہ تیری پرانی عادت ہے لیکن اب میری بہو آ گئی ہے ناں، یہ تیرا بہت اچھے سے خیال رکھے گی۔'' رفیعہ نے اپنی بہو ثانیہ کی بلائیں لیتے ہوئے کہا تھا۔

''تم گولڈ کے زیورات تو نہیں لے جا رہی ناں؟ بیٹی......! حالات بہت خراب ہیں۔'' شمسہ نے ثانیہ کو سمجھایا تھا۔

''نہیں امی......! بس یہ کڑے ہی پہنے ہوئے ہیں، باقی کوئی چیز بھی نہیں رکھی۔''

''سجاد بیٹے......! تم دونوں کا ہنی مون پروگرام کتنے دن کا ہے؟ ویسے ابھی تو میں نے نئی نویلی بہو کے ناز بھی نہیں اٹھائے تھے اور تم اسے لے کر اڑنے کے لیے آمادہ ہو؟'' رفیعہ نے کچھ ناراض لہجے میں سجاد کو مخاطب کیا تھا۔

''بس پندرہ دن کا پروگرام ہے، واپسی پر اپنی بہو کے ساتھ اپنے سارے ارمان نکال لیے

گا۔" سجاد نے مسکراتے ہوئے اپنی ماں کے گلے لگتے ہوئے کہا تھا۔

ان کی روانگی سے پہلے ثانیہ کی والدہ شمسہ کی بھی آمد ہو گئی تھی۔

"ثانیہ بیٹی......! ایک بار پھر سارا سامان چیک کر لو، کہیں کوئی چیز نہ رہ جائے، بعد میں تم پریشان ہوتی رہو گی۔"

"نہیں امی......! ہر چیز رکھ لی، بس آپ کی دعاؤں کی ضرورت ہے۔" ثانیہ کے چہرے پر زندگی سے بھری مسکراہٹ کا ہالہ تھا۔

"ہاں میرے بچو......! ہماری دعائیں ہمیشہ تمہارے ساتھ ہی ہیں۔" رفیعہ اور شمسہ دونوں نے باری باری سجاد اور ثانیہ کے سروں پر ہاتھ رکھا تھا۔

O......O......O

دوپہر بارہ بجے کے قریب سجاد اور ثانیہ ایئرپورٹ پر موجود تھے۔ "میری خواہش تھی کہ تمہارے ساتھ جہاز کا سفر کروں۔" سجاد نے ثانیہ کو مخاطب کیا تھا۔ "میری بھی تو خواہش تھی کہ تمہارے ساتھ بلندیوں کو چھولوں۔"

"سچ سجاد...... میں اس وقت خود کو دنیا کی سب سے خوش نصیب لڑکی تصور کر رہی ہوں۔" اور پھر جہاز نے اڑان کے سارے ابتدائی مرحلے طے کر لیے تھے اور رفتہ رفتہ بلندی اور بلندی کی طرف پرواز کر رہا تھا۔

جہاز جوں جوں بلند پرواز کرتا چلا جا رہا تھا، مناظر دھندلے ہوتے چلے جا رہے تھے۔ اب سوائے نیلے آسمان پر روئی جیسے بادلوں کے گالوں کے اور کچھ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔

O......O......O

اسلام آباد کے نواحی علاقے حسین آباد میں جمعے کی شام 06 بج کر 40 منٹ پر زندگی سے فقط 10 منٹ کے فاصلے پر موت نے 127 ہنستے مسکراتے لوگوں کو نگل لیا۔ بھوجا ایئر لائن کی فلائٹ نمبر B4-213 گر کر تباہ ہو گئی، آسمانی بجلی نے 127 لوگوں کی جان لے لی، زندگی سے رشتہ توڑنے والوں میں طیر، کالا بورڈ کے سید سجاد حسین اور ثانیہ سجاد بھی تھے جو ساتھ جینے مرنے کے وعدے کرتے ایک ساتھ ہی زندگی کی بازی ہار گئے۔

ثانیہ اور سجاد تو اسلام آباد اور مَری وغیرہ کے پُر فضا مقامات کی سیر کے لیے نکلے تھے مگر دونوں ایک ساتھ ہی راہِ عدم پر روانہ ہو گئے اس بات سے بے خبر کہ دور، بہت دور کراچی کے ایک کونے میں دو دُکھیاری مائیں ان کی جدائی کا داغ عمر بھر کا غم اپنے سینے پر سجائے بیٹھی ہیں۔

یہ تو صرف ایک گھر کی کہانی ہے۔ بھوجا ایئر لائن میں سوار ہونے والے 127 افراد چند منٹوں میں آگ اور دھوئیں، چیخ و پکار سے گزرتے ہوئے ہم سے دور...... بہت دور چلے گئے۔ ان کے جسم ٹکڑوں میں بٹ گئے، اپنے پیروں پر چلنے والے چادروں میں سما گئے۔ قیامت کا منظر تھا۔ دیکھنے والوں نے دیکھا ہوگا لیکن میں اپنا دل مضبوط کر کے بھی کچھ دیکھ نہ سکی لیکن ایک سوچ نے مجھے الجھائے رکھا اور یہ کہانی لکھنے پر مجبور کیا اور میری وہ سوچ یقیناً آپ کی بھی ہوگی کہ جب زندگی اتنی مختصر اور بے اعتبار ہے، لمحے بھر کا پتا نہیں کہ کیا ہو جائے اور کیا ہونے والا ہے؟ لیکن لوحِ محفوظ پر لکھی ہوئی تقدیر ضرور ایک دن سامنے آ جاتی ہے تو پھر انسان اس قدر سرکش، مغرور کیوں ہے؟

کیا اس واقعے سے ہمیں عبرت حاصل نہیں کرنی چاہیے؟ لوٹ کھسوٹ، بے ایمانی، بدلہ کی آگ، چند روپوں کی خاطر اچھے بھلے انسانوں کی ٹارگٹ کلنگ......شاید یہ سب سمجھنے لگے ہیں کہ ہمیں اس دنیا سے کبھی نہیں جانا ہے، اسی لیے سامان سو برسوں کا جمع کرنے کی تگ و دو میں ہیں۔ تیرگی جب بڑھ جاتی ہے تو آسمان سے آتی ایک روشن لکیر اسے نگل لیتی ہے۔ بدی کا اندھیرا بڑھتا جا رہا ہے...... خدا کے لیے، دوسروں کی امیدوں، خوشیوں، آرزوؤں اور تمناؤں کے چراغ روشن کرنا سیکھیے۔ آپ کی زندگی بھی سنور جائے گی۔

☆......☆......☆

اس گھر کو آگ......!

''ماشاء اللہ بڑی پیاری لگ رہی ہو آج......'' راشد نے وجیہہ کے سراپے پر نظر دوڑاتے ہوئے کہا تھا۔

''اب اتنی بجی سنوری ہوں پیاری تو لگوں گی ناں......!'' وجیہہ نے اٹھلاتے ہوئے جواب دیا تھا۔

''اتنی سج سنور کے تم میرے ہی گھر آتی ہو یا؟'' راشد کا جملہ ادھورا تھا۔

''کم آن راشی، میں آپ کے لیے اسپیشلی تیار ہوئی ہوں۔'' وجیہہ نے نظریں جھکاتے ہوئے کہا تھا۔

''تم مجھے کتنے پیار سے راشی پکارتی ہو...... سچ، مجھے بہت اچھا لگتا ہے، پلیز وجیہہ...... ذرا دوبارہ کہنا؟''

''راشی......!'' وجیہہ نے قدرے اونچی آواز میں کہا تھا۔ اس کے چہرے پر شوخی نمایاں تھی۔

''وجیہہ...... یہ تمہارے خالو ہیں، انہیں ذرا تمیز سے مخاطب کرو۔'' ٹرے میں چائے کے کپ لیے خالہ کرن اندر داخل ہوئیں تو وجیہہ سنبھل کر بیٹھ گئی جبکہ راشد کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا۔

''نہیں خالہ، بس یونہی، راشد اتنا پرانا سا نام ہے ناں تو میں نے سوچا، خالو کا نام راشی

ہی رکھ لیا جائے۔ اب آپ کے شوہر اتنے ہینڈسم جو ہیں، ان پر راشی نام سوٹ کرتا ہے۔"
وجیہہ نے زبردستی کی بات بناتے ہوئے کہا تھا۔

"اونہہ...... تم بتاؤ، بجو کیسی ہیں؟" کرن سے وجیہہ نے اپنی بڑی بہن کی خیریت دریافت کی تھی۔

"ماما بالکل خیریت سے ہیں، میں نے سوچا کالج سے سیدھی میں اپنی خالہ کے گھر آجاؤں، اس بہانے اپنی آنی سے ملاقات تو ہو ہی جائے گی، ساتھ ہی ان کے تین نٹ کھٹ بچوں سے بھی مل لوں گی۔" وجیہہ نے کمال محبت سے کرن کے گلے میں باہیں ڈالتے ہوئے کہا تھا۔

"مگر وجیہہ...... بچے تو آج اسکول سے لیٹ آئیں گے۔" راشد نے وجیہہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا۔

"ہاں...... آج تو بچوں کے اسکول میں فنکشن ہے۔" کرن نے یہ بتاتے ہوئے چائے کا کپ وجیہہ کی جانب بڑھا دیا تھا۔

"ہائے خالہ، پھر تو بہت دیر ہو جائے گی۔ میں گھر چلتی ہوں۔" وہ مصنوعی فکر چہرے پر سجائے اب چائے کے سِپ لے رہی تھی۔

"نہیں بھئی، اس بھری دوپہر میں تم گھر اکیلے کیسے جاؤ گی؟ راشد پلیز...... آپ وجیہہ کو گھر ڈراپ کر دیں، یہ اکیلی گئی تو میں پریشان ہی رہوں گی۔"

"ہاں ہاں...... یہ ٹھیک ہے۔" اپنی خالہ کرن کی یہ بات سنتے ہی وجیہہ کے چہرے پر شفق سے رنگ پھیل گئے تھے۔

"ٹھیک ہے پھر ابھی فوراً اٹھو، مجھے اپنی شاپ پر بھی جانا ہے۔" یہ کہتے ہوئے راشد کے چہرے پر بشاشت کے رنگ نمایاں تھے۔

"اچھا خالہ...... اپنا خیال رکھیے گا اور تینوں بچوں کو میری طرف سے خوب سارا پیار کیجیے گا۔ میں پھر آؤں گی۔" بیگ شولڈر پر ہینگ کرتی وجیہہ، کرن سے مخاطب تھی۔

"خبردار جو اب تم اکیلی کالج سے یہاں آئیں، بجو کو پتا چل گیا تو وہ تمہارے ساتھ

ساتھ میری بھی خبر لیں گی۔" کرن نے وجیہہ کو ڈانٹتے ہوئے کہا تھا۔

"اوہ خالہ......! آپ بھی بالکل ماما پر گئی ہیں۔ ہر بات پر روک ٹوک؟"

"وجیہہ......! جلدی سے آؤ، دیر ہو رہی ہے۔" راشد بائیک اسٹارٹ کیے اب آواز لگا رہا تھا۔

"چلو اب دعائیں پڑھتے ہوئے جانا اور گھر جا کر مجھے ایک میسج کر دینا......" کرن قدرے خوشگوار انداز میں وجیہہ کو رخصت کرتی اب چائے کے کپ ٹرے میں رکھ رہی تھی۔

"عجیب لڑکی ہے، جب دیکھو، کالج سے میرے گھر آ جاتی ہے۔" خود سے مخاطب اب وہ کچن کی جانب مڑ چکی تھی۔

O......O......O

"ویسے سچ کہوں وجیہہ، تم پر کھلے بال بہت اچھے لگتے ہیں۔" راشد نے بائیک پر پیچھے بیٹھی وجیہہ کو بڑے پیار سے مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا۔

"اوہ راشی...... سچ...... آپ کتنے اچھے ہیں۔" راشد کی بات سنتے ہی وجیہہ کا دل محبت بھری خوشگوار دھڑکنوں کے شور میں ڈوب گیا تھا۔

"تمہیں اگر دیر نہیں ہو رہی ہو تو قریبی ریسٹورنٹ میں کھانا کھائیں؟" راشد نے بائیک کی اسپیڈ سلو کرتے ہوئے پوچھا تھا۔

"راشی...... نیکی اور پوچھ پوچھ۔ کیوں نہیں! مجھے تو بڑی زوروں کی بھوک لگ رہی ہے اور پھر میں آپ کے ساتھ جتنا بھی وقت گزاروں، جانے کیوں مجھے کم ہی لگتا ہے۔"

"وجیہہ...... مجھے بھی تم بہت اچھی لگتی ہو......!" بائیک سے اترتے ہوئے راشد بے ساختہ وجیہہ کے گال کھینچتے ہوئے بولا تو وہ شرم سے نظریں جھکا کر رہ گئی تھی۔

"آؤ میری بلبل......!" وہ بڑی ہی شان سے وجیہہ کا ہاتھ پکڑ کر اسے کھینچتا ہوا ریسٹورنٹ میں داخل ہو گیا تھا۔ ریسٹورنٹ کا ماحول، دھیما دھیما میوزک اور وہاں موجود سر جوڑے جوڑوں کو دیکھ کر وجیہہ کے چہرے پر بڑی ہی دل فریب مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔

"راشی...... ہم اُس کونے والی ٹیبل کی جانب چلتے ہیں۔"

''اس کونے میں؟'' راشد نے وجیہہ کو عجیب سے نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

''اونہہ...... کیا برائی ہے، اُس کونے والی ٹیبل میں؟'' وجیہہ مصنوعی خفگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولی تھی۔

''ارے نہیں...... کوئی برائی نہیں، آؤ وہیں چل کر بیٹھتے ہیں۔'' راشد آگے بڑھ گیا تھا اور وجیہہ اس کے پیچھے ٹیبل تک آئی تھی۔

''راشی...... کاش آپ مجھے مل جاتے تو ہماری زندگی کتنی حسین ہوتی، ہماری سوچ ایک جیسی ہے، آپ مجھے بہت اچھے لگتے ہیں اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ آپ تنگ ذہن نہیں ہیں۔'' وجیہہ نے کمال مہارت سے اپنے دل کی بات راشد تک پہنچائی تھی۔

''وجیہہ...... اچھی تو تم بھی مجھے بہت لگتی ہو مگر اب کیا ہو سکتا ہے، میرے تین بچے ہیں اور تم بھی تو مجھ سے کتنی چھوٹی ہو، بالکل گڑیا ہو، میری گڑیا......!'' راشد نے بڑے ہی پیار بھرے انداز میں وجیہہ کے ہاتھ پر اپنے ہاتھ کی گرفت مضبوط کرتے ہوئے کہا تھا۔

''راشی...... سچ، میرا دل چاہتا ہے کہ میں آپ کے سنگ اپنی زندگی گزاروں، آپ کا یہ والہانہ پیار اور میرے لیے آپ جو اپنی مصروفیت کو بالائے طاق رکھ دیتے ہیں، سچ...... مجھے یہ بات بہت اٹریکٹ کرتی ہے۔ میں جانتی ہوں، جتنا آپ مجھ سے پیار کرتے ہیں، اتنا تو میں بھی آپ سے نہیں کرتی۔''

''وجیہہ...... پہلے کھانے کا آرڈر دے دو، باقی باتیں بعد میں کرتے ہیں۔'' راشد نے مینو کارڈ وجیہہ کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا تھا۔

''راشی...... ایک بات سچ سچ بتایئے گا کہ آپ میرے بارے میں کیا سوچتے ہیں؟''

وجیہہ نے کھانے کے دوران راشد کو کریدنا شروع کر دیا تھا۔

''اگر سچ کہوں تو......''

''تو کیا......؟'' وجیہہ کے لہجے میں بے چینی عود آئی تھی۔

''وجیہہ...... میں تم سے محبت کرنے لگا ہوں لیکن یہ خیال ہمیشہ میرے راستے میں حائل ہو جاتا ہے کہ میں تین بچوں کا باپ ہوں اور یوں میرے تمہاری طرف بڑھتے قدم رک

جاتے ہیں۔'' راشد سر جھکائے کہہ رہا تھا، شاید یہ بھی اعتراف محبت کا کوئی انوکھا انداز تھا۔

''اوہ راشی......! مجھے اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا لیکن ہاں، مجھے یہ بات ضرور ڈراتی ہے کہ خالہ میرے بارے میں کیا سوچیں گی؟ اور......'' وجیہہ کے چہرے پر ڈر کے آثار نمودار ہونا شروع ہوئے تھے۔

''پلیز وجیہہ...... کرن کو یہ بات کبھی بھولے سے بھی نہیں بتانا، کبھی اس کے سامنے ذکر بھی نہیں کرنا کیونکہ میں ڈرتا ہوں کہ میری شادی شدہ زندگی کہیں خراب ہی نہ ہو جائے؟'' راشد ایک گہری سانس بھرتے ہوئے بولا تھا۔

''اور میں......؟'' وجیہہ نے حیرت سے راشد کو دیکھا۔

''تم تو میری جان ہو لیکن میں خاندان میں تماشہ نہیں بننا چاہتا، بس یار...... سمجھا کرو ناں؟'' راشد کا لہجہ بے چارگی لیے ہوئے تھا۔

''واہ راشد......! جب اتنے ڈرپوک ہو تو کس نے کہا تھا کہ مجھ سے پیار کرو؟'' وجیہہ ٹھنک کر بولی تھی۔

''پاگل پن والی باتیں نہیں کرو، اگر کرن کو اس بات کی بھنک بھی پڑ گئی ناں تو وہ تینوں بچے میرے حوالے کر کے اپنی ماں کے گھر جا کر بیٹھ جائے گی۔ کیا تم سنبھال لو گی ان تینوں کو......؟''

راشد کے اس سوال پر وجیہہ کی آنکھیں جیسے کھل گئی تھیں۔ ''نہیں بھئی...... مجھ سے کہاں سنبھلیں گے بچے لیکن راشی...... ایک بات سچ کہوں کہ میں دل کی گہرائیوں سے آپ سے پیار کرتی ہوں، کب، کیسے ہوا یہ پیار، یہ تو مجھے نہیں پتا لیکن ہاں......! اتنا ضرور جانتی ہوں کہ آپ کو پانے کی خواہش اور محبت میرے دل میں سر ابھارتی ہے۔'' وجیہہ محبت بھری نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی جب کہ راشد کسی نئی دنیا میں کھو سا گیا تھا۔

O......O......O

''کیسی ہو وجیہہ، کب سے نمبر ملا رہا ہوں، کال تو ریسیو کیا کرو؟'' راشد نے وجیہہ کے کال ریسیو کرتے ہی شکوہ کیا تھا۔

''ارے...... کب سے کہاں، کال تو آئی ہی ابھی ہے۔'' وجیہہ کے لہجے میں حیرت کا عنصر شامل تھا۔ ''شاید موبائل میں گڑبڑ ہے۔''

''اف......! اب میری موبائل کی دکان کا کیا فائدہ؟ کیا میں اپنی محبوبہ کو ایک نیا موبائل بھی نہیں دے سکتا......!'' راشد نے بڑے موڈ میں کہا تھا۔

''اوہ ہو...... یہ تو بڑی اچھی بات ہے پھر کب مل رہا ہے مجھے نیا موبائل......؟'' وجیہہ نے بڑے خوشگوار انداز میں سوال کیا تھا۔

''پہلے اپنا پرانا موبائل سامنے والی دیوار پر دے مارو پھر ملے گا نیا......''

''ارے راشی...... ابھی کیسے؟ ابھی تو میں آپ سے بات کر رہی ہوں؟''

''اچھا...... میری سویٹی، کل تم کالج سے واپسی پر میری طرف آجانا، میں تمہیں نیا موبائل دے دوں گا۔'' راشد کے لہجے میں وجیہہ کے لیے پیار ہی پیار نمایاں تھا۔

''نہیں بھئی، میں آپ کے گھر نہیں آؤں گی، کرن خالہ ویسے ہی مجھے ڈانٹتی ہیں، کہیں ایسا نہ ہو کہ شک کے دائرے میں ہی آجاؤں۔''

''اوہ ہاں......! ٹھیک ہے پھر ایسا کرتے ہیں، میں کالج سے تمہیں پک کرتا ہوں، ہم کسی پُرسکون جگہ پر بیٹھیں گے، تم اپنے خوبصورت سے موبائل کی خوبصورتی میں کھونا اور میں تمہاری خوبصورتی سے دل بہلاؤں گا۔'' راشد کے لہجے سے گویا شہد ٹپک رہا تھا۔

''راشی...... راشی، سچ آپ نے تو میرے دل کی بات کہہ دی۔ میں کل آپ کا بے چینی سے انتظار کروں گی، آپ کالج سے مجھے ٹھیک ایک بجے پک کر لیجیے گا۔'' وجیہہ نے کچھ کھوئے کھوئے انداز میں کہا اور لائن کاٹ دی۔

''سب خیریت تو ہے ناں بادشاہ......! یہ ایک بھابھی کے ہوتے ہوئے نئی بھابھی کے کیا؟''

''اوئے...... پاگل ہو گیا ہے کیا؟ خاموش رہ......'' راشد نے سامنے بیٹھے دوست خرم کو گھورتے ہوئے کہا تھا۔

''ایسے ڈرو گے تو سیدھا بھابھی کے پاس پہنچ جاؤں گا اور سب کچھ بتا دوں گا۔'' خرم

نے دھمکی دینے والے مصنوعی انداز میں کہا تھا۔

''ارے نہیں یار، تیری بھابھی کی بھانجی تو ہے، بہت پیاری لڑکی ہے۔ یار، مجھ سے بہت پیار کرتی ہے۔'' راشد نے قدرے سنجیدگی سے خرم کو بتایا تھا۔

''کہاں ملو گے یار، بھابھی کو اگر پتا چل گیا تو......؟'' خرم نے کھوجتی نظروں سے راشد کو دیکھا تھا۔

''ہاں یار...... یہی بات سمجھ میں نہیں آ رہی۔ اسے کہاں لے جاؤں۔ خیر، کل تم ذرا دکان دیکھ لینا، میں شام میں ہی لوٹوں گا۔''

''ایک بات کہوں راشد بھائی......؟'' خرم نے راشد کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے سوال کیا تھا۔

''ہاں بولو......''

''میرا گھر خالی پڑا ہے، کیوں ناں؟'' خرم نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی تھی۔

''ارے یار جیو، تمہارا گھر تو نزدیک ہی ہے، سچ، تم نے تو میرا بڑا مسئلہ حل کر دیا ہے۔'' راشد نے خوشی اور جوش کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا تھا۔

''اتفاق سے مکان خالی ہے ورنہ تو کرائے پر چڑھنے ہی والا تھا۔ مجھے وہ لوگ سمجھ نہیں آئے اسی لیے میں نے نہیں دیا۔''

''اچھا ہی ہوا ناں......! خیر، مکان کی چابیاں؟'' راشد کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ آگے بڑھے اور خرم کو گلے سے لگا لے۔

''چابی کل صبح لے لینا، اب میں جیب میں رکھ کے تو گھومنے سے رہا۔'' خرم نے راشد کی بے تابی دیکھتے ہوئے منہ بنایا۔

''قسم سے یار، تُو نے میرا بڑا مسئلہ حل کر دیا......! اب کل یاد سے چابی لیتے آنا، یہ نہ ہو کہ بھول جاؤ۔'' راشد نے خرم کو ایک بار پھر یاددہانی کرائی تو اس نے راشد کے آگے ہاتھ جوڑ لیے۔

''معاف کرو یار......!'' خرم کی اس بے ساختگی پر وہ دونوں ہی قہقہہ لگا کر ہنسنے لگے۔

O......O......O

''ارے راشی...... یہ کس کا گھر ہے؟'' بند دروازے میں لگے تالے کو چابی لگاتا دیکھ کر وجیہہ نے حیرت سے سوال کیا تھا۔

''جلدی سے اندر چلو۔'' راشد تالا اور دروازہ کھولنے کے بعد وجیہہ کو تقریباً دھکیلتا ہوا دروازہ اندر سے لاک کر چکا تھا۔

''ارے...... آپ بتاتے کیوں نہیں، ہم کس کے مکان میں آئے ہیں راشی......؟'' وجیہہ نے اپنی بڑی بڑی آنکھوں کو پھیلاتے ہوئے پورے گھر کا جائزہ لیا تھا۔

''دوست کا گھر ہے۔'' وہ لان میں پڑے صوفے کی گرد صاف کرتے ہوئے بولا تھا۔

''راشی...... میں اتنی تیار ہو کر آئی تھی، میرے ذہن میں تھا، آپ مجھے کسی اچھے سے ریسٹورنٹ میں لے کر جائیں گے مگر آپ تو یہاں......!'' اس کی نظریں ابھی تک صوفے پر جمی گرد پر تھیں۔

''مائی سویٹی...... اس سے اچھی جگہ اور کیا ہو سکتی ہے جہاں ہم دونوں کو قربت کے لمحے میسر آئیں اور اپنا نیا موبائل تو دیکھو، ٹچ اسکرین ہے۔'' راشد نے وجیہہ کے پھولے ہوئے چہرے کو آہستگی سے چھوتے ہوئے کہا تھا تو وہ مکمل رام ہو گئی۔

''واو راشی...... یہ تو بہت خوبصورت ہے۔'' وہ موبائل کی، کی پریس کر رہی تھی جبکہ راشد، وجیہہ کی خوبصورتی میں مدہوش ہو رہا تھا۔

''وجیہہ......! سچ بتاؤ، تم مجھ سے واقعی بہت پیار کرتی ہو؟''

''ہاں راشی...... خود سے بھی زیادہ۔'' یہ کہتے ہوئے وہ بڑے موڈ میں موبائل سے راشد کی تصویریں اتارنے لگی تھی۔

''یار...... یہ گھر جا کے دیکھ لینا، ابھی مجھ سے باتیں کر لو، جانے پھر کبھی ایسا موقع ملے بھی؟'' راشد کا جملہ ادھورا تھا مگر وجیہہ کی سانسیں اتھل پتھل ہو گئی تھیں۔

''راشی...... اگر آپ مجھے پہلے ملے ہوتے تو آج ہم ایک ساتھ رہ رہے ہوتے۔'' وجیہہ نے نظریں جھکاتے ہوئے کہا تھا۔

''سنو...... ہم اب بھی ایک ساتھ رہ سکتے ہیں......!'' راشد نے اس کی تھوڑی پر انگلی

رکھتے ہوئے کہا تھا۔

"کیا واقعی ایسا ہو سکتا ہے؟" وجیہہ کے لہجے میں خوشی کے ساتھ حیرت بھی تھی۔

"اگر تم چاہو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔" راشد گہری سانس بھرتے ہوئے بولا تھا۔

"راشی...... آپ کا ساتھ میری زندگی کا مقصد ہے لیکن کرن خالہ کیا سوچیں گی ہمارے بارے میں؟" اگلے ہی پل اس کی آنکھوں میں آنسو اور چہرے پر رنجیدگی نمایاں نظر آنے لگی تھی۔

"ہم اس کو کچھ بتائیں گے ہی نہیں، بس خاموشی سے نکاح کر لیں گے۔ بتاؤ...... دو گی میرا ساتھ؟" راشد نے فرطِ محبت سے اسے بازوؤں میں تھامتے ہوئے کہا۔ تو وہ ہوں کہتی اس کی بانہوں میں سما گئی۔

O......O......O

"ارے یار...... یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے، وہ گھر کرائے پر تو اٹھانا تو ہے ہی۔" خرم نے راشد کو گھر کی چابیاں دیتے ہوئے کہا تھا۔

"یار...... تیرا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گا۔" راشد نے بڑی احسان بھری نگاہوں سے خرم کو دیکھا تھا۔

"لیکن یار...... نئی بھابھی کے لانے کی خوشی میں تُو کوئی دعوت تو دے یار، کیا بس یوں ہی شکریہ پر ٹرخا دے گا؟" خرم نے آنکھ مارتے ہوئے کہا تھا۔

"ارے یار......! کیوں نہیں، یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے، بس ذرا نئے گھر میں سیٹ ہو جاؤں پھر پہلی فرصت میں تجھے بلاؤں گا۔ اب ذرا نکلوں گا، وہ بے چاری میرے انتظار میں گھبرا رہی ہوگی۔" راشد اپنی دکان خرم کے حوالے کر کے نکل گیا۔

"خرم صاحب! یہ بہت اچھا موقع ہے، دکان پر قبضہ کرنے کا۔" وہ خود سے مخاطب ہوتے ہوئے راشد کے گھر کا نمبر ڈائل کر چکا تھا۔

"کرن بھابھی بات کر رہی ہیں؟ دیکھیے، میں آپ کا خیر خواہ ہوں، آپ کے شوہر راشد نے آپ کی بھانجی وجیہہ سے خفیہ شادی کر لی ہے اور وہ اسی محلے کے ایک مکان میں اس

وقت موجود ہیں۔" خرم اب اپنا کام کر چکا تھا پھر اس نے بڑے ہی مکروہ انداز میں ایک زوردار قہقہہ لگایا تھا اور پھر موبائل سے سم نکال کر دو ٹکڑے کر کے ڈسٹ بن میں ڈال دی۔

O......O......O

کرن کے دونوں بھائی اور دو دوست بالآخر راشد کا نیا گھر ڈھونڈنے میں کامیاب ہو گئے تھے، دروازہ وجیہہ نے ہی کھولا تھا، اپنے سامنے دونوں ماموؤں کو دیکھ کر اس کے تو اوسان ہی خطا ہو گئے تھے۔

"شرم نہیں آئی تمہیں یوں منہ کالا کرتے ہوئے؟" وجیہہ کے ماموں آصف نے اس کے گال پر زوردار تھپڑ رسید کرتے ہوئے کہا تھا۔

"وہ...... ماموں......! میں......!" اس سے آگے وہ کچھ نہیں بول سکی تھی، بس اس کی گھٹی گھٹی سسکیاں کمرے میں گونجنے لگی تھیں۔

"اس پر کیوں ہاتھ اٹھا رہے ہیں آپ......؟" راشد کمرے سے چیختا ہوا نکلا تھا۔

"اوہ......سالے...... بے غیرت......تُو نے یہ کیا کیا ہے؟" آصف نے آگے بڑھتے ہی راشد کا گریبان پکڑ لیا تھا۔

"ارے...... میری مرضی! میں ایک کروں یا چار؟ تیری بہن کو میں نے کون سا گھر سے نکال دیا ہے؟" راشد نے جذباتی انداز میں جواب دیا تھا۔

"گھر سے نہیں نکالا لیکن گھر تو اجاڑ دیا اور یقیناً تُو نے ہی میری بھانجی کو اپنے جال میں پھنسایا ہوگا۔ میں تجھے چھوڑوں گا نہیں۔" آصف کا غصے سے برا حال تھا۔ اس کی آنکھیں تو جیسے ابل چکی تھیں۔

"نکل میرے گھر سے، اس سے پہلے کہ دھکے دے کر گھر سے باہر نکالوں۔" راشد نے آصف کو دھکا دیتے ہوئے کہا تھا۔ "اور دیکھ، اگر تُو زیادہ شور مچائے گا تو میں تیری بہن کو طلاق دے دوں گا، تین بچوں کے ساتھ جب وہ گھر واپس جائے گی تو......؟"

"چٹاخ......" آصف ایک زوردار تھپڑ راشد کے گال پر رسید کر چکا تھا۔ "کیا کہا تُو نے......؟ طلاق دے گا، میری بہن کو......؟" آصف کی اس چیخ کے ساتھ سب سے چھوٹا

بھائی جو خاموشی سے کھڑا تھا، اور باہر جو دوست موجود تھے، وہ بھی اندر آ گئے تھے اور پھر چاروں نے مل کر راشد کو مارنا شروع کر دیا تھا۔ ایک کونے میں سکتے کے عالم میں موجود وجیہہ اس کو بچانے سے قاصر تھی، وہ بس سسکیاں لے رہی تھیں اور وحشت زدہ نظروں سے راشد کو پٹتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔

O......O......O

دوسرے دن تمام اخبارات میں یہ خبر موجود تھی کہ اے بی سینیا لائن کے رہائشی راشد شیخ کو اس کے دو سالوں نے اپنے دو دوستوں کے ساتھ مل کر ڈنڈے، لاتوں، گھونسوں سے بری طرح زدوکوب کر کے اس کا سر دیوار سے مار کر شدید زخمی کر دیا اور خود بھاگ گئے۔ اہل محلّہ نے راشد کو زخمی حالت میں ہسپتال پہنچایا مگر وہ راستے میں ہی دم توڑ چکا تھا جب کہ وجیہہ کی مسلسل بے ہوشی، ڈاکٹروں کے لیے باعث تشویش ہے۔

اٹھائیس سالہ راشد اپنے والدین کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اپنی سالی کی بیٹی سے شادی کرنے کے جرم میں وہ اپنی زندگی گنوا بیٹھا تھا لیکن اس سارے معاملے میں قصوروار کون ہے؟ راشد شیخ، جو بیوی اور تین معصوم سے بچوں کا باپ ہوتے ہوئے بھی ایک نوعمر لڑکی کے عشق میں گرفتار ہو گیا یا پھر وجیہہ جسے ماں باپ کی بے جا آزادی نے اس نہج پر پہنچا دیا کہ وہ زندگی کا اتنا بڑا فیصلہ کرنے میں خود مختار ہو گئی اور نا صرف اپنی بلکہ اپنی خالہ کی زندگی بھی برباد کر بیٹھی!!

کاش لڑکیاں یہ سمجھ جائیں کہ ہوس اور محبت میں کتنا فرق ہوتا ہے، کبھی کبھی مرد بھی اس باریک دھاگے جتنے فاصلے کی سنگینی اور نزاکت کو نہیں سمجھ پاتا مگر بہر حال اس کا نقصان کبھی دانستہ، کبھی نادانستہ عورت کو ہی ہوتا ہے لیکن اس کی ذمے داری ماں باپ پر بھی عائد ہوتی ہے۔ آج بے جا آزادی نے ہماری نئی نسل کو بے راہ روی کی راہ پر ڈال دیا ہے، ساتھ ہی اچھی تربیت کے فقدان نے دل دہلا دینے والے واقعات کو ایک عام سی کہانی بنا دیا ہے۔

☆......☆......☆

میں کس کے ہاتھ پہ

خنک موسم کی سنہری دھوپ کھڑکی کے شیشے سے چھن چھن کر اندر آ رہی تھی۔ سائیڈ ٹیبل پر رکھی بلیک کافی سے بھاپ اٹھ رہی تھی۔ میں ریک پر لگی کتابوں پر ایک نظر ڈالتی ہوئی واپس اپنی جگہ پر آ گئی۔ مختلف کرائم اسٹوریز کے اخبارات، فل اسکیپ پیپرز میرے اردگرد بکھرے ہوئے تھے جبکہ میں بے مقصد ہی نیلی جلد والی ڈائری کے صفحات پلٹ رہی تھی جس میں شہر کے مختلف تھانوں کے نمبرز کا اندراج تھا۔

''پھر کوئی کرائم اسٹوری لکھنی ہوگی؟'' میری بہن منہ بسورتے ہوئے میرے قریب ہی بیٹھ گئی۔

''ہوں......'' میں نے کافی کا مگ لبوں سے لگاتے ہوئے کہا۔

''آخر کتنی کہانیاں لکھیں گی آپ؟'' وہ مجھے عجیب نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔

''پورے سال بارہ کہانیاں لکھ کر میں کون سا تیر مار دیتی ہوں؟ یہاں تو دہشت گرد ایک دن میں بارہ سے پندرہ افراد مار دیتے ہیں۔'' میں نے کنپٹی پر اپنی انگلیوں کی گرفت مضبوط کرتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

''حالانکہ ایک انسان کا قتل پوری انسانیت کا قتل ہوتا ہے لیکن یہاں تو سب کے ضمیر مردہ ہو چکے ہیں۔ خیر......آپ اپنا کام جاری رکھیے۔'' وہ تاسف کے انداز میں کہتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔

''ہم کتنے بے حس ہو چکے ہیں۔ ایک دن میں پندرہ مر جائیں یا بیس، ہمیں اب اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا، مرنے والوں کی لاشیں روز اخبار کے سینے کو سرخ کر رہی ہوتی ہیں تو ہر گھنٹے بعد میک اپ و آرائش سے مزین ایک حسن کی دیوی نیوز بلیٹن کے ذریعے ہمارے کانوں میں ان خبروں کے حوالے سے دھماکے کر رہی ہوتی ہے۔ آج مجھے اپنا بچپن یاد آ رہا ہے جب کراچی لاشوں کا نہیں بلکہ روشنیوں کا شہر ہوا کرتا تھا۔ اگر خدانخواستہ کوئی شخص قتل کر دیا جاتا تو ہفتوں اس کی شبیہ نظروں میں گھوما کرتی اور ایک نامعلوم خوف وجدان میں چکراتا پھرتا مگر اب تو بے حسی کا یہ عالم ہے کہ نوجوانوں کی ٹارگٹ کلنگ عام ہو گئی ہے اور ان کے غم میں اگر ان کے ماں باپ گزر جائیں تو تدفین کے وقت لوگ یہ کہتے نظر آتے ہیں کہ ''جوان اولاد کا غم پل پل مارتا اس سے بہتر ہے، ایک ہی دفعہ مر جانا......'' آہ...... عجیب نفسانفسی کا دور ہے، غربت و افلاس سے مرتے لوگوں کی قسمت میں رزق نہیں بلکہ گولیاں ہیں جو جسموں کے ساتھ ساتھ روحوں کو بھی چھلنی کر دیتی ہیں۔ ظاہر ہے، پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے رزق چاہیے اور رزق کے حصول کے لیے کمائی کا ذریعہ ہونا چاہیے اور اگر کمائی کا کوئی ذریعہ نہیں ہے تو جرائم میں خود بہ خود ہی اضافہ ہوتا چلا جائے گا۔

میرے اجداد نے قربانیوں سے جو ملک بنایا تھا، وہ کیوں آج قبرستان بنتا چلا جا رہا ہے؟ ایک تو میں لفظ کیوں سے سخت چڑنے لگی ہوں، یہ لفظ ہمیشہ ہی میری بے ربط سوچوں کے آگے بند باندھ کے کھڑا ہو جاتا ہے۔

''آپی...... جلدی سے آئیے، ٹی وی پر بریکنگ نیوز آ رہی ہے، ایک سیاسی کارکن کا قتل ہو گیا ہے۔ آپ انہی کی شخصیت پر کہانی لکھ دیجیے۔'' بہن کی آواز میری سماعت کو جھنجھوڑ گئی۔

''سچ کہوں...... میں اپنے ملک کی سیاست سے بھی سخت نالاں ہوں، جتنی پارٹیاں بن گئی ہیں، اتنا ہی قتل و غارت گری میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔''

آپی...... جلدی آ جائیے......!'' بہن کی آواز نے پھر مجھے پہلو بدلنے پر مجبور کیا۔

نہیں میں نہیں آ رہی۔ میری آواز جھلائی ہوئی تھی۔ شاید میری کہانیاں بھی سیاست کا شکار ہو گئی ہیں کیونکہ میرے دماغ نے ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کیا فیصلہ دینے میں۔ میرے شہر

میں قتل و خون ریزی بڑھتی جا رہی ہے اور دہشت گردی کی جو وبا پھوٹی ہے، کیا اس کا کوئی سد باب نہیں؟''

لیکن میں یہ سوال ہی کیوں کر رہی ہوں؟ کیا میں نے تاریخ نہیں پڑھی؟ وہ تاریخ جو ہزاروں برس سے طاقت ور کے ہاتھوں کمزور کو دہشت گرد قرار دیتی ہے۔ نہیں...... شاید میں غلطی پر ہوں۔ تاریخ نے کمزور کو دہشت گرد خود سے نہیں کہا۔ وہ تو اپنے اوراق میں طاقت ور کا کمزور کے خلاف فیصلہ درج کرتی آئی ہے اور یہ مقدمہ آج بھی جاری ہے۔ تاریخ کی عدالتِ انصاف نے اس مقدمے کی سماعت آج تک کبھی بند ہی نہیں کی۔

اس وقت میرے سامنے موجود اخبار کے اَپر ہاف پیج پر ایک معصوم سی چودہ سالہ لڑکی عارفہ کی تصویر ہے۔ یہ تصویر میرے ذہن کے کینوس سے یوں چپک کر رہ گئی ہے جیسے چھپکلی دیوار سے چمٹی رہتی ہے۔ بارہا میں نے یہ اخبار اپنے سامنے سے ہٹایا۔ میری پوری کوشش تھی کہ میں کسی اور واقعے کو قلم بند کروں مگر جانے کیوں یہ تصویر مجھے ایک کرب میں مبتلا کر چکی ہے۔ میرا ذہن قبول نہیں کر رہا کہ اتنی معصوم سی پیاری لڑکی کو پوری طرح کھلنے اور گلشن حیات کو اپنی عطر جیسی خوشبو سے مہکانے سے پہلے ہی اس سے اس کی معصومیت کیوں چھین لی گئی؟ افسوس تو اس بات کا ہے کہ ظلم و ستم کا نشانہ بننے والی چودہ سالہ عارفہ کی زندگی اس کی سگی خالہ خیر النساء نے اجاڑ دی۔ عارفہ کی آنکھوں میں بے پناہ خوف اور حسرت نمایاں ہے۔ اس کے کرب زدہ چہرے پر ایک ہی سوال رقم ہے کہ ''اس کا آخر قصور کیا تھا؟''

میں نے پڑھا ہے اور آج اپنی آنکھوں سے دیکھ بھی رہی ہوں کہ ظلم کا چہرہ بدلتا رہتا ہے لیکن خصلت نہیں بدلتی، وہ چاہے فرعون ہو، نمرود ہو یا پھر عیسیٰ کو صلیب پر مصلوب کرنے کا حکم دینے والا پونٹیس پیلیٹ ہو، سب کی فطرت میں، ان میں سے ہر ایک کی جبلت میں وہ ظلم، وہ مکر اور وہ نخوت ہے جس نے ابلیس کو قیامت تک کے لیے بارگاہ عدل و نور سے راندۂ درگاہ کروایا تھا۔ ظلم کا انداز، اس کا وار، اس کے وار کی کاٹ جدا ہو سکتی ہے لیکن اس کا نشانہ ہمیشہ مظلوم ہوتا ہے۔

عارفہ کی بدقسمتی یہ تھی کہ اس کے والد عارف کو ایک مقدمے میں جیل ہو گئی، عارفہ کی

ماں نسرین بی بی اپنے آشنا سے محبت کے عہد و پیماں کر کے گھر سے ڈھائی لاکھ اور چھوٹے بیٹے کو لے کر فرار ہو گئی۔ اس گھر کی تباہی کا قصہ یہیں ختم نہیں ہوا، عارفہ کی خالہ خیر النساء، عارفہ کو اپنے گھر لے آئی اور پھر اس عورت نے کم عمر عارفہ کی محرومیت کا فائدہ اٹھانا شروع کر دیا۔ اس نے عارفہ سے منشیات فروخت کروانی شروع کر دی تھی۔ وہ عارفہ کو لڑکوں کو پھنسانے کی ترغیب دیتی اور کہتی کہ تم جوان اور خوبصورت ہو، اپنی جوانی سے فائدہ اٹھاؤ اور اس عمر میں دولت کماؤ جو زندگی بھر کام آئے گی مگر عارفہ ہر بار انکار کرتی، روتی اور واسطے دیتی مگر اس کے جواب میں خیر النساء، عارفہ کو مارتی پیٹتی اور مختلف طریقوں سے ایذا پہنچاتی، کبھی جان سے مارنے کی دھمکیاں دیتی تو کبھی فروخت کرنے کی بات کرتی تھی۔

اخبار میں عارفہ کی تصویر کی دید، میری آنکھوں کی مجبوری ہے، یقیناً قلم کا حق ادا کرنے کے لیے عارفہ کی مظلومی کی داستان اور ظلم و جور کے روز نامے کو قرطاس پر منتقل کرنا ایک مشکل امر ہے ورنہ میں تو عارفہ کی تصویر سے نگاہیں چرا چکی تھی۔ معصوم عارفہ کا انکار جب شدت اختیار کر گیا تو اس کی خالہ نے چائے میں بے ہوشی کی دوا ملا کر اسے پلا دی اور پھر اسے درندوں کے حوالے کر دیا۔ عارفہ جب ہوش میں آئی تو وہ برباد ہو چکی تھی، لٹ چکی تھی اور اس کی دہشت اور وحشت ناک آنکھوں میں سوائے آنسوؤں کے کچھ بھی نہیں تھا، لفظ گنگ ہو چکے تھے اور اس مرحلے پر بھی خیر النساء، عارفہ کو زبردستی اس کام یعنی جسم فروشی پر اکسا رہی تھی کیونکہ وہ عارفہ کی ویڈیو بنا چکی تھی جس کے ذریعے وہ اب اسے بلیک میل کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

ایک عورت وہ بھی جو خالہ کے رشتے کی حامل ہو، بھلا اپنی فرشتوں کی طرح معصوم بھانجی کے ساتھ ایسا سلوک کیسے کر سکتی ہے؟ یہ سچ دیکھنے اور پڑھنے کے بعد بھی میرا دل اس سچائی کو تسلیم نہیں کرتا مگر سچ تو یہی ہے کہ زمانہ قدیم سے لوگ خواتین اور کم عمر لڑکیوں پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑتے آئے ہیں، کہیں حوا کی بیٹی کو اپنے مفادات کی بھینٹ چڑھایا جاتا ہے تو کہیں اپنے مفادات کی بھٹی میں جھونک دیا جاتا ہے اور کہیں سسرال میں حوا کی بیٹی پر تیل چھڑک کر آگ لگا دی جاتی ہے اور پھر مجرم پکڑے بھی جاتے ہیں، مقدمات بھی درج ہوتے

ہیں لیکن ہمارے ملک کا قانون اتنی سست روی سے ان مقدمات کی سماعت کرتا ہے کہ ملزمان ناکافی ثبوت و شواہد کا فائدہ اٹھا کر سزا سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔

خیر النساء کا اپنے مقصد کے حصول کے لیے اپنی بھانجی عارفہ پر ظلم و ستم جاری تھا کہ وہ کسی نہ کسی صورت فرار ہو کر اپنی جان اور عزت بچانے کی خاطر اپنے چچا کے گھر پہنچ گئی تھی۔ عارفہ کے چچا نذیر نے اپنی بھتیجی کی مدد کے لیے قانون کا دروازہ کھٹکھٹایا لیکن کسی نے ان کا ساتھ نہیں دیا۔ عارفہ کی خالہ خیر النساء کے خلاف نہ تو کوئی ایف آئی آر درج کی گئی اور نہ ہی اب تک کوئی قانونی چارہ جوئی کی گئی ہے۔ اس حوالے سے عارفہ کا کہنا ہے کہ اس کی خالہ کے گھر کئی پولیس اہلکار بھتہ لینے آتے ہیں، شاید اسی لیے وہ خیر النساء خالہ کو کچھ نہیں کہتے۔

ہمارے ملک میں جہاں آزاد عدلیہ، پارلیمنٹ کی بالادستی ہے، قانون کا بول بولا ہے، وہاں آج بھی جمہوری دور میں قانونی مدد کے حصول اور انصاف کی فراہمی کے لیے کمزور لوگوں کو دربدر کی ٹھوکریں کھانا پڑتی ہیں۔ میں نہیں جانتی کہ عارفہ کو انصاف ملے گا یا نہیں؟ عارفہ کا مستقبل کیسا ہوگا؟ عارفہ کے ساتھ ساتھ عزیز نگر اورنگی ٹاؤن کی صبا بھی مجھے نہیں بھولتی جب سے میں صبا سے مل کر آئی ہوں، سچ کہوں، بہت مضطرب ہوں۔ میرا تو اب رونے کو دل بھی نہیں چاہتا کیونکہ ایک وقت ایسا بھی آتا ہے جب آنسو بھی ساتھ چھوڑ دیتے ہیں۔ سترہ سالہ صبا نے مجھے بتایا کہ وہ ایک ہفتے پہلے تک بہت خوش تھی کیوں کہ اگلے مہینے اس کی شادی ہو رہی تھی۔

"میں نے پوچھا، ہو رہی تھی، سے تمہاری مراد کیا ہے؟" تو وہ رونے لگی۔ میں اس کے رونے کی وجہ جانتی ہوں اس لیے میں نے اسے دلاسہ دینے کی ناممکن کوشش کی۔

"آپ کو پتا ہے، ہم غریب لوگوں کی سب سے بڑی مجبوری جہیز ہے، میں سات بہن بھائیوں میں پہلے نمبر پر ہوں۔ جونہی میں نے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا، میرے ماں باپ کو میرے لیے جہیز جمع کرنے کی فکر ستانے لگی لیکن جو باپ اپنے بچوں کو دو وقت کی روٹی نہیں کھلا سکے، سوچیے، اس کے لیے جہیز جمع کرنا کتنا تکلیف دہ امر ہوگا......!!" صبا نے آنسوؤں سے بھیگی آواز میں کہا تھا۔ "ایک دن مجھ سے میرے بابا نے پوچھا کہ تمہیں جہیز میں کون سی

ایسی چیز ہے جو ہر قیمت پر چاہیے؟ تو میں نے کہا...... ڈنر سیٹ۔"

"کیا ڈنر سیٹ؟" بے اختیار میرے منہ سے نکلا تھا۔

"جی ہاں، ڈنر سیٹ...... اپنے گھر میں اسٹیل کے برتن دیکھ دیکھ کر مجھے شدید چڑ محسوس ہوتی ہے۔ میں ہمیشہ یہی سوچتی ہوں کہ میرے گھر میں کانچ کے برتن کیوں نہیں ہیں؟ خوش رنگ پھولوں والی پلیٹوں میں، میں کیوں نہیں کھانا کھا سکتی؟ اسی لیے میں نے اپنے بابا سے فرمائش کی کہ مجھے کچھ دیں یا نہ دیں مگر ایک اچھا سا ڈنر سیٹ ضرور دیجیے گا۔"

"اچھا......" بابا نے آہستگی سے کہا۔

"اور آپ جانتی ہیں، میری اس فرمائش پر بابا کی آنکھیں تک مسکرانے لگیں، انہوں نے میرے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "میں اپنی بیٹی کو اپنے ساتھ لے جاؤں گا اور اسے اس کی پسند کا ڈنر سیٹ دلا کر لاؤں گا۔"

"ہوں......" میں نے اسی پر اکتفا کیا۔

"جس لڑکے سے میرا بیاہ ہو رہا تھا، اس کے ماں باپ بہت لالچی تھے، وہ آئے دن میرے بابا کے کان بھرتے رہتے، میری امی کو پریشان کرتے رہتے، نت نئی فرمائشیں تھیں ان کو، جہیز میں یہ چاہیے، جہیز میں وہ چاہیے۔ میں چھپ چھپ کے سنتی رہتی لیکن میں کچھ کہہ نہیں پاتی۔ میں جانتی ہوں، والدین مجبور ہیں، پہلی مجبوری تو یہ کہ کم آمدنی کی وجہ سے میرے لیے جہیز اکٹھا کرنا ان کے لیے کسی بارسے کم نہیں جبکہ دوسری مجبوری یہ کہ آج کے دور میں کماؤ پوت ملتا کہاں ہے اور میری یہ خوش قسمتی تھی کہ میرا ہونے والا شوہر کماتا تھا۔" صبا نے آنکھوں میں آئے آنسوؤں کو دوپٹے کے کونے میں جذب کیا۔

"ایسے نہیں کہتے، تمہاری اب بھی شادی اسی انداز میں ہوگی جیسے تم چاہتی ہو۔" اس کی ذہنی کیفیت اس وقت میری سمجھ سے باہر تھی اس لیے مجھ سے جو بن پڑا، میں نے کہہ دیا لیکن میرے جواب پر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی، یقیناً اس کی آنکھوں میں اپنے بابا کا چہرہ گھوم گیا ہوگا جو اپنے تیرہ سالہ بیٹے محمد ذیشان کو بلانے گھر سے نکلے تھے۔ ذیشان قریبی دکان تک گیا تھا اور گھر میں دسترخوان پر سب اس کا انتظار کر رہے تھے۔ باپ سے صبر نہیں ہوا تو وہ

خود بیٹے کو بلانے کے لیے گلی کے نکڑ تک ہی آیا تھا کہ طاغوت اور جبروت کی خودکار رائفلوں سے بارش کی طرح سے آتی ہوئی گولیوں نے محمد اعظم کا سینہ چھلنی کر دیا تھا اور پھر دہشت گرد اپنی بولی بولتے موٹر سائیکلوں پر سوار آناً فاناً غائب ہو گئے مگر صبا اور اس کے گھر والوں پر قیامت گزر گئی تھی۔

''یقیناً بابا کے جانے کے بعد زندگی مشکل ترین ہو گئی ہو گی لیکن صبر سے کام لو۔ انشاء اللہ...... سب اچھا ہو جائے گا۔'' میرا لہجہ سپاٹ تھا اور چہرہ احساسات سے عاری، شاید میرا ضمیر ایک پل کے لیے مردہ ہو گیا تھا۔

''سب اچھا ہو جائے گا؟'' صبا زیرِ لب بڑبڑائی تھی۔ ''جس وقت میرے باپ کا جنازہ اٹھایا جا رہا تھا، اس وقت میرے ہونے والی ساس نے میری ماں کو سہارا دینے کے بجائے ان کا ہاتھ آہستگی سے دباتے ہوئے کہا تھا کہ اب یہ رشتہ ہماری طرف سے تم ختم سمجھو۔'' صبا کی آنکھوں سے جھرنا پھوٹا تھا اور لب کرب سے لرز رہے تھے۔

میں خود بھی ایک لڑکی ہوں، اس وقت صبا کا چہرہ پڑھتے ہوئے میرے اوسان بھی خطا ہو چکے تھے۔ میں مرے ہوئے قدموں سے پلٹ آئی تھی۔

O......O......O

''جہیز ایک لعنت ہے تو پھر ہم اس پر لعنت کیوں نہیں بھیج دیتے؟'' میرے اپنے لفظوں کی بازگشت میرے کانوں میں دھماکے کر رہی تھی۔

''اوہ خدایا...... ! صرف اس وجہ سے شادی سے انکار کر دیا گیا کہ اب ان کو جہیز ملنے کی امید نہیں تھی۔ جہیز تو دور کی بات، صبا اور اس کے گھر والوں سے ان کا سایہ ہی چھین لیا گیا۔ کوئی قصور نہیں، کوئی دشمنی نہیں، نامعلوم افراد جانے کس کے نام کی گولیاں محمد اعظم کے سینے میں اتار گئے؟ دہشت گردوں کی کھلی آزادی اور روزانہ کی ٹارگٹ کلنگ آخر کب تھمے گی؟ آخر کیوں حکومت اور قانون نافذ کرنے والے ادارے وسیع اختیارات کے باوجود مصلحتاً کمزور اور دہشت گرد طاقتور نظر آتے ہیں؟

سال کے بارہ مہینے قتل و غارت گری اور خون ریزی کا بازار گرم رہتا ہے اسی لیے اب

میرے شہر کی کہانی...... ارم زہرا

شہر کراچی کو دنیا کی ایسے دہشت خطرناک شہروں میں شمار کیا جانے لگا ہے جہاں کسی کی جان و مال محفوظ نہیں۔ افسوس کا مقام تو یہ ہے کہ آج مارنے والا بھی یہ نہیں جانتا کہ وہ کسے اور کیوں مار رہا ہے؟ کرائے کے قاتل کیسے اس کمائی سے جانے کیسے نوالے اپنے حلق سے اتارتے ہیں؟ کیا ان کی نظروں میں وہ معصوم گھرانے نہیں گھومتے جن کے وارث کو مار کر ان کے منہ سے نوالے چھین لیے جاتے ہیں۔ کاش کوئی ان کے بارے میں سوچے تو سہی، آخر ان کا قصور کیا ہے؟

شاید میں نا سمجھ ہوں جبھی ہر وقت یہی سوچتی رہتی ہوں کہ قصور کس کا ہے؟ زمین کا، تاریخ کا کہ اس انسانی جبلت کا جس کے متعلق فرشتوں نے آدم خاکی کی تخلیق کے وقت ہی یہ خدشہ ظاہر کیا تھا کہ یہ زمین پر فساد کرے گا اور خون بہائے گا......!!

☆......☆......☆

یہ زندگی کے راستے

"میں پورے پندرہ سال بعد ٹرین میں بیٹھی ہوں، وہ سفر آج بھی مجھے یاد آتا ہے تو میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔" مہربانو نے کرب سے لب کاٹتے ہوئے وارث کو دیکھا پھر ایک مضمحل سی سانس بھر کر رہ گئی۔

"اچھا لیکن ایسا کیا ہوا تھا؟" وارث نے حیران نظروں سے مہربانو کو دیکھا۔

"وارث...... میں ٹرین کی کھڑکی سے گزرتے ہوئے اسٹیشنوں کو دیکھ رہی تھی۔ خوف مجھ پر سوار تھا اور میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں کسی طرح کھڑکی سے چھلانگ لگا دوں۔ مخصوص شکل کی چوٹیاں، بل کھاتی ہوئی ندیاں اور جنگل سب ہی کچھ تو میرے راستے میں آ رہا تھا مگر مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ میں کھڑکی سے باہر گھپ اندھیرے میں چھلانگ لگا سکوں۔" خوف مہربانو کے لہجے میں نمایاں تھا۔

"مگر اب تم میری شریک حیات ہو، تمہیں اپنے دل سے اس طرح کے خوف کو نکال دینا چاہیے۔" وارث نے آہستگی سے مہربانو کا ہاتھ تھاما۔

"نہیں وارث...... میں اپنی زندگی کے وہ پل کبھی نہیں بھول سکتی جس نے مجھے میرے اپنوں سے دور کر دیا۔ مجھ سے میرے ماں باپ، بھائی کا پیار چھین لیا۔ آپ جانتے ہیں وارث، وہ شخص مجھے اغوا کر کے لے جا رہا تھا اور میں کھڑکی سے چپکی اس کی لال بھبھوکا آنکھوں تو کبھی کھڑکی سے باہر چاروں طرف پھیلے اندھیرے کو تک رہی تھی۔ سسکیاں مجھ میں

ٹوٹ رہی تھیں اور میرے آنسو رو رو کر خشک ہو چکے تھے۔" باقاعدہ ہچکیوں سے روتے ہوئے مہربانو نے اپنا سر جھکا لیا۔

"پھر تم ایدھی ہوم کیسے پہنچیں؟" وارث کا لہجہ سوالیہ تھا۔

"میری کیفیت اور اس شخص کی مشکوک حالت دیکھ کر ڈبے میں بیٹھے لوگوں کو شک ہو گیا اس پر...... لوگوں نے اس سے پوچھ گچھ شروع کی تو وہ خوف زدہ ہو کر بھاگ گیا، یوں وارثوں کے ہوتے ہوئے ایدھی ہوم کے لاوارث بچوں کے درمیان آ گئی میں۔" مہربانو اب پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔

"تم نے کبھی اپنے ماں باپ کو ڈھونڈنے کی کوشش نہیں کی یا ان کی طرف سے کوئی پیش قدمی؟" وارث نے مہربانو کے چہرے پر رحم طلب نظریں دوڑائیں۔

"نہیں وارث...... میں اتنی چھوٹی تھی کہ نہ مجھے اپنے گھر کا پتا معلوم تھا اور نہ ہی اپنے گاؤں کا نام، مجھے تو اپنا نام بھی یاد نہیں، بس گھر والے مجھے پیار سے رجو کہتے تھے، اس سے زیادہ کچھ نہیں۔" مہربانو نے ایک طویل گہرا سانس لیا۔

"ہوں......" وارث نے اسی پر اکتفا کیا۔

"میرا نام مہربانو، بلقیس آنٹی نے رکھا ہے اور آپ کو پتا ہے وارث، ان کی بیٹی کبریٰ ایدھی نے مجھے ایک ماں کا پیار دیا ہے، یہ ان کی محبت کا اعجاز ہے کہ میں آج پڑھ لکھ کر اس قابل ہو گئی ہوں کہ ہر طرح کے حالات کا مقابلہ کر سکوں۔"

"یہ تو واقعی ایک نیکی کا کام ہے جو انہوں نے انجام دیا ہے۔" وارث نے تھوڑی سہلاتے ہوئے مہربانو کی جانب دیکھا۔

"لیکن یہ بھی تو ایک نیکی ہے وارث، کہ آپ نے ایدھی ہوم میں رہنے والی ایک لاوارث لڑکی کو اپنا شریک سفر بنا لیا؟"

"مجھے بابا نے جب تمہارے بارے میں بتایا تو میں تمہیں دیکھنے کا متمنی تھا۔ میں نے بابا سے کہہ دیا تھا کہ اگر لڑکی مجھے پسند آئی تو ہی شادی ہو گی اور تمہیں دیکھتے ہی میں اپنا دل ہار بیٹھا۔" وارث نے قدرے شوخ ہوتے ہوئے مہربانو کے قریب خود کو کیا تو وہ سمٹ سی گئی۔

''اف...... آپ بھی لیکن یہ میری خوش نصیبی ہے کہ آپ کی صورت مجھے ایک بہترین شریک حیات مل گیا۔'' مہربانو کے چہرے پر انوکھی خوشی کے آثار نمایاں تھے۔

''اچھا مہرو...... میر پور کچھ ہی گھنٹے کے فاصلے پر رہ گیا ہے، آزاد کشمیر کا شہر میر پور تمہارے کراچی سے زیادہ خوبصورت ہے۔'' وارث کے لہجے میں زعم تھا۔

''تو ڈھونڈلی ہوتی کوئی میر پور والی، کراچی آنے کی کیا ضرورت تھی؟'' مہربانو نے منہ بنایا۔

''بھئی...... میری مہرو سی خوبصورت پورے میر پور میں نہیں تھی اسی لیے تو کراچی آنا پڑا۔''

''اوہ ہو مہرو......!'' مہربانو نے شوخی سے کہا۔

''پیار سے پکارا تھا یار...... کیا برا لگا؟'' وارث نے بھی شوخی سے اسے دیکھا۔

''پیار سے پکارنا ہے تو رجو ہی پکارلیں۔ مجھے میرے ماں باپ اسی نام سے پکارتے تھے۔'' اداسی اگلے ہی پل مہربانو کے لہجے میں ہچکولے لینے لگی۔

''رجو بھی پیارا ہے اور بات سنو، آنکھوں کی تازگی اور ہونٹوں کی مسکراہٹ جلدی سے واپس لے آؤ، ہمارا اسٹیشن قریب آنے والا ہے۔ اماں اور ابا کے سامنے ایسے جاؤ گی کیا؟ ابا تو میرے کان مروڑ دے گا، کہے گا، نئی نویلی دلہن بیاہ کر لا رہا ہے یا اغوا کر کے؟'' وارث نے انجانے میں اس کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔

''اغوا......؟'' مہربانو نے ایک طویل سانس لی اور آہستگی سے بولی۔

''بھئی...... اس بار اغوا کرنے والا بیچ راستے میں تمہیں چھوڑ کر نہیں بھاگے گا۔ اب تو تم عمر بھر میری تابع رہو گی۔'' وارث کا لہجہ محبت میں ڈوبا اور جذباتی ہو گیا تھا۔

''مجھے بھی منظور ہے۔'' مہربانو اسے بے حد عقیدت اور محبت سے دیکھتے ہوئے بولی۔

''رجو...... اپنے چہرے کی اس رونق کو ہمیشہ برقرار رکھنا میرے لیے۔ میں تمہارا ہم سفر تو ہوں ہی لیکن بہترین دوست بھی ثابت ہوں گا۔'' وارث کے لہجے میں محبت ہی محبت تھی۔

''جب وقت حسین، دلکش اور دلربا لگنے لگتا ہے تو جانے کیوں جلدی گزرنے لگتا ہے؟''

مہربانو کھڑکی سے بل کھاتی ہوئی ندیوں کو دیکھتے ہوئے خود سے مخاطب تھی جب کہ وارث برتھ سے سفری سامان اتارنے میں مصروف ہو چکا تھا۔

O......O......O

''واہ...... واہ...... میری بہو تو بڑی سلیقہ شعار ہے۔'' ناز بی بی نے مہربانو کو سلیقے سے دستر خوان لگاتے دیکھا تو بے اختیار اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔

''بھئی...... میری بڑی خواہش تھی کہ میں اپنی بہو شہر سے لے آؤں۔ جب کبھی وارث کراچی جاتا تو یہ خواہش اور زور پکڑنے لگتی۔ اب کراچی میں تو اپنا کوئی ہے نہیں لیکن پھر مجھے خیال آیا، کیوں نہ ایدھی ہوم......'' اکبر علی ابھی آگے کچھ کہتے کہ ناز بی بی نے انہیں اشارے سے خاموش کرایا۔

''بس...... بس...... اس سے آگے کہنے کی کیا ضرورت ہے؟ بچی کا دل دکھتا ہوگا، بس اب یہ اس گھر کی بیٹی ہے اور ہمارے وارث کی بیوی۔ اب اس کی پہچان یہی ہے۔'' ناز بی بی نے معصوم سے چہرے والی مہربانو کو بغور دیکھا۔

''نہیں میری بچی......! اداس نہیں ہوتے۔ چلو جا کر اب وارث کو بلا لاؤ۔ جب تک آواز نہیں دو، ہلتا نہیں ہے اپنی جگہ سے۔'' ناز بی بی نے ماتھے کا بوسہ لیتے ہوئے مہربانو کو خفت سے آزاد کرانے کی کوشش کی۔

''جی امی...... بس ابھی بلا کر لاتی ہوں۔''

''لو بھئی...... بہو کیا آگئی اس گھر میں، اب ہمارے بولنے پر بھی پابندی لگ گئی۔'' اکبر علی نے برا سا منہ بنا کر ناز بی بی کو دیکھا۔

''اب آپ بھی بہو کے سامنے بار بار ایدھی ہوم کا ذکر نہیں کیا کریں۔''

''جانتا ہوں، بس یونہی، خیر...... یہ تو بتاؤ، اس کے کاغذات اصلی تو ہیں ناں؟''

''مطلب کیا ہے آپ کا؟'' ناز بی بی کے لہجے میں حیرت تھی۔

''ارے...... شہر کی پڑھی لکھی لڑکی ہے۔ کچھ خبر نہیں ناں، کہیں جعلی ڈگری لائی ہو۔ آج کل شہروں میں یہ بات عام ہے ناں۔''

''اب اس کا مجھے پتا نہیں لیکن عادت و اطوار سے واقعی نفیس طبیعت کی مالک ہے۔''

''تم بہو کے کان میں یہ بات ڈال دینا کہ ہم لندن کے لیے اپلائی کرنا چاہتے ہیں تو اپنی ساری ڈگریاں نکال لے۔'' اکبر علی بڑے ہی محتاط انداز میں گفتگو کر رہے تھے۔

''اب اتنی جلدی کیا ہے؟ ذرا رک کر یہ کام کر لینا۔'' تاز بی بی نے مہربانو کے کمرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''ارے پاگل...... یہ کاغذی پروسس کتنا طویل ہوتا ہے، تمہیں کیا پتا؟ یہ کام تو جتنی جلدی ہو جائے، اتنا ہی اچھا ہے۔ سجاد بار بار لندن سے کال کر رہا ہے۔ ابھی وقت اپنے ہاتھ سے نکل گیا تو جا چکا تیرا وارث لندن......'' اکبر علی کے لہجے میں جیسے غصے کی چنگاریاں تھیں۔

''ایک تو تم اور تمہارا بھائی دونوں ہوا کے گھوڑے پر سوار رہتے ہو۔ کرتی ہوں بات میں بہو سے۔'' تاز بی بی ہولے سے بولیں۔

''لو آ گئے دونوں۔'' اکبر علی نے وارث اور مہربانو کو آتے دیکھا تو خود بھی جلدی سے دسترخوان کی جانب بڑھ گئے۔

''چلو بیٹا...... بسم اللہ کرو۔ دسترخوان لگتے ہی فوراً آتے ہیں۔''

''ارے...... میری ماں، سفر کی تھکان جو ابھی نہیں اتری، کیا کروں؟'' ایک بڑی سی جمائی لیتے ہوئے وارث گویا ہوا۔

''چلو بہو، تم نکالو، یہ سدا کا ست ہے۔'' تاز بی بی نے مہربانو کو مخاطب کیا تو وہ شریری مسکراہٹ لبوں پر سجائے وارث کو دیکھنے لگی جو چھوٹے سے بچے کی طرح ماں کے گلے لگ چکا تھا۔

O......O......O

''میں یقیناً قسمت کا دھنی ہوں جبھی اتنی پڑھی لکھی اور ساتھ ہی خوبصورت بیوی مجھے ملی ہے۔'' وارث نے مہربانو کے کاغذات فائل کرتے ہوئے کہا۔

''اور مجھے اس بات پر فخر ہے کہ مجھے اتنا سمجھنے والا، پیار کرنے والا شوہر ملا ہے۔'' مہربانو کھوئے کھوئے لہجے میں بولی۔

"تو پھر تیار ہو ہمارے ساتھ لندن جانے کے لیے؟" وارث ترچھی نظر سے اسے دیکھتے ہوئے بولا۔

"آپ جہاں چاہے، لے جائیں، جس حال میں چاہے رکھیں، میں تو بس آپ کی رفاقت چاہتی ہوں۔" مہربانو کے لہجے کی شگفتگی اور سادگی وارث کے کانوں میں رس گھول رہی تھی۔

"سچ...... تمہیں پا کر میں بہت خوش ہوں، مجھے یقین ہے، تمہارا ساتھ میری زندگی حسین بنا دے گا۔"

"وارث...... آپ جانتے ہیں، آپ سے ملنے سے پہلے میں اکثر سہانے خواب دیکھا کرتی تھی مگر ڈرتی تھی جو خواب پورے نہیں ہو سکتے کبھی، انہیں آنکھوں میں سجانے کا کیا فائدہ......؟"

"پھر......؟" وارث کے ہونٹوں پر بڑی دل فریب مسکراہٹ جاگی۔

"لیکن اب بہت خوش ہوں۔ اللہ نے میری دعائیں قبول کیں، میرے خوابوں کو حقیقت کا روپ دے دیا اور مجھے آپ سے ملا دیا۔"

"مہرو...... تم ہمیشہ میری رہو گی ناں، میرے دوست کہتے ہیں، لڑکیاں بے وفا ہوتی ہیں۔ کبھی ان پر اعتبار نہیں کرنا چاہیے۔" وارث اپنی رو میں بولتا جا رہا تھا۔

"نہیں وارث...... میں ہمیشہ آپ کا ساتھ دوں گی، میں آپ کی شریک حیات تو ہوں ہی لیکن ساتھ ہی آپ کا یہ مجھ پر احسان عظیم ہے کہ آپ مجھے اس جگہ سے نکال کر لے آئے جہاں میری کوئی پہچان نہیں تھی، مجھے لگتا تھا، وہ چار دیواری تا عمر میرا مقدر بنی رہے گی لیکن پھر یہ سوچ کر مطمئن ہو جاتی کہ ایک بھیڑیئے کے پنجے سے تو نکل آئی۔" مہربانو رشک آمیز نگاہوں سے وارث کو دیکھنے لگی۔

"ہاں بھئی...... ایک بات اور، وہ یہ کہ میں پوری کوشش کروں گا کہ تمہیں تمہارے والدین سے ملوا سکوں، تم مجھے ان کی نشانیاں بتاؤ، شاید میں ڈھونڈوانے میں کچھ تمہاری مدد کر سکوں۔" وارث نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا تھا۔

"اے کاش، مجھے کچھ یاد آجائے، میں اس وقت بہت چھوٹی تھی جب مجھے اغوا کیا گیا تھا، صرف چار سال کی۔ وارث...... میں نے اپنی زندگی کے بیس سال اس آس میں گزارے ہیں کہ ایک دن میں اپنے گھر والوں سے مل سکوں گی مگر دل کی سرزمین پر وہم اور خدشات کی جو جھاڑیاں اگ آتی ہیں، وہ میرے کومل جذبوں کو بھی برباد کر دیتی ہیں۔" مہربانو کے لہجے میں کرب امڈ آیا تھا۔

"یار...... میں سمجھ سکتا ہوں تمہارے جذبات لیکن یہ بھی تو سوچو، میرے ماں اور بابا بھی تو تمہارے اپنے ہیں، جب تمہیں اپنی امی یا ابو کی یاد ستائے، تم ان کے ساتھ بیٹھ کر دل کا بوجھ ہلکا کر لیا کرو۔" وارث نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"جی وارث...... ضرور، اچھا وارث، میں نے سنا ہے، لندن جانا تو بہت مشکل ہوتا ہے۔ اگر آپ ملک سے باہر جانا چاہتے ہیں تو کہیں اور کیوں نہیں اپلائی کرتے جہاں سے ویزہ آپ کو آسانی سے مل جائے؟" مہربانو خود کو سنبھالتے ہوئے بولی۔

"ارے نہیں...... میرے چچا لندن میں کافی عرصے سے مقیم ہیں، مجھے کوئی مشکل درپیش نہیں ہوگی، بس لندن جانے کے لیے ایک شرط تھی کہ میں اپنی بیوی کے ساتھ جاؤں۔"

"کیا مطلب...... یہ شرط کس نے لگائی۔ ہے؟" مہربانو نے چونک کر وارث کو دیکھا۔

"مم...... مم...... میرا مطلب ہے، یہ شرط میرے دل نے لگائی ہے کہ جاؤں گا تو اپنے ساتھی کے ساتھ۔ کیوں، کیا تمہارا دل نہیں چاہ رہا کہ ہم اپنا ہنی مون لندن میں منائیں؟" وارث نے بات کا رخ اچانک ہی موڑا تھا۔

"ہاں...... کیوں نہیں۔" مہربانو کے چہرے پر حیاانگیز مسکراہٹ کا ہالہ نمایاں تھا۔

"تو بس پھر دعا کرو یار، خدا ہماری راہ میں آنے والی ہر ہر رکاوٹ کو دور کر دے۔" وارث نے جذباتی انداز میں کہا اور لیٹ گیا جبکہ مہربانو کے چہرے پر سکون اور طمانیت بھری مسکراہٹ تھی۔

O......O......O

مہربانو اور وارث کی شادی کو ابھی چھ ماہ ہی ہوئے تھے کہ قسمت کی دیوی نے انہیں

لندن پہنچا دیا۔ وارث کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا جبکہ مہربانو کی خوشی بھی قابل دید تھی، اسے لندن آنے سے زیادہ اس بات کی خوشی تھی کہ اس کا شریک حیات خوش ہے مگر اب مہربانو کی زندگی میں ایک بڑا چیلنج آ گیا تھا، جب تک وہ پاکستان میں تھی، باہر نکلا کرتی تھی، گھوما پھرا کرتی تھی، گھر میں وارث کے والدین تھے جن کے ساتھ وہ خوب باتیں کیا کرتی، ان کی خدمت کرنا وہ اپنا فرض سمجھتی تھی مگر یہاں لندن آنے کے بعد وہ ایک کمرے میں بند ہو کر رہ گئی تھی۔ دیار غیر میں نہ تو کوئی اس کا رشتہ دار تھا اور نہ ہی دوست احباب،، بس پورا دن ایک کمرے میں بند اپنی تنہائیوں سے وہ مخاطب رہتی۔ وارث جاب کے حصول کے لیے زیادہ تر گھر سے باہر ہی رہا کرتا، یوں پانچ چھ ماہ کی قلیل خوشی کے بعد ایک بار پھر اسے تنہائی نے آ گھیرا تھا، اسے شدت سے ایدھی ہوم کا وہ کمپارٹمنٹ یاد آ رہا تھا جہاں وہ ننھے ننھے بچوں کو تعلیم دیا کرتی پھر شام سلائی کڑھائی کی کلاسز لیا کرتی تھی۔ وقت یقیناً بہت اچھا گزر رہا تھا مگر یہاں آنے کے بعد وہ بالکل اندر سے بجھ گئی تھی اور شاید کام کی زیادتی کی وجہ سے وارث بھی الجھا الجھا سا رہنے لگا تھا اور اسے بہت کم ٹائم دینے لگا تھا۔

''یہ تقدیر کے فیصلے بھی کتنے اٹل ہوتے ہیں، ہماری سوچوں سے جدا، میری بھی کیا قسمت ہے، منگ جو چھوٹا سا ایک گاؤں ہے، وہاں سے مجھے میری قسمت کراچی لے آئی، کراچی سے آزاد کشمیر کے شہر میرپور اور اب لندن مگر شہر اور ملک بدلنے سے اداسی نے اپنی جگہ نہیں بدلی، وہ آج بھی میرے ہی دل کو اپنی آماجگاہ سمجھتی ہے۔'' مہربانو اداسی کے جاں گسل میں ڈوبی بے ارادہ کمرے میں ٹہلنے لگی۔

''وارث کو تو اب تک آ جانا چاہیے تھا؟'' بے خیالی میں وہ دیوار پر لگی وال کلاک کو دیکھتے ہوئے بولی تھی۔

O......O......O

''لو بھئی...... دیکھ لیا تم نے، وارث اپنے قول و فعل کا پکا ہے۔'' وارث نے سامنے بیٹھی ہوئی نیہا کو مخاطب کیا تھا۔

''سچ وارث...... مجھے خوف اور اندیشے پریشان کر رہے تھے۔ یہ مجھے قطرہ قطرہ اندر

سے کھوکھلا کر رہے تھے۔ اگر تم لندن نہیں آتے تو میرا کیا ہوتا؟'' نیہا جذباتی انداز میں گفتگو کر رہی تھی۔

''تم بچپن کی محبت ہو، ایسے کیسے تمہیں چھوڑ دیتا؟ سچ...... تمہاری محبت کی خاطر کیا کیا پاپڑ بیلنے پڑے ہیں مجھے۔ خیر...... چھوڑو اب ان سب باتوں کو، اتنے دنوں بعد ملے ہیں، میرے دل پر چھائی رنگین فضا، ساری رومانیت تمہارے واہموں کی نذر ہو رہی ہے۔'' وارث اس کی باتوں سے خفا نظر آ رہا تھا۔

''اچھا بھئی...... اپنی خفگی دور کرو اب، مجھے پہلے یہ بتاؤ، پاکستان میں سب کیسے ہیں؟ تمہاری امی، بابا اور میرے گھر والوں سے تو مل کر آئے ہو ناں؟''

''ہاں بھئی...... وہاں سب خیریت ہے، سب ٹھیک ہیں، تمہارے گھر والے تمہیں بہت یاد کرتے ہیں، ویسے تمہیں نہ جانے کس کیڑے نے کاٹا تھا کہ یہاں پڑھنے چلی آؤ؟'' وارث منہ بچھلاتے ہوئے بولا تھا۔

''لیکن وارث...... یہ تو سوچو، اب ہم دونوں مل کر اپنی زندگی سنواریں گے، ہم اب اپنی زندگی اپنے طریقے سے گزاریں گے لیکن......'' نیہا کے چہرے پر خوف اور وہم ایک بار پھر رقصاں تھے۔

''لو بھئی...... اب کیا ہو گیا؟'' وارث نے بے ساختہ پوچھا۔

''تمہاری بیوی جس کی بدولت تم یہاں تک پہنچے ہو، اسے کیا بتاؤ گے؟''

''ارے یار...... چھوڑو، مجھے اس کی پروا نہیں اسی لیے تو اسے ایدھی ہوم سے پسند کر کے لایا تا کہ بعد میں اسے چھوڑنے میں آسانی ہو۔ سچ...... اس کا کوئی پرسان حال نہیں۔''

''کیا......؟'' نیہا کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔

''تم اتنی ڈپریس اور ٹینس مت ہو۔ اسے میں سنبھال لوں گا۔ تم بس اب مجھ سے ملن کی تیاری کرو۔ قسم سے، تمہیں پانے کے لیے میں نے بڑے جتن کیے ہیں۔'' وارث ایک گہری سانس بھر کر مسکرایا تھا۔

''لیکن وارث...... یہ سب اتنا آسان نہیں ہے۔ کیا تم حقیقت میں اپنی بیوی کو چھوڑ دو

گے؟'' نیہا مسلسل اندیشوں کے حصار میں تھی۔

''یہ میرا مسئلہ ہے، میں اسے سنبھال لوں گا مگر مجھے تم سے اس طرح کے جملوں اور باتوں کی توقع نہیں تھی۔ مجھے لگا تھا تم مجھے دیکھتے ہی خوشی سے جھوم اٹھوگی اور کہوگی، بس اب اور انتظار نہیں کر سکتی، ہمیں کورٹ میرج کر لینی چاہیے۔'' وارث کے لہجے میں تناؤ آ گیا تھا۔

''ارے نہیں وارث...... میں سچ، بہت خوش ہوں، مجھے خوشی ہے کہ تم نے ہماری محبت کا مان رکھا اور جو وعدے ہم نے کیے تھے، تم اسے نبھانے کے لیے آ گئے ہو۔'' نیہا کا لہجہ محبت سے معمور تھا۔

''شکر خدا کا، مجھے اپنی نیہا پہلے والے موڈ میں تو نظر آئی۔ چلو ٹھیک ہے، تم ہاسٹل کی راہ لو پھر کل لندن ٹاور پر ملتے ہیں۔'' وارث کھڑے ہوتے ہوئے بولا تھا۔

''ٹائم پر آ جانا۔'' نیہا کے لبوں کی تراش میں مسکراہٹ زندہ ہوئی۔

''میں مطلوبہ ٹائم سے پہلے آ جاؤں گا۔'' وارث اپنے مخصوص انداز میں مسکرایا اور پھر دونوں مخالف سمت اپنی اپنی راہ لے چکے تھے۔

O......O......O

''آپ کہاں رہ گئے تھے وارث......؟ سچ، میں بہت پریشان ہوگئی تھی۔'' مہربانو کے لہجے میں سخت بے چارگی تھی۔

''کام ڈھونڈنے نکلا تھا، کوئی عیش کرنے نہیں گیا تھا۔ پتا ہے، لندن میں رہنا اتنا آسان نہیں اور تم میرے لیے پریشان مت ہوا کرو۔'' وارث سخت چڑے ہوئے لہجے میں کہہ رہا تھا۔

''آپ کے جو چچا یہاں مقیم ہیں، ان سے کہیں کہ وہ کوئی کام دلوا دیں اور......'' مہربانو نے جملہ ادھورا چھوڑا تھا۔

''ارے...... ان کا یہی احسان ہے کہ انہوں نے ہمیں یہاں بلا لیا۔ خیر...... مل جائے گی نوکری، تم پریشان مت ہو۔'' وارث اس سے نظریں چراتے ہوئے اپنی جرابیں اتار کر جوتے میں رکھنے لگا۔

''وارث...... جیسا آپ بہتر سمجھیں، آپ کو پتا ہے، آج دن میں میری طبیعت خراب ہو گئی تھی مگر چاہنے کے باوجود بھی آپ سے رابطہ نہیں ہو سکا۔ شاید آپ کہیں بزی تھے جبھی میرا فون ریسیو نہیں کیا؟'' مہربانو مجرمانہ انداز میں سر جھکاتے بولی۔ ''خیر...... میں ڈاکٹر کے پاس گئی تھی۔''

''کیا...... ڈاکٹر کے پاس؟ مگر کیسے اور کس کے ساتھ؟ کہیں اکیلی تو نکل نہیں گئیں؟''

''نہیں وارث...... ہماری پڑوسن ایک بہت اچھی خاتون ہیں، اردو اسپیکنگ بھی ہیں، ان کے ساتھ میں گئی تھی۔'' وہ شکوہ کناں لہجے میں بتا رہی تھی۔

''چلو پھر ٹھیک ہے، اب تم بھی آرام کرو اور مجھے بھی سونا ہے۔'' وارث بستر پر لیٹتے ہوئے بولا تھا۔

''وارث...... مجھے آپ کو اور بھی کچھ بتانا ہے؟'' مہربانو کے چہرے پر معصومیت تھی اور آواز میں اشتیاق۔

''اب کیا ہے یار...... سکون سے سونے دو۔'' وارث نے منہ بسورا اور کروٹ لے لی۔

''وارث...... ایک خوش خبری ہے ہمارے لیے۔''

''خوش خبری...... کیسی خوش خبری؟'' وارث بے ساختہ اٹھ کر بیٹھ گیا تو مہربانو جھینپ کر ہنس دی مگر شرم مانع رہی۔

''تم پہیلیاں کیوں بجھوا رہی ہو؟''

''خداوند تعالیٰ چاہتا ہے کہ ہمیں بہت جلد اولاد کا سکھ بھی مل جائے۔'' مہربانو کے لہجے میں شرم عیاں تھی۔

''اوہ تو...... کیا کہہ رہی ہو؟'' وارث کو شدید حیرت کا دھچکہ لگا تھا۔

''کیوں...... کیا آپ خوش نہیں ہیں اس خبر سے؟''

''نہیں یار...... یہ بات نہیں ہے، بس نئی جگہ آ کے بسے ہیں اس لیے سوچ رہے ہیں۔ اس میں ایک یہ نئی آفت۔'' دونوں ہاتھوں سے سر تھامے وارث اب اٹھ کر بیٹھ چکا تھا۔

''آفت......؟'' چھناکے سے کہیں اندر کچھ ٹوٹا تھا۔ مہربانو کو یقین نہیں ہو رہا تھا کہ اتنی

اچھی خبر کے جواب میں اسے اتنا برا ری ایکشن ملے گا۔

''ارے...... میرا مطلب ہے، میں اس بات کے لیے ابھی ذہنی طور پر تیار نہیں تھا۔'' قدرے الجھتے ہوئے لہجے میں وہ مہربانو سے مخاطب تھا۔

''تو کوئی بات نہیں وارث...... ابھی تو ٹائم ہے ناں، ہم نئے مہمان کے آنے تک یقیناً سیٹ ہو جائیں گے۔'' اس کا لہجہ یقین سے آباد تھا۔

''ٹھیک ہے، اب تم آرام کرو، ہم اس ٹاپک پر صبح بات کرتے ہیں۔'' وارث تیزی سے کروٹ لیتے ہوئے بولا تھا۔

''وارث...... آپ میں دن بہ دن کتنا بدلاؤ آتا جا رہا ہے۔'' وہ اب دکھی دل سے وارث کے برابر لیٹی آنسو بہا رہی تھی۔ نیند اس سے کوسوں دور تھی۔ دوسری جانب وارث اس خوفناک حقیقت کے بارے میں سوچ رہا تھو جو آنے والے وقت میں اس کے پیر کی زنجیر بن سکتی تھی۔

O......O......O

''نیہا...... میں چاہتا ہوں، جتنی جلدی ممکن ہو سکے، ہمیں کورٹ میرج کر لینی چاہیے۔'' وارث کے لہجے میں شدت تھی۔

''نہیں وارث...... میں کورٹ میرج کے خلاف ہوں۔ میں پاکستان جا کر شادی کرنا چاہتی ہوں۔ اپنے گھر والوں کو اپنی خوشی میں شریک کرنا چاہتی ہوں۔'' نیہا جذباتی لہجے میں بولی تھی۔

''ارے یار...... تم سمجھا کرو، مجھے جلدی ہے۔''

''ہاں تو پھر میرے ساتھ پاکستان چلیں، بس ایک مہینے کی تو بات ہے، وہاں سب سے ملاقات بھی ہو جائے گی اور شادی بھی۔'' نیہا کے لہجے میں حقیقی خوشی کے آثار تھے۔

''ہاں...... بات تو صحیح ہے، اس بہانے مجھے اس مشکل سے چھٹکارا بھی مل جائے گا۔'' وارث بڑبڑایا۔

''بتائیں وارث...... کیا آپ پاکستان چلنے کے لیے تیار ہیں؟ اپنی بیوی کو یہاں اکیلا

چھوڑ سکتے ہیں ناں آپ؟" نیہا بڑی خوش اسلوبی سے پوچھ رہی تھی۔

"ہاں یار...... وہ بہت بولڈ لڑکی ہے، رہ لے گی تو پھر ٹھیک ہے، تم تیاری شروع کرو چلنے کی، ہم جتنی جلدی ہو سکا، یہاں سے نکل جائیں گے۔" وہ یکدم کسی خیال سے خود کو آزاد کراتے ہوئے بولا تھا۔

"واہ وارث...... سچ، آپ نے مجھے آج جو خوشی دی ہے، میں اسے کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔"

"اچھا نیہا...... مجھے کچھ ضروری کام ہیں اس لیے اب میں چلتا ہوں۔" وارث آہستگی سے کہتا پلٹا تھا مگر دل پر ایک نادیدہ بوجھ تھا، ایک چور جذبہ تھا جو اسے بار بار الجھا رہا تھا مگر وہ بڑی سفاکی سے اسے روندتے ہوئے آگے بڑھ رہا تھا۔

O......O......O

وارث کو گئے ایک مہینہ ہونے کو آیا تھا۔ مہربانو امید سے تو تھی ہی، ساتھ ہی اس کی نظریں دہلیز کا پیچھا نہیں چھوڑتی تھیں۔ وہ اس آس پر دن گزار رہی تھی کہ شاید کوئی آہٹ اسے وارث کی خبر دے۔

"میں تو سوچتی تھی محبت زندگی میں بہار لے آتی ہے، سوکھی ٹہنیوں پر بھی نکھار لے آتی ہے۔ وارث...... میں نے تم سے محبت کی ہے، کوئی گناہ تو نہیں جو تم محبت کی اس نشانی سے لاتعلقی برتتے ہوئے ہم دونوں کو اکیلا چھوڑ گئے ہو؟ یہ کیسی بہار لائے تھے تم میری زندگی میں جسے خود اپنے ہاتھوں سے خزاں کے سپرد کر گئے ہو؟ میں نے تو سنا تھا کہ محبت آباد کرتی ہے لیکن پھر میں کیوں ویران ہو گئی ہوں؟ وارث میں تمہیں کہاں ڈھونڈوں؟ کس سے تمہارے بارے میں پوچھوں؟ عجیب امتحان میں تم نے مجھے ڈال دیا ہے۔ میری کچھ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا۔" وہ اضطرابی انداز میں اپنے لب کاٹتی ہوئی خود سے مخاطب تھی۔

حقیقت کی خوفناکیاں اور بدصورتیاں یقیناً اس کے تعاقب میں تھیں۔ جس راستے کو وہ حسین اور اپنی منزل سمجھ کر نکلی تھی، وہ اسے اندھی کھائی میں لے آیا تھا مگر وہ اکیلی تو نہیں تھی جو حالات کے تھپیڑوں کا مقابلہ کرتی۔ اس کے ساتھ ایک دل اور دھڑک رہا تھا جو اس کے

لے قیمتی متاع سے کم نہیں تھا مگر اسے اس بات کا یقین ہو گیا تھا کہ وارث اسے دھوکا دے کر جا چکا ہے مگر اس کا دل اسے تسلی دیتا رہتا کہ شاید ایک دن وارث لوٹ آئے۔ وارث نے اس کے ساتھ کیوں کیا ایسا؟ یہ تو سمجھنے سے وہ قاصر تھی مگر وارث کی دی ہوئی نشانی اس کے اندر جینے کی تمنا کو سیراب کر رہی تھی۔

O......O......O

"کیسی طبیعت ہے اب تمہاری؟" اس کی پڑوسن رمیزہ، مہربانو سے مخاطب تھی۔

"جی آنٹی، بس ٹھیک ہی ہوں۔" وہ بمشکل اپنی سانس بحال کرتے ہوئے بولی۔

"خیریت ہے؟ کہاں رہتی ہو آج کل؟ میں فکر مند ہوں تمہارے لیے۔" وہ شکل سے پریشان نظر آ رہی تھی۔

"آنٹی...... ایک اسٹور میں سیلز گرل کی ملازمت مل گئی ہے مجھے، بس اسی لیے گھر لیٹ آتی ہوں۔" ایک افسردہ سی آہ اس کے منہ سے نکلی تھی۔

"بچی......! تم اس حالت میں کام کر رہی ہو؟ یہ کوئی اچھی بات نہیں۔ تمہارا شوہر پاکستان سے کیوں نہیں آ رہا؟ سچ، بڑا ظالم ہے وہ...... اپنی بیوی کو کوئی اس حال میں چھوڑ کر جاتا ہے؟" رمیزہ کا انداز خفگی بھرا تھا۔

"کہہ تو آپ بالکل ٹھیک رہی ہیں لیکن شاید وہ اب کبھی نہیں آئے گا، وہ مجھے چھوڑ گیا ہے۔" اس جملے کے ادا کرنے کے ساتھ ہی وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔

"کیا کہہ رہی ہو تم؟" رمیزہ کے تو اوسان خطا ہو گئے تھے۔

"آنٹی...... جس دن میں نے انہیں یہ خوش خبری سنائی، اسی دن سے وہ ناراض ہو کر چلے گئے ہیں۔"

"ارے...... بڑا ہی بدبخت ہے وہ...... اتنی پھول سی پیاری بچی کو اس حال میں چھوڑ کر چلا گیا۔ ایسا بھی کوئی کرتا ہے؟ تم مجھے اس کا نام اور مکمل ایڈریس دو اور ہاں، اس کی ایک عدد تصویر بھی دو، میں ذرا اس کے بارے میں معلومات کرتی ہوں۔" رمیزہ کا لہجہ اَن دیکھی آگ کی مانند دہک رہا تھا۔

''جی آنٹی...... شاید ان کی محبت جاگ جائے، انہیں میرا خیال آجائے اور وہ مجھے دوبارہ اپنے ساتھ رکھ لیں؟'' مہربانو کے چہرے کا تناؤ اور لہجے کا کھنچاؤ اس بات کا ثبوت دے رہا تھا کہ وہ سخت تکلیف میں ہے۔

O......O......O

اس روز پورے ایک ہفتے بعد رمیزہ، مہربانو سے ملنے آئی تھیں۔ ان کا چہرہ اترا ہوا تھا اور آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔

''آنٹی...... سب خیریت تو ہے ناں؟'' مہربانو کا دل خوف سے بھر گیا تھا۔

''وارث کی خبر لائی ہوں۔'' وہ آہستگی سے بولی تھیں۔

''کیسے ہیں وہ...... ٹھیک تو ہیں ناں؟'' مہربانو کو اپنا دل ایک عجیب سی کیفیت میں ڈوبتا ابھرتا محسوس ہوا تھا۔

''بیٹیا......! اب تم سے کیا چھپانا، ماشاءاللہ...... تم بہت بہادر ہو۔''

''کیا بات ہے آنٹی...... کیا نہیں چھپانا؟'' مہربانو کو اپنے بدن پر چیونٹیاں سی رینگتی محسوس ہونے لگیں۔

''اس نے نیہا نامی لڑکی سے شادی کر لی ہے اور ان دنوں امریکہ میں مقیم ہے۔ نیہا نامی لڑکی یہیں لندن میں رہتی تھی۔ یہاں کی کسی یونیورسٹی کی طالبہ تھی۔'' وہ شکستہ لہجے میں بتا رہی تھیں۔

''اوہ......'' مہربانو اپنا دل تھام کر بیٹھ گئی۔ اس سے زیادہ اس سے کچھ نہیں کہا گیا۔

''بیٹیا......! وہ تمہیں سیڑھی بنا کر یہاں تک پہنچا ہے۔ تمہاری علمی قابلیت سے اس نے فائدہ اٹھایا ہے بس۔''

''اچھا......'' وہ پھر اتنا ہی کہہ کر خاموش ہو گئی۔

''میں نے تو بھئی...... یہاں جوایجی کا دفتر ہے، وہاں تمہارے نام سے کمپلینٹ نوٹ کروا دی ہے۔ دیکھنا تم، وہ اسے ڈھونڈ کر کتنی کڑی سزائیں دیں گے۔'' رمیزہ کے لہجے میں دکھ آباد تھا۔

جب ان سے ملی تو ایک خوشی کا سماں تھا۔ ماں باپ، بھائی کے نقش جو اَن مٹ ہو چکے تھے، وہ تصور کے پردے سے نکل کر سب اس کے سامنے جیتے جاگتے کھڑے تھے۔

1993ء میں ایدھی ہوم کلفٹن میں لاوارث بچوں کے ہوم میں لائی گئی مہربانو جس کا اصلی نام رضیہ ہے، وہ سترہ، اٹھارہ سال بعد اپنے والدین سے معجزانہ طور پر مل گئی ہے مگر قسمت کا ستم دیکھیے کہ آج مہربانو اپنی بچی کو اس کے باپ سے محروم دیکھ رہی ہے۔

مہربانو ایدھی ہوم واپس آ چکی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ اس کا اصل ننھیال یہی ہے۔ بلقیس ایدھی اس کی نانی ہیں اور کبریٰ ایدھی اس کی ماں۔ اسے یہاں بچوں کو تعلیم دے کر سکون ملتا ہے اور ایک آس، امید، انتظار کا موسم بھی اس کے اندر اپنی کیفیات بدلتا رہتا ہے کہ شاید ایک دن وارث اپنی اولاد کو دیکھنے، اسے اپنانے واپس لوٹ آئے۔

شہر کراچی میں جہاں قتل و غارت گری، اغوا، مار پیٹ، ٹارگٹ کلنگ جیسے واقعات ہوتے ہیں، وہیں اس شہر کے دامن میں دردِ دل رکھنے والوں کی بھی کمی نہیں۔

قارئین! میر پور کے پہاڑوں سے اغوا کا سفر کرنے والی ایک معصوم بچی کو کراچی کے اس شخص نے اپنی منزل پر پہنچا دیا جس نے اس بچی کا ہاتھ پکڑ کر اسے ایدھی سینٹر پہنچایا تھا اور اس شہر کی شان ستار ایدھی، بلقیس ایدھی، کبریٰ ایدی اور فیصل ایدھی بھی ہیں جنہوں نے انسانی ہمدردی کے وہ چراغ روشن کیے جو ہمارے شہر کو روز اندھیروں میں تبدیل کرنے والوں کی خواہشوں کا خون کرنے کے لیے کافی ہیں اور تاریک اندھیرے میں روشنی و امید کی کرن ہیں۔

☆......☆......☆

کیا یہ حقیقت ہے؟

اورنگی ٹاؤن کا مشہور زمانہ علاقہ کٹی پہاڑی، اس مقام کا نام سنتے ہی کراچی والوں کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں جب کہ ملک بھر کے لوگوں کے چہروں پر تشویش نمایاں ہو جاتی ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ کیا کٹی پہاڑی پر جنوں کا بسیرا ہے؟ کیا یہاں چڑیلوں نے ڈیرے ڈالے ہوئے ہیں؟ کیا یہاں چھلاوے نمودار ہوتے ہیں جو پوری آبادی کے لیے خوف کی علامت بن کر آتے ہیں؟ دو چار نعشیں گراتے ہیں...... کسی کا سہاگ اجاڑتے ہیں تو کسی کی زندگی بھر کا سہارا چھین لیتے ہیں اور غائب ہو جاتے ہیں۔

کٹی پہاڑی کے اطراف سے درجنوں کہانیاں جڑی ہوئی ہیں اور سب سے زیادہ مشہور یہ کہ...... یہاں روحیں بھٹک رہی ہیں، یہ ان لوگوں کی روحیں ہیں جو بے موت مارے گئے ہیں۔ کہانی کی تلاش میں میری نگاہیں اکرم بابا کو ڈھونڈ رہی تھیں جو وہاں چوکیداری کا فریضہ انجام دیتے ہیں اور رات گئے بھٹکتی روحوں کا سامنا کرتے ہیں۔ انہوں نے ہی مجھے بتایا تھا کہ کٹی پہاڑی آج کل روحوں کی آماجگاہ بنی ہوئی ہے اور پھر جونہی سورج نے مغرب کی سمت شفق کی لال چادر میں اپنا منہ چھپایا تھا، میں اکرم بابا کا گھر تلاش کرنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔

"السلام علیکم......! اکرم بابا......!" میں جو خاصا طویل سفر طے کر کے وہاں پہنچی تھی، انہیں پھولی سانسوں کے ساتھ سلام کیا۔

''شکریہ آنٹی......آپ نے میرے لیے اتنا کیا مگر میرے پاس آپ کو دینے کے لیے کچھ نہیں ہے سوائے دعاؤں کے۔'' مہربانو کا چہرہ اس بات کا غماز لگ رہا تھا کہ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے کے لیے بے قرار ہے۔

O......O......O

وقت تیزی سے گزرتا جا رہا تھا، مہربانو نے حالات سے سمجھوتہ کر لیا تھا مگر جب آج ایک ننھی سی کرن اس کی اندھیر زندگی میں روشنی کی کرن بن کر نمودار ہوئی تو وہ بے اختیار ہو گئی۔ اپنی گود میں ایک خوبصورت سی پری کو دیکھ کر وہ بہت روئی، خزاں کی زد میں آئی خشک ٹہنی اس ننھی کونپل کو پا کر ہری بھری ہونے کے لیے تیار تھی۔

بیٹی کی پیدائش کے بعد اس کے اندر ایک نیا عزم جنم لے رہا تھا۔ اسے اپنی بیٹی کی خاطر وارث کا بوجھ اپنے اوپر سے ہٹانا تھا۔ وہ اب اس شخص کا نام، چہرہ، خیال تک بھول جانا چاہتی تھی جس نے محض اپنی طلب کی خاطر اسے بے آسرا کر دیا۔ حیرت ہے، لوگ اتنے ڈھونگی بھی ہو سکتے ہیں۔ بے ساختہ اس کی نگاہوں میں وارث کے ماں اور باپ کے چہرے آ گئے جن میں وہ اپنی حقیقی ماں اور باپ کو تلاش کرتی تھی...... بچی کے رونے کی آواز نے اس کے حصار کو توڑ دیا۔ مہربانو فرطِ محبت سے اس کا ننھا سا ہاتھ تھپکنے لگی۔

''ارے مہربانو، میری بات غور سے سنو۔'' ریزہ ہانپتی کانپتی اس کے قریب آئی تھی۔

''ماشاءاللہ......تمہاری بیٹی بالکل تم پر گئی ہے۔'' وہ مسکراتے ہوئے گہرا سانس لے رہی تھیں۔

''سب خیریت تو ہے ناں؟ آپ نے تو میری جان نکال دی۔'' مہربانو نے حیرت سے انہیں دیکھا۔

''کیا تمہیں رجو کہہ کر کوئی پکارتا تھا؟'' ان کا سوال غیر متوقع تھا۔

''جی......میری ماں اور باپ......'' سارے جہاں کا درد مہربانو کے لہجے میں سمٹ آیا۔

''اور تمہارا کوئی بھائی بھی تھا؟''

''جی ہاں بالکل، میرا ایک بھائی تھا مگر آپ یہ سب کیوں پوچھ رہی ہیں؟ آپ کیسے

جانتی ہیں میرے ماضی کے بارے میں؟'' مہربانو کے لہجے میں حیرت ہی حیرت تھی۔

''کیا تمہیں اپنی ماں کا نام یاد ہے؟'' رمیزہ کا لہجہ جلد بازی کا غماز تھا۔

''جہاں تک مجھے یاد ہے، ان کا نام حفیظ بیگم تھا اور محرم خان بھائی کا نام۔'' وہ دماغ پر زور دیتے ہوئے بولی تھی۔

''اوہ مبارک ہو مہرو...... تمہارے ماں باپ، بھائی مل گئے ہیں۔''

''کیا......؟ سچ......؟ کب اور کہاں ہیں وہ؟'' مہربانو کا خوشی سے برا حال تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیسے وہ اپنی خوشی کا اظہار کرے۔ ایک خوش رنگ کیفیت اس کے چہرے پر پھیلی ہوئی تھی۔

''ارے بٹیا......! میں نے ایدھی سینٹر والوں کو تمہاری اغوا ہو جانے والی کہانی سنائی تھی اور پھر تم کس طرح یہاں لائی گئیں اور اب جب کہ تمہارا شوہر تمہیں چھوڑ کر چلا گیا ہے تو میں نے ان سے اپیل کی کہ وہ تمہارے بارے میں کچھ کریں اور دیکھو، آج کا دن کتنی بڑی خوشی ہمارے لیے لایا ہے۔ یہاں ایدھی سینٹر میں ایک خاتون کام کرتی ہیں جو تمہاری فیملی کو بہت قریب سے جانتی ہیں۔ انہوں نے ہی تو مجھے بتایا کہ کس طرح ایک فیملی نے اپنی چار سالہ بیٹی کو کھو دیا۔'' وہ تیز تیز لہجے میں بولتی جا رہی تھیں۔

''مجھے ملنا ہے اپنے گھر والوں سے۔'' مہربانو کے چہرے پر آئی خوشی دیدنی تھی۔

''تم اب پہلی فرصت میں پاکستان واپس جاؤ، یہاں کے آفس والے تمہیں وہاں کا ایڈریس دے دیں گے اور تم وہاں جا کر ان سے مل لینا، یقیناً ان کی تو خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں رہے گا۔ انہوں نے اپنی ایک بیٹی کھوئی تھی اور اب انہیں بونس بھی ملے گا یعنی بیٹی اور نواسی دونوں۔'' رمیزہ بول رہی تھیں مگر مہرو کو ایسے لگا تھا جیسے کسی نے اس کے دل کی زمین کو ہلا دیا ہو۔

O......O......O

کہتے ہیں، دنیا گول ہے، مہربانو بھی اپنی قسمت کے چکروں میں الجھی بڑی مشکلوں سے پاکستان واپس لوٹی۔ لانڈھی، مظفر آباد کالونی میں اس کے والدین اس کے منتظر تھے۔ وہ

"ارے بیٹیا...... ! تم تو مقررہ ٹائم سے پہلے ہی پہنچ گئیں۔ تم سے فون پر بات کرنے کے بعد میں تو یہی سوچ رہا تھا کہ تم شاید ڈر کر یہاں آنے کا ارادہ ترک کر دو گی۔"

"نہیں بابا...... ! آپ سے بات کرنے کے بعد تو میری جستجو اور بڑھ گئی ہے۔" میں نے ان کے گھر کے دروازے پر کھڑے ہوئے پھولے سانس کے ساتھ ہی اپنی بات مکمل کی۔

"تو ٹھیک ہے پھر تم ابھی یہاں میرے گھر میں بیٹھو، پانی وغیرہ پیو، اپنی سانسیں بحال کرو، میں اتنی دیر میں نماز سے فارغ ہو کر آتا ہوں۔

اکرم بابا اپنی بیوی کو آواز لگاتے ہوئے گھر کے اندر داخل ہوئے تھے تو میں بھی ان کے پیچھے گھر میں داخل ہو گئی تھی۔ کچھ ہی دیر میں اکرم بابا کی بیوی میرے قریب پانی کا جگ اور گلاس رکھ کر چلی گئی تھیں جبکہ اکرم بابا نماز پڑھنے کے لیے قریبی مسجد چلے گئے تھے۔

اکرم بابا کے مسجد جانے کے بعد ان کی بیوی کچن میں ایسی مصروف ہو گئی تھیں کہ انہیں میرا خیال ہی نہیں آیا۔ کمرے کا ماحول بہت گھٹن زدہ تھا اور اس گھٹن زدہ ماحول میں، میں سوچ رہی تھی کہ...... "کیا واقعی یہاں روحیں بھٹک رہی ہیں اور وہ یہاں کے لوگوں کو نظر بھی آتی ہیں؟ اس ترقی یافتہ دور میں جب کہ انسان نے خلا کی وسعتوں میں قدم رکھ دیا ہے، سائنس ٹیکنالوجی نے اتنی ترقی کر لی ہے کہ عقل انسانی خود حیران ہے تو پھر بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ انسان ابھی تک توہمات کے چکر میں پڑا رہے؟" اور پھر اچانک جیسے مجھ پر ایک وحشت سی طاری ہو گئی تھی، سو میں نے گھبرا کر وہاں سے باہر نکلنے کا فیصلہ کیا تھا۔

"سنیے...... میں ذرا قریبی اسٹور سے کولڈ ڈرنک لینے جا رہی ہوں۔ اکرم بابا آئیں تو انہیں بتایئے گا کہ......" میں کچن میں جھانکتے ہوئے بول رہی تھیں جب کہ اکرم بابا کی بیوی کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں تھا، نہ ہاں کا کوئی جواب نہ ہی نا کا۔

"عجیب خاتون ہیں، احساسات سے عاری......" میں نے کندھے اچکاتے ہوئے سوچا اور تیزی سے باہر نکل آئی...... باہر ہوا ہلکی خنکی تھی۔

میری پیشانی پر آیا پسینہ اب مجھے ٹھنڈک کا احساس دلا رہا تھا۔ میں اپنی رو میں چلتی جا رہی تھی۔ مجھے کسی جنرل اسٹور کی تلاش تھی جہاں سے ایک ٹھنڈی یخ کولڈ ڈرنک مل سکے۔ ابھی

میں نے دو گلیاں ہی عبور کی تھیں کہ اچانک خوف کا احساس بڑی شدت سے میرے دل اور ذہن پر غالب ہونے لگا۔ یہ بات تو سو فیصد درست ہے کہ کئی پہاڑی کے اونچے نیچے راستوں پر چلتے ہوئے انسان کو اچانک ہی یہ خیال خوف زدہ کر دیتا ہے کہ کہیں کسی نامعلوم مقام سے آتی گولی بدن کے آر پار نہ ہو جائے۔ میں کشاں کشاں چلتی ہوئی جس گلی میں پہنچی تھی، اس گلی کے بیشتر مکانات جلے ہوئے تھے بلکہ جلے ہوئے گھروں کی دیواریں خوفناک دراڑوں سے منقش ہو چکی تھیں۔ اس گلی کے نکڑ پر لگی اسٹریٹ لائٹ کا سایہ اندھیری گلی میں عجیب وحشت زدہ سا ماحول پیدا کر رہا تھا۔ اسی وقت میرے کانوں میں جیسے کسی بازگشت کی صورت یہ آواز آئی۔

''یہ زندگی بھی عجیب ہے، اس کی آگ میں بس جلتے رہو، زندگی کی آسائشوں، آرام اور سکون کے واسطے، بس انتظار کے دن کاٹتے رہو۔'' پھولے ہوئے سانس سے تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی وہ عورت اور نجانے کیا، کیا بڑبڑا رہی تھی۔

''کون ہے یہ؟'' میں خوف زدہ سی اس عورت کی حالت پر غور کر رہی تھی، میلی سی چادر میں دبلا پتلا سراپا، کھچڑی جیسے اجڑے بال جو اس کے شانوں پر پھیلے ہوئے تھے، اس کے ہاتھ میں ایک بڑا سا شاپر تھا غالباً جس میں کپڑوں کے علاوہ اور دیگر سامان بھی تھا۔

''کیا یہ عورت پاگل ہے جو اس اندھیری گلی میں جلے ہوئے مکان کے دروازے پہ کھڑی ہے؟'' میں بھی آہستہ آہستہ اس مکان کے قریب پہنچ گئی۔

''سہیل بیٹا...... دروازہ کھولو، بیٹا...... جلدی سے کھولو'' اور پھر پل بھر میں جلا ہوا دروازہ چرچراتی ہوئی آواز کے ساتھ کھل گیا تھا اور وہ عورت اندر داخل ہو گئی۔ اس گھر کی ٹوٹی ہوئی دیوار سے مکان کے اندر خستہ حالی کا نقشہ بخوبی دیکھا جا سکتا تھا۔ اس کے لیے گھر میں داخل ہونے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔

''سہیل...... میرے بچے، تیری یاد نے تو میرے دل اور دماغ کو اجاڑ کر رکھ دیا ہے، بس بیٹا...... اب تو گھر آجا، یہ ماں تیرے بغیر بے چین ہے۔'' وہ عورت سامنے کھڑے غالباً اٹھارہ، انیس سال کے نوجوان سے مخاطب تھی۔

''ماں......تُو، تو جانتی ہے، میں کتنا مجبور ہوں، میں تیرے پاس نہیں آسکتا، بس تُو ہی آجاتی ہے تو میرے دل کو تسلی ہو جاتی ہے۔ یہ بتا......آج کھانے میں کیا پکایا ہے؟'' اب وہ دونوں ہی چلتے ہوئے گھر کی زمین پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئے تھے۔

''یقیناً یہ کوئی مجرم ہے جو جیل سے بھاگ کر آیا ہے اور یہاں پناہ اختیار کی ہوئی ہے یا ہو سکتا ہے، کوئی رہزن ہو جو دن کے اجالے میں لوگوں کو لوٹتا ہو اور رات اس کھنڈر جیسے گھر میں قیام کرتا ہو۔'' میں نے یہ سوچا پھر میرے دل میں خیال آیا کہ میں اسی وقت کال کر کے پولیس کو خبر دوں مگر میں مصلحتاً خاموش رہی۔

''یہ دیکھ......آج میں روٹی قیمے کے ساتھ تیرے لیے کھیر بھی بنا کر لائی ہوں۔ میرے چاند، تجھے کھیر بہت پسند ہے ناں؟'' عورت کی آواز میں محبت ہی محبت تھی۔

''ماں......! تو کتنی اچھی ہے۔'' نوجوان نے اپنی ماں کے گلے میں بانہیں ڈال کر کہا۔

''پھر تو مجھ سے اتنا دور کیوں رہتا ہے؟'' عورت کی آواز میں بہت کرب تھا اور لفظوں کے ساتھ ساتھ اب سسکیاں بھی ٹوٹ ٹوٹ کر آرہی تھیں۔

''اف......کتنا عجیب منظر تھا......ایک ویرانے میں ماں اور بیٹے کا اس انداز میں ملن۔ آخر ان کے درمیان ایسی مجبوری کی کون سی دیوار حائل ہے جو......'' ابھی میں انہی سوچوں میں غلطاں تھی کہ گلی میں ایک بھیڑیے نما کتے کی آمد نے میری جان نکال دی تھی اور وہ جس انداز میں بھونک رہا تھا، میرا دل خوف سے کانپنے لگا تھا۔ میں سب کچھ بھول کر سرپٹ دوڑتی ہوئی تیزی سے گلیاں عبور کرتی واپس اکرم بابا کے گھر کے سامنے پہنچ گئی۔

''ارے بٹیا......میں تمہیں کب سے ڈھونڈ رہا ہوں، جلد اندر آؤ، تم خیریت سے تو ہو ناں......؟'' اکرم بابا کے چہرے پر فکر کی لکیریں نمایاں تھیں۔ میں نے اثبات میں سر ہلایا تھا اور خاموشی سے ان کے گھر میں داخل ہو گئی۔

O......O......O

''بٹیا......میں بات جلدی شروع کروں گا تا کہ جلدی ختم بھی ہو جائے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم یہاں زیادہ وقت نہیں گزارو، ویسے تم نے یہاں آ کر ایک بات تو محسوس کی ہوگی؟''

اکرم بابا نے نہایت ہی ملائم لہجے میں پوچھا۔

''کون سی بات بابا؟'' میرے لہجے میں تجسس تھا۔

''یہی کہ اس علاقے کے بیشتر گھر خالی، جلے ہوئے اور تباہ حال ہیں، یہاں اندھیرے کا راج ہے......''

''جی بابا...... ایسا کیوں ہے؟'' میں نے اپنی آنکھوں کو ہتھیلیوں سے مسلا اور خود کو اس گھر اور منظر سے چھٹکارہ دلانے کی کوشش کی جس سے کچھ دیر پہلے میری آنکھوں کا سامنا ہوا تھا۔

''بیٹا...... گئے دنوں جو یہاں لسانی فسادات ہوئے تھے، یہ سب اسی کا نتیجہ ہے۔ ان فسادات میں رخسار نامی ایک لڑکی کو بھی اغوا کر لیا گیا تھا پھر اسے تشدد اور زیادتی کا شکار بنا کر موت کے گھاٹ اتار دیا گیا اور اس کی نعش کو یہاں پہاڑ کی چوٹی پر پھینک دیا گیا۔ رخسار تو مر گئی لیکن جس اذیت اور کرب سے وہ دوچار ہو کر مری تھی، یقیناً اسی لیے اس کی روح کو قرار نہیں ملا۔ شاید اسی لیے وہ آج بھی ہمارے اردگرد چلتی پھرتی نظر آتی ہے، لوگ اس کو دیکھتے ہیں، وہ پاگلوں کی طرح ان کے پیچھے بھاگنے لگتی ہے، اسی وجہ سے خوف زدہ لوگ اس علاقے کو چھوڑ کر جانے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔''

''کیا واقعی یہ بات سچ ہے کہ یہاں پر رخسار کی روح پریشان حال پھرتی ہے؟'' میں نے بڑی بے یقینی سے پوچھا تھا۔ ''ایک لڑکی جو یقیناً تکلیف دہ مراحل سے گزر کر مر چکی ہے، وہ انسانوں کو پریشان کر رہی ہے۔ میں اس بات کو کیسے تسلیم کر لوں؟''

''یہ بالکل سچ ہے بیٹا......! میں تمہاری تشفی کے لیے یہ بات بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ انسانی وجود کے لیے جسم، روح اور عقل کا ہونا ضروری ہے۔ یہ انسان کی حقیقت ہے۔ انسان جسم، روح اور عقل کے بغیر خاک کا ڈھیر ہے۔ جسم مادہ ہے یعنی جسم حاضر ہے جبکہ عقل اور روح غائب عنصر ہیں۔ روح کو کسی نے نہیں دیکھا لیکن اس کا وجود قوی ہے کیونکہ روح مرکز خیالات ہے۔ اس کے بغیر زندگی ممکن نہیں۔''

''لیکن بابا......! میری سمجھ میں ایک بات نہیں آئی کہ انسان جسم کے فنا ہونے کے بعد روح کی موجودگی کی عقلی دلیل کیا ہے؟''

"بٹیا......! روح نہایت ہی لطیف اور ہلکی ہوتی ہے، یہی وجہ ہے کہ اس کی حرکات لامحدود ہوتی ہیں۔ وہ ایسے کام انجام دے لیتی ہیں جو کہ جسم انجام نہیں دے سکتا اس لیے عقل انسانی حیران رہ جاتی ہے۔"

"اچھا......!!" حیرت میرے لہجے میں اب بھی نمایاں تھی۔

"بٹیا......! میں تمہیں اس حوالے سے اسی جگہ کا ایک اور واقعہ سناتا ہوں۔"

"جی بابا جی......!" میں ہمہ تن گوش ہوگئی تھی۔

"یہاں سے تین گلیاں چھوڑ کر ایک سترہ سالہ نوجوان لڑکا سہیل رہتا تھا۔ وہ اپنے ماں باپ کا اکلوتا بیٹا تھا۔ جن دنوں کٹی پہاڑی پر لسانی فسادات پھوٹے، اس دن وہ اپنے گھر پر تھا جب کہ اس کے ماں باپ علاقے سے باہر نکلے ہوئے تھے۔ فساد کے بعد آناً فاناً پورا علاقہ بند ہوگیا تھا، لوگ گھروں میں محصور ہو گئے تھے، ہر طرف گولیاں چل رہی تھیں، اسی دوران میں سہیل کے گھر پر پیٹرول بم سے حملہ ہوا تھا۔ اس نے اپنی جان بچانے کی بہت کوشش کی تھی لیکن گھر سے باہر نہیں نکل سکا۔ اردگرد والوں نے فائر بریگیڈ کو بلانے کی کوشش کی تھی لیکن فائر بریگیڈ نے اتنے خراب حالات میں آنے سے انکار کر دیا تھا۔ نتیجہ یہ نکلا تھا کہ سہیل سمیت وہ پورا گھر جل گیا تھا۔"

"کیا......؟" یہ کہانی سن کر تو مجھ پر حقیقت میں اب ہیبت طاری ہو چکی تھی۔

"ہاں بٹیا......! یہ لڑائی فسادات کا سلسلہ بارہ گھنٹے جاری رہا۔ گلیوں کے اندر چھلاوؤں کا راج تھا اور گلیوں کے باہر پولیس اہلکار کسی کو اندر آنے نہیں دے رہے تھے۔ سہیل کے ماں باپ پوری رات پاگلوں کی طرح ایک سڑک کے کنارے بیٹھے اپنے اکلوتے بیٹے کی زندگی کے لیے دعا گو تھے اور جب کسی طرح یہ ہولناک رات گزر گئی اور سہیل کے ماں باپ اپنی گلی میں داخل ہوئے تو دور سے ہی اپنے جلے ہوئے گھر کا منظر دیکھ کر ان کے دل دہل گئے لیکن وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ جب وہ اندر داخل ہوں گے تو کیا قیامت کا منظر ہوگا؟" ان کے بیٹے سہیل کی لاش کوئلہ بن چکی تھی، اس کی آنکھیں غیر معمولی طور پر کھلی تھیں جن میں حیرت تھی، انتظار تھا کہ کوئی شاید اسے بچانے کے لیے آجائے، آنکھیں گواہی دے رہی تھیں کہ وہ کس بے بسی سے

مرا ہے اور پھر اس واقعے کے بعد اس کی ماں پاگل ہو گئی۔ گورنمنٹ نے انہیں دوسری جگہ منتقل تو کر دیا ہے لیکن آج بھی سہیل کی ماں اپنے بیٹے کے لیے نت نئے کھانے بنا کر لاتی ہے اور یہ اس کا دعویٰ ہے کہ اس کا بیٹا اسے روز ملنے آتا ہے اور اس کے ہاتھ سے کھانا کھاتا ہے۔''

میں جو دم بخودسی اکرم بابا کو سن رہی تھی، خود میری اپنی حالت ایسی ہو چکی تھی جیسے کاٹو تو لہو نہیں۔ ''یا الٰہی......! یہ کیا ماجرا ہے؟ کچھ دیر پہلے میں نے جو منظر دیکھا ہے، ایک پاگل سی عورت اور اس کا بیٹا...... کیا واقعی وہ سہیل کی روح تھی؟ یا پھر ایک خواب یا شاید ایک تصوراتی خیال جسے فرض کر لیا جائے؟'' میں حقیقت میں اس وقت سخت ڈر گئی تھی۔ اکرم بابا کی باتیں یقیناً درست تھیں۔ جس بات کا اکرم بابا ذکر کر رہے تھے، وہ میں ان کے بتانے سے پہلے ہی دیکھ چکی تھی۔ میں جو آسیب، بھوت، ارواح وغیرہ کی قائل نہیں تھی، اچانک ہی اس واقعے نے مجھے اپنے خیالات بدلنے پر مجبور کر دیا تھا۔

''بٹیا......! گزشتہ چھ ماہ سے یہاں ایسا ہی ہو رہا ہے یقیناً جب تک تم اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھ لو، تم یقین نہیں کرو گی۔'' اکرم بابا آلتی پالتی مار کر بیٹھ چکے تھے جبکہ ان کے لہجے اور آنکھوں سے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ سونا چاہتے ہیں، سو میں نے اٹھنے میں ہی اپنی عافیت جانی تھی اور ان سے جانے کی اجازت لی تھی۔

''ہاں بٹیا......! اب رات بہت ہو گئی ہے۔ تمہارا یہاں سے جلدی نکل جانا ہی بہتر ہے۔'' وہ خوش دلی سے بولے تھے۔

''اچھا بابا......! خدا حافظ......!'' میں یہ کہتی ہوئی ان کے گھر سے باہر نکل آئی تھی۔

گاڑی اب واپسی کے لیے راستوں پر رواں تھی لیکن میری سوچ کے دھارے انجانے رخ پر گامزن تھے مثلاً اگر سہیل کی کہانی میں پہلے سن لیتی اور پھر اس کے بعد میرا ان دونوں سے سامنا ہوتا تو یقیناً میری روح، جسم کی قید سے آزاد ہو چکی ہوتی...... میں اپنے اردگرد موجود لوگوں کو بھی اب شک کی نگاہ سے دیکھ رہی تھی کہ کہیں یہ بھی تو بھٹکی ہوئی روحیں تو نہیں جو انسانی روپ میں گھوم رہی ہیں......!!

O......O......O

اکرم بابا سے سہیل کی روح کی کہانی سنے، خود اس کہانی کا حصہ بنے کئی روز گزر چکے تھے لیکن روح کے حوالے سے کئی سوال اور سوچیں میرے دماغ کو مسلسل الجھا رہی تھیں اور اب اس مرحلے پر آ کر میرے دل سے اس واقعے کے بعد والا تمام ڈر اور خوف نکل چکا تھا کیونکہ میں ارواح خبیثہ، جن بھوت اور چڑیل کے بارے میں نہیں بلکہ روح کی حقیقت جاننا چاہتی تھی اور پھر میرے تجسس نے مجھے اس حوالے سے ریسرچ کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ میں نے روحوں کے حوالے سے بہت ساری کتابیں پڑھیں مگر ہر کتاب کے اختتام سے میری تشفی نہیں ہوئی تھی۔ میں بہت ساری شخصیات سے بھی ملی لیکن کسی نے بھی مجھے مدلل جواب نہیں دیا تھا۔ ابھی میں اسی الجھن میں مبتلا تھی کہ مجھے ایک ایسی شخصیت مل ہی گئی جو مجھے اس پیچیدہ الجھن سے نکالنے میں معاون ثابت ہوئی۔ ان سے ملاقات کے بعد ابھی میرے دل کی زبان پر آئی ہی تھی کہ وہ شخصیت گویا ہوئی تھی۔

''اس کائنات میں کوئی راز، راز نہیں ہے لیکن اس کائنات سے انسان اسی وقت فائدہ اٹھا سکتا ہے جب وہ ان اصولوں کو صدق دل سے اپنا لے جو اس کائنات کے خالق نے بنائے ہیں۔''

''روح کی حقیقت کیا ہے؟'' میں نے فوری طور پر ان سے یہ سوال کیا تھا۔

''انسان کسی بھی حقیقت کو اسی وقت تسلیم کرتا ہے جب حواس خمسہ کی تمام قوتیں اس پر گواہ ہو جائیں۔ یہ حقیقت اور سچائی کا معیار ہے، بس اللہ نے انسان کو حواس کی انمول نعمت سے نوازا ہے اور جو لوگ اس نعمت سے محروم ہیں، انہیں اس کائنات کا تو کیا، اپنا ہوش بھی نہیں ہوتا اسی لیے دنیا والے انہیں پاگل کہتے ہیں۔''

''لیکن اس بات کا روح سے کیا تعلق ہے؟''

''جسم، روح اور عقل، یہ تینوں عنصر انسان کی ذات میں اپنا اپنا فرض پورا کر رہے ہیں۔ اب یہ فرض انسان کا ہے کہ وہ ان عناصر کے تعاون سے کائنات و مافیہا کی حقیقت جاننے کی کوشش کرے۔''

''لیکن یہ روح آخر ہے کیا؟'' مجھے اس طرح کے جوابوں سے سخت کوفت محسوس ہو رہی تھی۔

''جاننا چاہتی ہو تو جانو، یہ ایک ایسا راز ہے جس کے بارے میں حق تعالیٰ نے قرآن

پاک میں بھی خاموش رہنے کو کہا ہے کیوں کہ یہی اس کی قدرت کا راز ہے۔''

''لیکن روح تو مرکز حیات ہے؟'' میں نے اپنی عقل کے مطابق کہا۔

''یہ حقیقت ہے، روح حیات کا احساس ہے۔ جب تک جسم طاقت ور رہتا ہے، اس وقت تک روح کا جسم سے تعلق رہتا ہے لیکن جب جسم اپنی طبعی عمر کو پہنچ جاتا ہے تو روح، جسم کا ساتھ چھوڑ دیتی ہے جسے ''موت'' کہا جاتا ہے اور کیونکہ قرآن پاک میں اس زندگی کے بعد ایک اور ابدی زندگی کا تصور پیش کیا گیا ہے جس پر تمام مسلمانوں کا ایمان ہے۔''

''یعنی آپ کا مطلب ہے، روح کبھی فنا نہیں ہوتی؟''

''ہاں بالکل، روح پر حکم چلانے کی خاطر ہی روح درکار ہوتی ہے کیونکہ روح لطیف ہوتی ہے لہٰذا ضروری ہے کہ انسان اس روح کی خاطر جسم سے نجات حاصل کر لے اور اگر روح پاک ہو تو دوسری ارواح پر حکم بھی چلایا جاسکتا ہے۔''

''روحوں کے بھٹکنے کی اصل وجہ؟'' میں اپنے سوال کرنے کی فطرت سے مجبور تھی۔

''وہ روحیں جو برے جسمانی اعمال کے مطابق بھاری اور گندی ہو جاتی ہیں، وہ دنیائے وحدت کی نوری حدود کو پار نہیں کر سکتیں اس لیے فضا میں بھٹکتی رہتی ہیں جنہیں دنیا والے اپنے قابو میں کر لیتے ہیں۔''

''کیا واقعی بھٹکتی روحوں کو قابو کرنا آسان ہے؟'' میرے تجسس نے پھر کروٹ لی۔

''روح سے روح کے ذریعے ہی کام لیا جاسکتا ہے۔'' پہلی بار ان کے لبوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔

''سہیل کی روح کیوں بھٹک رہی ہے؟'' میری کچھ حد تک تشفی ہو گئی تھی اس لیے میں اصل بات تک آ ہی گئی۔

''کیوں کہ وہ بے موت مارا گیا...... اس لیے اس کی روح بھٹک رہی ہے۔''

''یعنی یہ جو روز ٹارگٹ کلنگ ہو رہی ہے، خوفناک دھماکے ہو رہے ہیں، لوٹ مار کا بازار گرم ہے، بھتہ خوری اور اسٹریٹ کرائم نے لوگوں سے ان کی زندگیاں چھین لی ہیں، کیا ان سب کی روحیں بھی بھٹک رہی ہیں؟''

میرے اس سوال پر انہوں نے ایک تاسف بھری نظر میرے چہرے پر ڈالی اور پھر بولے۔

"یہ جو انسانوں کے بھیس میں عزرائیل گھوم رہے ہیں، ایک دن ان کی روحیں بھی یوں ہی بھٹکیں گی، شاید یہ بھول بیٹھے ہیں کہ ایک دن ان کی بھٹکتی روحوں کو قابو کرنے والے بھی انسان ہی ہوں گے، ان ہی جیسے انسان......"

"اے کاش...... یہ نادان لوگ جان جائیں۔ جانے کیوں یہ اپنی عاقبت خراب کر رہے ہیں؟" میں نے بہت بے بسی کے عالم میں جواب دیا۔

"اصل بات تو تب ہے کہ اگر کوئی روح، جسم کے فنا ہونے سے قبل ہی اپنے رب سے ناتہ جوڑ لے؟"

"یہ کیسے ممکن ہے؟" میں چونکی۔

"ایسی روحیں پاک اور مقدس ہوتی ہیں۔ وہ منشائے الٰہی کے مطابق کام انجام دیتی ہیں اس لیے انہیں حق تعالیٰ کا قرب حاصل ہوتا ہے۔ ان روحوں کے جسم تو دنیا میں موجود رہتے ہیں لیکن وہ خود ذات الٰہی کے حضور میں سر بہ سجود احکام کی منتظر رہتی ہیں۔ اب یہ تمہارا فیصلہ ہے کہ تم اپنی روح کو اس مادی اور فانی جسم سے جدا کر کے حق تعالیٰ سے ناتا جوڑنا چاہتی ہو یا پھر یونہی کسی بھٹکتی روح کا پیچھا کرنا چاہتی ہو؟"

"یقیناً میں تو......" ابھی میں مزید آگے کچھ بولتی کہ میں نے دیکھا، وہ شخصیت غائب ہو چکی ہے یا شاید میں کسی شخصیت سے مخاطب ہی نہیں تھی۔ یہ تو محض میری اپنی سوچیں تھیں جو آپس میں کلام کر رہی تھیں یا یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ میری الجھن دور کرنے اور میری مدد کی خاطر کوئی نیک روح میرے حواس پر چھائی ہوئی ہو...... یقیناً یہی درست ہے کیونکہ میں جو روحوں کی کھوج میں مبتلا ہوں تو میری الجھن کا سلجھاؤ روح ہی کر سکتی ہے، کوئی انسان نہیں کیونکہ انسان جس تیزی سے انسانوں کا قتل کر رہا ہے، مجھے یقین ہے، ایک دن ایسا آئے گا جب اس دنیا میں انسانوں کی نہیں، بھٹکتی روحوں کی حکمرانی ہوگی۔ آج جہاں انسان بسے ہیں، یہ جگہ صرف اور صرف روحوں کی آماجگاہ ہوگی۔

☆......☆......☆

زندہ زمیں کا مرثیہ

فلیٹ کی بالکونیوں پر بندھی رسیوں سے لٹکتے ہوئے چھوٹے گیلے کپڑے اور ان سے قطرہ قطرہ نچڑتا ہوا پانی ان کے وہاں ہونے کا اعلان کرتا ہے جو بظاہر نہیں ہیں۔ عجیب لوگ ہیں، اتنی ویرانی...... ایسی خاموشی......!! میں کندھے اچکاتی ہوئی آگے بڑھ جاتی ہوں۔ ایک کھڑکی سے کوئی ٹوکری الٹ کر گلی میں کچرا ڈھیر کرتا ہے۔ میری نگاہیں بے ساختہ اوپر جاتی ہیں مگر وہاں کوئی سر جھانکتا دکھائی نہیں دیتا...... ادھر ایک سمت سے کسی بچے کی گیند میرے پاس سے ہو کر نیچے لڑھکتی چلی جاتی ہے۔ بھاگتے ہوئے قدموں کی آواز بھی آتی ہے مگر کون ہے؟ کوئی بھی نہیں......! ہر سمت رونق اور چہل پہل کا گمان ہے...... مگر حقیقت؟ حقیقت میں کچھ بھی نہیں......!!

میں آہستگی سے نیم تاریک گلی میں داخل ہوتی ہوں۔ کسی کی چاپ ہولے ہولے میرے کانوں میں دستک دے رہی ہے۔ اس لمحے ایک ڈراؤنا خیال بھی دبے پاؤں میرے پیچھے چلا آرہا ہے...... میں نے گھبرا کر پیچھے دیکھا مگر کسی کو نہ پایا...... یقیناً یہ میرا وہم تھا......!!

کل ہی تو یہاں سے میرا گزر ہوا تھا جب تو بڑی چہل پہل تھی، سودا سلف خریدتی عورتیں، کرکٹ کھیلتے بچے، پان کے کیبن کے پاس سگریٹ کے دھوئیں سے مرغولے بناتے لڑکے، رنگ برنگی، جلتی بجھتی روشنیاں، موٹریں، بسیں، رکشے بلکہ یہاں تو ہر وقت ٹریفک کا اژدھام نظر آتا تھا، رات گئے ایسی رونق کہ...... دن کا گماں ہو......! مگر آج ایسا کیا ماجرا ہوا

کہ ہر طرف سناٹے کا راج ہے......!!

میرا دل تو کر رہا ہے کہ ایک ایک گھر کا دروازہ پیٹ ڈالوں، چیخ چیخ کر صدا دوں کہ کوئی ہے اس جگہ؟ مگر ایسا کرنے سے قاصر ہوں، آدھی رات کو میرا ایسا عمل غیر مہذب ہوگا لیکن پھر بھی...... "کیا یہاں سب کے سب سو رہے ہیں؟ ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟" میں نے خود سے سوال کیا تھا......اور اگلے ہی لمحے میرے کانوں میں پھر وہی آوازیں گونجنے لگی تھیں، شور و غل، ہنگامہ، چہل پہل، افراتفری، بوڑھے، بچے اور عورتوں کی ملی جلی آوازیں، سبزی والا بھی آواز لگاتا جا رہا ہے اور تو اور، گوشت، دودھ اور مٹھائی کی دکان پر بھی رش قابل دید ہے۔ میں حیران پریشان سی اپنی نظروں کے اس دھوکے پر ہونق سی آگے بڑھ رہی ہوں...... مگر اچانک ہی مٹی کے ڈھیر پر پاؤں پڑنے سے میں منہ کے بل گر گئی ہوں، میری نظریں بے ساختہ اِدھر اُدھر گئیں مگر میں جلدی سے کپڑوں سے گرد جھاڑتی ہوئی کھڑی ہو گئی مبادا کسی نے مجھے دیکھ نہ لیا ہو...... مگر یہ کیا......؟ وہ جو ہر سمت ہنگامے اور رونق کا گماں تھا، حقیقت میں کچھ بھی نہیں ہے......!

میں ایک عمارت کے ملبے پر کھڑی حیرت سے دور تک اس نیم تاریک گلی کو دیکھ رہی ہوں...... اف......! ایک کراہ آمیز چیخ میرے منہ سے نکلی اور اندھیرے کے سینے میں دفن ہو گئی، میرے سامنے تباہ شدہ عمارتیں تھیں اور ان عمارتوں کے ملبے کے ڈھیر پر ہی میرے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔

"کیا یہ انسانی اعضاء ہیں؟" گوشت کے لوتھڑے در و دیوار سے چپکے دیکھ کر میری آنکھیں حیرت سے پھٹی رہ گئیں۔ یہ ایسا قیامت خیز منظر تھا کہ میں نے گھبرا کر دونوں ہاتھوں سے اپنا منہ ڈھانپ لیا۔ سینکڑوں فلیٹس اور کھنڈر ہوئی دکانوں کے ملبے سے آہ و بکا، بین، ماتم اور چیخوں کا سلسلہ پھر شروع ہوا اور ان آوازوں سے فضا گونجنے لگی تھی۔

"ہائے میرا بچہ......! تو میری کُل کائنات تھا، میرے بڑھاپے کا سہارا۔" سر پہ پٹی باندھے ایک بوڑھی ماں ملبے کے ڈھیر پر بیٹھی تھی۔

"ہائے...... میرا سہاگ اجڑ گیا......" ایک بیوہ دہائی دے رہی تھی۔

''میرا لال، معصوم سا بچہ، شاید قدرت مہربان ہو جائے اور وہ اس ملبے سے زندہ نکل آئے۔'' ایک نوعمر لڑکی چیخ چیخ کر بین کر رہی تھی اور پاگلوں کی طرح اپنا سر پیٹ رہی تھی۔

''تباہ و برباد کر دیا میرے گھر کو، زندگی بھر کی پونجی سے اسے بنایا تھا۔ آج پتھروں اور راکھ کا ڈھیر نظر آتا ہے۔ ہائے اللہ......! مکان تو گیا ہی، ساتھ ہی میرے جوان بیٹے کو بھی مجھ سے چھین لیا۔'' ایک شخص اپنا سر پیٹتا ہوا وہاں سے گزرا تھا۔ میں نے یہ سارے مناظر دیکھے تھے۔

میرا دل چاہا تھا کہ...... اس بین کرتی ہوئی ماں کے حلق میں پانی کے قطرے ڈال دوں کہ چیخ چیخ کر اس کا گلہ پھٹ رہا تھا...... لیکن نہیں، پہلے میں اس نوعمر لڑکی کے ساتھ مل کر اس ملبے کے ڈھیر سے اس کا بچہ تلاش کروں، وہ رو رو کر کہہ رہی ہے کہ وہ شیر خوار ہے......!

''یا الٰہی......! یہ کیا ماجرا ہے؟ ایسا ظلم اور بربریت؟'' میرے لیے بہتر یہی ہے کہ میں یہاں سے بھاگ جاؤں۔ میں نے ساری ہمت مجتمع کر کے اٹھنا چاہا تھا اور پھر میں آہستگی سے نظریں چراتی ہوئی وہاں سے آگے بڑھ گئی تھی۔ کیا کرتی کہ میرے دلاسے تو ان سب کے لیے مرہم نہیں بن سکتے تھے......!!

کچھ آگے بڑھی تو پھر وہی آوازوں کا اژدہام دھکم پیل کرتا میرے دل اور سماعت کے پار ہونے لگا تھا۔

''بڑی ہمدرد نظر آتی ہو، ڈھونڈو نا، ہمارے سروں کو......'' دو دھڑ میرے سامنے جانے کہاں سے آ کے کھڑے ہو گئے تھے۔

''یہ سر بریدہ نعشیں مجھ سے عجیب سا سوال کر رہی تھیں......! اور میں حیرت اور خوف کے باعث پھٹی آنکھوں سے انہیں تک رہی تھی۔ یہ منظر دل دہلا دینے والے تھے۔ ایک اور نعش وہاں اپنا ہاتھ تلاش کر رہی تھی، خون آلود کپڑوں میں لڑکھڑاتی وہ کبھی اپنے پیاروں کو دیکھتی تو کبھی ملبے کے ڈھیر میں نظریں مرکوز کر لیتی۔

''کیا قصور تھا ہمارا......؟ کیوں کیا دھماکہ یہاں، عرش سے فرش پر لا کر ہمیں زمین کے ڈھیر تلے دفنا دیا......'' عجب کراہ تھی جو میرے دل پر ہتھوڑے برسا رہی تھی۔

"کیوں کھڑی تماشا دیکھ رہی ہو؟ خدا کے لیے، میری ٹانگ ڈھونڈ دو......!" ایک نوجوان حسرت بھری نظروں سے مجھے دیکھتا، سوال کر رہا تھا۔

"یاالٰہی......! کیا یہی انسانیت کی وقعت ہے؟ ملبے کے ڈھیر میں کھلونے بھی ہیں اور کھیلنے والے بھی، جسمانی اعضاء تلاش کرتے یہ لوگ زندہ تو نہیں ہیں......! تو پھر کیا یہ ساری روحیں ہیں جو مجھ سے ہم کلام ہیں؟"

ایک خوف اور کپکپی سی مجھ پر طاری ہو چکی تھی۔ میں نے اپنی آنکھیں میچ لی تھیں...... اور کچھ دیر بعد جب دوبارہ کھولی تھیں تو دیکھا، سب مناظر وہاں سے گم ہو چکے تھے مگر دل دہلا دینے والی چیخیں اور فریادیں میرے کانوں میں دھماکے کر رہی تھیں۔

"اب تو یہاں سے بھاگنے میں ہی عافیت ہے۔" میں نے دکھی دل کے ساتھ سوچا تھا ورنہ کچھ دیر پہلے کے رقت آمیز لمحات زندگی بھر میرا پیچھا کرتے رہیں گے۔ میں اردگرد دیکھتی، خوف و ہراس میں دوڑ لگاتی ہوئی، مین سڑک پر آچکی ہوں...... یہاں شور اور سرگوشیاں، نعرے اور گالیاں، چیخیں، صدائیں، احتجاج اور دھرنے، مختلف آوازوں سے پورا علاقہ گونج رہا ہے، اندر تو میں روحوں سے مل کر آئی تھی مگر یہاں تو زندہ لاشیں ہیں، کئی افراد اپنے حواس کھو بیٹھے ہیں۔

پولیس ابھی تک یہ بھی طے نہیں کر سکی کہ دھماکہ خودکش تھا یا پلانٹڈ؟ مختلف ایجنسیاں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوششوں میں ضرور مصروف دکھائی دیتی ہیں لیکن عوام کے زخموں پر کون مرہم رکھے؟ نیوز اپ ڈیٹس کیمروں میں قید ہو رہی تھیں مگر سچ، وہاں موجود لوگوں کا کوئی پرسان حال نظر نہیں آ رہا تھا۔

یہاں بم دھماکے میں تباہ ہونے والے فلیٹس کے ملبے کی بھی صفائی کی جا رہی تھی جہاں سے بم کی شدت کے نتیجے میں سالم جسم ٹکڑوں میں بٹ جانے والوں کے اعضاء بھی مل رہے تھے، وہیں سینہ کوبی کرتی ہوئی خواتین نظر آ رہی تھیں جو اٹھنے والے ملبے کا بغور جائزہ لے رہی تھیں کہ شاید ملبے کے نیچے ان کا گم شدہ پیارا نظر آ جائے۔

سچ کہوں تو اب میں یہاں سے بھاگ جانا چاہتی ہوں، یہاں زندہ انسان بھی تکلیف میں ہیں اور روحیں بھی پریشان حال ہیں، جب آنکھوں کے سامنے بلند و بالا عمارتیں کھنڈر بن

جائیں اور خاندان کے خاندان اجڑ جائیں تو روحیں بھی لرز جاتی ہیں۔ انسانی جسموں میں قید یہ روحیں اپنے ساتھیوں، پیاروں کے لیے پریشان ہیں تو دوسری طرف جسموں سے محروم روحیں اپنے جسمانی اعضاء کو ڈھونڈنے کے لیے بے قرار نظر آتی ہیں تو کبھی اپنے پیاروں سے جدائی پر بے حال......!

روحوں کے اس مقتل سے میں خود کو کھینچ لائی ہوں۔ اب میں اس جگہ سے دور ایک چبوترے پر بیٹھی اس سانحے کے بارے میں سوچ رہی ہوں جس کے مناظر میری آنکھوں میں مقید ہو چکے ہیں اور میرے زار و قطار رونے کے باوجود بھی وہ مناظر دھندلاتے نہیں، آخر ان معصوم لوگوں کا قصور کیا تھا؟ میں کس سے سوال کروں؟ کس سے جا کر پوچھوں؟ ۔

مسخ ہوئی عمارتوں کے ڈھیر میں
یہ کس کی ہیں آنکھیں؟
جو اپنے خوابوں کے ساتھ
ہمیشہ کے لیے سو چکی ہیں
یہ دو ننھے ہاتھ، جو دھڑ سے محروم نظر آتے ہیں،
آہ، یہ رہے تہی دست!
یہ کون سے چہرے تھے؟
جن کو دیکھے بغیر ان کے پیاروں کو
نہ چین ملتا تھا نہ قرار
آج ہو چکے ہیں رزق خاک
ہاں...... یہ ہے وہی عباس ٹاؤن!
جہاں زندگی، زندگی کا احساس دلاتی تھی
آہ...... اک بم دھماکہ
مرے شہر کے پیارے لوگوں کا
جیون برباد کر گیا

میرے شہر کی کہانی ...... ارم زہرا

انہیں اپنے گھروں سے بے گھر کر گیا
بکھرے سامان کے ساتھ
بکھرے ہیں جسمانی اعضا
کیا یہی ہے انسانیت کی وقعت میرے اللہ!
ملبے کے ڈھیر میں دبے
کھلونے بھی ہیں اور کھیلنے والے بھی
ردائیں یوں پھیلی ہیں
گویا اپنے پیاروں کا کفن بنی ہیں
نہ فرقہ ہے نہ یہاں ذاتیں ہیں
بس انسانیت ہی بربریت کا نشانہ بنی ہے
بارود کی بو اور گولیوں سے چھلنی ہوا
لہو کے قطرے، لہو کے چرچے یہاں
زمیں بھی لہو اُبل رہی ہے
سلگ رہی ہے، سکڑ رہی ہے
اپنے دامن میں بکھرے، بچھڑے ہوئے لوگوں کو
آہ و بکا پر تڑپ رہی ہے
اور چیخ چیخ کر کہہ رہی ہے
کیا تمہیں خبر ہے؟
اک دن وہ حی قیوم!
بہت جلد تم سے اسی زمیں پر
ایک ایک قطرہ خوں کا حساب لے گا!
اے مُردہ ضمیرو، خودکش بمبارو......
اے قوم کے بے حس حکمرانو......

میرے شہر کی کہانی...... ارم زہرا

اگر زندہ انسانوں کی آوازیں
تم تک نہیں پہنچ رہی تو
خدارا......!
زندہ زمیں کا مرثیہ ہی سن لو......!!!

میری نگاہیں زمین پر مرکوز تھیں اور سوچوں میں لفظ قطار در قطار سر جھکائے اتر رہے تھے۔ عباس ٹاؤن کی فضا پُر اسراریت کا شکار ہے، یہاں ہو کا عالم ہے، ایک خوف ہے، دہشت ہے، روحیں یہاں چکراتی پھر رہی ہیں، اپنے پیاروں سے اس طرح علیحدگی ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھی۔ وہ سراپا سوال ہیں۔ جبکہ زندہ انسان اپنے عزیزوں کے لیے رنجیدہ نظر آرہے ہیں۔ وہ بھی سراپا سوال ہیں کہ آخر ان کے جاں نثاروں کا قصور کیا تھا؟ کس سے فریاد کریں، کس سے انصاف مانگیں؟

میں خالی خالی سی کھڑی کسی سمت سفر کرنے کا ارادہ کرتی ہوں پھر پاؤں اٹھاتی ہوں مگر اٹھے ہوئے پاؤں زمیں پر نہیں پڑتے کہ میرا جسم تو ہے ہی نہیں...... میں لہراتی ہوئی کھلے آسمان کی سمت پرواز کرنے لگتی ہوں اور پھر...... گھپ اندھیرے میں ایک روشن مکان کی سمت تیزی سے پرواز کرتی ہوئی اس کے صحن میں اتر آئی ہوں۔ سامنے محرابی در والے بڑے سے کمرے کے ایک کونے میں ایک وجود قلم اور کاغذ لیے بیٹھا کچھ لکھنے میں محو ہے۔ میں نے رقت آمیز آواز میں اسے پکارا مگر وہ بے حسی کی چادر اوڑھے قلم سے کاغذ پر جانے کیا نشتر چلا رہا ہے۔

''سنو......! تمہارے الفاظ بے اثر رہیں گے جب تک تم وہ سانحہ خود آنکھوں سے نہیں دیکھو گی۔ سنو......! کیا میری آواز تم تک نہیں پہنچ رہی ہے؟'' میں اس کی بے حسی پر کڑھتی ہوئی آگے بڑھی اور روشنی بن کر اس کی آنکھوں میں چمکنے لگی کہ میں اپنے جسم کے بنا ادھوری تھی...... اور پھر میں...... اور مجھ میں تڑپتی روح سانحۂ عباس ٹاؤن کے اس افسوس ناک دل دہلا دینے والے واقعے پر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ اس وقت میرے پاس دل کا بوجھ ہلکا کرنے کا واحد ذریعہ یہی ہے کہ میں قرطاس پر ''زندہ زمین کا مرثیہ'' لکھ لوں......!!

☆......☆......☆

آرزوئیں دفن ہوئیں

''آ گیا میرا لاڈلہ......؟'' سرور بی بی نے اقبال حسین کو گھر میں داخل ہوتے دیکھا تو کچھ مطمئن سی ہو گئیں۔

''اماں......! روٹی دے دو، سچ، سخت بھوک لگ رہی ہے۔ آج تو سارا دن دکان پر کھڑے رہنا پڑا۔'' اقبال نے منہ پر پانی کے چھینٹے مارتے ہوئے کہا اور تولیے سے اپنا منہ رگڑ ڈالا۔

''بس چاند......! ابھی لائی، دو منٹ میں روٹی ڈل جائے گی تُو ذرا جب تک اپنی کمر نکالے۔'' سرور بی بی نے اٹھتے ہوئے کہا اور پھر جتنی دیر میں وہ توے پر روٹیاں ڈالتی رہیں، اتنی دیر تک اقبال ٹی وی کے چینل بے مقصد بدلتا رہا تھا۔

''یہ لے میرے لال......! گرما گرم روٹیاں آ گئیں۔'' سرور بی بی نے پیار سے پچکارا۔

''ماں......! تُو کیوں تکلیف کرتی ہے، روٹیاں ایک ہی وقت پکا کر رکھ دیا کر، مجھے نہیں اچھا لگتا تجھے یوں بے وقت اٹھانا۔'' اقبال نے روٹی کا پہلا نوالہ توڑتے ہوئے کہا۔

''ارے......کوئی بات نہیں، اس میں میری اپنی خوشی بھی تو شامل ہے، مجھے اچھا لگتا ہے اپنے چاند کے لیے روٹیاں بنانا۔''

''ہوں......'' اقبال ایک ہلکی سی ہوں کے ساتھ مکمل کھانے کی طرف محو تھا۔

''بھئی...... میرا تو بڑا ارمان ہے کہ دلہن لے آؤں اب اس گھر میں، جو تیرا خیال رکھ

سکے۔ تجھے وقت پر دو روٹی بنا کر دے سکے۔ یہ جان تو اب بوڑھی ہو چکی ہے اور پھر گھر، گھر کام کر کے اب اتنا دم خم کہاں رہا مجھ میں۔"

"ماں......! مجھے نہیں اچھا لگتا تیرا گھر، گھر کام کرنا، بس چھوڑ دے اب......اب تو میں کمانے لگا ہوں ناں، ویڈیو گیم کی دکان سے اتنی تو کمائی ہو جاتی ہے کہ ہماری گزر بسر ہو جائے۔" اقبال نے پانی کا گلاس تخت پر پٹخا۔ اس وقت وہ شدید جھنجلاہٹ کا شکار نظر آ رہا تھا۔

"بس تیری شادی کے لیے کچھ پیسے اور جوڑ لوں پھر چھوڑ دوں گی یہ کام۔" سرور بی بی نے اقبال کی بلائیں لے ڈالی تھیں۔

"میری شادی؟" اقبال نے قدرے مایوسانہ انداز میں کہا۔

"ہاں بچے......! پورے پچیس سال ہو گیا ہے، کیا شادی نہیں کرے گا؟ تیری بہن کو تو میں نے اٹھارہ کی ہوتے ہی رخصت کر دیا تھا۔" سرور بی بی اسے اب ناراض نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔

"بھئی...... میں ابھی نہیں پڑنا چاہتا ان شادی وادی کے چکر میں، یہاں اپنا گزارہ مشکل ہے، ایک اور کو کیسے سنبھالوں گا؟" اقبال سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔

"چل ایسے نہیں کہتے، دلہن تو اپنا نصیب لے کر آئے گی، ہو سکتا ہے، اس کے آتے ہی تُو دولت میں کھیلنے لگے۔"

"ماں......! اب تجھے کون سمجھائے؟"

"بھئی...... مجھے تو تیرے لیے سارہ پسند ہے۔ بہت حیادار اور دین دار خاندان ہے اس کا، بس ڈرتی ہوں کہیں اس کی ماں منع نہ کر دے۔" سرور بی بی کے چہرے پر مایوسی کے سائے منڈلانے لگے۔

"کیوں ماں......! خالہ کیوں منع کرے گی؟" اقبال نے ماں کو حیرت سے دیکھا۔

"تیری ماں گھروں میں کام کرتی ہے ناں، لاکھ تُو اچھا کماتا ہے مگر میں تو......" دو موٹے موٹے آنسو سرور بی بی کے گالوں پر لڑھک گئے۔

''ارے...... میرے لیے میری ماں سے بڑھ کر کچھ نہیں، ایسے سو رشتے میری طرف سے بھاڑ میں جائیں......'' اقبال کے لہجے میں برہمی نمایاں تھی۔

''چل ایسا نہیں سوچتے اور نہ کہتے ہیں، وہ معصوم سی بچی ہے، شریف گھرانہ ہے، یہ تو بس میرے اپنے وسوسے ہیں۔'' سرور بی بی مسکرائیں۔

''اماں......! اماں......! تم تو میرے گلے میں پھندہ ڈال رہی ہو؟''

''ہاں تاکہ تُو سدھر جائے، بس اب کل ہی تیرے رشتے کے لیے خالدہ سے بات کرتی ہوں۔''

''کیوں ہتھیلی پر سرسوں جمانے لگی ہو ماں؟''

''تیری شادی کے ذکر سے تو میرے دل میں گلاب سی تازگی آجاتی ہے، بس میرے بچے......! تیرے سہرے کا ارمان اس ماں کی خواہش ہے۔'' یہ کہتے ہوئے سرور بی بی نے اقبال کو وارفتہ نگاہوں سے دیکھا۔

''اچھا لیکن ذرا صبر تو کر لے اماں......! کچھ پیسے جوڑلوں پھر تُو لے آنا دلہن۔'' وہ سمجھانے والے انداز میں بولا۔

''یہ میں تجھ سے بہتر جانتی ہوں، کچھ پیسے میں نے بھی جمع کیے ہوئے ہیں اور ایک کمیٹی بھی ڈالی ہوئی ہے۔ سوچ رہی ہوں جیسے ہی کمیٹی مل جائے، میں تیرا ہاتھ پیلے کردوں۔'' سرور بی بی بے حد مسرور نظر آرہی تھیں۔

''ٹھیک ہے اماں......! جیسی تیری مرضی، میں تو چلا اب سونے۔'' اقبال نے جمائی لی تو سرور بی بی کھانے کے برتن اٹھا کر کچن کی طرف چلی گئیں۔

O......O......O

''بھئی...... مبارکاں، خالدہ نے رشتہ پکا کرلیا ہے۔'' سرور بی بی نے اکلوتے بیٹے اقبال کو گلے سے لگاتے ہوئے کہا۔

''یہ لو بھائی، منہ تو میٹھا کرلو۔'' ثمرین نے پورا گلاب جامن اقبال کے منہ میں ٹھونس دیا۔

''ہاں...... ہاں...... کھلاؤ، بہن ارمان نہیں نکالے گی تو کون نکالے گا؟'' سرور بی بی نے ہلکی سی چپت اقبال کے سر پہ ماری۔

''اماں......! تم کیا کم تھیں؟ اب یہ ثمرین بھی مجھے تنگ کرنے آ گئی ہے؟''

''اف اماں......! تم نے تو چراغ لے کر اپنی بہو ڈھونڈی ہے۔ آج کے دور میں ایسی معصوم، سیدھی سادی لڑکی کہاں ملتی ہے؟ میرا بھائی تو اسے تنگ کر دے گا۔ جیسی اس کی حرکتیں ہیں، یہ احساس دلا رہی ہوں کہ مجھے سارہ کے کان پہلے سے بھرنا ہوں گے۔'' ثمرین نے آنکھیں گھمائیں۔

''بدتمیز ہو تم...... مت سدھرنا۔'' اقبال نے آنکھیں دکھائیں۔

''اچھا...... تم بہن بھائی آپس میں باتیں کرو، میں ذرا پڑوس سے ہو کر آتی ہوں۔'' سرور بی بی خوش دلانہ انداز میں کہتی ہوئی کھڑی ہو گئیں۔

''اچھا بھائی! یہ بتاؤ، تم نے سارہ کو دیکھا ہے؟'' ثمرین نے چہکتے ہوئے سوال کیا۔

''نہیں ناں، کہاں؟ ہمیشہ سات پردوں میں نکلتی ہے، بس اتنا جانتا ہوں کہ اس کی آنکھیں بڑی، بڑی اور خوبصورت ہیں۔'' اقبال نے معصومیت سے جواب دیا۔

''تو کیا ارادہ ہے؟ ملواؤں تمہیں اس سے؟'' ثمرین کی اس بات سے اقبال کے ہونٹوں سے حلق تک جیسے شہد سرایت کر گیا۔

''ثمرین، کیا کہہ رہی ہے تُو؟ اگر کسی کو پتا چل گیا تو؟ اور اماں کیا سوچے گی؟'' اقبال دھیرے سے گویا ہوا۔

''ارے بھائی! اب سارہ تمہاری منگیتر ہے اور کچھ نہیں ہوتا، میں اس کی کوئی سبیل نکال لوں گی۔'' ثمرین نے اقبال کی پیٹھ پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

O......O......O

''بھائی......! آج دکان ذرا دیر سے کھولنا۔'' ثمرین نے اقبال کے کان میں سرگوشی کی تھی۔

''کیا چل رہا ہے تم دونوں بھائی بہن کے درمیان؟'' توے پر سے پراٹھے اتارتی

سرور بی بی نے ثمرین اور اقبال سے سوال کیا۔

''کچھ خاص نہیں ماں......! پرسوں میں واپس چلی جاؤں گی تو بس بھائی سے کچھ فرمائش کر رہی تھی۔ اب میرا اتنا بھی حق نہیں؟'' ثمرین نے روٹھنے والے انداز میں کہا۔

''ارے نہیں میری بچی......! تجھے تو پورا حق ہے۔ چلو بچو......! جلدی جلدی ناشتہ کرو، میں چائے نکال رہی ہوں۔'' سرور بی بی چائے کپوں میں ڈالتی ہوئی بولیں۔

''ماں......! آپ کی واپسی کب تک ہوگی؟'' ثمرین نے اپنے مطلب کی بات جلدی سے پوچھی۔

''یہی کوئی تین بجے تک۔'' سرور بی بی بے خیالی میں بولیں۔ میں نے دال بنا دی ہے، بس تم آٹا گوندھ کر روٹی ڈال دینا۔ اس اقبال کا کچھ پتا نہیں اسے بے وقت بھوک لگتی ہے۔'' تیزی سے کچن سمیٹتی سرور بی بی اب کھڑی ہو گئی تھیں۔

''ارے ماں......! اب بھائی کی فکر کرنا بند کریں، میں تو اس کی بھوک اڑوانے کا انتظام کرنے جا رہی ہوں۔'' ثمرین نے لفظ چبا چبا کر ادا کیے تو اقبال اسے گھور کر رہ گیا جب کہ سرور بی بی سنی ان سنی کرتی ہوئی تیار ہونے کے لیے کمرے میں چلی گئیں۔

O......O......O

''ارے بھئی...... اتنا شرماؤ گی تو کیسے چلے گا؟ ادھر بیٹھو۔'' ثمرین، سارہ کا ہاتھ کھینچتی ہوئی گھر میں لے آئی تھی۔

''اگر گھر میں کسی کو پتا چل گیا تو؟'' سارہ مہین سی آواز میں بولی۔ اس کے چہرے پر دنیا جہان کا ڈر نمایاں تھا۔

''ارے بھئی...... کچھ نہیں ہوتا، تم اپنی دوست سے ملنے جا رہی تھیں اور میں نے تمہیں راستے میں دیکھا، پکڑا اور پھر کھینچتے ہوئے اپنے گھر لے آئی، یہی ہے ناں، اصل بات؟''

''جی......!'' سارہ نے اثبات میں سر ہلایا۔

''پھر اتنا ڈر کیوں رہی ہو؟'' ویسے بھی تم کو اقبال سے ملوانا ہے۔'' ثمرین نے تیزی سے اپنا موقف بیان کیا۔

''کیا......؟'' سارہ بے اختیار کھڑی ہو گئی۔

''بیٹھو...... میں اقبال کو بلا کر لاتی ہوں۔'' وہ اس کی آنکھوں میں جھانکتی ہوئی بولی۔

''نہیں، یہ ٹھیک نہیں۔''

پھر اگلے ہی لمحے اس نے کچھ سوچا اور اسے کھینچتی ہوئی لان میں لے آئی۔ ''بھئی...... تم دونوں ایک دوسرے کو دیکھ لو، بعد میں یہ نہ کہنا کہ دولہا یا دلہن کی شکل دکھائے بغیر شادی کر دی......!'' ثمرین کندھے اچکاتی تخت کے کونے پر ٹک گئی۔

اقبال کی شوخ نگاہیں سارہ کے سراپے میں الجھ چکی تھیں جب کہ سارہ نظریں جھکائے اپنے تھرتھر کانپتے جسم کو سہارا دے رہی تھی مگر وہ ناکام نظر آرہی تھی۔

''دیکھا...... ماں نے تمہارے لیے چاند کا ٹکڑا ڈھونڈا ہے۔'' ثمرین ایک ادا سے بولی۔

''چاند کو اتنا شرماتے ہوئے میں پہلی بار دیکھ رہا ہوں۔'' اقبال شرارتی انداز میں ہنسا۔

''اف......'' سارہ نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا۔

''دیکھو اقبال......! میں نے اپنا وعدہ پورا کیا، اب میں اسے چھوڑنے جارہی ہوں، یہ نہ ہو کہ اس کے گھر میں کسی کو خبر ہو جائے۔'' ثمرین کے چہرے پر فکر تھی۔

''ہاں...... ہاں...... ٹھیک ہے۔'' اقبال نے اثبات میں سر ہلایا۔

''تو جلدی سے بتاؤ...... کیسی پسند ہے؟ یہ تصویر سے زیادہ مختلف تو نہیں؟'' ثمرین نے بھائی کی پیشانی پر ہاتھ رکھا۔

''اس سے بھی کہیں زیادہ خوبصورت۔'' اقبال نے ہلکی شرماہٹ کے ساتھ بتایا تو سارہ کا چہرہ کھل کر گلاب ہو گیا۔

''اب میں جانا چاہتی ہوں۔'' سارہ نے آہستگی سے کہا۔

''ہاں بھئی...... چلو، اب ہمیں واقعی جانا چاہیے۔ اماں اگر آگئیں تو میری شامت آجائے گی۔'' ثمرین، سارہ کا ہاتھ پکڑے ہوئے اسے داخلی دروازے سے باہر لے آئی تھی۔

O......O......O

''اماں......! یہ اگلے پچھلے تمام پیسے جوڑ کر پورے پانچ ہزار میرے پاس جمع ہو گئے

ہیں۔'' اقبال نے ماں کی جانب نوٹ بڑھاتے ہوئے کہا۔

''میرے پاس اس مہینے کی بی سی ملنے کے بعد پورے تیس ہزار ہو جائیں گے۔'' سرور بی بی نے مسکرا کر بتایا۔

''اچھا ماں......!'' اقبال کی باچھیں کھلیں۔

''لیکن یہ پیسے تو بہت تھوڑے ہیں، اتنے سے پیسوں میں شادی تھوڑی ہوتی ہے؟'' سرور بی بی کے چہرے پر فکر کے سائے منڈلانے لگے۔

''بھئی...... کچھ ادھار میں دکان کے مالک سے بھی تو لوں گا، وہ کہہ رہا تھا...... تیری شادی کے لیے دس، بیس ہزار دینا میرے لیے کوئی بڑی بات نہیں۔''

''ٹھیک ہے پھر تو کسی طرح سے بیس ہزار کا بندوبست کر لے، میں بھی آج اپنی کام والی باجی سے بات کروں گی۔'' سرور بی بی نے پُرسوچ انداز میں کہا۔

''ویسے اماں......! اتنے پیسوں کی ضرورت کیا ہے؟ سادگی سے بھی تو شادی ہو سکتی ہے ناں؟''

''ارے بیٹا......! میرا سادگی سے ہی تو شادی کرنے کا ارادہ ہے؟''

''اچھا......؟'' اقبال نے منہ بسورا۔

''بس چاند دل کو ایک دھڑکا لگا رہتا ہے کہ جانے کب میری آنکھ بند ہو جائے، تیری دلہن اس گھر میں آ جائے گی تو مجھے تسلی و سکون تو ملے گا ہی، ساتھ ہی اس گھر میں رونق بھی ہو جائے گی۔'' سرور بی بی نے بہت محبت اور شفقت سے اقبال کے سر پر ہاتھ رکھا تو وہ خاموش ہو گیا۔

''ٹھیک ہے...... میں آج ہی دکان کے مالک سے بیس ہزار ایڈوانس کی بات کروں گا۔'' اقبال نے چائے کا خالی مگ ماں کی طرف بڑھایا اور اٹھ گیا۔

O......O......O

''تو تمہیں بیو نے میرا پیغام پہنچا دیا تھا؟'' اقبال نے برقعے میں ملبوس سارہ کی آنکھوں میں جھانکا۔

''جی......!'' وہ قدرے کٹی سی آہستگی سے بولی۔

''اچھا...... مجھے تم سے کچھ ضروری بات کرنی ہے، اگر تمہیں اعتراض نہ ہو تو میرے ساتھ قریبی آئس کریم کی شاپ تک چلو گی۔'' اقبال نے آہستہ آہستہ اپنی بات سارہ تک پہنچائی مگر وہ بدستور خاموش ہی کھڑی تھی۔

''دیکھو...... اب تم میری منگیتر ہو، میں تمہارا اچھا برا، سب کا جواب دہ ہوں، تم مجھے غلط نہیں سمجھنا، بس ایک پریشانی ہے، اس بارے میں بات کرنی ہے۔'' اقبال نے اپنا مقصد بیان کیا۔

''جی...... ٹھیک ہے، چلیے۔'' سارہ نے بڑی مشکل سے جواب دیا۔

''اوئے چھوٹے، ذرا آدھا گھنٹہ دکان سنبھالنی ہے تُو بیٹھ، چائے وغیرہ منگوا کر پی، میں ابھی آتا ہوں۔'' اقبال ایک بچے کو تنبیہ کرتا ہوا دکان سے باہر آیا اور پھر وہ دونوں سیدھے ہاتھ کی گلی میں مڑ گئے۔ اس گلی کے اختتامی سرے پر ہی ایک آئس کریم پارلر تھا۔

''کون سی آئس کریم منگواؤں تیرے لیے؟'' اقبال نے بیٹھتے ہی سارہ سے دریافت کیا۔

''کوئی بھی......'' وہ اتنا ہی کہہ کر خاموش ہو گئی۔

''تم اتنا کم کیوں بولتی ہو؟''

''آپ بتایئے، مجھے اس طرح سے کیوں بلوایا؟'' سارہ نے معصومیت سے پوچھا۔

''دیکھو...... ایک بات میں تمہیں صاف صاف بتا دوں، میں اتنا نہیں کماتا کہ تمہیں عیش کرواؤں، ہاں، دو وقت کی روٹی کا وعدہ ضرور کرتا ہوں۔'' اقبال نے آستین کے کف اوپر چڑھاتے ہوئے کہا۔

''جی...... ٹھیک ہے۔'' سارہ نے اسی پر اکتفا کیا۔

''میری اماں یا میرے پاس اتنے پیسے نہیں ہیں کہ ہم شان و شوکت سے شادی کریں، بس سادگی سے نکاح ہو گا اور میں یہ بھی نہیں چاہوں گا کہ تم بھاری جہیز کے ساتھ میرے گھر آؤ، تم سمجھ رہی ہو ناں؟'' اقبال نے خاموش بیٹھی سارہ سے سوال کیا۔

''جی...... میں سب سمجھ رہی ہوں، آپ اپنی بات جاری رکھیے۔'' اسی دوران ویٹر آئس کریم کے کپ ٹیبل پر رکھ کر چلا گیا تو اقبال نے اسے آئس کریم کھانے کی دعوت دی۔

''تو پھر مجھے بتاؤ، تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں ہے ناں؟ کہیں بعد میں تم یہ شکایت کرو کہ میں تمہیں عیش نہیں کراتا؟ یا میری اماں نے شادی شان و شوکت سے نہیں کی؟'' اقبال نے پھر اسے کریدا۔

''مجھے بس آپ کا ساتھ چاہیے اور کچھ نہیں۔'' سارہ نے مختصر جملوں میں پوری بات کہہ دی تھی۔

''تم تو بڑی سیانی ہو، میرے دل کی بات جان گئی ہو، بس میں کل ہی ماں کو تمہارے گھر بھیجوں گا کہ وہ تمہاری ماں کو بتا دیں کہ جہیز کے چکر میں وہ نہ پڑیں، مجھے کچھ بھی نہیں چاہیے۔''

''ٹھیک ہے...... آپ جیسا بہتر سمجھیں۔'' سارہ کے لبوں پر ہلکا سا تبسم تھا۔

''شکریہ سارہ...... تم نے میرا مان رکھا۔'' ایک ہی پل میں اقبال کے دل میں سارہ کے لیے ڈھیروں پیار اُمڈ آیا۔

''پتا ہے...... جب سے میں نے تمہاری سوہنی شکل دیکھی ہے، بس دل کرتا ہے، تمہیں سامنے بٹھا کر دیکھتا ہی رہوں، میں تو اماں کو منع کر رہا تھا کہ ابھی میں شادی نہیں کرنا چاہتا، یہ تو اماں نے زبردستی کی۔'' اقبال بنا سانس لیے کہے چلا جا رہا تھا۔

''سارہ خاموش سی بہت اشتیاق سے اسے سن رہی تھی۔ ''پتا ہے پھر میں نے ماں سے کہا کہ تُو اپنی پسند کی......''

''اچھا......'' سارہ ہلکی ہنسی کے ساتھ گویا ہوئی۔

''بس اماں نے تجھے پسند کر لیا اور اب مجھے اپنی ماں کی پسند پر ناز ہے۔'' اقبال نے یہ کہتے ہوئے نظروں کا زاویہ بدلا اور ویٹر کو اپنی طرف متوجہ کیا۔

''بہت شکریہ تمہارے آنے کا۔'' جیب سے ایک لال نوٹ نکال کر وہ اب ویٹر کی جانب بڑھا چکا تھا۔

''اب چلیں یہاں سے......؟'' سارہ کی متفکر آواز پر اقبال اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''ہاں...... کیوں نہیں، گھر تو یہاں سے نزدیک ہی ہے، تم گھر کی طرف جاؤ، میں دکان

جاتا ہوں اور ہاں، اپنا خیال رکھنا۔" ایک بھرپور مسکراہٹ کے ساتھ اقبال اپنی دکان کی طرف مڑ گیا جب کہ سارہ گھر کی جانب۔

O......O......O

"دیکھا اماں......! استاد نے پورے بیس ہزار دیئے ہیں مجھے، ذرا گننا تو...... اب کل کتنے پیسے ہو گئے ہیں ہمارے پاس؟" اقبال نے پیسے ماں کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"تجھے اب بہت جلدی ہو گئی ہے، دیکھ رہی ہوں تیرے رنگ و انداز۔" سرور بی بی نے اقبال کے کان کھینچتے ہوئے کہا۔

"چھوڑ ناں، اماں......! ذرا پیسے تو گن اور ہاں، اماں......! میں سادگی سے شادی کرنا چاہتا ہوں تو سارہ کے گھر والوں کو بھی سمجھا دے کہ ہمیں جہیز نہیں چاہیے۔" اقبال نے ماں کی طرف التجائی انداز میں دیکھا۔

"اچھا بچے......! کہہ دوں گی میں، یہ دیکھ، اب کُل ملا کر پورے نوے ہزار ہو گئے ہیں۔" سرور بی بی نے مسرت بھرے لہجے میں کہا۔

"کیا......؟ نوے ہزار......؟" اقبال کے لہجے میں حیرت اور خوشی تھی۔

"کل مجھے کام والی باجی دس ہزار دے دیں گی تو پورے ایک لاکھ روپے ہو جائیں گے پھر دیکھنا، کتنی تیزی سے تیری شادی کی تیاری شروع کر دوں گی۔" سرور بی بی، اقبال کی بلائیں لیتے ہوئے بولیں۔

"واہ اماں......! تُو، تو بڑی اچھی، ہوشیار، سمجھ دار ہے، میں تو بہت پریشان ہو رہا تھا۔ خیر...... اب ایک معقول رقم ہو ہی گئی ہے تو میں اپنے سارے دوستوں کو شادی پر بلاؤں گا۔" اقبال کے چہرے پر مسرت کا ہالہ تھا۔

"ہاں...... میرے بچے......! ضرور، ضرور، ہم سب کو بلائیں گے۔ چل اب مجھے آرام کرنے دے۔" اور پھر سرور بی بی آرام کرنے کی خاطر تخت پر لیٹ گئیں جب کہ اقبال، سارہ کے ساتھ آئندہ زندگی کے خوبصورت خواب دیکھنے لگا۔

O......O......O

اس روز سرور بی بی بہت خوش نظر آ رہی تھیں، بھاگ بھاگ کر گھر کے سارے کام کر رہی تھیں۔

''چل اقبال......! اٹھ جا...... دکان پر نہیں جانا؟'' انہوں نے بڑے لاڈ سے اقبال کا ہاتھ کھینچا۔

''سب خیریت تو ہے ماں......! بڑی خوش نظر آ رہی ہے۔ ماشاء اللہ سے...... اللہ...... میری ماں کو کسی کی نظر نہ لگے۔'' اقبال نے کروٹ لیتے ہوئے شوخی سے کہا۔

''آج میں اپنی بہو کے ساتھ خریداری کے لیے جا رہی ہوں۔'' وہ نخرے دکھانے والے انداز میں بولیں۔

''کیا...... سارہ کے ساتھ؟'' اقبال...... ماں کی بات سن کر اب مکمل جاگ گیا تھا۔

''ہاں......اب اس کے لیے جوڑے لینے جا رہی ہوں تو سوچا، اسی کی پسند سے لے لوں۔''

''واہ ماں......! کیا بات ہے، بہو کا ابھی سے اتنا خیال، وہ گھر آ گئی تو، تُو بیٹے کو بھول جائے گی۔'' اقبال نے شکوہ کیا۔

''ہاں...... ایسا ہی سمجھ لے۔'' سرور بی بی مسکراتے ہوئے بولیں۔

''جا ماں......! میں تجھ سے ناراض ہو گیا......'' اقبال نے خفگی سے منہ دوبارہ کمبل کے اندر گھسا لیا۔

''ارے...... تُو، تو میرا راجا بیٹا ہے۔ ناشتہ بنا کر رکھا ہے، کر کے دکان پر جانا ہے، میں بس نکل رہی ہوں۔ آج کے کام جلدی جلدی نمٹا لوں تا کہ سارہ کو بازار لے جا سکوں۔'' سرور بی بی نے پورے دن کا نقشہ کھینچا۔

''ٹھیک ہے ماں......!'' اقبال نے بستر سے اٹھتے ہوئے کہا۔

''اچھا بچے......! گھر اچھے سے لاک کر کے نکلنا، اس بڑے صندوق میں ہی سارے پیسے پڑے ہیں۔''

''ارے ماں......! کون پاگل اس گھر کا رخ کرے گا؟'' تم جاؤ تسلی سے اور بہو کے ساتھ بیٹے کے لیے بھی کچھ لے لینا۔''

”میرے چاند......! اللہ تجھے لمبی زندگی دے۔ تیرے لیے تو یہ ماں جیتی ہے۔ اچھا چاند......! ناشتہ وقت پر کر لینا، میں نکل رہی ہوں۔“ اقبال کی پیشانی کا بوسہ لیتی سرور بی بی جا چکی تھیں۔ جب کہ اقبال نے بھی دکان پر جانے کے لیے تیاری شروع کر دی تھی۔

O......O......O

بلوچ کالونی تھانے کی حدود منظور کالونی میں بروز جمعہ 3 رفروری کو سرور بی بی، اقبال کی شادی کی شاپنگ کر کے سات یا آٹھ بجے کے دوران جب گھر لوٹیں تو انہوں نے دیکھا کہ گھر کا دروازہ کھلا پڑا ہے، سب لائٹیں بند ہیں اور پورے گھر میں اندھیرا ہو رہا ہے۔

”یا الٰہی......! خیر......آج اقبال کو خاص تاکید کر کے بھی گئی تھی پھر بھی دروازہ کھلا ہے اور اندھیرا پھیلا ہے پورے گھر میں؟“ سرور بی بی بڑبڑاتی ہوئی صحن سے نکل کر کمرے کی طرف آئیں اور لائٹ جلانے کے بعد جیسے ہی انہوں نے کمرے کا دروازہ کھولا تو ان کی چیخیں بلند ہو گئیں۔ ان کے لختِ جگر، پچیس سالہ اقبال حسین کی خون میں لت پت نعش پڑی ہوئی تھی۔ اقبال کے منہ اور چہرے سے خون نکل رہا تھا جب کہ گھر کا تمام سامان بکھرا ہوا تھا اور وہ صندوق جس میں سرور بی بی نے اقبال کی شادی کے لیے رقم رکھی تھی، اس کا تالا ٹوٹا ہوا تھا۔

اقبال حسین ایک شریف انسان تھا اور اس کی کسی سے دشمنی بھی نہیں تھی تو پھر یہ کون شقی القلب انسان تھا جو پیسے کی خاطر اقبال کو موت کے گھاٹ اتار گیا؟ تا حال پولیس ملزم کو پکڑنے میں ناکام ہے۔ دوسری طرف سرور بی بی جو اقبال کی شادی کے خواب آنکھوں میں سجائے بیٹھی تھیں، وہ تو جیسے جیتے جی مر گئیں۔ ان کی ساری آرزوئیں، خواب اقبال کی میت کے ساتھ ہی دفن ہو گئے ہیں۔

پولیس کی ملزم کو پکڑنے کی کوشش تو اپنی جگہ لیکن آج سرور بی بی جس شدت سے اپنے لختِ جگر کو یاد کرتی ہیں اور تڑپتی ہیں تو مجھے پورا یقین ہے، ان کی آہیں اقبال کے ملزم کو جلا کر خاکستر کر دیں گی......

☆......☆......☆

وہ حساب لے گا

نئے سال کی ابتدا ہونے والی ہے، نئے سال کے کیلنڈرز بھی دیواروں پر آویزاں ہو چکے ہیں اور تو اور لوگوں کی اکثریت نے تو جنتری بھی خرید لی ہے۔ پورے سال کا زائچہ نظروں کے سامنے ہے۔ خوشی اور غم کے ملے جلے تاثرات سے سجے فلکی اثرات پر ماہرین کی رائے بھی قابل ستائش ہے۔ اسی حوالے سے سوچتے ہوئے جانے کیوں اچانک ہی بجلی کی طرح ایک خیال میرے دماغ میں کوندا...... اور میں کتابوں کے ریک سے 2012ء کی جنتری اٹھا لائی اور پھر 2012ء نومبر کے حوالے سے خصوصی احکامات پڑھتے پڑھتے میری آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ ملازمت میں ترقی، سفر کے مواقع، دوستوں سے وابستہ توقعات اس مہینے پورے ہونے کا امکان تھا، بس طبیعت کی ناسازی کے حوالے سے کچھ ضروری ہدایات تھیں۔ میں نے جنتری بند کر دی کیونکہ میں جانتی ہوں، اس میں جو کچھ لکھا ہے، وہ امکان پر مبنی ہے، سو فیصد سچ نہیں۔

''بچاؤ...... بچاؤ...... میرے ہاتھ چھوٹ رہے ہیں۔'' ان لفظوں کی بازگشت مجھے سونے نہیں دیتی۔ میں کئی راتوں سے پریشان ہوں کیوں کہ مجھے چین ہی نہیں مل رہا اور جب بے چینی نے مجھے کروٹیں بدلنے پر مجبور کیا تو میں کمپیوٹر آن کر کے بیٹھ گئی۔ میں گوگل پر 28/ نومبر 2012ء کا Horoscope سرچ کر چکی تھی۔ اس تاریخ کے سارے ہی Zodiac sign میں نے پڑھ لیے، کسی میں بھی کوئی ایسی بات نہیں تھی جسے پڑھ کر تشویش

میں مبتلا ہوا جائے۔

ستائیس سالہ اویس بھی اپنا Zodiac sign پڑھ کر گھر سے نکلا تھا۔ اس کے لیے یہ بات باعثِ خوشی تھی کہ آج کی تاریخ میں ملازمت میں ترقی کے امکانات بڑے قوی ہیں۔

آج کے دن تو سفر بھی وسیلۂ ظفر ہے، کوئی پریشانی نہیں تھی۔ فائنل انٹرویو کی کال تھی، تعلیم یافتہ، خوش شکل، بی کام میں پورے کراچی میں تیسری پوزیشن حاصل کرنے والا اس جاب کے لیے لائق تھا اور پھر ہوا بھی یہی، اویس کا قریبی دوست جو کے ای ایس سی میں ملازمت کرتا تھا، اس دوست کے ذریعے اسے پتا چلا کہ ویکنسیاں آئی ہوئی ہیں تو اویس نے بھی اس جاب کے حصول کے لیے انٹرویو دیا اور کمیٹی نے اس کی فائنل انٹرویو کے لیے سلیکشن بھی کر لی۔

اویس کی تیاری بھرپور تھی۔ وہ ہر طرح سے بہتر نظر آنا چاہتا تھا۔ کپڑوں کی سلیکشن سے لے کر میچنگ شوز تک وہ نکال چکا تھا، بس اب صبح ہونے والے انٹرویو کے لیے خود کو ذہنی طور پر تیار کر رہا تھا۔ گزشتہ رات تو اویس سرجی کوچنگ انسٹی ٹیوٹ جہاں وہ بطور ٹیچر ملازمت کرتا تھا، وہاں اپنے تمام دوستوں کو ٹریٹ دینے کا وعدہ بھی کر آیا تھا۔

28 نومبر کا سورج اس کے لیے خوشیوں کا پیغام لے کر طلوع ہوا تھا۔ ٹریفک کا شور اور اژدھام اسے برا لگ رہا تھا اور ساتھ ہی یہ فکر بھی ستا رہی تھی کہ کہیں وہ لیٹ نہ ہو جائے۔ مستقبل کے سہانے خواب اس کی آنکھوں میں سجے ہوئے تھے کیونکہ چھ بہن بھائیوں میں وہ سب سے بڑا تھا اس لیے اس کی خواہش تھی کہ ان کی ذمہ داری اچھے انداز میں نبھائے۔ وہ اپنے ماں باپ کا سہارا بننا چاہتا تھا۔ یہ جاب اس کے لیے ایک سنگِ میل ثابت ہو سکتی تھی اس لیے وہ دل و جان سے دعائیں کرتا اپنی منزل کی جانب گامزن تھا۔ دورانِ سفر وہ اپنے تعلیمی سرٹیفکیٹ، ڈگریوں اور دیگر ضروری دستاویزات پر طائرانہ نظر ڈالتا رہا اور دل ہی دل میں اپنی خوش نصیبی پر ناز کرتا رہا۔

اویس بیگ عبداللہ ہارون روڈ پر واقع اسٹیٹ لائف بلڈنگ میں مقررہ وقت سے پہلے ہی پہنچ گیا تھا اور اب اپنی نشست پر بیٹھا انٹرویو شروع ہونے کا انتظار کر رہا تھا کہ انٹرویو شروع ہونے سے کچھ دیر قبل ہی عمارت کے اندر کا ماحول تبدیل ہو گیا، ہر طرف آگ، آگ کی

صدائیں بلند ہونا شروع ہو گئیں اور دیکھتے ہی دیکھتے عمارت میں دھواں ہی دھواں بھر گیا۔ اب پوری عمارت میں افراتفری مچ چکی تھی جس کا جہاں دل چاہ رہا تھا، وہ وہاں بھاگ رہا تھا اور سب کے ذہنوں پر صرف اپنی جان بچانے کی دھن سوار تھی، بدحواسی کے عالم میں دوڑتے لوگ ایک دوسرے سے ٹکرا رہے تھے۔ ایسے میں اویس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا اور وہ بھی اپنی جان بچانے کی خاطر نویں منزل پر ایک روشن دان جو اسے اس وقت زندگی کی کرن محسوس ہوا، وہ اس کی بیرونی جانب لٹک گیا اور لوگوں سے مدد کے لیے فریاد کرنے لگا۔ عمارت میں آگ کا شور وغل سن کر پورے علاقے میں کافی بھگدڑ مچ گئی تھی۔ عمارت کے باہر لوگوں کی بڑی تعداد جمع تھی۔

نویں منزل سے لٹکتا اویس اپنی زندگی کی بھیک مانگ رہا تھا، لوگوں سے فریاد کر رہا تھا مگر اویس کی فریادیں شاید ان کے گوش گزار نہیں ہو رہی تھیں۔ نیچے مجمع یہ عجیب وغریب منظر بڑی حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ دیکھنے والے اپنے اپنے موبائل فونز سے اویس کی مجبوری اور بے بسی کو اپنے کیمروں میں محفوظ کر رہے تھے۔ میڈیا بھی بھرپور طریقے سے اپنی کوریج کر رہا تھا لیکن کوئی اہل بصیرت وہاں یہ نہیں سوچ رہا تھا کہ یہ نوجوان جو اتنی بلندی پر جھول رہا ہے، اس کے بچاؤ کی تدبیر کیسے کی جائے؟ اگر اس کی ماں، اس کا باپ یا بہن بھائی اسے ایسی حالت میں دیکھتے تو یقیناً وہ اس وقت اپنی جان کی بازی لگا کر اسے بچانے کی کوشش کرتے مگر افسوس، اس وقت اویس کے سگے رشتے دار موجود نہیں تھے۔ پندرہ منٹ کی فریادیں اور چیخنے چلانے کے بعد اویس کے ہاتھ چھوٹ گئے۔ وہ بلندی سے نیچے گرتا آسمان کی بلندیوں پر پہنچ چکا تھا مگر بے حسی کا تماشہ جاری رہا، پورا دن اس فوٹیج کی بریکنگ نیوز ہر چینل سے آتی رہیں۔

میری سمجھ میں یہ نہیں آرہا کہ آخر لوگ کیوں اتنے بے حس ہو گئے ہیں؟ کوئی کمبل، لحاف، کپڑے کا تھان، کسی آفس کا پردہ اس لٹکتے ہوئے نوجوان کے نیچے بچھا کر اس کی جان بچا سکتا تھا مگر شاید جیتے جاگتے، بھاگتے دوڑتے انسان پتھر کے بت بن چکے تھے جن کے سارے احساسات مردہ ہو چکے تھے۔ نہ ہی ان کا ضمیر ان کو ملامت کر رہا تھا اور نہ ہی ان کے دل دہل رہے تھے۔

زندگی صورتیں بدلتی رہتی ہے مگر موت کا رنگ ایک ہی ہے اس لیے کہ موت فطرت کا ایک رویہ ہے اور فطرت کے رویئے وقت، حالات کے ساتھ بدلا نہیں کرتے۔ اویس تو اس بے حس معاشرے سے فریاد کرتے کرتے چلا گیا لیکن میری سوچوں کے آئینے میں اتر کر وہ مجھ سے عجیب عجیب سوال کرتا ہے۔

''جب قسمت کا فیصلہ اوپر والا کرتا ہے تو ستاروں کے کھیل ہم نیچے بیٹھ کر کیوں کھیل رہے ہیں؟''

''بہر حال اس کے اثرات بھی تو شخصیت پر مرتب ہوتے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''میں اب جان چکا ہوں، یہ شہر، شہر آسیب بن چکا ہے۔ اب یہاں انسانیت زندہ نہیں رہی، سانس لیتے، حرکت کرتے، مسکراتے، جاگتے، قہقہے لگاتے جسموں کی گری موم کی طرح پگھل چکی ہے۔ اب زمین پر چلتے پھرتے لوگوں کو زمین کے نیچے دفن ہونے کی ضرورت ہی نہیں کیوں کہ ان کے جسم مردہ ہو چکے ہیں۔''

''ظاہر ہے، جب جوانیاں کلاشنکوف کے بدلے بیچ دی جائیں تو جسم مردہ ہی ہو جاتے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''میں تو اس شہر کی روشنیوں میں اضافہ کرنا چاہتا تھا۔ ملک کا نام روشن کرنا چاہتا تھا مگر بے رحمی اور بے حسی کا شکار ہو گیا۔ اب میں جان گیا ہوں، اس شہر میں زندگی نہیں رہتی بلکہ بیمار معاشرے کا ہر شخص دائمی مریض بن گیا ہے۔ جس میں زندگی کی کوئی رمق موجود نہیں۔''

سوچوں کے آئینے میں نظر آتی اویس کی شبیہ کئی حصوں میں تقسیم ہوئی اور پھر غائب ہو گئی اور میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گئی کہ موت کا بھیانک، شب جیسا تاریک چہرہ کبھی نہیں بگڑتا، آخر کیوں؟ اویس ہی کہتا ہے، میں شہر آسیب میں رہ رہا ہوں جہاں کبھی ایک کال پر موت کا پیغام مل جاتا ہے تو کبھی اندھی گولی کے روپ میں موت آ جاتی ہے۔ کبھی موت کا بم بلاسٹ ہو جاتا ہے تو کہیں موت آگ کی لپیٹوں میں تن جلاتی نظر آتی ہے، کوئی بھوک کی خاطر موت کو گلے سے لگا لیتا ہے تو کوئی بے روزگاری کے باعث موت کا زہر اپنے اندر اتار لیتا ہے، شہر آسیب میں ہر طرف مایوسی کا راج ہے، یہاں کی ہوائیں اب خوشبو نہیں بانٹتیں نہ ہی شبنم کی نمی

پھول کی پنکھڑی کا روپ سنوارتی ہے۔ سدا کی بے وفا زندگی ہر قدم پر اپنا رنگ بدل لیتی ہے اور موت کے سینے پر اپنا سر ٹکا دیتی ہے۔

ستائیس سالہ اویس تو لوگوں کی بے حسی کا شکار ہو چکا تھا لیکن کراچی کا ہی رہائشی محمد عباس صرف انیس سال کا تھا۔ اپنے پانچ بہن بھائیوں میں سب سے بڑا، کم عمری میں ہی گھر والوں کا بوجھ اس کے کاندھوں پر آ گیا تھا اس لیے اس نے ملازمت کی خاطر پڑھائی ترک کر دی اور نجی ٹیکسٹائل کمپنی میں ملازمت کرنے لگا۔ یہاں اس کی ملاقات سارہ سے ہوئی، معمولی شکل وصورت والی یہ لڑکی اس کے دل کو صرف اس لیے اچھی لگی کیوں کہ وہ اس چھوٹی سی عمر میں اپنی ماں کا سہارا بننا چاہتی تھی۔

ایک دن داخلی دروازے پر محمد عباس نے سارہ کو روک لیا۔ وہ بھی کچھ جھجکتے ہوئے رک گئی۔ کئی دنوں سے وہ محمد عباس کی آنکھوں میں اپنے لیے پسندیدگی کا رنگ تو دیکھ ہی رہی تھی۔

''تم کیوں ملازمت کرتی ہو یہاں؟ ایسی بھی کیا مجبوری ہے تمہارے ساتھ؟ مجھے اچھا نہیں لگتا، سب تم کو گھور گھور کر دیکھتے ہیں۔'' محمد عباس نے اپنے دل کی بات سارہ کو بتائی۔

''میرا...... میری ماں کے علاوہ کوئی نہیں ہے، میں ہی ان کا واحد سہارا ہوں۔ میرے بابا تو کب کے اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں اس لیے مجھے مجبوراً یہاں جاب کرنی پڑ رہی ہے۔'' چندرہ سالہ سارہ نے انتہائی کرب کے ساتھ اپنی روداد محمد عباس کو سنائی۔

''یہ تو بہت تکلیف دہ بات ہے، اچھا...... میں تمہارے لیے کچھ کرتا ہوں۔'' وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

''آپ میرے لیے کیا کریں گے؟'' سارہ نے آہستگی سے پوچھا۔

''تمہیں مجھ پر اعتبار تو ہے ناں، میرا مطلب ہے، تم مجھ پر بھروسہ کر سکتی ہو؟'' محمد عباس کا لہجہ سوالیہ تھا مگر سارہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ظاہر ہے، وہ پہلی بار ملنے والے اس شخص پر کیسے بھروسہ کر سکتی تھی؟

''میں تمہیں اپنا نمبر دے دوں؟ تم مجھے کال کر لینا جب کوئی ضرورت ہو تمہیں۔'' قدرے توقف کے بعد محمد عباس پھر بولا تھا۔

''ٹھیک ہے۔'' سارہ نے اثبات میں اپنا سر ہلا دیا۔

''تم بہت اچھی ہو سارہ...... مجھے تمہاری سادگی سے ڈر لگتا ہے، یہ عمر تو گھر میں بیٹھ کر نئے نئے خواب سجانے کی ہوتی ہے۔ خیر...... جو قدرت کو منظور ہو۔'' وہ اپنی دانست میں سارہ کو سمجھاتا جا رہا تھا اور وہ خاموشی سے سنتی جا رہی تھی۔ قدرت کی ستم ظریفی پر وہ حیران تو تھی ہی لیکن عباس کی ایسی سوچ جان کر دل ہی دل میں خوش بھی ہو رہی تھی۔

O......O......O

وقت تیزی سے گزرتا جا رہا تھا۔ محمد عباس کے کہنے پر سارہ نے نہ تو اسے کال کی اور نہ ہی دوبارہ اس کے روکنے پر راستے میں رکی۔ محمد عباس کے لیے یہ امر حیران کن تھا۔ آخر ایسی کیا بات ہو گئی ہے کہ سارہ اسے مسلسل اگنور کر رہی ہے؟

''کوئی پریشانی ہے کیا؟'' ایک دن کینٹین کی طرف جاتی سارہ کو محمد عباس نے زبردستی روک لیا تھا۔

''نہیں تو......'' وہ اس پر اکتفا کر گئی۔

''میری کوئی بات بری لگی ہے تمہیں؟''

''جی نہیں......'' سارہ نے ٹکا سا جواب دیا تھا۔

''پھر مجھ سے بات کیوں نہیں کر رہی ہو تم......؟'' محمد عباس اس کے اس رویے پر حیران ہو رہا تھا۔

''بس یونہی......''

''یہ کیا بات ہوئی؟'' سارہ کا ایسا رویہ اس کی شدتوں میں اضافے کا باعث تھا۔ ''بولو یار...... میں تمہاری مدد کرنا چاہتا ہوں۔'' وہ چپ کھڑی سارہ کو جھنجھوڑ کر پوچھنا چاہتا تھا۔

''مجھے میری امی نے منع کیا ہے کہ میں کسی اجنبی سے بات نہیں کروں، اجنبی نقصان پہنچاتے ہیں۔'' وہ معصومیت سے بولی تھی۔

''ہاں......!'' محمد عباس کا منہ کھلا رہ گیا تھا۔

''تمہاری امی بالکل ٹھیک کہتی ہیں، آج کا دور اس قابل ہی نہیں ہے کہ کسی پر اعتبار کیا

جائے۔"

"اب آپ مجھے جانے دیں۔" سارہ راستے میں کھڑے محمد عباس سے کہتی آگے بڑھنے لگی۔

"میں تمہاری مدد کرنا چاہتا ہوں۔"

"لیکن مجھے آپ کی مدد نہیں چاہیے۔" وہ دو بدو جواب دے رہی تھی۔

"مجھے نہیں اچھا لگتا تمہارا جاب کرنا، کیا ایسا ہو سکتا ہے، تم گھر بیٹھو اور میں ہر مہینے تمہیں کچھ رقم دے دوں؟" "کیا......؟" سارہ نے اسے حیرت سے دیکھا تھا۔

"دیکھو...... جب تک مجھے دوسری ملازمت نہیں مل جاتی، میں تمہیں تھوڑی رقم دوں گا، جیسے ہی شام کے اوقات میں کوئی جاب مل گئی، وعدہ کرتا ہوں، تمہیں یہاں جتنی سیلری ملتی ہے، اتنی ہی تمہیں دوں گا۔"

"آخر مجھ پر اتنی مہربانی کیوں؟" سارہ کی نگاہوں میں کھوج کا عنصر تھا۔

"بس تم مجھے بہت اچھی لگتی ہو اور میں چاہتا ہوں، تمہیں یہاں کے ماحول سے نکال لے جاؤں۔" وہ آہستگی سے بولا تھا۔

"کہو...... میری بات مانتی ہو؟ میں تمہاری کفالت کے لیے تیار ہوں لیکن اس کے لیے تمہیں یہ جاب چھوڑنی پڑے گی۔" محمد عباس اپنی دھن میں کہتا جا رہا تھا اور سارہ حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اسے لگ رہا تھا، ایک پاگل جنونی لڑکا اس سے عجیب سی فرمائش کر رہا ہے۔

"ٹھیک ہے...... میں سوچ کر جواب دوں گی۔" سارہ نے کہا تھا اور تیزی سے آگے بڑھ گئی تھی۔

O......O......O

دن گزرتے چلے جا رہے تھے، محمد عباس نے لاکھ کوشش کی کہ سارہ اس کی بات مان لے مگر نہ ہی پھر کبھی سارہ راستے میں رکی اور نہ ہی اس نے محمد عباس کو کال کی۔ ادھر محمد عباس کا چین وسکون برباد ہو رہا تھا اور دوسری طرف سارہ تھی جو اسے اور اس کے جذبات کی شدتوں سے منکر نظر آ رہی تھی۔

"میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں، میری نیت نیک اور ارادہ پکا ہے۔ تمہارا گھر میں

دیکھ چکا ہوں۔ اگر میں تمہیں پسند ہوں اور تم بھی راضی ہو تو مجھے بتاؤ، میں اپنے والدین کو تمہارے گھر رشتہ پکا کرنے کے لیے بھیج دوں؟"

یہ ایک رقعہ تھا جو محمد عباس ایک چھوٹے سے بچے کے ذریعے سارہ تک پہنچا چکا تھا۔ تین دن کی خاموشی کے بعد آخر سارہ کی کال محمد عباس کے پاس آ گئی تھی۔ اس نے رضامندی کا اظہار کر دیا تھا۔

"لیکن میری ایک خواہش ہے بلکہ اب تو میں حکم دینے کا بھی......"

"جی...... آپ کہیے؟" سارہ نے جلدی سے کہا تھا۔

"پلیز سارہ...... جاب چھوڑ دو...... تم ایک خوب صورت جوان لڑکی ہو، تمہارے پیچھے کتنے گندے جملے کستے ہیں لوگ، میں تمہیں بتا نہیں سکتا، ویسے بھی اب تم میری شریک حیات بننے جا رہی ہو اس لیے میرا فرض ہے، میں تمہاری ہر ضرورت کا احترام کروں۔" محمد عباس جذباتی لہجے میں بولا تھا۔

"کیا آپ شادی کے بعد میری امی کی مدد کرنے کا وعدہ کر سکتے ہیں؟" سارہ کے لہجے میں التجا تھی۔

"ہاں...... کیوں نہیں، وہ میرے لیے قابل احترام ہیں، وہ بھی تو میری ماں جیسی ہی ہیں۔" محمد عباس نے ہامی بھر لی تھی۔

"ٹھیک ہے پھر میں کل سے جاب پر نہیں آؤں گی۔"

"اچھی بات ہے۔" محمد عباس کے لب و لہجے میں خوشی کے آثار تھے۔

سارہ گھر میں بیٹھ چکی تھی اور محمد عباس نے شام کے اوقات میں دوسری ملازمت ڈھونڈ لی تھی۔ محمد عباس کے گھر والوں نے دونوں کا رشتہ پکا کر دیا تھا اور ایک مہینے بعد شادی کی تاریخ بھی طے کر لی گئی تھی۔ محمد عباس کے کاندھوں پر اب دہری ذمہ داری عائد ہو چکی تھی۔ وہ انتہائی محنت سے کام کر رہا تھا۔

ایک رات جب وہ پارٹ ٹائم جاب کر کے گھر لوٹا تو اس کے موبائل پر نامعلوم نمبر سے ایک کال آئی۔ محمد عباس گھر والوں سے کچھ دیر میں آنے کا کہہ کر چلا گیا اور پھر پوری رات

گزر گئی اور دوسرا دن بھی آ گیا لیکن محمد عباس گھر نہیں لوٹا۔ اس کے موبائل سوئچ آف تھا۔ گھر والوں کا رو رو کر برا حال تھا۔ محمد عباس کے والد اپنے بیٹے کو پاگلوں کی طرح ڈھونڈ رہے تھے۔ بالآخر پاکستان بازار پولیس اسٹیشن میں اس کی گمشدگی کی اطلاع دینے پہنچے تو وہاں سے پتا چلا، رات ہونے والی ٹارگٹ کلنگ میں دو نعشیں ہماری تحویل میں ہیں۔ آپ ہسپتال جا کر دیکھ لیں اور پولیس کے اس بیان سے محمد عباس کے والد محمد اختر کے اوسان خطا ہو گئے، وہ بھاگتے ہوئے سول اسپتال پہنچے جہاں انہیں محمد عباس اور اس کے دوست برکت علی دونوں کی نعشیں مل گئیں جنہیں نامعلوم افراد اپنی گولیوں کا ٹارگٹ بنا کر غائب ہو چکے تھے۔ انہوں نے دونوں کے سینے میں چار چار گولیاں اتاری تھیں۔ یہ آٹھ گولیاں تین خاندان تباہ کر چکی تھیں۔

O......O......O

یاالٰہی......! میرے شہر کو کس کی نظر لگ گئی ہے؟ آج یہاں کی گلیوں میں بچھی مٹی کے ذروں میں انسانیت ریزہ ریزہ نظر آ رہی ہے۔ کسی بھی ملک کے نوجوان اس ملک کا مستقبل ہوتے ہیں۔ آج کیوں نوجوانوں کو ٹارگٹ کر کے شہر کو ویران کیا جا رہا ہے؟ حقیقت تو یہ ہے، آدم خور، مردم بے زار قسم کے دہشت گرد پورے شہر میں پھیل چکے ہیں خاص کر کراچی ان شدت پسندوں کا ٹھکانہ بن چکا ہے۔ معاشرے میں پھیلی بے حسی کبھی ایک اولیس کی جان لے لیتی ہے تو تیزی سے پھیلتی فرقہ واریت محمد عباس جیسے نوجوانوں کو نگلتی جا رہی ہے۔ خدارا......کوئی تو سدباب، کوئی تو حل......!!

آج روشنیوں کا شہر کراچی فرقہ واریت، بے حسی، لاتعلقی، کرپشن، جاگیرداری، مہنگائی، بے روزگاری، ناخواندگی، بدعنوانی میں جکڑا اپنے مقدر کو رو رہا ہے۔ آج کراچی کی زمین لاوا اگل رہی ہے۔ اس کی مٹی، اس کی خوشبو سلگ رہی ہے۔ آج اس شہر آسیب میں لہو کی خبریں، لہو کے چرچے پھیلے ہوئے ہیں۔ کاش کوئی تو ایسا آئینہ ہو جس میں اہل ظلم اور مردہ ضمیر اپنے مکروہ چہروں کو دیکھ لیں کیونکہ اب وہ وقت دور نہیں جب وہ حی قیوم اسی زمین پر بے گناہوں کے خون کے ایک ایک قطرہ کا حساب لے گا......!!

☆......☆......☆

خواب جو بکھر گئے

''اماں......! کل شمع کی شادی ہے۔ مجھے نیا سوٹ چاہیے۔'' رضیہ نے لمبی سی چٹیا کو جوڑے کی شکل دیتے ہوئے کہا۔

''بڑی نیا سوٹ بنائے گی تو، پھر مجھے بھی آپ سوٹ دلائیں۔'' فریدہ نے آنکھیں مٹکاتے ہوئے رضیہ کو پھر ماں کو دیکھا۔

''ماں کے پاس تم دونوں کے سوٹ کے لیے بے کار پیسے نہیں، عقل کے ناخن لو۔'' پروین نے ماں کی سائیڈ لیتے ہوئے دونوں بڑی بہنوں کو گھورا۔

''اماں......! جواب تو دیں، کیا واقعی شمع باجی کی شادی پر ہم پرانے کپڑے ہی پہنیں گے؟'' یہ چوتھے نمبر کی سکینہ تھی جو خاموش بیٹھی ماں کو اب کاندھا پکڑ کر جھنجھوڑ رہی تھی۔

''مجھے کچھ نہیں پتا۔'' بڑی سی سینی میں گول گول پیاز کاٹتی بخت بی بی کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ پیاز کی ترشی ان کے اندرونی جذبات سے خوب میل کھا رہی تھی۔

''زینت اور شوانی......! اگر کمرے کی صفائی ہو گئی ہو تو صحن میں آجاؤ، میں صحن میں جھاڑو نہیں لگا رہی، آج کمر میں بہت درد ہے۔'' نسیم منہ بناتی ہوئی اب تخت کے کونے پر ٹک چکی تھی۔

''کیوں...... کیوں نہیں کرنی تم نے صفائی؟ یاد ہے ناں، آج تمہاری باری ہے صفائی کی؟'' شوانی غصے سے دھاڑتی ہوئی کمرے سے نکلی تھی۔

''ارے......تم دونوں لڑنا بند کرو، کل شمع کی شادی ہے، ہم کیا پہنیں گے، ابھی یہی سمجھ

نہیں آ رہا ہمیں اور تم دونوں ہمارے دماغ کی دہی نہ بناؤ۔'' رضیہ نے منہ بنایا اور ماں کے قریب ہو کر بیٹھ گئی۔

''اچھی ماں......! کچھ پیسے دے دو، میں اپنی سیلری پر تمہیں دے دوں گی، میری ساری دوستیں نت نئے ڈریس میں خوب تیار ہو کر آئیں گی اور ایک میں...... وہی چار سال پرانے کپڑے پہن کر جاؤں گی جن کا فیشن بھی اب جا چکا ہے۔ نہیں بھئی...... سب میرا مذاق اڑاتے ہیں۔'' رضیہ نے رونی صورت بناتے ہوئے کہا۔

''ہوں......'' ہلکی سی ہوں کے ساتھ بخت بی بی نے سر اٹھا کر اپنی ساتوں بیٹیوں کو دیکھا۔ بخت بی بی کے لیے تو ان کی ہر بیٹی کسی شہزادی سے کم نہیں تھی مگر اگلے ہی لمحے وہ ایک گہری سانس لے کر دوبارہ سر جھکا چکی تھیں۔ ''سبزیاں اور دالیں بھی اتنی مہنگی ہو چکی ہیں۔ غریب کھائے بھی تو کیا؟'' بینگن اور آلو کاٹتی ہوئی وہ اب بیٹیوں سے مخاطب تھیں۔

''ٹھیک ہے ماں......! اگلے ماہ سے میں اپنی سیلری آپ کو نہیں دوں گی، جب میرا وقت آتا ہے کچھ بنانے کا تو سارے پیسے ختم ہو چکے ہوتے ہیں۔ آخر اتنی محنت سے کماتی ہوں اور اپنے اوپر کچھ خرچ بھی نہیں کر سکتی؟'' رضیہ نے باقاعدہ اپنا سر پیٹا اور بہتے آنسوؤں کو دوپٹے سے پونچھا۔

''کیوں بے کار ماں کو پریشان کر رہی ہو؟ سب کچھ تو جانتی ہو، یہاں پیٹ بھر کھانا میسر نہیں اور تم نئے کپڑوں کی فرمائش کر رہی ہو؟'' پروین نے ماں کے کندھے پر اپنا سر ٹکایا اور بے ساختہ ماں کے گال کا ایک بوسہ لے لیا۔

''یہ کیا بات ہوئی......! پانچویں جماعت تک پڑھ پڑھ کر ہم سارے ہی گھر بیٹھتے چلے گئے، نہ اچھی تعلیم میسر ہے، نہ اچھے کپڑے، کھانا تو دور کی بات، میری تو زبان اب سادے کھانوں کی عادی ہو چکی ہے۔ مرغن غذائیں تو شاید ہماری قسمت میں ہی نہیں ہیں؟'' فریدہ نے پروین کو ٹوکا اور آنکھیں دکھائیں۔

''کل مزے دار بریانی اور قورمہ ملے گا ناں، خوب اپنی زبان اور دانتوں کو موقع دینا۔'' شوانی نے ہنستے ہوئے زینت کو آنکھ ماری تو قریب بیٹھی نسیم نے اس کی پیٹھ پر ایک ہاتھ جڑ دیا۔

''باجی رضیہ اپنی زبان کا ویسے ہی اتنا استعمال کرتی ہے کہ میں حیران ہوتی ہوں، ان کا منہ کیوں نہیں دُکھتا؟'' سکینہ نے ساری بہنوں پر ایک نظر ڈالی اور پھر رضیہ کی تنقیدی نظروں سے نظریں ملاتی، زبان دانتوں تلے دبا کر رہ گئی۔

''تم سب اب اپنے اپنے کاموں میں لگو، رضیہ تم فریدہ کے ساتھ بھائی کے کپڑے دھولو، یوسف بھی گھر آتا ہوگا۔ پروین اور سکینہ، باورچی خانے میں جاؤ اور جلدی سے سبزی بھون کر روٹی ڈال لو، صبح کا آٹا کافی بچا ہوا ہے۔'' بخت بی بی نے جلدی جلدی بیٹیوں کو حکم دیا۔

''جی اچھا ماں......!'' رضیہ کے ساتھ فریدہ، سکینہ اور پروین بھی اٹھ گئیں۔

''تم دونوں صفائی مکمل کرو۔'' زینت اور شوانی کی طرف وہ کڑی نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔

''اے نواز سونگی......! تو کہاں مجھے اکیلا چھوڑ گیا؟ یہ تیری سات بیٹیاں، سات بھنور کی طرح ہیں، میں اکیلی کیسے ان کو پار لگاؤں گی؟'' آنسو تھے کہ تواتر سے بہے جا رہے تھے۔

خواہشات زندگی کے حصول کا سامان اتنا آسان نہیں تھا۔ مہنگائی اور پھر سات بیٹیوں کا خرچہ، باپ کا سایہ سر سے اٹھ چکا تھا۔ ایک اکلوتا بھائی، وہ بھی نوکری کے لیے در، در ٹھوکریں کھا کر اب گھر لوٹا تھا۔

''سلام ماں......!'' یوسف نظریں جھکا کے گھر میں داخل ہوا تھا۔

''آج بھی ناکام لوٹا ہے؟'' بخت بی بی کے چہرے پر فکر کے سائے منڈلا رہے تھے۔

''ماں......! یہ مزدوری کے کچھ پیسے رکھ لو، کام تو آج بھی نہیں ملا۔'' یوسف نے کچھ نوٹ ماں کی جانب بڑھائے تھے۔

''چل ...... شکر ادا کر۔'' بخت بی بی نے نوٹ مٹھی میں دباتے ہوئے کہا تھا۔

''ماں......! مجھے پکا کام کب ملے گا؟ بہت تھک گیا ہوں، اینٹیں اٹھانا، سیمنٹ کی بوریاں تیسری منزل تک پہنچا پہنچا کر میرا حال برا ہو گیا ہے۔'' یوسف اب ماں کی گود میں سر رکھ کر لیٹ گیا تھا۔

''ہاں...... میرے بچے......! اللہ ہمارے حال پر رحم کرے گا، بس تم ہمت کبھی نہیں ہارنا۔'' بخت بی بی نے اکلوتے بیٹے کی پیشانی کا بوسہ لیتے ہوئے کہا تھا۔

"ماں......! ہمت کیسے ہاروں گا میں؟ جب تھکتا ہوں تو ساتوں بہنوں کا چہرہ میری نظروں کے سامنے آجاتا ہے اور پھر اپنی ساری ہمت مجتمع کیے کھڑا ہو جاتا ہوں۔"

"ہاں...... میرے بچے......! ہاں...... میں سب جانتی ہوں۔ اللہ تمہیں ہمیشہ کامیاب کرے۔" بخت بی بی نے ایک گہری سانس لی اور یوسف کی پیشانی پر اپنے لب رکھ دیے۔

O......O......O

بڑے سے صحن اور ایک کمرے پر مشتمل گھر میں رضیہ کے رونے کی آواز گونج رہی تھیں۔

"یاالٰہی......! خیر...... یہ اس طرح سے کیوں رو رہی ہے؟" بخت بی بی بھاگتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئیں۔

"خیریت باجی......؟" فریدہ بھی پریشانی کے عالم میں کمرے میں داخل ہوئی۔

"آپی......! کیا ہوا ہے؟ اس طرح سے کیوں رو رہی ہو؟" پروین کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔

"کچھ بتائے گی بھی یہ؟" بخت بی بی نے دونوں بیٹیوں کو باری باری دیکھا اور پھر رضیہ کو گھورا جو اوندھے منہ بستر پر لیٹی زار و قطار رو رہی تھی۔

"باجی......! کیا پریشانی ہے، کیوں اس طرح رو رہی ہو؟" فریدہ نے رضیہ کے کان کے قریب جا کر سوال کیا۔

"ہماری میڈیسن کمپنی کا مالک آج کہہ رہا تھا کہ آٹھویں پاس ورکرز کو وہ جاب سے نکال دے گا۔ کاش...... ماں......! میں میٹرک کر لیتی۔ آج میرے پاس سرٹیفکیٹ تو ہوتا، کہیں یہ جاب میرے ہاتھ سے نکل نہ جائے۔" رضیہ کی آنسوؤں سے لبریز آنکھیں اور سسکیوں نے بخت بی بی کے سینے پر کاری ضرب لگائی تھی۔

"ہائے...... خدا نہ کرے۔" وہ بے اختیار بولیں جب کہ فریدہ اور پروین بھی اپنی اپنی جگہ سن ہو کر رہ گئیں۔

"اماں......! اب کیا ہوگا؟ میں تو وہاں فریدہ کو رکھوانا چاہ رہی تھی مگر اب تو اپنی نوکری کے بھی لالے پڑ گئے ہیں؟" رضیہ جیسے مکمل طور پر ٹوٹ چکی تھی۔

"اچھا بجو...... ! پانی تو پیو پہلے۔" سکینہ نے پانی کا گلاس رضیہ کی طرف بڑھایا تھا۔ ساری بہنیں اسے دلاسہ دے رہی تھیں جب کہ بخت بی بی متعجب سی رضیہ کو دیکھ رہی تھیں۔

"رضیہ اسی سال تیس کی ہو جائے گی، یہ عمر تو شادی کی ہوتی ہے۔ اپنا گھر کب بسائے گی یہ؟ نوکری کے چکر میں یہ اپنے بارے میں سوچتی ہی نہیں ہے لیکن پھر یہ میرا گھر کیسے چلے گا؟ رضیہ اور یوسف کی کمائی سے تو سفید پوشی کا بھرم ابھی باقی ہے۔" بخت بی بی جانے کیا کچھ سوچ رہی تھیں۔

"ماں...... ! تم کیا سوچ رہی ہو؟" شوانی نے ماں کو مخاطب کیا۔

"کچھ نہیں......" بخت بی بی نے ساتوں بیٹیوں کے سراپے پر نظریں ڈالیں اور پھر اگلے ہی لمحے سر تھام کر بیٹھ گئیں۔

"میں تو رضیہ کے بارے میں سوچ رہی تھی، یہاں تو یہ ساری ہی تار کا جھاڑ ہو چکی ہیں۔ ان سب ہی کی عمر شادیوں کی ہے۔ کیسے ان کا بیاہ کروں گی؟"

"ماں...... ! تم پریشان ہوگئی ہونا؟" پروین نے ماں کے دونوں ہاتھوں کو تھام لیا۔

"میری بچیاں...... ! ماں کا دل چاہتا ہے، اس کے جگر کے ٹکڑے ہمیشہ خوش رہیں، انہیں سارے جہاں کا سکھ ملے، ہر آسائش ملے مگر یہ ماں مجبور ہے۔" آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑیاں بہہ رہی تھیں۔ اب رضیہ بھی گھبرا کر بیٹھ چکی تھی۔ ماں کی ایسی حالت اس سے دیکھی نہ گئی۔

"ماں...... ! میں کل اپنے باس سے بات کروں گی، انہیں اپنی مجبوری بتاؤں گی تو وہ ضرور مان جائیں گے۔ ماں...... ! آپ کی بیٹی آپ کے ساتھ ہے، آپ بالکل پریشان نہ ہوں۔" رضیہ نے بے ساختہ بخت بی بی کو گلے سے لگا لیا تھا۔ کچھ ہی دیر میں کمرے میں ماں اور ساتوں بہنوں کی سسکیاں گونج رہی تھیں۔

"اماں...... ! میں کراچی جا رہا ہوں۔" یکسر اپنی ذات میں مگن یوسف اپنی دھن میں بولتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔

"کیا......؟ کیوں......؟ کس لیے؟" سب نے ایک ساتھ ہی سوال کیے جب کہ بخت بی بی جیسے سب کچھ بھول کر یوسف کے چہرے پر اپنی نگاہیں مرکوز کر چکی تھیں۔ "کیوں بچے......؟"

''اماں......! میرا دوست شہزاد کراچی سے آیا ہوا ہے، کہہ رہا ہے، یہاں حیدر آباد میں کچھ کام نہیں، کراچی چل میرے ساتھ، وہاں اتنا کام ہے کہ تُو کر کر کے تھک جائے گا اور پھر تجھے بہنوں کی شادی بھی تو کرنی ہے؟ یہاں رہ کر تُو کچھ نہیں کر سکتا۔'' یوسف تیز، تیز لہجے میں بتا رہا تھا۔

''اور تُو نے ہامی بھر لی؟'' بخت بی بی نے بے ساختہ سینے پر ہاتھ رکھا۔

''ہاں ماں......! میں اب کراچی جا کر قسمت آزمائی کرنا چاہتی ہوں۔ سوچ رہا ہوں، شہزاد کے ساتھ ہی نکل جاؤں۔ وہ مجھے بھی اچھا گائیڈ کر دے گا۔'' یوسف کے لہجے میں امید تھی۔

''بھائی......! تم ہمارے بغیر کیسے رہو گے؟'' نسیم نے بھائی کے گلے لگ کر پوچھا تھا۔

''ارے میری بہنا......! جب تیرا بھائی وہاں سیٹ ہو جائے گا تو تجھے بھی وہیں بلا لے گا، تم سب پھر وہاں میرے ساتھ ہی رہنا۔'' یوسف نے نسیم کے سر پر ہلکی سی چپت لگائی تھی۔

''نہیں...... میرا دل نہیں مان رہا......'' بخت بی بی نے برملا انکار کیا۔

''ارے ماں......!'' سمجھا کر، میں کراچی میں پندرہ دن، ایک ماہ گزار لوں تو سب سمجھ آ جائے گا اور اگر بات نہیں بنی تو لوٹ آؤں گا۔ تجھے پتا ہے، شہزاد کے گھر کلر ٹی وی، فریج آ چکا ہے اور اس بار تو اس نے چھوٹے بھائی کو نئی بائیک بھی دلائی ہے۔''

''اچھا......؟'' رضیہ نے اچھا کو لمبا کھینچا۔

''سچ...... میرا بھی دل چاہتا ہے کہ میں اپنی بہنوں کی تمام خواہشات پوری کروں، ہمارے گھر بھی زمانے بھر کی آسائشیں ہوں، نت نئے پکوان پک رہے ہوں، بس ماں......! ایک بار مجھے قسمت آزمائی کا موقع دے دو۔'' یوسف کے لہجے میں التجا تھی۔

''ہاں...... ہاں ماں......! بھائی کراچی چلا گیا تو ہمارے دن پھر جائیں گے۔'' رضیہ نے بہت یقین سے کہا تھا۔

''نہیں...... میں بھائی کو جانے نہیں دوں گی۔'' پروین نے بے ساختہ بھائی کا ہاتھ تھاما۔

''پاگل...... بھائی جائے گا تو ہمیں بھی کچھ سکھ کے دن نصیب ہوں گے۔'' فریدہ نے پروین کو ٹوکا۔

''تم خود کو کیوں نوکری نہیں کرتیں؟ بھائی یہاں بھی تو اتنی محنت کرتا ہے، وہاں بھائی کا خیال کون رکھے گا؟'' پروین کے چہرے پر غصہ تھا۔

''ارے بھئی...... میں اپنا خیال خود رکھ سکتا ہوں، تم سب پریشان کیوں ہو میرے لیے؟ اماں......! تم بتاؤ، شہزاد پرسوں جا رہا ہے، اس کو ابھی جواب دینا ہے؟'' یوسف نے سوچوں میں ڈوبی ماں کو مخاطب کیا تھا۔

بخت بی بی نے ایک نظر ساری بیٹیوں کے چہرے پر ڈالی تھی۔ آنگن کے یہ مہکتے گلاب انہیں جی جان سے زیادہ عزیز تھے پھر وہ اکلوتے بیٹے کی جانب مڑی تھیں جو بہت منت و مرادوں کے بعد خدا نے ان کو عطا کیا تھا۔

''ٹھیک ہے بیٹا......! تم جاؤ'' یہ کہتے ہوئے عجیب بے بسی تھی ان کے چہرے پر۔
''اللہ تمہیں کامیاب کرے۔'' یہ کہتے ہوئے وہ گھٹنوں میں سر دیئے بے اختیار رونے لگی تھیں۔

O......O......O

''بھائی......! تمہارا سارا سامان اس میں رکھ دیا ہے۔'' رضیہ نے کپڑے کے بڑے سے بیگ کو صحن میں رکھتے ہوئے کہا تھا۔

''اچھا بھائی......! یہ میرے پاس دو سو روپے ہیں، یہ آپ رکھ لیں، ضرورت کے وقت کام آئیں گے۔'' یہ کہہ کر پروین نے جلدی سے بھائی کی جیب میں روپے ڈال دیئے تھے۔

''اور بھائی......! یہ سب بہنوں کے کل ملا کر ہزار روپے۔ آپ ہماری طرف سے یہ رکھ لیجیے، جانے کہاں ان کی ضرورت پڑ جائے آپ کو؟'' سب سے چھوٹی نسیم نے بھائی کی طرف پیسے بڑھائے تھے تو یوسف تڑپ اٹھا تھا۔

''میری پیاری بہنو......! یہ پیسے تم ہی رکھو، میرے پیچھے اگر تمہیں ضرورت پڑ گئی تو کیا کرو گی؟ بس تم اپنے بھائی کے لیے دعا کرنا کہ اچھی سی جاب پر لگ جائے۔'' یوسف کے لہجے میں محبت بھری اداسی تھی۔

''ہاں...... ہاں...... ضرور لیکن پھر بھی یہ ہماری خوشی ہے، آپ رکھ لیں بلکہ جب آپ کی نوکری ہو جائے گی تو ہم ساری بہنیں آپ سے سود سمیت پیسے وصول کریں گی۔'' شوانی

نے زبردستی کی مسکراہٹ چہرے پر لاتے ہوئے جواب دیا تھا۔

''اچھا ماں......! اب اجازت دو۔'' یوسف نے ماں کو مخاطب کیا جو اپنی سوچوں میں کبھی ماضی کو تو کبھی آنے والے لمحوں کے تانے بانے بُن رہی تھیں۔

''بس بیٹا......! اپنا بہت خیال رکھنا، وقت پر کھانا، کھانا اور وقت پر سونا۔ کسی سے جھگڑا مت کرنا، بے کار کسی سے الجھنا نہیں، بس اپنے کام سے کام رکھنا۔''

''ارے ماں......! میں بچہ تھوڑی ہوں جو آپ یوں مجھے سمجھا رہی ہیں؟'' یوسف بے ساختہ ہنسا تھا۔

''اپنی ماں سے رابطے میں رہنا، ماں کا دل پریشان رہے گا، کراچی پہنچتے ہی سب سے پہلے مجھے فون کرنا بچے......!'' بخت بی بی بے اختیار رو پڑی تھیں۔

''ماں......! آپ روئیں نہیں، میں آپ کے آنسوؤں کا مداوا تو بننے جا رہا ہوں، پکا وعدہ، جاتے ہی آپ سے رابطہ کروں گا۔ اچھا رضیہ......! ایک کام تُو کرنا۔'' یوسف نے رضیہ کو مخاطب کیا تھا۔ ''یہ پیسے تم رکھو، اس سے اپنے موبائل کی بیٹری بدل لینا، نئی بیٹری ڈل جائے گی تو لمبی بات ہو جائے گی۔ جب دیکھو، بیٹری کی وجہ سے تمہارا موبائل بند رہتا ہے۔ پتا چلا، میں وہاں سے کال کروں اور تمہارا موبائل مجھے بند ملے......'' یوسف نے خدشہ ظاہر کیا تھا تو رضیہ نے لپک کر پیسے اس کے ہاتھ سے لے لیے تھے۔

''بھائی سے پیسے کیوں لیے؟'' تمہارے پاس اتنے پیسے نہیں کہ نئی بیٹری خرید سکو؟'' پروین نے رضیہ کو آنکھیں دکھائی تھیں اور ساتھ ہی ڈپٹا تھا۔

''کیوں...... میرے پاس پیسے کہاں سے آئیں گے؟ ساری تنخواہ تو میں ماں کے ہاتھ پر رکھ چکی ہوں۔'' رضیہ نے دو بدو جواب دیا تھا۔

''اچھا پیاری بہنو......! اب میں چلتا ہوں، تم سب اماں کا بہت خیال رکھنا۔'' یوسف نے باری باری ساری بہنوں کو پیار کیا تھا اور آخر میں بخت بی بی کے پاس آیا تو وہ بیٹے کو گلے لگا کر رندھی ہوئی آواز میں بولی تھیں۔ ''جاؤ میرے چاند......! خدا تمہاری حفاظت کرے۔''

''یوسف......! جلدی کرو، جانے میں دیر ہو رہی ہے۔'' دروازے پر سے آنے والی

شہزاد کی آواز پر وہ سب چونکے تھے۔

''اچھا ماں......! خدا حافظ......! سب اپنا خیال رکھنا۔'' یوسف نے پہلے ایک نظر ماں کو اور پھر یکے بعد دیگرے ساری بہنوں کو دیکھا تھا اور تیزی سے نکل گیا تھا۔

O......O......O

''ماں......! کراچی سے بھائی کا میسج آیا ہے، وہ شہزاد کے ساتھ ہی رہ رہا ہے، کوئی ملیر، سعود آباد کا علاقہ ہے۔'' رضیہ نے موبائل اسکرین پر میسج دیکھتے ہوئے کہا۔

''شکر خدا کا...... رہنے کا ٹھکانہ تو ملا میرے بچے کو...... یہ بتا، کوئی نوکری وغیرہ کی خبر نہیں سنائی اس نے؟'' بخت بی بی نے اداس لہجے میں دریافت کیا۔

''نہیں اماں......! فقط ایک میسج ہی آیا ہے اور کچھ نہیں۔ میں تو بھائی کی آواز سننے کو بھی ترس گئی ہوں۔ پورا ایک ہفتہ ہوگیا ہے۔'' رضیہ کے لہجے میں جھنجھلاہٹ تھی۔

''کیا بھائی کا میسج آیا ہے، نوکری مل گئی اسے؟'' شوانی بھاگتی ہوئی آئی تھی اور اب وہ رضیہ کے گلے میں بانہیں ڈالے ہوئے کھڑی تھی۔

''نہیں......نوکری کا کچھ پتا نہیں لیکن بھائی، شہزاد بھائی کے ساتھ رہ رہا ہے اور بالکل خیریت سے ہے۔'' رضیہ نے جان چھڑانے والے انداز میں کہا تھا۔

''اماں......! اب بھائی جب کمانے لگے گا تو مجھے تو دو نئے سوٹ دلائے گی؟'' رضیہ نے برجستہ ماں کو مخاطب کیا تھا۔

''اور میں تو لپ اسٹک کا نیا شیڈ لوں گی۔'' شوانی جو حد درجہ میک اپ کی شوقین تھی، اس نے اپنے مطلب کی بات کی۔

''ارے ہاں بھئی......ضرور، پہلے اسے نوکری تو مل جائے۔ وہ وہاں سیٹ ہو جائے پھر تم بہنیں اپنے ارمان نکالتی رہنا۔'' بخت بی بی نے دوپٹہ نماز کے انداز میں سر پر لپیٹا تھا اور مصلے کی طرف بڑھ گئی تھیں۔

O......O......O

''شہزاد یار......! اب تو مجھے کراچی آئے ہفتے سے زیادہ ہو رہا ہے، کوئی بات ہی نہیں

یار......! میں اپنی ساری جمع پونجی لے کر کراچی پہنچا ہوں، اگر کوئی تیرا جاننے والا ہے تو، تُو مجھے اس سے ملا دے۔ کسی نوکری کا انتظام ہو جائے اور گھر والوں کو کچھ بھجواؤں۔" یوسف کا سر فکر مندی سے جھکا ہوا تھا اور وہ انگلیوں سے چٹائی کرید رہا تھا۔

"تجھے زیادہ تجربہ کس کام کا ہے؟" شہزاد نے اس کے چہرے پر فکر دیکھ کر پوچھا۔

"یہی مزدوری کا۔" اس نے مختصر سا جواب دیا۔

"تو، تُو ایسا کر، تیار ہو جا، میں تجھے ٹھیکے دار صاحب سے ملواتا ہوں، یقیناً وہ تجھے کوئی کام دے دیں گے، میں آج کل ان کے ساتھ پلاسٹر کا کام کر رہا ہوں تو ابھی اسٹارٹ میں میرے ساتھ ہیلپر لگ جا، جب تجھے کام آ جائے گا تو ٹھیکے دار تجھے اچھی تنخواہ کے ساتھ کسی دوسری جگہ کام پر لگا دے گا۔"

"ہاں...... یہ بہتر رہے گا تو پھر تم مجھے اپنے ٹھیکے دار صاحب سے ملواؤ۔" یوسف کو شہزاد کی بات سن کر جیسے امید کی ایک کرن نظر آئی تھی۔

"ہاں...... بس ابھی میں وہیں کے لیے نکل رہا ہوں تُو بھی تیار ہو جا۔" شہزاد نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا تو یوسف بھی ساتھ ہی اٹھ کھڑا ہوا۔

"ویسے یار......! تجھے ہر کام کی بہت جلدی کیوں ہوتی ہے؟ دھیرج رکھ میرے یار......!" شہزاد نے یوسف کے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا تو وہ مسکراتے ہوئے بولا تھا۔

"بس گھر والوں کی توقعات کا خیال مجھے بے چین کیے رکھتا ہے۔"

"خیر...... چل ٹھیک ہے، چل آ جا......" شہزاد نے آگے بڑھتے ہوئے کہا تھا تو یوسف بھی اس کے پیچھے ہو لیا تھا۔

O......O......O

"ارے اماں......! مجھے کام مل گیا ہے۔" یوسف نے موبائل اپنے دوسرے کان پر منتقل کرتے ہوئے کہا۔ اس کے لہجے میں جوش تھا۔

"نہیں اماں......! کام تو وہی پرانا ہے، مزدوری والا لیکن ایک دن کی مزدوری چار سو روپے بتائی ہے ٹھیکے دار نے اور پندرہ بیس دن کا کام ہے۔ کہہ رہا تھا، دل لگا کر کام کیا تو

تجھے اور کام بھی دوں گا۔"

"بس دعا کرنا ماں......! میرے لیے، بہنوں کو میری طرف سے پوچھنا۔"

"ہاں ہاں ماں......! بس یہ ہفتہ نکال لے کسی طرح، میں پھر تجھے پیسے بھجواتا ہوں۔"

"اچھا ماں......! خدا حافظ......! شہزاد کا سارا بیلنس نہ ختم ہو جائے...... یہ لے یار، تیرا بڑا شکریہ۔" یوسف نے موبائل شہزاد کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا تھا۔

"اوئے...... چل، کوئی بات نہیں، دوستوں کا شکریہ ادا نہیں کرتے، چل، آج تو چائے بنتی ہے۔ اتنی اچھی خبر تُو نے ماں کو سنائی ہے۔" شہزاد نے یوسف کو چمکارتے ہوئے کہا تو وہ ہنس دیا۔

"ہاں...... کیوں نہیں، آج چائے میری طرف سے، بلا چھوٹے کو۔"

"اوئے چھوٹے......!" شہزاد نے ایک چھوٹے اور قدرے موٹے سے بچے کو آواز دی تھی۔

"بچے......! دو چائے ملائی مار کے......" یوسف نے ٹیبل بجاتے ہوئے کہا تھا۔

"ابھی آیا صاحب......!"

"اوئے سن...... دو پراٹھے بھی ساتھ لے آ، گرما گرم ہونے چاہئیں۔"

"اوئے ہوئے...... تُو، تو بڑا فراخ دل ہے۔ چل، جلدی سے چائے پی کے نکلتے ہیں ورنہ ٹھیکے دار کا گزر یہاں سے ہوا تو ڈانٹ پڑ جائے گی۔ پورا دن اسی ہوٹل میں بیٹھ کر وہ چائے پیتا ہے اور سگریٹ پھونکتا ہے۔" شہزاد کی زبانی یہ بات سن کر یوسف کی سٹی گم ہو گئی تھی۔

O......O......O

"واہ......! واہ......! بھائی کو کام مل گیا۔" پروین نے نعرہ لگایا تھا۔

"اماں......! اب ہمارے دن پھر جائیں گے۔" نسیم نے اماں کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔

"میری طرف سے ایک لمبا والا میسج بھائی کو کر دو۔" سکینہ نے رضیہ کی طرف دیکھتے ہوئے التجائی انداز میں کہا۔

''لمبا والا میسج، کیا مطلب؟'' رضیہ نے حیرت سے سکینہ کو دیکھا۔

''مجھے بھائی سے چنری والا دوپٹہ منگوانا ہے۔'' سکینہ کے بولتے ہی زینت بھی آگے بڑھ گئی۔

''ہاں...... میں نے سنا ہے، کراچی میں ایمی ٹیشن جیولری بہت اچھی ملتی ہے، مجھے وہاں سے ایک نگوں والا سیٹ چاہیے۔'' زینت کے چہرے پر انجانی خوشی تھی۔

''میں بھی تو سوٹ منگواؤں گی بھائی سے۔'' رضیہ جو میسج رائٹ کر رہی تھی، اپنی فرمائش بھی اس میں لکھنے لگی۔

''تم سب لوگوں کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ کوئی ضرورت نہیں ہے میرے بچے کو پریشان کرنے کی، ویسے بھی ابھی ہمیں پہلے مالک مکان کا قرضہ اتارنا ہے، چار ماہ کا کرایہ چڑھ گیا ہے۔'' بخت بی بی نے ڈپٹنے والے انداز میں کہا تھا۔

''اچھا ناں...... یہ ہمارا اور بھائی کا مسئلہ ہے۔ رضیہ باجی......! بھیج دو میسج......'' فریدہ نے کہا تھا۔

''جو تم لوگوں کو سمجھ آئے، کرلو، میں ذرا روٹی ڈال لوں۔'' بخت بی بی باورچی خانے کی طرف چلی گئی جب کہ ساری بہنیں اپنی اپنی فرمائشیں رضیہ کو نوٹ کرانے لگیں۔

O......O......O

''ارے بھئی...... کیا لمبی لسٹ آئی ہے تیرے گھر سے۔'' شہزاد نے یوسف کی زبانی موبائل اسکرین پر میسج کی صورت موجود لسٹ سن کر کہا تھا۔

''ارے یار......! اب کون سمجھائے ان چھوٹیوں کو، ویسے میری اماں نے کوئی فرمائش نہیں کی۔ شاید اس لیے کہ انہیں یہ فکر ستا رہی ہوگی کہ چار ماہ کا مکان کا کرایہ دینا ہے، مالک مکان تنگ کر رہا ہوگا۔'' یوسف نے آہستگی سے کہا تھا۔

''میرے خیال میں تو ہر مہینے ایک بہن کی فرمائش پوری کر دے تو بات کچھ بن جائے ورنہ میرے یار......! بڑی مشکل ہو جائے گا تیرے لیے۔'' شہزاد نے مصنوعی شرارت چہرے پر سجاتے ہوئے کہا تو یوسف بھی قہقہہ لگانے پر مجبور ہو گیا۔

''اچھا...... کل ٹھیکے دار صاحب کہہ رہے تھے، تم لوگ کرائے پر ایک بائیکل لے لو، چھوٹے موٹے کام آسانی سے ہو جائیں گے۔ کام چھوڑ کر پیدل مارکیٹ جانے میں وقت بہت ضائع ہوتا ہے۔''

''تو کیا سائیکل کا کرایہ ہم دونوں مل کر دیں گے؟'' شہزاد کی بات سن کر یوسف نے فوراً ہی پوچھا تھا۔

''ارے نہیں...... سائیکل کا کرایہ ہمارے کھاتے میں نہیں ہے، وہ تو ٹھیکے دار صاحب دیں گے۔''

''پھر تو بڑی اچھی بات ہے، ہمیں پہلی فرصت میں سائیکل لے لینی چاہیے۔ آنے جانے میں بھی آسانی اور وقت کی بچت بھی ہوگی۔'' یوسف نے آمادگی کا اظہار کیا تھا۔

''چل تو پھر نکلتے ہیں، بس میں چاہ رہا ہوں تُو ٹھیکے دار صاحب کی نظر میں ایک محنتی مزدور کے روپ میں آجائے تاکہ آئندہ تیرے لیے آسانی ہو جائے۔'' شہزاد نے یوسف کے گلے میں بانہیں ڈالتے ہوئے کہا تھا۔

O......O......O

''ارے یار...... اگر دو سیمنٹ کی بوریاں اور آ جائیں تو آج کا کام مکمل ہو جائے گا، یہ کام ادھورا رہ گیا تو ٹھیکے دار صاحب آج کی دیہاڑی روک لیں گے۔'' شہزاد بیلچہ دیوار سے لگاتے ہوئے بولا تھا۔

''اب کیا کریں؟ استاد کا نمبر ملاؤ۔'' یوسف کے چہرے پر ایک دم ہی یاسیت سمٹ آئی تھی۔

''ایک کام کرو، میں تجھے مارکیٹ میں اکرم کی دکان پر اس دن لے گیا تھا، کیا وہ تجھے یاد ہے؟'' شہزاد نے یوسف سے سوال کیا تھا۔

''ہاں...... یاد تو ہے۔''

''تو بس تو اس سے دو سیمنٹ کے تھیلے پکڑ لے۔ حساب استاد کے کھاتے میں نوٹ کروا دینا۔ جتنی دیر میں تُو سیمنٹ لائے گا، میں استاد کو فون کر کے بتاتا ہوں اور اس سامنے والی

دیوار کا پلاسٹر کر دیتا ہوں۔''

''ہاں...... یہ ٹھیک رہے گا۔'' یہ کہہ کر یوسف تیزی سے نکل گیا تھا مگر ابھی وہ کچھ دور ہی گیا تھا کہ اسے ایک پولیس موبائل نے روک لیا۔ پولیس والوں کو دیکھ کر اس کی جان نکل گئی۔

''اوئے...... کون ہے تُو؟ کہاں سے تعلق ہے تیرا......؟'' یوسف کا اجنبی چہرہ اور پھر چہرے پر پھیلی گھبراہٹ نے پولیس والوں کو اس کی طرف متوجہ کر دیا تھا۔

''یوسف نام ہے میرا...... حیدر آباد سے آیا ہوں۔''

''یہاں کیا کرنے آیا ہے؟''

''صاحب...... نوکری......''

''اچھا...... تو کہاں کرتا ہے نوکری؟'' ایک پولیس والے نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر سوال کیا تھا تو وہ اور گڑبڑا گیا تھا۔

''صاحب...... نوکری نہیں، مزدوری کرتا ہوں۔'' وہ تھوک نگل کر بولا تھا۔

''کب آیا ہے تُو حیدر آباد سے......؟'' دوسرا پولیس والا بھی آگے بڑھا تھا۔

''دو ہفتے پہلے......'' یوسف نے ڈرتے ڈرتے جواب دیا۔

''دو ہفتے میں تو نے سائیکل خرید لی؟ واہ...... کیا کام کرتا ہے؟'' پولیس والے کی بتیسی نکلی تھی۔

''نہیں یہ میری نہیں ہے، کرائے کی ہے۔'' یوسف نے بے بسی سے جواب دیا۔

''اوئے...... تُو دو ہفتے پہلے حیدر آباد سے کراچی آیا ہے اور تجھے کرائے پر سائیکل بھی مل گئی؟ جھوٹ بولتا ہے سالا...... سب پتا ہے تجھ جیسے لوگ ایسے ہی بہانے کر کے چوری چکاری کرتے ہیں۔ مجھے تو یہ سائیکل چوری کی ہی لگتی ہے۔ بتا...... کہاں سے چرائی ہے؟'' پولیس والے نے ایک ہاتھ جڑتے ہوئے پوچھا تھا۔

''نہیں صاحب...... یہ میں نے کرائے پر لی ہے۔ میں چور نہیں ہوں۔'' اب یوسف گڑگڑاتے ہوئے کہہ رہا تھا مگر دونوں پولیس والوں میں سے کسی نے بھی یوسف کی بات پر

یقین نہیں کیا۔ ''چل بیٹھ موبائل میں، اب تھانے جا کر ہی تیری تفتیش ہوگی۔'' اور پھر وہ لاکھ منتیں کرتا رہا مگر کسی نے کچھ بھی نہیں سنا اور یوسف کو زبردستی موبائل میں بٹھا لیا گیا۔

O......O......O

قارئین ''! نا کردہ جرم کی پاداش میں گرفتار یوسف گزشتہ ڈھائی سال سے رہائی کا منتظر ہے مگر وہ بھلا کیسے رہا ہوگا؟ اس کا تو مقدمہ ہی نہیں چل رہا۔ اسے تو ڈھائی سال سے کسی عدالت میں پیش ہی نہیں کیا گیا۔ عدالت میں پیشی کے لیے تو بھاری رقم طلب کی جاتی ہے، یہ رقم وہ کہاں سے لائے؟ جیل حکام کی فرمائشیں وہ کیسے پوری کرے؟ سو جیل حکام بھی شاید اسے بھول چکے ہیں۔ یوسف آج بااثر قیدیوں کا غلام بن کر رہ گیا ہے۔ صبح سے شام تک چند ٹکوں کی خاطر وہ بااثر قیدیوں کی خدمت گزاری میں وقت اس لیے گزار رہا ہے کہ شاید اسے اسی طرح چند روپے مل جائیں اور وہ اسے جوڑ جوڑ کر اپنی رہائی کی امید کو حقیقت کا روپ دے سکے۔ اسے جب بھی اپنے گھر کا خیال آتا ہے تو وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے، میری ماں کا نام تو بخت ہے مگر یہ بدبختی میری ماں اور میرا کیوں تعاقب کر رہی ہے؟ میں نے کسی کا کیا بگاڑا ہے؟ میری بہنیں جو میری آس لگائے بیٹھی ہیں، معلوم نہیں، کیسے جی رہی ہوں گی؟

یوسف کی یہ ایک دن کی سوچ نہیں، دن بھر کی مشقت کے بعد رات کو جب وہ اپنے سیل میں بند کر دیا جاتا ہے تو وہ یہ سب کچھ سوچتا ہے اور رات بھر اس کی سسکیاں اور آہیں سیل کی در و دیوار سے ٹکرا کر واپس آ رہی ہوتی ہیں، دوسری طرف بخت بی بی ہر روز جیل کی اونچی فصیلوں کے دروازے کھلتے ہوئے دیکھ رہی ہوتی ہیں۔ اس کی دعا بس یہی ہے کہ خدایا......! اس زنداں کے دروازے وا کر دے۔ میرا بیٹا مجھے واپس دلا دے۔

آج بخت بی بی بیٹے کی رہائی اور سات بیٹیوں کی پرورش کی خاطر کراچی سینٹرل جیل کے سامنے ایک سڑک کے کنارے اپنی چادر بچھا کر بھیک مانگنے پر مجبور ہیں۔

☆......☆......☆

اے کاش کہ......

''ارے...... اتنی دیر سے کیوں آئیں، جلدی آنا تھا؟'' وہ عظمیٰ کا ہاتھ پکڑتی اسے کمرے میں کھینچ چکی تھی پھر اس نے تیزی سے دروازہ اندر سے لاک کر دیا۔

''کیا بات ہے آپی...... سب خیریت تو ہے ناں؟'' عظمیٰ نے حیرت اور تجسس بھرے لہجے میں صبا سے پوچھا۔

''ارے پاگل...... ایک بہت ہی زبردست قسم کی سی ڈی ملی ہے مجھے، بس اسی لیے بلوایا ہے تجھے۔'' صبا نے سی ڈی پلیئر کو ٹی وی کے قریب رکھا اور سی ڈی پلیئر کی تار ٹی وی سے اٹیچ کرنے لگی۔

''کیا کوئی نئی مووی آئی ہے؟'' عظمیٰ نے دلچسپی سے ٹی وی اسکرین کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''ہوں...... یہی سمجھ لو بس۔'' وہ اب ٹی وی آن کر رہی تھی۔

''کیا ہم یہ مووی کل نہیں دیکھ سکتے؟ ابھی تو میں امی سے اجازت لیے بغیر آئی ہوں۔ پتا نہیں کتنی دیر لگ جائے پھر وہ ناراض ہو جائیں گی۔'' عظمیٰ منہ بگاڑتے ہوئے بولی۔

''ارے یار...... بیٹھ جاؤ، یہ مووی زیادہ لمبی تھوڑی ہوتی ہے، بس ابھی ختم ہو جائے گی۔'' صبا نے اس کو بیٹھنے کے لیے کہا مگر اس کا سارا تجسس ٹی وی اسکرین کی جانب تھا۔

''اچھا...... آپ کہتی ہیں تو بیٹھ جاتی ہوں۔'' وہ زبردستی کے سے انداز میں اب بیٹھ چکی

تھی اور گیلے بالوں کا بنا جوڑا کھول کر بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی۔

''تم کتنی پیاری ہو یار......'' صبا محویت سے سب کچھ بھولے اب عظمیٰ کو دیکھنے لگی۔ گلابی رنگ کے کاٹن کے سوٹ میں اس کی سفید دودھ جیسی رنگت اور پھر گیلے بالوں کی لٹیں جو اس کے شانوں پر پھیلی ہوئی تھیں، وہ غضب ڈھا رہی تھی۔

''ارے صبا آپی......آپ مجھے اتنے عجیب سے انداز سے کیوں دیکھ رہی ہیں؟'' عظمیٰ نے حیرت کا مظاہرہ کرتے ہوئے سوالیہ نظروں سے صبا کو دیکھا۔

''کچھ نہیں یار......تم نہیں سمجھو گی، ابھی تمہاری عمر ہی کیا ہے، صرف سولہ سال، پہلے بڑی ہو جاؤ پھر تم سے پوچھوں گی۔'' وہ معنی خیز انداز میں عظمیٰ کا سرتاپا جائزہ لیتی اب دوبارہ ٹی وی کی جانب متوجہ ہو گئی تھی۔

''آپی......آپ اتنا چھپ کے کیوں موی دیکھ رہی ہیں؟ کیا آپ کی امی ناراض ہوں گی؟'' عظمیٰ نے اپنی دانست میں سوال داغا تھا۔

''ہاں......انہیں میرا موی دیکھنا پسند نہیں۔'' صبا نے تکا سا جواب دیا۔

''اچھا......اب جلدی سے پلے کر دیں، مجھے بچ...... بہت دیر ہو رہی ہے۔ ہم نے تو سارا ٹائم باتوں کی نذر کر دیا۔'' عظمیٰ کی نظریں اب اسکرین پر جمی ہوئی تھیں جب کہ صبا ریموٹ لے کر اس کے برابر آ کر بیٹھ گئی۔

''ڈرو گی تو نہیں تم......؟'' صبا نے عجیب سی نظریں عظمیٰ کے سراپے پر ڈالتے ہوئے پوچھا۔

''کیوں......کیا کوئی ڈراؤنی فلم ہے؟'' وہ شوخی سے بولی۔

''نہیں......ڈراؤنی تو نہیں ہے، بس یونہی پوچھ رہی تھی۔'' وہ پلے کا بٹن پش کرتی اب اسکرین کو گھور رہی تھی جبکہ عظمیٰ بھی محویت سے ٹی وی کی جانب دیکھ رہی تھی۔

''اوہ آپی......پلیز...... بند کریں اسے، یہ کیا دیکھ رہی ہیں آپ......؟'' عظمیٰ اچھل کر کھڑی ہو چکی تھی۔ ''آپ اتنی گندی موی دیکھتی ہیں، بہت بری بات ہوتی ہے۔ آخ......'' وہ تیزی سے بند دروازے کی طرف بھاگی تھی۔

''ارے...... بیٹھو تو یار، انجوائے کرو میرے ساتھ......'' صبا نے اس کا ہاتھ کھینچا تو وہ ہاتھ چھڑا کر دروازے کی جانب بڑھ گئی۔

''نہیں پلیز...... آپی، مجھے جانے دیں، مجھے بچ...... گھن آ رہی ہے۔ پلیز...... آپ بھی اسے بند کر دیں۔'' وہ رندھی ہوئی آواز میں کہہ رہی تھی۔

''اچھا بھئی...... لو، یہ بند کر دیا۔ اب کسی سے اس کا ذکر نہیں کرنا۔'' صبا نے اسے تنبیہ کی۔

''آپ بھی یہ وعدہ کریں، دوبارہ اتنی گندی مووی نہیں دیکھیں گی۔'' عظمٰی کے حواس کچھ بحال ہوئے تھے۔

''ہاں بھئی...... وعدہ۔'' صبا نے ناگوار لہجے میں کہا تھا۔

''چلو ٹھیک ہے، اب تم جاؤ......'' صبا نے اٹھ کر دروازہ کھولا تو عظمٰی تیزی سے باہر کی جانب بھاگ گئی جبکہ صبا نے اس کے جاتے ہی پلے کا بٹن پش کر دیا تھا۔

O......O......O

اس روز عظمٰی کافی دن بعد صبا کے بلانے پر اس کے گھر آئی تھی۔

''تم تو اس دن ایسے ڈر کر بھاگیں جیسے میں تمہیں کھا جاتی۔'' صبا نے اسے تقریباً گھورتے ہوئے کہا۔

''ہاں...... وہ مجھے بہت عجیب سا لگا تھا۔'' وہ آہستگی سے بولی تھی۔

''کیوں...... کچھ کچھ ہوتا ہے کیا؟'' صبا کا لہجہ اگلے ہی لمحے شوخ سا ہو گیا تھا۔

''کوئی اور بات کریں آپی......'' عظمٰی کچھ گڑبڑا سی گئی تھی۔

''سنو...... میری کچھ تصویریں کھینچ دو، کاش میری ایک تمہاری جیسی خوبصورت بہن ہوتی تو تمہیں بار بار تنگ نہ کرنا پڑتا۔'' صبا نے اس کو اتنے محبت بھرے لہجے میں مخاطب کیا کہ وہ بلا حیل وحجت تصویریں کھینچنے کے لیے راضی ہو گئی۔

''یہ دیکھو میگزین، مجھے بس ایسے ہی تصویریں اتروانی ہیں۔'' صبا نے عظمٰی کی جانب ایک فلمی میگزین بڑھایا تھا۔

"یہ ماڈلز جیسی ، اتنی بولڈ.......! آپی...... آپ ایسی تصویروں کا کیا کریں گی؟" عظمیٰ حیران و پریشان سی ہو کر ان نیم عریاں تصویروں کو دیکھ رہی تھی۔

"تم ایک تو سوال بہت کرتی ہو، بس کھینچو میری تصویریں۔" صبا دوپٹہ ایک جانب پھینکتی اب مختلف پوز دے رہی تھی۔ اس کا ڈریس خاصہ ایڈوانس تھا، سلیولیس شرٹ، بڑا سا گلا، فٹنگ کا ٹراؤزر۔

"آپی...... آپ تو مجھے بالکل ماڈل جیسی لگ رہی ہیں۔" عظمیٰ بھی اب سب کچھ بھولے بڑے مزے سے صبا کی تصویریں اتار رہی تھی۔

"لاؤ...... اب میں تمہاری بھی کچھ تصویریں کھینچوں۔" صبا نے عظمیٰ کے ہاتھ سے کیمرہ لیتے ہوئے کہا۔

"نہیں بھئی...... مجھے تصویریں نہیں کھنچوانی۔" عظمیٰ نے فوراً ہی انکار کیا تھا۔

"ارے پاگل...... بس ایسے ہی، صرف ہم دیکھیں گے پھر میں تمہارے سامنے ہی ڈیلیٹ کر دوں گی۔" صبا نے اسے اکسایا تھا۔

"لیکن میں......" عظمیٰ جیسے گومگو کی کیفیت میں گرفتار ہو گئی۔

"اچھی لگو گی یار، بولڈ بنو، کیا ڈری سہمی، اماؤں کی طرح ہر وقت دوپٹہ لپیٹے رہتی ہو؟"

"ہاں آپی...... میری بھی ایک دوست بس جینز اور شرٹ میں رہتی ہے، دوپٹہ تو وہ پہنتی ہی نہیں ہے۔" یہ بتاتے ہوئے عظمیٰ کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک عود کر آئی تھی۔

"یار عظمیٰ...... تمہارا فگر بہت اچھا ہے، تم پر یہ والا پوز زیادہ خوبصورت لگے گا۔" صبا نے میگزین پرنٹ ایک ماڈل کی تصویر پر انگلی رکھتے ہوئے کہا اور فوراً ہی دوپٹہ اس کے شانوں سے کھینچ لیا۔

"تم ویسے ماڈلنگ کر سکتی ہو......!" صبا نے عظمیٰ کو ایک نئے رخ سے آگاہ کیا تھا۔

"کیا...... سچ؟" عظمیٰ کی مسکراہٹ بڑی بھلی تھی اور پھر صبا نے عظمیٰ کی ایک سے ایک تصویر کھینچنا شروع کر دی تھی۔ عظمیٰ بھی صبا کی باتوں میں آ کے اس کے کہنے کے مطابق تصویریں کھنچوائے جا رہی تھی۔

"یار...... تم اس پوز میں تو بہت سیکسی لگ رہی ہو۔" صبا نے سیٹی بجانے کے انداز میں اپنے لب سکیڑے تھے۔ عظمیٰ ایک شرمیلی سی مسکراہٹ لبوں پر سجائے دوسرا پوز دینے لگی تھی۔

"یار...... قیامت لگ رہی ہو، قیامت......" صبا نے عظمیٰ کو اس طرح آئینے میں اتارا تھا کہ وہ اس کے کہنے پر عمل کرتی تصویریں کھنچوا رہی تھی۔

O......O......O

دروازہ بہت دیر سے پیٹا جا رہا تھا، اتفاق سے اس وقت عظمیٰ کے علاوہ گھر میں کوئی نہیں تھا، اس نے تقریباً بھاگتے ہوئے مین گیٹ کھولا تھا۔

"اوہ صبا آپی...... آپ؟ سب خیریت تو ہے ناں......" وہ گھبرائے ہوئے لہجے میں پوچھ رہی تھی۔

"پڑوسن ہوں تمہاری، کیا آ نہیں سکتی؟" صبا نے چڑے ہوئے انداز میں جواب دیا۔

"آیئے اندر......" عظمیٰ اسے راستہ دیتی ہوئی سامنے سے ہٹ گئی تھی۔

"سنو...... ایک ڈراما پروڈیوسر گھر آیا ہوا ہے، میں نے اسے تمہاری تصویریں دکھا دی ہیں، وہ اب تم سے ملنے کی ضد کر رہا ہے۔" صبا نے بغیر کسی لگی لپٹی کے اپنے آنے کا مقصد بیان کر دیا تھا۔

"کیا آپ نے اسے میری وہ تصویریں بھی دکھا دیں؟ مگر آپ نے تو مجھ سے وعدہ کیا تھا وہ آپ وہ ساری تصویریں ڈیلیٹ کر دیں گی؟" خوف کے عالم میں پھیلی عظمیٰ کی آنکھیں اب گیلی بھی ہو گئی تھیں۔

"ارے یار...... کچھ نہیں ہوتا، چلو میرے ساتھ۔" صبا نے لاپروائی سے کہا تھا۔

"نہیں...... میں نہیں جاؤں گی کسی سے ملنے۔" عظمیٰ روہانسی ہو چکی تھی۔

"چلو بھئی......" صبا نے اسے پیار سے پچکارتے ہوئے کہا تھا۔

"کہا نا...... میں نہیں جا رہی آپ کے ساتھ......" عظمیٰ ایک جھٹکے کے ساتھ صبا سے ہاتھ چھڑاتی، اپنی آنکھیں رگڑنے لگی تھی۔

"ٹھیک ہے، تو پھر میں وہ تصویریں پرنٹ کروا کر تمہاری امی کو دکھاؤں گی۔" صبا بہت

ڈھٹائی اور مکاری سے بولی تھی۔

''جی نہیں...... آپ ایسا کچھ نہیں کریں گی۔'' عظمیٰ کے تو اب اوسان ہی خطا ہو چکے تھے۔

''میرے ساتھ چلتی ہو تو ٹھیک ہے ورنہ میں تمہاری امی کو سب کچھ دکھاؤں گی۔''

''سب کچھ؟ وہ تصویریں تو میں نے آپ کے کہنے سے کھنچوائی تھیں، میں تو آپ کو منع کر رہی تھی، پلیز...... میری امی بہت غصے والی ہیں، ان کو نہیں دکھایئے گا۔'' عظمیٰ کا انداز التجائی تھا۔

''تو پھر چلو، پہلے اس پروڈیوسر سے ملو...... باقی باتیں بعد میں کریں گے۔''

''ٹھیک ہے، چلتی ہوں۔'' عظمیٰ پیر پٹختی ہوئی اس کے ساتھ چلنے کے لیے آمادہ ہو گئی تھی۔

صبا نے انتہائی چالاکی کے ساتھ آخر کار وہ کام مکمل کر لیا تھا جس کی منصوبہ بندی وہ پچھلے کئی ہفتوں سے کر رہی تھی۔ اس نے عظمیٰ کی نیم عریاں تصویریں دکھا کر ایک شیطان صفت آدمی کو پھنسا لیا تھا، وہ کوئی ڈراما پروڈیوسر نہیں تھا بلکہ ایک عیاش جرائم پیشہ تھا جو معصوم لڑکیوں کو اپنے جال میں پھنسا کر ان کی عزتوں سے کھیلتا تھا۔

عظمیٰ جونہی کمرے میں داخل ہوئی تھی، صبا نے باہر سے دروازہ لاک کر دیا تھا، بند کمرے میں عظمیٰ روتی، فریاد کرتی رہی تھی مگر کوئی فریاد سننے والا نہ تھا جب کہ کمرے سے باہر بے صبری سے ٹہلتی صبا کا سارا دھیان تو اس خفیہ وڈیو کیمرے پر تھا جو وہ انتہائی چالاکی سے کمرے میں چلتا چھوڑ آئی تھی۔

O......O......O

عظمیٰ...... صبا کے سامنے بیٹھی پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی مگر صبا پر اس کے رونے کا کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔

''خبردار...... اپنی آواز بند کرو اور اب اپنے گھر جاؤ ورنہ میں پورے محلے کو بتا دوں گی کہ آج تمہارے ساتھ کیا ہوا ہے پھر تم اپنا منہ چھپاتی پھرنا۔'' اس نے نہایت ہی سخت لہجے

میں کہا تھا۔

''آپ نے میرے ساتھ ایسا سلوک کیوں کیا؟ آخر میرا قصور کیا تھا؟'' لفظ جیسے ٹوٹ ٹوٹ کر عظمیٰ کے لبوں سے گر رہے تھے۔

''ایسا کچھ نہیں ہوا ہے، بس اب تم خاموشی سے اپنے گھر جاؤ، اس سے پہلے کہ میرے گھر میں کوئی آئے اور تمہاری ایسی حالت دیکھے، سوچ لو، بدنامی تمہاری ہی ہوگی۔'' صبا شاطرانہ انداز میں کہتی عظمیٰ کا حلیہ درست کرنے کے لیے آگے بڑھی تھی۔

''میں گھر نہیں جاؤں گی اب...... میں خودکشی کرلوں گی اور......''

''تم پاگل ہو گیا؟'' صبا نے عظمیٰ کی بات کاٹی تھی۔ ''تمہاری خودکشی سے تمہارے گھر والے بدنام ہو جائیں گے۔ کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے۔ اور اب وہ اس کے قریب بیٹھتی اسے پانی کا گلاس پکڑا رہی تھی جب کہ عظمیٰ سکتے کی سی کیفیت میں گرفتار تھی۔

''دیکھو یار عظمیٰ...... میں تمہارے ساتھ ہوں، میں کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گی، بس تم بھی خاموش رہنا۔'' صبا نے اسے بہت پیار سے گلے لگا کر کہا تھا۔

''ہاں میں خاموش رہوں گی لیکن آپ بھی میرے گھر والوں کچھ نہیں بتائیں گی۔'' عظمیٰ بہت ڈرتے ہوئے لہجے میں بولی تھی۔

''ارے یار...... یہ بھی کوئی کہنے والی بات ہے۔ بالکل ایسے ہی ہوگا۔ اب تم بے فکر ہو کر جاؤ اور ڈرنا بالکل بھی نہیں، تم میرا یقین کرو، کچھ نہیں ہوگا۔''

''اچھا......؟'' عظمیٰ اب اپنی تمام ہمت مجتمع کر کے جانے کے لیے کھڑی ہوگئی تھی۔

''شاباش...... اب تم اپنے گھر جاؤ، میں ذرا اس منحوس کی خبر لیتی ہوں، اس نے تمہارے ساتھ آخر اتنی گھناؤنی حرکت کیوں کی ہے؟'' صبا کا انداز ہمدردی جتانے والا تھا۔

عظمیٰ ہر بات سے بے نیاز مرے ہوئے قدم اٹھاتی اس کے گھر سے نکل گئی تھی جب کہ صبا اپنے موبائل پر ایک نمبر ملانے کے بعد اپنی اس گھناؤنی حرکت پر داد طلب کرنے کے ساتھ ساتھ اپنا معاوضہ بھی طلب کر رہی تھی۔

O......O......O

اس واقعے کے ٹھیک ایک ہفتے بعد صبا ایک بار پھر عظمیٰ کے گھر پہنچی تھی۔ صبا کو دیکھ کر عظمیٰ کی تو جیسے جان ہی نکل گئی تھی۔

''اب کیا ہوا ہے؟'' اس نے ڈرے ہوئے لہجے میں پوچھا تھا۔ اس کی رنگ زردی مائل ہو چکی تھی جب کہ آنکھیں بھی نم ہو چکی تھیں۔

''فوراً میرے ساتھ گھر چلو......'' صبا اس کا ہاتھ پکڑ کر تقریباً کھینچتے ہوئے بولی تھی۔

''میں کہیں نہیں جانا چاہتی، آخر بات کیا ہے؟ مجھے تو ہول اٹھ رہے ہیں۔'' عظمیٰ نے چور نظروں سے صحن میں بچھی چارپائی پر بیٹھی اپنی ماں کو دیکھتے ہوئے آہستگی سے سوال کیا تھا۔

''یار عظمیٰ...... بس غضب ہی ہو گیا ہے، یہاں میں تمہیں کچھ نہیں بتا سکتی، تم میرے ساتھ میرے گھر چلو پہلے۔'' مصنوعی خوف کا تاثر چہرے پر سجاتی صبا انتہائی مکاری کا مظاہرہ کر رہی تھی اور یوں صبا کے زور دینے پر عظمیٰ نے خود کو چادر میں چھپایا تھا اور صبا کے ساتھ اس کے گھر آ گئی تھی۔

''مجھے بتایئے تو اصل بات کیا ہے؟'' صبا...... عظمیٰ کو کمرے میں لے جانے کے لیے آگے بڑھی تھی تو وہیں رک گئی تھی۔ دہشت اس کے چہرے پر نمایاں تھی۔

''سچ بتایئے...... اندر کوئی ہے تو نہیں؟'' آنسو تواتر سے عظمیٰ کی آنکھوں سے بہہ رہے تھے اور قدم ڈگمگانے لگے تھے۔

''نہیں...... اندر کوئی نہیں ہے اور خدا نہ کرے کہ جو میں کوئی ایسی ویسی حرکت جان بوجھ کر تمہارے ساتھ کروں مگر عظمیٰ...... اب مسئلہ یہ ہے کہ...... بات اور زیادہ بگڑ چکی ہے۔'' صبا نے دوپٹے کا پلو انگلی پر لپیٹتے ہوئے کہا تھا۔

''اب کیا طوفان آ گیا ہے؟'' عظمیٰ نے گھٹی گھٹی آواز میں پوچھا تھا۔

''یہ دیکھو......'' صبا نے کمرے میں داخل ہوتے ہی سی ڈی پلیئر آن کر دیا تھا اور پھر ٹی وی اسکرین پر جو تماشہ شروع ہوا، وہ عظمیٰ کی جان نکالنے کے لیے کافی تھا۔

''آپ ملی ہوئی ہیں اس ذلیل شخص کے ساتھ، یہ موی اس دن آپ نے ہی ریکارڈ کی تھی ناں، معصوم لڑکیوں کو بلیک میل کرتی ہیں آپ؟'' وہ پوری شدت سے صبا پر پل پڑی

تھی۔

''تم جو بھی سمجھو مگر حقیقت یہ ہے کہ اب یہ شخص تم سے دوبارہ ملنا چاہتا ہے۔'' صبا قدرے مکروہ انداز میں بول رہی تھی۔

''میں مرجاؤں گی مگر اس سے ملنے ہرگز نہیں جاؤں گی، تم کیوں نہیں خود کو اس کے سامنے پیش کردیتیں؟'' عظمیٰ غصے سے پھنکار رہی تھی۔

''زبان سنبھال کر بات کرو......'' صبا نے اسے آنکھیں دکھائی تھیں۔

''پلیز...... یہ سی ڈی میرے حوالے کردو۔'' عظمیٰ سخت بے چارگی سے کہہ رہی تھی۔

''تو ٹھیک ہے، تم آخری بار اس سے مل لو پھر میں یہ سی ڈی تمہارے حوالے کردوں گی۔''

''مجھے یوں بلیک تو نہ کریں، ابھی یہ سی ڈی آپ کے پاس ہے۔ آپ اسے میرے حوالے کردیں۔'' عظمیٰ روتی اور گڑگڑاتی جارہی تھی۔

''میرے پاس تو یہ اس کی کاپی ہے، ماسٹر رول تو اسی شخص کے پاس ہے۔ سوچ لو، اگر تمہاری یہ سی ڈی وہ مارکیٹ کردے تو تمہاری عزت خاک میں مل جائے گی۔ ابھی تو یہ صرف بات مجھے پتا ہے۔'' صبا ایک مکروہ مسکراہٹ کے ساتھ بولی تھی۔

''تو پھر ابھی مجھے اس کے پاس لے چلیں، میں خود اس کمینے آدمی سے بات کروں گی، شاید اسے میری حالت پر رحم آجائے۔'' عظمیٰ شدت غم سے روتے ہوئے بولی تھی۔

''ابھی تو نہیں، کل صبح چلیں گے۔'' صبا نے نہایت سپاٹ لہجے میں کندھے اچکاتے ہوئے کہا تھا۔

''ٹھیک ہے...... میں صبح آجاؤں گی لیکن آپ اس آدمی کے چنگل سے نکالنے میں میرا ساتھ تو دیں۔''

''میں تمہارا ساتھ ہی تو دے رہی تھی مگر تم تو مجھ پر ہی شک کرنے لگیں۔''

''آپ کچھ بھی کہیں لیکن میں جان گئی ہوں کہ آپ کو سب معلوم تھا، آپ یہ سب کچھ جان بوجھ کر کررہی ہیں۔ میں تو آپ کو آپ کہتی تھی اور آپ نے......''

''اچھا ناں......اب بس بھی کرو، کل اس شخص سے تمہاری آخری ملاقات ہوگی پھر اس کے بعد تمہاری جان اس شخص سے ہمیشہ کے لیے چھوٹ جائے گی۔'' یوں صبا نے اسے بہلا پھسلا کر گھر کی جانب روانہ کر دیا تھا اور خود موبائل پر اس شخص سے اگلے دن کا پروگرام طے کرنے لگی۔

O......O......O

اگلے دن صبح دس بجے رکشہ عظمیٰ کے گھر کے سامنے رکا۔ عظمیٰ پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق گھر سے باہر آئی اور رکشے میں بیٹھ گئی۔ صبا پہلے سے ہی موجود تھی۔

''چلو ڈیفنس کی طرف......'' صبا نے رکشے والے سے کہا تھا اور پھر عظمیٰ سے یوں مخاطب ہوئی۔

''اب تم بہادری کا مظاہرہ کرنا، اپنے حق کے لیے لڑنا تمہارا فرض ہے۔ سی ڈی لے کر ہی لوٹنا ورنہ یقین کرو، تمہاری ساری زندگی برباد ہو جائے گی۔''

صبا...... عظمیٰ کو یہ سب کچھ سمجھا رہی تھی مگر وہ تو اپنے اردگرد کے ماحول سے کٹی خلا میں کسی غیر مرئی نقطے کی کھوج میں مبتلا تھی۔

رکشہ مختلف راستوں سے ہوتا ہوا بالآخر ایک بنگلے کے سامنے رک گیا۔ وہ دونوں تیزی سے اتر کر بنگلے کے گیٹ میں داخل ہو گئیں جو ان کی آمد سے پہلے ہی کھولا جا چکا تھا۔

''بیٹھو یہاں پر تم، میں ابھی آتی ہوں۔'' صبا...... عظمیٰ کو لاؤنج میں بٹھاتی ایک دوسرے کمرے میں داخل ہو گئی اور پھر کچھ دیر بعد جب وہ لوٹی تو اس کے چہرے پر انوکھی مسرت کے آثار تھے۔

''عظمیٰ...... تمہارا کام ہو گیا ہے۔ جاؤ...... جا کر تم سی ڈی لے آؤ۔ جب تک میں یہاں تمہارا انتظار کرتی ہوں۔'' صبا نے بہت پیار اور محبت سے کہا تھا۔

''پلیز......آپ کہیں نہیں جایئے گا، پچ...... مجھے یہاں بہت ڈر لگ رہا ہے، بس میں سی ڈی لے کر فوراً آتی ہوں۔'' یہ کہہ کر عظمیٰ تیزی سے کمرے کی طرف بھاگی تھی اور پھر اس کے کمرے کے اندر جاتے ہی صبا نے باہر سے کنڈی لگا دی تھی، یوں عظمیٰ قید ہو چکی تھی، صبا کا

کام بس یہیں تک تھا، اسے اس کی مطلوبہ رقم مل گئی تھی اس لیے وہ تیزی سے بنگلے سے باہر آ گئی تھی جہاں رکشہ پہلے ہی اسٹارٹ تھا، سو وہ اس میں بیٹھ کر اپنے گھر کی جانب پلٹ آئی تھی۔

O......O......O

عظمیٰ ایک ہفتے اس بنگلے میں قید رہی جہاں اعجاز نامی شخص اس پر ظلم و ستم کے ساتھ زیادتی کا شکار بھی بناتا رہا تھا۔ یہ بنگلہ دراصل فحاشی کا اڈہ تھا جہاں ہوس پرست اپنی ہوس کی آگ بجھانے آتے تھے۔

صبا نے عظمیٰ کو بے وقوف بنا کر اس کی الٹی سیدھی تصویریں اور مووی کے ذریعے پھنسا تو لیا تھا لیکن عظمیٰ کے والدین نے جب عظمیٰ کو ڈھونڈنے کی کوشش کی تو وہ منور کے ذریعے جو رکشہ ڈرائیور تھا، اس کے بنگلے تک پہنچ گئے اور دوران پولیس چھاپہ عظمیٰ کو بازیاب کرا لیا گیا تھا۔

کمرۂ عدالت میں بڑا جذباتی منظر نظر آ رہا تھا۔ یہاں مظلوم عظمیٰ کے ساتھ ظالم صبا بھی موجود تھی جس نے اپنی قبل از گرفتاری ضمانت کروائی ہوئی تھی اور اب ضمانت میں توسیع کی خواہش مند تھی۔ سرکاری وکیل نے عظمیٰ کا تحریری بیان پیش کرتے ہوئے جج صاحب سے کہا تھا کہ ملزمہ صبا کسی رعایت کی مستحق نہیں ہے، اس نے ایک عورت ہوتے ہوئے معصوم لڑکی کی زندگی برباد کر دی، اسے اپنی نفسانی خواہشات کی بھینٹ چڑھا دیا۔ معصوم عظمیٰ پاکیزہ زندگی گزار رہی تھی مگر صبا نے اسے درندوں کے حوالے کر دیا تھا۔

جج صاحب نے صبا کو ضمانت قبل از گرفتاری کی توسیع سے انکار کرتے ہوئے اسے کمرۂ عدالت میں ہی گرفتار کرنے کا حکم دے دیا تھا مگر صبا آہستہ آہستہ بہت ہوشیاری سے عدالت کے باہر نکل گئی تھی اور آناً فاناً اپنے وکیل کے ہمراہ غائب ہو گئی تھی...... اور افسوس کا مقام یہ ہے کہ صبا ابھی تک فرار ہے۔

O......O......O

عظمیٰ کی معصومیت، اس کی عزت و آبرو، ظالم سماج کے ان بھیڑیا نما انسانوں کی وجہ

سے داغدار تو ہو گئی مگر یہ واقعہ ہمارے ارباب اختیار کو اس بات کی دعوت فکر دیتا ہے کہ جدید ٹیکنالوجی میں پیشہ وارانہ مہارت کو جس منفی انداز میں استعمال کیا جا رہا ہے، اس کی روک تھام کے لیے قانون کیوں حرکت میں نہیں آتا؟ صدر کے علاقے میں ریٹیو سینٹر کی بلند و بالا عمارت آج جدید ٹیکنالوجی سے جڑے اس گھناؤنے کاروبار میں بنیادی کردار ادا کر رہی ہے، صرف 30 روپے میں ایسی سی ڈیز بھی دستیاب ہیں جو پورے خاندان کی عزت کو چند لمحے میں خاک میں ملا دیتی ہیں۔ ایسے میموری کارڈز بھی سر عام فروخت ہو رہے ہیں جو معاشرے کے گھناؤنے کردار، کبھی صبا کی شکل میں اور کبھی اعجاز کی شکل میں بلیک میلنگ کے لیے تیار کرتے ہیں۔ ان باعزت ماں باپ کا، خاندانوں کا بھلا کیا قصور ہے؟ یہ بات نوجوان لڑکیوں کو سوچنی چاہیے جو جذبات کی رو میں بہہ کر ان دھوکے بازوں کے چکر میں پڑ جاتی ہیں اور اپنا گوہر نایاب نہ صرف گنوا بیٹھتی ہیں بلکہ ان کو بازار کی زینت بنا دیا جاتا ہے۔ یہ المیہ نہیں تو اور کیا ہے، یہ ہمارے لیے سوچنے کا مقام ہے لیکن...... اے کاش کہ کوئی تو سوچے؟

☆......☆......☆

اندھے بہرے لوگ

''واہ...... واہ...... کیا خوبصورت جھمکے ہیں، کتنے کے ہیں؟'' شوکیس میں سجے مختلف زیوارات میں سے فرحانہ کی نظر سونے کے جھمکوں پر ٹک گی۔

''بی بی...... یہ جڑاؤ ہیں۔'' دکان دار نے فرحانہ کی حالت پر نظر دوڑاتے ہوئے استہزائیہ لہجے میں کہا۔

میلی سی چادر اور ملگجے شلوار قمیص میں وہ قینچی چپل پیر میں پھنسائے گھر میں کام کرنے والی ماسی لگ رہی تھی۔

''عقل کے اندھے...... یہ تو مجھے بھی نظر آرہا ہے کہ یہ جڑاؤ ہیں، پر ہیں کتنے کے؟'' فرحانہ نے دانت پیستے ہوئے سامنے بیٹھے قدرے خوش شکل لڑکے کو مخاطب کیا۔

''تیس ہزار کے۔'' دکان دار نے منہ بناتے ہوئے جواب دیا۔

''اتنے مہنگے؟'' فرحانہ نے دانتوں میں انگلی دبائی۔

''سونے کا ریٹ آسمان سے باتیں کر رہا ہے بی بی......!'' وہ سخت کوفت کے عالم میں واپس کاؤنٹر کی طرف بڑھ گیا۔

''ارے...... ارے دکھا تو دو، لے کر نہیں بھاگ جاؤں گی۔'' فرحانہ نے اسے پلٹتے دیکھا تو بے اختیار چیخی۔

''پہلے خریدنے والی تو بنو پھر دکھا بھی دوں گا۔ اب جاؤ بھئی، زیادہ دماغ نہیں خراب کرو۔''

"آکڑو کہیں کا...... کہہ تو ایسے رہا ہے جیسے دیکھنے کے بھی پیسے لگتے ہوں۔ ایسے جان چھڑا رہا ہے مجھ سے جیسے نظر لگا دوں گی اس کی دکان کو۔" فرحانہ نے ایک قہر آلود نظر دکان دار پر ڈالی اور باہر نکل آئی۔

"کم بخت...... اسی کی دکان پر اچھے ڈیزائن نظر آتے ہیں۔ کسی نے صحیح ہی کہا ہے جسے مسکرانا نہیں آتا، اسے دکان نہیں کھولنی چاہیے۔" وہ رکشے کی طرف بڑھتی ہوئی خود سے مخاطب تھی۔

"بھیا سرجانی ٹاؤن چلنا ہے؟"

"ڈیڑھ سو روپے ہوں گے۔" رکشے والے نے سائیڈ گلاس میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"نیو کراچی سے سرجانی ٹاؤن ڈیڑھ سو روپے؟ کیا سٹھیا گئے ہو؟"

"ایک سو تیس میں چلنا ہے تو بیٹھ جاؤ ورنہ اپنی راہ لو۔" رکشے والے نے سگریٹ لبوں میں دباتے ہوئے بے زاری سے کہا۔

"سوئی گورنمنٹ بیڑہ غرق ہو، ہر چیز کے دام اتنے بڑھ گئے ہیں کہ بس اب تو اپنا دم نکلنے کی نوبت آگئی ہے۔" ہاتھ میں پکڑا سبزی کا تھیلا سیٹ پر رکھتی اب وہ خود بھی بیٹھ چکی تھی۔

"بھیا...... ذرا تیز چلانا، پہلے ہی بہت دیر ہوگئی ہے۔" رکشا اسٹارٹ ہوتے ہی فرحانہ نے کہا اور پھر اچانک ہی وہ کسی خیال کے تحت چونکی اور موبائل بیگ سے نکال کر نمبر ملانے لگی۔

O......O......O

فرحانہ بیگ کو مضبوطی سے بازو کے نیچے دبائے اسی سنار کی دکان پر داخل ہوئی۔ آج اس کے ساتھ ایک سات سالہ لڑکا بھی تھا۔

"لو یہ آج پھر آگئی......؟" زوہیب نے نعمان کی توجہ فرحانہ کی طرف دلائی۔

"ارے...... تم......؟" فرحانہ، نعمان کو دیکھتے ہی بے ساختہ بولی۔ "یہ تمہاری دکان ہے؟" اس نے ایک ہی سانس میں کئی سوال کر ڈالے۔

"نہیں...... یہ میرے دوست زوہیب کی دکان ہے، میں فیکٹری سے فارغ ہو کے اکثر یہاں اس کے پاس وقت گزارنے کے لیے بیٹھ جاتا ہوں۔"

"اوہ...... اچھا......" فرحانہ نے طنزیہ نظر زوہیب کے سراپے پر ڈالی مگر آج وہ خود بھی

ٹھیک ٹھاک تیار ہو کر آئی تھی۔ صاف ستھرے لباس پر نفاست سے کیا میک اپ اس کی شخصیت کو نکھار رہا تھا۔

''تم جانتے ہو اسے؟'' زوہیب نے نعمان سے آہستگی سے پوچھا۔

''ہاں...... یہ میرے ساتھ فیکٹری میں کام کرتی ہیں۔ ہمارے ڈیپارٹمنٹ الگ ہیں لیکن میں ان کو آتے جاتے ہوئے اکثر دیکھتا ہوں۔'' نعمان نے وضاحت کی۔

''اوہ...... اچھا......'' زوہیب نے بھرپور نظروں سے فرحانہ کا سرتاپا جائزہ لیا جو ابھی تک جھمکوں میں ہی گم نظر آ رہی تھی۔

''یہاں جو پسند آئے، آپ مجھے بتائیں، یہ اپنا یار ہے، آپ سے زیادہ پرافٹ نہیں لے گا۔'' نعمان نے فرحانہ کو مخاطب کیا۔

''نہیں بھئی...... یہ جھمکے تو واقعی میری رینج سے باہر ہیں۔ آپ مجھے یہ سونے کی بالیاں دکھا دیں۔'' وہ دوسری طرف شوکیس میں سجی بالیوں میں سے ایک پر انگلی رکھتے ہوئے بولی۔

زوہیب نے فوراً ہی بالیاں نکال کر اس کے سامنے رکھ دیں۔

''ارے...... یہ تو بہت ہلکی ہیں۔'' فرحانہ خفیف سی ہو گئی۔

''ساڑھے پانچ ہزار کی ہیں محترمہ......!'' زوہیب نے ہنسی لبوں میں دبائی۔

''یہ...... کاغذ جیسی بالیاں...... ساڑھے پانچ ہزار کی؟'' وہ ہونق سی اب نعمان کا چہرہ تک رہی تھی۔

''ارے یار...... یہ اپنی جاننے والی ہیں، کچھ ڈسکاؤنٹ تو کرو۔'' نعمان نے زوہیب کو آنکھ مارتے ہوئے پیار سے سمجھایا۔

''دیکھتا ہوں......'' زوہیب نے بالیاں اپنے سامنے رکھی ویٹ مشین پر رکھ دیں اور پھر قدرے توقف کے بعد بولا۔ ''ٹھیک ہے، آپ اس کے پانچ ہزار دے دیجیے گا۔''

''پانچ ہزار بھی زیادہ ہیں۔'' فرحانہ منہ بناتی ہوئی بولی۔

''جائز لے رہا ہوں آپ سے، یہ تو نعمان کی وجہ سے پانچ سو میں نے چھوڑ دیئے ورنہ یقین کریں، اس میں میرا کوئی پرافٹ نہیں ہو رہا۔'' زوہیب اب اسٹول پر بیٹھا فرحانہ کے

فیصلے کا منتظر تھا۔ ''ارے...... آپ اچھی طرح سوچ لیجیے، جب تک میں آپ کے لیے کولڈ ڈرنک منگواتا ہوں۔'' نعمان کولڈ ڈرنک کا کہنے کے لیے شاپ سے نکل گیا جبکہ فرحانہ کی نظریں گھوم پھر کر انہی گولڈ کے جھمکوں پر جا رہی تھیں۔

''چلیے ٹھیک ہے...... یہ بالیاں ہی دے دیجیے۔'' فرحانہ نے بادل ناخواستہ جواب دیا۔ اتنی دیر میں کولڈ ڈرنک بھی آ گئی۔

''یہ لیجیے...... آپ کی بالیاں۔'' چھوٹے سے سرخ مخملی ڈبے میں زوہیب بالیاں سیٹ کرتا اب فرحانہ کی طرف بڑھا چکا تھا۔

''احتیاط سے رکھیے گا، آج کل کچھ پتا نہیں۔'' نعمان نے کولڈ ڈرنک فرحانہ کے ساتھ بیٹھے ہوئے بچے کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''ہاں...... یہ تو ہے۔'' فرحانہ نے بیگ کی اندرونی جیب سے پیسے نکال کر زوہیب کے حوالے کیے اور بالیوں کو احتیاط سے بیگ میں رکھنے لگی۔

O......O......O

''ارے...... آپ کہاں غائب ہیں؟ کیسے ہیں؟ میں کافی دن سے آپ کی تلاش میں ہوں۔'' گارمنٹس فیکٹری کے مین گیٹ پر فرحانہ نے نعمان کو دیکھتے ہی ایک ہی سانس میں کئی سوال کر ڈالے۔

''میں بالکل ٹھیک ہوں، آپ سنائیے، سب خیریت تو ہے ناں؟'' نعمان متعجب سا پلٹا۔

''وہ...... اصل میں مجھے جیولری کی دکان والے زوہیب کا نمبر چاہیے۔'' فرحانہ نے جلدی سے اپنا مدعا بیان کیا۔

''خیریت...... زوہیب کا نمبر کیوں؟'' نعمان کے لہجے میں حیرانی تھی۔

''اُفوہ...... دو دفعہ موصوف کی دکان پر گئی ہوں مگر دونوں دفعہ ہی بند ملی۔ سوچا...... اب فون کر کے جاؤں تو بہتر رہے گا۔'' فرحانہ نے بات بناتے ہوئے کہا۔

''دکان جمعے کے علاوہ تو کھلی رہتی ہے۔ خیر...... میں دیتا ہوں نمبر۔'' نعمان نے موبائل

جیب سے نکالتے ہوئے کہا۔

"ہاں...... ہاں...... پلیز...... آپ کی مہربانی ہوگی ورنہ سرجانی ٹاؤن سے نیو کراچی جانا سخت کوفت میں مبتلا کر دیتا ہے۔"

"یہ لیجیے...... نوٹ کیجیے۔" نعمان نمبر بتانے لگا اور فرحانہ تیزی سے وہ نمبر اپنے موبائل میں فیڈ کرنے لگی۔

"ویسے آپ کا دوست بڑا اکڑو قسم کا ہے۔" فرحانہ منہ بناتے ہوئے موبائل بیگ میں رکھتے ہوئے بولی۔

"شادی نہیں ہوئی ناں، اس کی جبھی اتنی اکڑ ہے۔" نعمان ہنستے ہوئے بولا۔

"اکڑ تو اس کی اب میں نکالوں گی......" فرحانہ نے آہستگی سے کہا اور شوخی سے مسکرا دی۔ نعمان اپنے راستے پر چل دیا جب کہ فرحانہ تو کسی اور ہی دنیا کی سیر کے لیے نکل چکی تھی۔

O......O......O

"اللہ...... موبائل پیکیج سسٹم بنانے والوں کو سلامت رکھے۔" فرحانہ نے زوہیب کا نمبر "فرینڈز اینڈ فیملی لسٹ" میں فیڈ کرتے ہوئے کہا اور فوراً ہی زوہیب کے نمبر پر کال ملائی۔ دوسری طرف سے زوہیب نے فوراً ہی کال ریسیو کر لی۔

"کیسے مزاج ہیں آپ کے؟" فرحانہ نے بڑی ادا سے کہا۔

"جی...... آپ کون؟" دوسری طرف سے آواز آئی۔

"آپ کی عاشق......" ایک قہقہے کے ساتھ فرحانہ بولی۔

"آپ کی بے کار باتوں کے لیے میرے پاس فالتو وقت نہیں......" زوہیب نے یہ کہہ کر لائن کاٹ دی۔

"اوئے ہوئے...... یہ تو پکا اخروٹ ہے...... یہ تو پٹنے والا نہیں لگتا ہے، اس کے آگے اپنا ہی سر پھوڑنا پڑے گا۔" فرحانہ نے دانت پیستے ہوئے کہا مگر وہ ہمت نہیں ہاری اور ایک بار پھر زوہیب کا نمبر ملا بیٹھی۔ کال ریسیو ہو چکی تھی۔

''زوہیب...... پلیز...... لائن نہیں کاٹیے گا۔'' وہ رندھی ہوئی آواز بناتے ہوئے بولی۔

''آپ آخر ہیں کون؟'' اپنا نام سنتے ہی زوہیب بات کرنے پر مجبور ہو گیا۔

''آپ جانتے ہیں مجھے لیکن بس......''

''لیکن بس کیا......؟'' زوہیب نے سوال کیا۔

''یہی کہ میرے دل کا حال نہیں جانتے؟'' فرحانہ محبت بھرے لہجے میں بولی۔

''سنایئے اپنے دل کا حال......'' زوہیب کے لہجے میں بے زاری تھی۔

''زوہیب...... میں جب سے آپ سے ملی ہوں، آپ کو بھول نہیں پا رہی۔ آپ کی شخصیت میں جادو ہے، شاید میں اسی لیے بار بار آپ کی طرف کھنچ رہی ہوں۔'' وہ گہری سانس لیتے ہوئے بولی جیسے کوئی بہت بڑا بوجھ دماغ سے سرک کر ہوا میں تحلیل ہو گیا ہو۔

''آپ کی مجھ سے کب ملاقات ہوئی تھی؟'' زوہیب بے اختیار سوال کر بیٹھا۔

''جب میں آپ سے ملوں گی تو آپ جان جائیں گے۔'' فرحانہ نے جذباتی لہجے میں کہا۔

''آپ شاید کچھ غلط سمجھ رہی ہیں، میرا مطلب ہے، آپ جس سے ملی ہیں، وہ میں نہیں ہوں۔''

''آپ کا گول چہرہ ہے ناں؟ اور داڑھی مونچھیں بھی ہیں۔'' فرحانہ نے بھی فوراً اپنی تسلی کرنا چاہی۔

''ارے...... یہ تو مردوں کی شان ہے، ہر دوسرا مرد داڑھی اور مونچھوں میں ہی نظر آتا ہے۔'' زوہیب ہنستے ہوئے بولا۔

''بے وقوف......'' فرحانہ آہستگی سے بولی۔

''شاید آپ خود ہی بے وقوف بن گئیں۔'' زوہیب زور سے ہنسا۔

''آپ کی سندھی ہوٹل کے پاس سنار کی دکان ہے ناں؟'' فرحانہ کا لہجہ خاصا مضبوط تھا۔

''جی ہاں......'' زوہیب نے بے اختیار کہا۔

"پھر میں بے وقوف نہیں ہوں لیکن ہاں، آپ سے پہلی ہی نظر میں پیار کرنے کی بے وقوفی کر چکی ہوں......" یہ کہتے ہی فرحانہ نے لائن کاٹ دی اور زور زور سے قہقہے لگانے لگی۔ "مسٹر زوہیب...... اب تم پھنس گئے ہو، اب اس نمبر پر تمہاری کال خود ہی آئے گی۔" شوخی اور مسکراہٹ سے کھیلتے اس کے لب بے ساختہ موبائل کی اسکرین چومنے لگے۔

O......O......O

دوسرے دن ٹھیک بارہ بجے فرحانہ کا موبائل بجا، زوہیب کا نام اسکرین پر بلنک کر رہا تھا۔

"اونہہ...... ظاہری اکڑ تھی...... اب آیا نا...... لائن پر......" فرحانہ نے تیزی سے کال ریسیو کر لی۔

"بہت ناراض ہوں آپ سے، کچھ نہیں سنوں گی اور ہاں، آئندہ مجھ بے وقوف کے نمبر پر کال کرنے کی ضرورت نہیں......" یہ کہہ کر فرحانہ نے لائن کاٹ دی۔ "بے وقوف تو اب میں تمہیں بناؤں گی......" فرحانہ نے ایک فریبی مسکراہٹ کے ساتھ موبائل الٹتے پلٹتے ہوئے کہا۔ موبائل پھر بجنے لگا۔

"کیوں تنگ کر رہے ہیں آپ مجھے؟" فرحانہ ناراض سے لہجے میں بولی۔

"ارے...... آپ تو اتنی ناراض ہیں کہ کچھ بھی سنے بنا لائن کاٹ دیتی ہیں؟" دوسری طرف سے زوہیب کی آواز آئی۔

"ٹھیک ہے...... اب لائن نہیں کاٹ رہی، کہیے...... کیا کہنا چاہتے ہیں؟" فرحانہ اپنی ہنسی دباتے ہوئے گویا ہوئی۔

"آپ کو میرا نمبر کہاں سے ملا؟"

"آپ کے وزیٹنگ کارڈ سے......" ابھی وہ آگے کچھ بولتی کہ زوہیب بول اٹھا۔

"میرے وزیٹنگ کارڈ پر میرا سیل نمبر نہیں ہے، صرف شاپ کا پی ٹی سی ایل نمبر ہے۔"

"چلیے...... اس سے کیا فرق پڑتا ہے، بس میں آپ تک پہنچ گئی، یہی میرے لیے باعث خوشی ہے مگر افسوس...... آپ خواتین کا احترام کرنا نہیں جانتے۔ ان کے احساسات کی

آپ کو بالکل قدر نہیں۔" وہ بگڑے لہجے میں بولی۔

"اچھا ناں، اگر میری وجہ سے آپ کا دل برا ہوا تو سوری...... سوری میں کبھی کسی سے نہیں کہتا لیکن آپ سے کہہ رہا ہوں۔" زوہیب نے برق رفتاری سے اپنی بات مکمل کی۔

"اچھا...... ایک شرط پر آپ کا سوری منظور ہوگا۔"

"کون سی شرط؟"

"آپ کو مجھ سے ملنا ہوگا۔" فرحانہ اپنی خوشی پر قابو پاتے ہوئے بولی۔

"ہاں...... ملنا تو میں بھی آپ سے چاہ رہا ہوں۔" زوہیب کے لہجے میں بھی جلد بازی تھی۔

"آپ نے میری شاپ تو دیکھی ہے ناں، بس لائن میں آگے ایک آئس کریم پارلر ہے، ہم وہیں کل ملتے ہیں۔" زوہیب نے کہا۔

"ٹھیک ہے...... میں آجاؤں گی۔"

"مگر میں آپ کو پہچانوں گا کیسے؟"

"میں گرین سوٹ میں آؤں گی۔" فرحانہ ہولے سے بولی۔

"ٹھیک ہے...... باقی باتیں پھر میں آپ سے کل مل کر کروں گا لیکن یاد رہے، ٹھیک پانچ بجے۔"

"جی...... ٹھیک ہے۔" فرحانہ کے ہامی بھرتے ہی زوہیب نے لائن کاٹ دی۔

"یہ ہوئی نا بات...... زبردست فرحانہ......! تم بالکل صحیح جا رہی ہو۔"

O......O......O

آئس کریم پارلر کے ماحول سے بے نیاز، زوہیب...... فرحانہ کا منتظر تھا۔ پانچ سے چھ اور چھ سے سات بجنے کو آئے تھے مگر فرحانہ نہ تو کال ریسیو کر رہی تھی اور نہ ہی خود آئی تھی۔ زوہیب آئس کریم پارلر میں بیٹھے جوڑوں کو دیکھتا رہا تو کبھی آنے والی لڑکیوں میں گرین رنگ کے کپڑوں میں ملبوس لڑکی کو کھوجتا رہا۔ بالآخر تنگ آ کر وہ واپس دکان پر آ گیا۔

"سب خیریت تو ہے ناں؟" نعمان نے اس کے لٹکے ہوئے منہ کو دیکھ کر پوچھا۔

"کچھ خاص نہیں یار، بس......جس کام کے لیے گیا تھا، وہ ہوا نہیں۔" زوہیب نے اپنی کنپٹی دباتے ہوئے کہا۔

"چلو یار...... ہوتا ہے کبھی کبھی، غم نہیں کرو پھر میں نکلوں؟ گھر پر سب میرا انتظار کر رہے ہیں۔" نعمان کے جاتے ہی زوہیب کی انگلیاں مستقل موبائل کی Key پریس کر رہی تھیں کہ اچانک ہی کال ریسیو کر لی گئی۔

"آئیں کیوں نہیں؟ میں نے کتنا انتظار کیا؟" زوہیب خاصا برہم تھا۔

"سوری زوہیب، ایک ایمرجنسی ہو گئی تھی۔ میری پڑوس والی آنٹی کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔ سچ...... میں تو بالکل ڈر گئی تھی۔" فرحانہ بے ساختہ رونے لگی۔

"ارے پلیز......اب رونا بند کرو۔" زوہیب یکدم نرم پڑ گیا۔

"شکر ہے، میری آنٹی بچ گئیں، مجھے وہ اپنی جان سے زیادہ عزیز ہیں۔"

"اچھا......" زوہیب نے اسی پر اکتفا کیا۔

"بالکل اتنی ہی عزیز جیسے آپ۔" فرحانہ کی روتی آواز زوہیب کی سماعت سے ٹکرائی۔

"آپ سچ کہہ رہی ہیں؟" زوہیب کے لہجے میں بے یقینی تھی۔

"آپ مجھے فرحانہ کہہ کر بلائیں، کیا آپ، آپ لگا رکھی ہے؟ اور میں جھوٹ نہیں بولتی۔"

"اب کیسی ہیں آپ کی آنٹی؟" زوہیب اب قدرے پرسکون تھا۔

"اب کافی بہتر ہیں۔ اچھا...... میں آپ سے لیٹ نائٹ بات کروں گی، ابھی تھوڑی مصروف ہوں۔" فرحانہ نے کمال مہارت سے بہانہ بنایا اور لائن کاٹ دی۔

"ہا......ہا...... زوہیب، تم میرے انتظار میں صرف میرے بارے میں ہی سوچ رہے ہوں گے۔ میں یہی تو چاہ رہی تھی، اب تمہاری مجھ سے ملنے کی تڑپ ہی مجھے مزہ دے گی۔ ایکسیڈنٹ تو بہانہ تھا زوہیب اب تم مجھے چھوڑ کر نہیں جا سکتے......" فرحانہ کے چہرے پر انوکھی خوشی کی حدت تھی۔

O......O......O

''یار زوہیب...... سب خیریت تو ہے ناں؟ میں دو تین دن سے تمہیں پریشان دیکھ رہا ہوں۔'' نعمان نے زوہیب کو کریدنا چاہا۔

''کچھ خاص نہیں، بس ایسے ہی ایک پرسل مسئلہ ہے۔ انشاء اللہ...... جلدی حل ہو جائے گا۔'' زوہیب نے آہستگی سے کہا۔

''اچھا پھر میں نکلتا ہوں، تم فون پر مجھ سے رابطہ رکھنا، ویسے بھی سونے کی بڑھتی قیمت کے باعث کوئی گاہک تو ہے نہیں۔''

''ارے...... یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے، یار زندہ، صحبت باقی۔ میں ہوں ناں، تیرے ساتھ، دیکھ لوں گا۔'' نعمان نے زوہیب کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا تھا۔

نعمان کی روانگی کے ذرا دیر بعد ہی موبائل پر فرحانہ کی کال آئی تھی۔ زوہیب نے فوراً کال ریسیو کی تھی۔

''کیا بات ہے، آج آواز میں وہ جوش نہیں؟'' فرحانہ نے زوہیب کی آواز سنتے ہی کہا تھا۔

''بس طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے، سر میں درد ہے میرے۔'' زوہیب کے لہجے میں شکوہ تھا۔

''میرے پاس آجائیں، میں آپ کا سر دبا دوں۔''

''جی نہیں...... میں ٹھیک ہوں، ابھی پونسٹان لوں گا تو بالکل فٹ ہو جاؤں گا۔'' زوہیب کے بوکھلائے جواب پر فرحانہ زور سے ہنس دی۔

''زوہیب...... آپ کا دل نہیں چاہتا جب آپ کی ایسی کیفیت ہو تو کوئی آپ کا سر دبائے؟ پیار سے آپ کا سر اپنے کاندھے پر رکھ کر آپ کے بال سہلائے؟''

''ہوں......'' زوہیب ہوں پر اکتفا کیے اپنے دل کی بے ترتیب دھڑکنوں کو سن رہا تھا۔

''اف زوہیب...... میرا تو دل کرتا ہے......'' وہ اتنا ہی کہہ کر خاموش ہو گئی۔

''تمہارا دل کیا کرتا ہے؟'' زوہیب بے چین ہو چکا تھا۔

''کچھ نہیں، رہنے دیں، مجھے شرم آرہی ہے۔''

"پھر بھی کہو تو......" زوہیب اصرار کر رہا تھا۔

"مجھے آپ سے ملنا ہے زوہیب، کتنے دن ہو گئے آپ کو دیکھا ہی نہیں؟" فرحانہ گہری سانس لیتے ہوئے بولی۔

"ملو نا مجھ سے...... مجھے خود تمہیں دیکھنا ہے۔ عجیب آگ میں جل رہا ہوں۔ تمہاری باتوں نے مجھے اسیر کیا ہوا ہے، ایسا لگتا ہے، تم سے جنم جنم کا رشتہ ہے۔" زوہیب مدہوشی کی سی کیفیت میں بولتا چلا جا رہا تھا جبکہ فرحانہ کا بس نہیں چل رہا تھا کہ خوشی سے چھلانگیں لگائے۔

"مجھے فائیو اسٹار ہوٹل دیکھنے کا شوق ہے، آپ کبھی گئے ہیں وہاں؟" فرحانہ بے ساختہ دل کی بات زبان تک لے آئی۔

"ہاں...... جا چکا ہوں، چلنا ہے وہاں میرے ساتھ؟"

"ہوں......" فرحانہ نے آہستگی سے کہا۔

"چلو ٹھیک ہے، کل چلتے ہیں۔"

"کیا سچ......؟" فرحانہ کی آواز میں خوشی آ گئی۔

"ہاں بھئی...... تم میری دکان تک پہنچو پھر وہاں سے ٹیکسی کر لیں گے۔" زوہیب نے دوسرے دن کا پروگرام بناتے ہوئے کہا۔

"اوہ...... آئی لو یو سو مچ زوہیب......!" فرحانہ نے اتنے زور سے کہا کہ زوہیب ایک پل کے لیے موبائل کان سے دور کرنے پر مجبور ہو گیا۔

"پاگل ہو بالکل......" زوہیب اس وقت ہواؤں میں اڑ رہا تھا اور خود کو دنیا کا خوش نصیب انسان تصور کر رہا تھا۔

O......O......O

ٹیکسی جیسے ہی زوہیب کی دکان کے سامنے رکی، وہ بجی سنوری فرحانہ کو دیکھ کر بے ساختہ بولا۔ "اوہ ہو...... تو تم ہو؟"

"کیوں...... میں اچھی نہیں ہوں کیا؟" فرحانہ نے خفگی سے سائیڈ ڈور کھولتے ہوئے

کہا۔

''نہیں...... اچھی ہو لیکن باتیں زیادہ اچھی کرتی ہو۔ یہ کون ہے؟'' فرحانہ کے ساتھ ایک سات سالہ بچے کو دیکھتے ہوئے زوہیب نے پوچھا۔

''یہ میرا سب سے چھوٹا بھائی ہے، مجھ سے بہت پیار کرتا ہے بلکہ میرے بغیر نہیں رہتا اس لیے میں ہمیشہ اسے اپنے ساتھ ہی رکھتی ہوں۔'' فرحانہ نے مفصل معلومات پہنچائیں۔

''اچھا جی......!'' زوہیب ٹیکسی ڈرائیور کو ہوٹل کا پتا بتاتے ہوئے فرحانہ کی طرف متوجہ ہوا۔

''ویسے اگر تم ایک دفعہ یہ کہہ دیتیں کہ مجھے آپ کی دکان پر جھمکے پسند آئے تھے......''

''تو وہ آپ میرے لیے لے آتے؟'' فرحانہ نے زوہیب کی بات کاٹتے ہوئے الٹا اسی سے سوال کیا۔

''جی نہیں...... بس میں تمہیں پہچان جاتا، میرا یہ مطلب تھا۔'' زوہیب نے بات مکمل کی۔

''کنجوس......'' فرحانہ نے منہ بناتے ہوئے کہا جبکہ زوہیب معنی خیز انداز میں مسکرا کر رہ گیا۔

O......O......O

زوہیب نے رفتہ رفتہ آنکھیں بند کر کے فرحانہ کی تمام خواہشات پوری کرنا شروع کر دی تھیں۔ ہوٹل، شاپنگ مال، تفریحی مقامات غرض یہ کہ فرحانہ جو فرمائش کرتی، اسے پوری کرنا زوہیب کے لیے فرض ہو جاتا۔

اس روز فرحانہ، زوہیب کی شدید خواہش پر اسے پہلی مرتبہ اپنے گھر لے آئی تھی۔

''ارے...... تم گھر پر اکیلی رہتی ہو؟ تمہارا بھائی کہاں ہے؟'' زوہیب نے خالی گھر میں اکیلی فرحانہ کو دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔

''امی ابو تو ہیں نہیں میرے، ایک آنٹی ہیں رشتے کی، ان کے ساتھ ہی رہتی ہوں۔ بھائی ابھی ان کے ساتھ نکلا ہوا ہے۔ آپ آرام سے بیٹھیں جب تک وہ دونوں آ جائیں

گے۔ میں اچھی سی چائے بنا کر لاتی ہوں آپ کے لیے۔" فرحانہ نے شوخی سے چٹکی بجاتے ہوئے کہا تھا۔

"نہیں...... تم یہاں میرے پاس بیٹھو۔" زوہیب نے فرحانہ کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتے ہوئے اسے خود سے قریب کر لیا تھا اور پھر محبت کب ہوس کا روپ اختیار کر گئی اور کب دونوں اس آگ میں جلنے لگے، دونوں کو پتا ہی نہیں چلا۔ شیطان ان پر مکمل حاوی تھا اور پھر جب دونوں ہوش کی دنیا میں آئے تو فرحانہ...... زوہیب کا کالر پکڑے اس سے پوچھ رہی تھی۔ "تم نے یہ کیا کیا؟" آنسو تھے کہ بہے چلے جا رہے تھے۔ اس کی ہچکیاں بندھی ہوئی تھی۔

"سوری فرحانہ، میں سخت شرمندہ ہوں، مجھے کچھ سمجھ نہیں آیا......" اس سے آگے زوہیب کچھ نہیں کہہ سکا۔

"زوہیب...... یہ ہے تمہاری محبت؟ تم نے تو مجھے کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑا......" وہ زاروقطار رو رہی تھی۔

"فرحانہ......! میری بات سنو، ہم جلد ہی نکاح کر لیتے ہیں۔ میں گھر جاتے ہی امی سے بات کرتا ہوں پھر سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔" زوہیب نہایت جذباتی انداز میں بول رہا تھا۔

"ہاں زوہیب...... پلیز، جلدی کرو، ایسا نہ ہو کہ بہت دیر ہو جائے۔" فرحانہ نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی تھی۔ فرحانہ نے دروازہ کھولا تو اس کا چھوٹا بھائی ساجد کھڑا تھا۔

"اب میں جا رہا ہوں۔" زوہیب حقیقتاً گھبرا گیا تھا اس لیے وہ زیادہ دیر رکا نہیں اور دروازے سے نکل گیا۔

"تجھ سے کہا تھا، گھنٹے...... ڈیڑھ گھنٹے میں آنا پھر جلدی کیوں آ گیا؟" فرحانہ نے زوہیب کے جاتے ہی معصوم ساجد کے گال پر ایک تھپڑ رسید کیا تو وہ زور زور سے روتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔

''شکر ہے...... میرا پلان کامیاب ہو گیا...... اگر یہ اور جلدی آ جاتا تو ساری محنت رائیگاں چلی جاتی......''

O......O......O

''یار...... تُو فرحانہ کو جانتا ہے ناں؟ میں اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ امی راضی ہیں تُو بھی چل نا میرے ساتھ؟'' زوہیب نے یہ خبر نعمان کو سنائی تو وہ حیرت سے گویا ہوا۔

''کون فرحانہ......؟ کس سے شادی کرنے جا رہے ہو؟''

''ارے یار...... وہی جو تمہارے ساتھ فیکٹری میں کام کرتی ہے۔ اس کا آگے پیچھے تو کوئی ہے نہیں، یوں کرو تم اس کے بھائی بن جاؤ تا کہ امی کو بھی تسلی ہو جائے۔'' ایک ہی سانس میں زوہیب ساری بات کہہ گیا۔

''یار...... تُو پاگل ہو گیا ہے...... وہ فرحانہ شادی شدہ ہے۔''

''ابے...... تیرا دماغ تو ٹھیک ہے ناں؟'' زوہیب نے نعمان کو غصے بھری نظروں سے دیکھا۔

''ہاں یار...... وہ جو بچہ اس کے ساتھ اس دن آیا تھا، وہ فرحانہ کا بیٹا ہے بلکہ اسکی تو ایک بیٹی بھی ہے جو اس کے شوہر منیر احمد کے ساتھ ڈھاکہ میں رہتی ہے۔''

''تُو صحیح کہہ رہا ہے؟'' زوہیب کا دل چاہ رہا تھا کہ زمین پھٹ جائے اور وہ اس میں سما جائے۔

''ہاں میرے دوست......! بالکل ٹھیک کہہ رہا ہوں لیکن یہ نہیں جانتا کہ ان کی علیحدگی ہو گئی ہے یا پھر......''

نعمان اس سے بھی آگے کچھ بتاتا مگر زوہیب نے اسے روک دیا۔ اسے معصوم نظر آنے والی فرحانہ سے اتنے بڑے دھوکے کی امید نہیں تھی۔ وہ فرحانہ سے حقیقتاً سچی محبت کرنے لگا تھا۔

''سوری یار...... مجھے اگر پہلے علم ہوتا کہ فرحانہ نے مجھ سے تیرا نمبر اس بری نیت سے مانگا ہے تو میں کبھی نہیں دیتا اور تُو اتنا آگے نکل گیا، مجھے اب بتا رہا ہے؟'' نعمان...... زوہیب کو گلے سے لگائے بولے چلے جا رہا تھا مگر وہ خاموشی سے بند آنکھیں کیے اپنے آنسو جذب کر رہا تھا۔

O......O......O

''کیوں شادی نہیں کر رہے تم مجھ سے؟'' فرحانہ زور سے چیخی تھی۔

''کیوں کہ تم شادی شدہ ہو؟'' زوہیب نے ضبط کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا تھا۔

''وہ......وہ......وہ......شادی ختم ہو چکی ہے......'' فرحانہ حقیقتاً ٹپٹا گئی تھی۔

''تم نے مجھ سے جھوٹ کیوں بولا فرحانہ......؟ میں تم سے سچی محبت کرتا تھا؟'' زوہیب رندھی آواز میں بول رہا تھا۔ ''مگر اب تمہارے اور میرے راستے الگ ہیں، اب تمہارا مجھ سے کوئی تعلق نہیں......'' زوہیب نے حتمی فیصلہ سنایا تھا۔

''اوہ......اگر تم نے ایسا کیا تو میں سب کو، خاص کر تمہارے گھر والوں کو بتا دوں گی کہ تم میرے ساتھ زیادتی کرتے رہے ہو......'' فرحانہ نے اپنے اندر کا زہر اگلا تھا۔

''اس کی ذمہ دار تم خود ہو......'' زوہیب چیخا تھا۔

''تم بچے نہیں ہو زوہیب......! اور تم جانتے ہو، میں ایسا کر بھی سکتی ہوں۔''

''تم چاہتی کیا ہو؟''

''تم میری خاموشی کی قیمت پانچ ہزار روپے ماہوار مجھے دو گے اور......''

''کیا......؟ پانچ ہزار روپے ہر مہینے......؟ تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا؟ تم مجھے بلیک میل کر رہی ہو......'' زوہیب......فرحانہ کی بات کاٹتے ہوئے غصے سے چیخا تھا۔

''ہاں......یہی سمجھ لو، دیتے ہو تو ٹھیک ورنہ میں کل ہی تمہارے گھر پہنچ رہی ہوں......'' فرحانہ کی دھمکی کارآمد ثابت ہوئی اور زوہیب ہر مہینے پانچ ہزار روپے فرحانہ کو دینے پر رضامند ہو گیا۔

O......O......O

مارچ کا مہینہ تیزی سے اپنے دامن میں دنوں کو سمیٹ رہا تھا کہ ایک شام سرجانی ٹاؤن تھانے کی حدود میں زیرِ تعمیر کالج کے سامنے بوری بند لاش ملی جو مقتولہ فرحانہ کی تھی اور پھر پولیس نے اس قتل کا معمہ فرحانہ کے موبائل فون پر آنے والی کال ٹریس کر کے حل کر لیا تھا۔

فرحانہ ایک عرصے تک زوہیب کو بلیک میل کرتی رہی تھی اور وہ اسے پانچ ہزار روپے ماہانہ ادا کرتا راہ تھا۔ اسی دوران زوہیب کی شادی ہو گئی تھی۔ شادی کے بعد فرحانہ نے

زوہیب کو دھمکی دی تھی کہ اگر اس نے اسے دی جانے والی رقم میں اضافہ نہیں کیا تو وہ اس کی بیوی کو جا کر بتا دے گی کہ زوہیب میرا آشنا ہے اور مجھ سے ناجائز تعلق استوار کر رکھا ہے۔ اس کے بعد زوہیب نے اسے آٹھ ہزار روپے ماہانہ دینا شروع کر دیے تھے لیکن اب تقریباً ایک ہفتے قبل فرحانہ نے زوہیب کو فون کر کے کہا تھا کہ اسے ہیپاٹائٹس سی ہو گیا ہے اور علاج کے لیے ہر ماہ دس ہزار کی ضرورت ہو گی۔ زوہیب...... فرحانہ کا یہ نیا مطلوبہ سن کر چراغ پا ہو گیا تھا، اس نے ایک منصوبے کے تحت جس میں نعمان بھی شامل تھا، فرحانہ کو خیسو گوٹھ بلایا تھا جہاں ایک گھر میں دونوں نے فرحانہ کو زیادتی کا نشانہ بنا کر پہلے اس کے گلے میں تار سے پھندہ لگایا تو وہ بے ہوش ہو گئی اور پھر دوپٹے کی مدد سے اس کے گلے میں پھندہ لگایا جس سے وہ فوراً ہی ہلاک ہو گئی، اس کے بعد دونوں نے مل کر فرحانہ کو بوری میں بند کیا اور سرجانی تھانے کی حدود میں پھینک دیا۔

''پولیس...... فرحانہ کے موبائل فون پر کال ٹریس اور ڈیٹا کی مدد سے دونوں ملزمان نعمان اور زوہیب کو گرفتار کر چکی ہے۔

O......O......O

نعمان اور زوہیب کی زندگیاں برباد ہو چکی ہیں جبکہ فرحانہ اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھی ہے۔ اس سارے قصے میں قصور کس کا کتنا ہے؟

فرحانہ کے شوہر منیر احمد کا...... جو اسے یہاں اکیلا چھوڑ کر ڈھاکہ میں رہائش پذیر ہے؟ مہنگائی کا...... جس سے تنگ آ کر فرحانہ ایسے معاملات اور مطالبات پر مجبور ہو گئی اور زوہیب کو پیسے کمانے کا ذریعہ بنایا؟ موبائل پیکیج سسٹم کا...... جو فاصلوں کو مٹاتا، پل پل کی خبریں دینے پر مصروف ہے یا پھر حالات کا؟ ہمارے ملک میں روز بروز ایسے واقعات اور حادثات بڑھتے جا رہے جو باعث فکر ہے۔

☆......☆......☆

وہ مر چکا تھا

ثناء تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی آفس میں داخل ہوئی اور کرسی پر ڈھے گئی۔

''سب خیریت تو ہے نا؟'' پرنسپل نے اس کی غیر ہوتی حالت کو نوٹ کرتے ہوئے پوچھا۔

''مجھے ایک گلاس پانی مل جائے گا؟'' اس کی سانس پھولی ہوئی تھی۔

''ہاں...... میں ماسی سے کہتی ہوں۔'' پرنسپل نے بیل پر ہاتھ رکھا۔ ماسی آ چکی تھی۔ پرنسپل اسے ہدایات دے رہی تھیں اور ساتھ پانی لانے کا بھی کہہ چکی تھیں مگر ثناء کی حالت مستقل بدتر ہوتی جا رہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے اور سوچ کے رستے اس اجنبی کی کھوج میں جتلا تھے جو سارے راستے اس کا پیچھا کرتا رہا۔ ''کون ہو سکتا ہے وہ......؟'' آنکھوں میں آئے آنسوؤں کو صاف کرتے ہوئے وہ خود سے ہم کلام تھی۔

''مس ثناء......! پانی......'' ماسی نے اس کی جانب گلاس بڑھایا تو وہ اپنے خیالات سے باہر آ گئی۔

''ثناء......! سب خیریت تو ہے ناں، کوئی پریشانی ہے؟'' پرنسپل محبت اور خلوص بھرے لہجے میں اس سے دریافت کر رہی تھیں۔

''جی میڈم...... سب ٹھیک ہے، بس یونہی مجھے امید یاد آ گئیں، آج ان کی برسی ہے۔'' بے اختیار ثناء کی آنکھوں میں آنسو دوبارہ بھر آئے۔ وہ گلاس ماسی کو لوٹاتی اب کھڑی ہو چکی

تھی۔

''اوہ...... آئی ایم سوری، تم آج چھٹی کر لیتیں؟'' پرنسپل آہستگی سے بولیں۔

''نہیں...... اب میں ٹھیک ہوں۔'' وہ زبردستی کی مسکراہٹ چہرے پر سجاتے ہوئے بولی۔

''آج پیریڈ نہیں لو...... تم آرام کر لو، میں تمہاری جگہ کسی اور ٹیچر کو بھیج دیتی ہوں۔'' پرنسپل ازراہِ ہمدردی بولیں۔

''نہیں میڈم...... آئی ایم فائن...... میں چلتی ہوں۔'' وہ پرنسپل سے جھوٹ بولتی ہوئی آفس سے نکل آئی مگر سچ تو یہ تھا کہ آج اس کے ساتھ جو حادثہ پیش آیا تھا، اس کے بعد اسے اپنی ماں کی کمی شدت سے محسوس ہو رہی تھی۔ اس کی دو بڑی بہنیں اپنی اپنی دنیا میں مگن رہتیں مگر اس کی ہمیشہ یہ کوشش ہوتی کہ وہ اپنے پاپا کا بیٹا ہے، ان کو کبھی یہ خیال نہیں آئے کہ ان کا کوئی بیٹا نہیں ہے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اس پرائیویٹ اسکول میں ٹیچنگ کر رہی تھی کہ آج جب معمول کے مطابق وہ گھر سے نکلی تو ایک موٹر بائیک مستقل اس کی کار کا پیچھا کرتی رہی۔ اس پر سوار نوجوان پستہ قد، گہرے سانولے رنگ کا تھا، اس کی آنکھوں میں پراسراریت تھی جو شناہ کو خوف زدہ کر رہی تھی اور اب یہ سوچ سوچ کر اس کی جان نکل رہی تھی کہ وہ شخص اس کا پیچھا کرتے اس کے اسکول تک پہنچ گیا ہے۔

''اب کیا ہوگا...... کہیں وہ مجھے تنگ تو نہیں کرے گا؟ ایسے تو میرا روز اسکول آنا محال ہو جائے گا اور اگر یہ بات میں گھر میں سب کو بتاتی ہوں تو پھر میرا جاب کرنا مشکل ہو جائے گا۔'' اس کی خود ساختہ سوچوں کے ساتھ ڈر کا احساس بڑھتا جا رہا تھا۔ اس وقت خود کو اس کیفیت سے نکالنا اس کے لیے مشکل ترین امر تھا اور پھر زبردستی وہ خود کو کلاس روم کے ماحول میں ایڈجسٹ کرنے لگی۔

O......O......O

وہ سو رہی تھی کہ کسی نے اسے جگایا، اس نے نیم وا آنکھوں سے دیکھا، اندھیرے کی دبیز تہوں سے ایک ہیولہ ابھرا۔ اس سے پہلے کہ شناہ کسی خوف اور اچنبھے کا اظہار کرتی، اس

ہیولے نے ثناء کو چپ چاپ رہنے اور اپنے پیچھے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ ثناء سہمی سی بستر پر بیٹھ گئی۔ وہ ہیولہ قدرے دور جا کر کھڑا ہو گیا۔ اس کی لال بھبھوکا آنکھیں ثناء کے چہرے پر گڑی ہوئی تھیں۔ وہ کبھی ہاتھ کے اشارے سے ثنا کو بلاتا تو کبھی اس کے ہونٹوں کی جنبش ثناء کو اکساتی کہ وہ اس کے پیچھے آ جائے۔

''جاؤ...... چلے جاؤ یہاں سے، مت کرو میرا پیچھا، کون ہو تم اور کیا چاہتے ہو؟'' اس دوران میں وہ قریب ٹیبل پر رکھا پانی کا گلاس اسے کھینچ کر مار چکی تھی اور زور زور سے چلا رہی تھی۔

''کیا ہوا ہے تمہیں؟'' ثناء کی پسینے سے آلود پیشانی اور اس کو سوتے میں بڑبڑاتا دیکھ کر عروج اس کی جانب بڑھی اور تیزی سے اس کا کاندھا جھنجھوڑ دیا تو وہ ہڑبڑا کر اٹھ گئی۔

''کوئی بہت برا خواب دیکھ رہی تھیں ناں تم......؟'' ثناء کی بڑی بہن عروج نے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں آپی......! بہت برا خواب تھا لیکن شکر ہے کہ وہ خواب ہی تھا......'' ثناء نے سائیڈ ٹیبل پر رکھا پانی کا گلاس دیکھا اور اطمینان کا سانس لیتے ہوئے گلاس لبوں سے لگا لیا۔

''چلو کوئی بات نہیں، اب تم اٹھ گئی ہو تو سونا نہیں، کچھ دیر میں نماز کا ٹائم بھی ہونے والا ہے۔ اب اگر سو گئیں تو نماز قضا ہونی ہی ہے، ساتھ اسکول کے لیے بھی لیٹ ہو جاؤ گی۔'' عروج اس کو سمجھاتے ہوئے واپس اپنے بستر پر آ گئی مگر ثناء کو اب نیند کہاں آتی، گزشتہ روز پیش آنے والا واقعہ اس کے اعصاب پر سوار تھا جس کے باعث وہ خواب میں بھی یہی سب کچھ دیکھ رہی تھی۔

O......O......O

یہ پہلوان گوٹھ کا قدرے ایک سنسان راستہ تھا۔ ابھی ثناء کی کار موڑ کاٹتے ہوئے مین روڈ پر آئی تھی کہ سامنے جھاڑیوں کے جھنڈ سے اچانک ہی وہ بائیک سوار نوجوان نمودار ہو گیا۔

''کیسی ہو میری لال پری......؟'' بائیک کو ریس دیتا ہوا وہ ثناء کی کار کے قدرے قریب آ چکا تھا اور نہایت اوچھے لہجے میں پوچھ رہا تھا۔

"اپنی بکواس بند کرو اور دفع ہو جاؤ یہاں سے......" ثناء نے نخوت سے اس کے سراپے پر ایک نظر ڈالی اور کار کی اسپیڈ بڑھا دی۔

"سنو...... تم پر اتنا غصہ اچھا نہیں لگتا، کم از کم اپنا نمبر تو دے دو۔" اس کی آواز قدرے تیز تھی اور باچھیں کھلی ہوئی تھیں۔

"مت تنگ کرو مجھے، اپنی شکل دیکھی ہے تم نے؟" ثناء نے اس کی خوفناک آنکھوں کو ایک نظر دیکھا۔ اگلے ہی پل اس کے سراپے پر ایک جھرجھری سی طاری ہو گئی۔

"شکل مت دیکھو، دل دیکھو میرا۔" اب وہ بائیک انتہائی قریب لا چکا تھا۔ اس سے پہلے کہ بائیک اور کار کا آپس میں تصادم ہوتا، ثناء نے کار کو بریک لگائے اور یوٹرن سے گاڑی دوسرے راستے کی جانب موڑ دی۔ اس وقت خود پر کنٹرول رکھنا اور اس کے بعد کار کو کنٹرول کرنا اس کے لیے کافی مشکل تھا مگر وہ اپنے حواس پر قابو پاتی ہوئی بالآخر اسکول پہنچ ہی گئی۔

O......O......O

وہ رات بھی ثناء نے بہت کرب میں گزاری تھی اور علی الصبح جب گہری دھند کے پیچھے سے سورج نے آنکھیں میچ کر جھانکا تو اس کی بجھی آنکھوں میں گیلی روشنی ٹمٹما رہی تھی۔ وہ جانتی تھی، کچھ دیر بعد وہ گھر سے اسکول کے لیے نکلے گی اور پھر وہ دو خوفناک آنکھیں اس کے تعاقب میں ہوں گی اور وہ ہراساں سی پورا دن اسی ڈر وخوف کے عالم میں گزارے گی۔

"چلو ثناء......! جلدی کرو ورنہ پھر لیٹ ہو جاؤ گی۔" عروج کھڑکی سے پردے ہٹاتی ہوئی کہہ رہی تھی مگر وہ تو جیسے سننے اور سمجھنے کی صلاحیت سے محروم ہو چکی تھی۔ عروج جا چکی تھی مگر اسے یوں لگا، کھڑکی سے جھانکتی وہ دو آنکھیں اسے ہی دیکھ رہی ہیں۔ ثناء نے گھبرا کر پردے برابر کیے اور بھاگتے ہوئے واش روم میں آ گئی۔ وہ نل کھولتی پانی کے چھینٹے اپنے چہرے پر ڈال رہی تھی۔ اس کے حواس گم ہو چکے تھے اور پھر جونہی ثناء کی نظر آئینے پر گئی، اس کی چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی، آئینے کی سطح پر وہی دو لال آنکھیں اسے گھور رہی تھیں۔ ثناء برق رفتاری سے دروازہ کھولتی اپنے بستر پر آ گئی۔ وہ تھر تھر کانپ رہی تھی۔ ان آنکھوں کی دہشت کے باوجود سنسناہٹ دوڑا چکی تھی پھر اچانک ہی اس کے کمرے کی دہلیز پار کرتا ہوا ایک

ہیولہ اس کے انتہائی قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے چہرے پر وہی آنکھیں تھیں جن سے آگ کی لپٹیں نکل رہی تھیں۔ ثناء اسے زاویہ بدل بدل کر دیکھ رہی تھی مگر اس چہرے کی ہیئت کذائی میں کوئی فرق نہیں آیا۔

''چلے جاؤ یہاں سے......'' وہ ساری ہمت مجتمع کر کے چلائی۔

''ثناء......! کیا ہوا ہے تمہیں؟'' اس کے والد اس کا ہاتھ تھامے حیرت سے سوال کر رہے تھے اور وہ پھٹی نظروں سے انہیں گھور رہی تھی۔

''ارے...... تمہیں تو بہت تیز بخار ہو رہا ہے۔ چلو شاباش...... لیٹو تم۔'' وہ ثناء کی تپتی پیشانی پر ہاتھ رکھے کہہ رہے تھے۔ ''میں ابھی تھرمامیٹر لے کر آتا ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ تیزی سے کمرے سے نکل گئے جب کہ ثناء کے وجود پر ایک عجیب کیفیت طاری تھی۔ نقاہت کا احساس بڑھ گیا تھا جیسے کسی نے اس کی رگوں سے لہو نچوڑ لیا ہو۔

O......O......O

ثناء پورے ایک ہفتے بعد ڈر کے خول سے باہر آئی تھی۔ اس نے سوچ لیا تھا، اب اگر وہ شخص اس کا پیچھا کرے گا تو وہ ڈر کے نہیں بھاگے گی بلکہ پوری ہمت اور دلیری سے اس کا سامنا کرے گی، سو اس نے جیسے ہی پہلوان گوٹھ کے راستے پر اپنی گاڑی کی ریس بڑھائی، ٹھیک اسی وقت اس کے سامنے وہی شخص اپنی بائیک پر نمودار ہوا مگر آج وہ اکیلا نہیں تھا بلکہ اس کے ساتھ ایک اور شخص اس کے پیچھے بیٹھا ہوا تھا۔ بائیک تیزی سے ثناء کی کار کے سامنے رکی جس کے باعث ثناء نے کار کو بریک لگائے تھے۔

''بھائی...... اس نے پورے ہفتے انتظار کروایا ہے، اس کو اس کی سزا دینی چاہیے۔'' یہ اجنبی شخص تھا جسے ثناء پہلی بار دیکھ رہی تھی۔

''نہیں یار...... ابھی یہ اپنا نمبر خود دے گی، اس کو اندازہ ہے میری بے تابی کا۔'' وہی اسرار بھری آنکھیں، مکروہ چہرہ اور لبوں کی جنبش......

''تم دونوں اپنی منحوس شکل لے کر یہاں سے دفع ہو جاؤ...... تمہیں نمبر دینا تو دور کی بات، اب اگر آئندہ اس راستے پر نظر آئے تو میں تمہاری کمپلین پولیس سے کر دوں گی۔'' ثناء

نے انتہائی سخت لہجے میں تنبیہ کی۔

''بھائی...... اس کی اتنی جرأت، اس کو کیوں نا اغوا کر لیا جائے؟'' فرنچ داڑھی والا شخص طیش کے عالم میں آگے بڑھا۔

''ہاں...... یہ صحیح ہے، یہ سالی ایسے نہیں مانے گی......'' دوسرا بھی آگے بڑھا مگر ثناء نے برق رفتاری سے گاڑی ریورس کی اور تیزی سے دوسرے راستے پر ڈال دی۔ ان دونوں کو بائیک پر سوار ہونے اور اس کا پیچھا کرنے میں جتنا وقت درکار تھا، اتنی دیر میں ثناء مختلف راستوں سے ہوتی گاڑی کا رخ واپس گھر کی طرف کر چکی تھی۔

O......O......O

''اف...... مجھے اغوا کرنے کی کوشش...... یہ سوچ کر ثناء کا غصے کے مارے برا حال تھا۔

''اس کی اتنی ہمت ہوگئی ہے کہ اب وہ اپنے دوست کے ساتھ مل کر مجھے اغوا کرنا چاہتا ہے؟ اس طرح میرا تو گھر سے نکلنا ہی مشکل ہو جائے گا۔ کیوں ناں...... میں پولیس اسٹیشن میں اس کی کمپلین لکھوا دوں؟'' اور پھر وہ اپنی سوچوں کو عملی جامہ پہناتی گلستان جوہر تھانے کا نمبر ملا چکی تھی۔

سب انسپکٹر عادل جو عرصہ دراز تک شارع فیصل تھانے میں انویسٹی گیشن افسر متعین رہ چکے تھے، وہ ان دنوں گلستان جوہر میں اپنے فرائض انجام دے رہے تھے۔ ثناء کی بات سن کر ان کی حیرت کا ٹھکانہ نہیں رہا تھا۔ ثناء جس شخص کے بارے میں ان کو بتا رہی تھی، وہ شخص ان کے ریکارڈ کے مطابق مر چکا تھا۔

''تمہیں جس شخص نے اغوا کرنے کی کوشش کی تھی، کیا واقعی اس کا حلیہ یہی ہے؟'' انہوں نے ایک بار پھر ثناء سے سوال کیا۔

''انسپکٹر صاحب! میں آپ سے مذاق نہیں کر رہی۔ یہاں میری جان پہ بنی ہے اور آپ بجائے اس غنڈے کو گرفتار کرنے کے، مجھ سے سوال پر سوال کر رہے ہیں؟ اگر کل میرے گھر والے میرے اغوا کی رپورٹ آپ کے پاس لکھوانے آئیں تو شاید تب آپ کو میری بات پہ یقین آ جائے گا۔'' ثناء غصے سے کہتی لائن کاٹ چکی تھی۔

''عجیب بات ہے، یہ لڑکی جس شخص کے بارے میں بتا رہی ہے، وہ تو پولیس ریکارڈ کے مطابق ڈیڑھ سال قبل قتل ہو چکا ہے۔ اس کا نام ساجد خان تھا اور وہ گلستان جوہر کا رہائشی اور بھتہ گروپ کا کارندہ تھا۔ اسی الجھن میں سب انسپکٹر عادل، ثناء کا نمبر ملا چکے تھے۔

''مسنوبی بی...... جو شخص تمہارا تعاقب کر رہا ہے، تمہیں دھمکا رہا ہے اور آج اس نے اغوا کرنے کی کوشش بھی کی ہے، وہ حقیقت میں مر چکا ہے اور میرے پاس اس کی موت کے واضح ثبوت بھی موجود ہیں۔''

''تو کیا یہ اس کا بھوت ہے جو مجھے پریشان کر رہا ہے اتنے دنوں سے؟'' ثناء کے لہجے میں تشویش تھی۔

''بی بی...... میں نے ایسا کب کہا؟ ہو سکتا ہے، کوئی اس کا ہم شکل ہو؟''

''اس کا ہم شکل ہے یا اس کا بھوت لیکن وہ جو کوئی بھی ہے، اس نے میری زندگی کو اجیرن بنایا ہوا ہے۔ اگر آپ کچھ نہیں کر سکتے تو میں اب خود ہی اس سے نمٹ لوں گی۔'' ثناء ایک بار پھر لائن کاٹ چکی تھی۔

''کہیں وہ حقیقت میں کوئی بھوت تو نہیں؟ لیکن نہیں، وہ کوئی بھوت نہیں ہو سکتا۔ آج اس کے ساتھ اس کا دوست بھی تو تھا مگر اس کی پراسرار آنکھیں...... اور پھر وہ کیوں مجھے اپنے اردگرد محسوس ہوتا ہے جیسے وہ کہیں میرے قریب ہی ہو؟ کہیں یہ میرا وہم تو نہیں ہے یا پھر خوف کی علامت؟ جبھی وہ میرے اعصاب پر سوار رہتا ہے ہر وقت...... لیکن سب انسپکٹر کی بتائی گئی بات کسی حد تک باعثِ تشویش بھی تو ہے۔''

O......O......O

سب انسپکٹر عادل ابھی اپنی سیٹ پر بیٹھے ہی تھے کہ ڈیوٹی انسپکٹر نے اطلاع دی۔ پہلوان گوٹھ کی ایک پرائیویٹ اسکول ٹیچر ثناء اپنی آلٹو کار میں اسکول سے گھر جا رہی تھی کہ اسے فائرنگ کر کے قتل کر دیا گیا ہے۔

''کیا ثناء کا قتل ہو گیا ہے؟'' سب انسپکٹر کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔ وہ برق رفتاری سے سیٹ چھوڑ کر کھڑے ہو گئے تھے۔

''ملزم بہت شاطر اور چالاک تھا کیوں کہ قتل کرنے کی کوئی اصلی وجہ سامنے نہیں آ رہی تھیں۔ ثناء کا موبائل، پرس میں پچیس ہزار روپے اور اس کی کار جوں کی توں تھی مگر اسے کس بنا پر قتل کیا گیا ہوگا، کہیں کوئی محبت وجت کا چکر تو نہیں؟'' ڈیوٹی آفیسر اپنے تئیں وجوہات بیان کر رہا تھا۔

''چلو میرے ساتھ، تفتیش شروع کرتے ہیں، یقیناً ثناء کو آج پھر اغوا کرنے کی کوشش کی گئی ہوگی اور دوران مزاحمت اسے گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا، آہ......'' سب انسپکٹر عادل نے تاسف کے انداز میں اپنی گردن ہلائی۔

''لیکن میرے لیے پریشان کن بات یہ ہے کہ ثناء نے دو روز قبل جس شخص کا حلیہ مجھے بتایا ہے، وہ پولیس ریکارڈ کے مطابق مر چکا ہے اور اس جیسی شکل وصورت اور جسامت کا ملزم و قاتل میری انویسٹی گیشن کے مطابق کوئی نہیں ہے۔'' سب انسپکٹر عادل اپنی رو میں بول رہے تھے۔

''سر...... آپ کس ملزم کی بات کر رہے ہیں؟'' ڈیوٹی انسپکٹر نے مداخلت کی۔

''ساجد خان کی......'' سب انسپکٹر عادل کی نظریں خلا میں کسی غیر مرئی نقطے پر مرکوز تھیں اور وہ پُرسوچ انداز میں کہہ رہے تھے۔ ''اس بات کو تو تقریباً ڈیڑھ سال گزر چکا ہے، کہیں ایسا تو نہیں...... ساجد خان کی روح بھٹک رہی ہو؟'' ڈیوٹی انسپکٹر قدرے محتاط انداز میں گویا ہوا۔

''ارے...... ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ ایک روح کیوں کسی لڑکی کا قتل کرے گی؟'' سب انسپکٹر عادل نے اسے گھورا۔

''سر...... میں نے سنا ہے، ایسے افراد جو بے گناہ لوگوں کو قتل کر دیتے ہیں، ان کی روحیں بھٹکا کرتی ہیں۔''

''اپنی قیاس آرائی بند کرو اور مجھے یہ کیس دیکھنے دو۔'' سب انسپکٹر عادل بولے۔ دونوں اپنی اپنی باتوں میں محو واردات کی جگہ پر پہنچ چکے تھے۔ ثناء کی کار پولیس اسٹیشن پہنچائی جا رہی تھی جب کہ ثناء کے پرس کی تلاشی کے بعد اس کے ورثاء کو اطلاع دی جا چکی تھی۔

O......O......O

ابھی ثناء کے کیس کی گتھیاں مکمل طور پر سلجھی نہیں تھیں کہ گلستان جوہر سے ہی تین کال گرلز کے اغوا کی خبر سب انسپکٹر عادل کو ملی اور پھر دورانِ تفتیش ہی دو کال گرلز ایک لاکھ روپے تاوان کے عوض بازیاب ہوگئیں جبکہ تیسری کو تاوان نہ ملنے کی وجہ سے قتل کر دیا گیا۔ ملزم کا سراغ لگانے کی غرض سے جب ان دو کال گرلز کا بیان ریکارڈ کیا گیا تو سب انسپکٹر حیرت کے سمندر میں غوطے کھانے لگے کیوں کہ دونوں بھی ملزم کا وہی حلیہ بیان کر رہی تھیں جو ثناء نے بتایا تھا۔

''یاالٰہی......! یہ کیا ماجرا ہے؟ کیا واقعی ساجد خان کی روح بھٹک رہی ہے یا پھر کوئی اس کے بھیس میں قتل و غارت گری کا بازار گرم کر رہا ہے؟'' اسی دوران وزیر اعلیٰ سندھ کے پائلٹ کو فائرنگ کر کے قتل کر دیا گیا۔ عینی شاہدین کے مطابق قتل کرنے والا ملزم اور کوئی نہیں، ساجد خان ہی تھا اور پھر کچھ کے بعد دیگر دو لڑکوں اسد اور اجمل کے قتل کی بھی اطلاع موصول ہوئی۔ قتل کرنے والا انتہائی سفاکی سے قتل کرنے کے بعد نجانے کہاں غائب ہو رہا تھا؟

گلستان جوہر کے رہائشیوں کے لیے ان کا علاقہ شہرِ آسیب بن چکا تھا۔ ان کے مطابق ساجد کی روح بھٹک رہی ہے جبھی وہ بیک وقت مختلف جگہوں پر نظر آتا ہے۔ آسانی سے لوگوں کا قتلِ عام کرتا ہے اور پھر غائب ہو جاتا ہے کیوں پولیس اور سیکورٹی کے ادارے اب اتنے کمزور بھی نہیں کہ ایک مطلوب دہشت گرد کو پکڑ نہیں سکیں، یہ یقیناً کسی روح کا کام ہے اور یہ روح ساجد خان کی تھی......!!

O......O......O

کراچی پولیس کے سینئر تفتیشی افسر ڈی ایس پی قمر اور ان کی ٹیم کے سب انسپکٹر عادل کے لیے یہ شخص معمہ بن چکا تھا۔ ایک باقاعدہ تفصیلی میٹنگ کے بعد سب انسپکٹر عادل نے ایدھی قبرستان کا دورہ کیا جہاں انہیں ساجد خان کی قبر مل گئی۔ نادرا سے جاری ہونے والا ساجد خان کا ڈیتھ سرٹیفکیٹ بھی ان کے اوسان خطا کیے دے رہا تھا جب کہ علاقے کے لوگ ساجد خان کی بھٹکتی روح سے بچنے کے لیے مختلف علماء سے رجوع کر رہے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ وظیفے اور خود کو دعاؤں کے حصار میں لے کر نکلنے سے ساجد خان کی روح ان کو کوئی نقصان

نہیں پہنچائے گی۔

کراچی قائد آباد منزل پیٹرول پمپ کے قریب 16 راگست کو دو دوستوں میں جھگڑا ہو رہا تھا۔ تلخ کلامی کے باعث دونوں نے ایک دوسرے پر پستول تان لی۔ شومئی قسمت، اسی دوران پولیس کی موبائل کا گزر وہیں سے ہوا، پولیس اہلکاروں نے دونوں کو حراست میں لے کر پوچھ گچھ کی تو معلوم ہوا کہ ان میں سے ایک ملزم رستم گلستان جوہر کا رہائشی اور بھتہ گروپ کا کارندہ ہے۔ اسپیشل انویسٹی گیشن سیل میں جب ملزم رستم کو منتقل کیا گیا تو پولیس افسران کی حیرت کا ٹھکانہ نہیں رہا کیوں کہ رستم...... ساجد خان تھا۔ وہ مرا نہیں تھا بلکہ اس نے مرنے کا ڈھونگ رچایا تھا حالاں کہ یہ بات تصدیق شدہ تھی کہ ساجد خان کی نعش 16 رجنوری 2011ء کو پاک کالونی کے علاقے سے ملی تھی۔ اس کی تدفین بھی ہو چکی تھی اور اس کی قبر بھی موجود تھی۔ اس کے گھر والوں نے اس کا سوئم اور چہلم بھی کیا پھر مردہ ساجد خان کیسے زندہ ہو گیا؟ پولیس ریکارڈ میں ساجد خان کے ڈیتھ سرٹیفکیٹ، پوسٹ مارٹم رپورٹ اور اس کے قتل کی ایف آئی آر بھی موجود تھی۔

اور پھر سب انسپکٹر عادل کی اسپیشل انویسٹی گیشن میں بالآخر ساجد خان نے چپ کا قفل توڑ دیا تھا۔ ساجد خان نے بتایا تھا کہ میں تین بچوں کا باپ ہوں۔ خود کو جرائم کی دنیا سے نکالنے کے لیے میں نے اپنے کزن خرم کا سہارا لیا، خرم نے مجھ سے کہا کہ میں ایسا کام کروں گا کہ تُو زندہ رہے گا لیکن کاغذوں پر تیری موت ہو جائے گی، پس خرم نے 2010ء میں نیو جوبلی انشورنس سے میری انشورنس کروائی اور بیمے کی رقم ایک لاکھ 45 ہزار روپے بھی ادا کی، اس پالیسی کے مطابق اگر میری موت طبعی ہوئی تو میرے ورثاء کو 70 لاکھ روپے اور اگر میری موت غیر طبعی ہوئی تو میرے اہل خانہ کو ایک کروڑ 5 لاکھ روپے ملنے تھے۔ میں نے بیمہ پالیسی پر دستخط کر دیئے اور پھر ہم نے لاوارث نعش کی تلاش شروع کر دی جو ہمیں ایدھی سینٹر سے باآسانی مل گئی۔ اس کے بعد باقاعدہ ایک منصوبے کے تحت اس لاش کی تدفین ہوئی بلکہ اس قبر پر اپنے نام یعنی ساجد خان کے نام کی سنگ مرمر کی تختی میں نے خود ہی نصب کی۔ یوں میں اپنے گروپ کے لوگوں کے لیے مر گیا...... میں نے کچھ عرصہ لاہور میں سکونت اختیار

کی اور پھر ایک نئے نام رستم کے ساتھ دوبارہ کراچی کے محلہ گلستان جوہر آ گیا مگر میری بدقسمتی کہ میں پکڑا گیا اور یوں بیمہ کی ایک کروڑ روپے کی رقم کی وصولی کے لیے میں نے جو ڈرامہ رچایا، جو کلیم داخل کیا تھا، افسوس...... وہ سب دھرا کا دھرا رہ گیا۔

O......O......O

ساجد خان کی زندہ روح اس وقت عدالتی ریمانڈ پر کراچی سینٹرل جیل کے زیر سماعت قیدیوں کے بیرک میں انتہائی بے چین اور پریشان کن صورت حال سے دوچار ہے۔ اس کے ساتھ موجود درجنوں قیدی ساجد خان سے تنگ آ چکے ہیں۔ یہ رات کو چیخ مار کر بیٹھ جاتا ہے۔ کہتا ہے، میری روح مجھے سونے نہیں دیتی، میں کبھی ان اپارٹمنٹس کو دیکھتا ہوں جہاں میں کھڑے ہو کر فائرنگ کرتا تھا اور بے قصور لوگوں کو بڑے ہی آرام سے مار دیا کرتا تھا۔ مجھے کبھی وہ پل نظر آتا ہے جہاں میں نے ایک نوجوان کو گولی مار کر اس سے گاڑی چھینی تھی، مجھے اس بلڈر کی روح بھی بے چین کرتی ہے جس سے بھتے کی رقم نہ ملنے پر میں نے اسے موت کے گھاٹ اتار دیا اور میرا سکون اس وقت برباد ہو جاتا ہے جب میرے خیالوں میں ثناء کا چہرہ گھوم جاتا ہے۔ میں نے کتنی بے دردی سے اس کے دماغ میں گولیاں اتاری تھیں، صرف اس وجہ سے کہ وہ مجھ سے دوستی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ یقیناً آج میرے ہاتھوں مرنے والے درجنوں افراد کی روحیں میرے تعاقب میں ہیں۔ آج نہ میری روح میرے قابو میں ہے اور نہ میں اس کو بے چین روح کو مطمئن کر سکتا ہوں۔ جانے کیوں مجھے ایسا لگتا ہے کہ زندگی بھر میں بھٹکتا رہا، اب تا قیامت میری روح بھٹکتی رہے گی۔

☆......☆......☆

شک کا بیج

''تم اب تک جاگ رہی ہو؟'' موبائل پر سنائی دیتی ثناء اللہ کی آواز میں حیرت تھی۔
''ہاں...... تمہاری کال کا انتظار جو کر رہی تھی۔'' صغریٰ نے نہایت ہی شوخ لہجے میں کہا۔
''مجھے امید نہیں تھی کہ تم اتنی شدت سے میری کال کا انتظار کروگی؟'' ثناء اللہ نے یہ بات کچھ ایسے لہجے میں کی تھی جیسے کچھ کھوجنا چاہ رہا ہو۔
''میرا دل تو پہلے ہی تمہارا متمنی تھا، تم نے اپنا موبائل نمبر دے کر تو اسے مکمل گھائل ہی کر دیا۔'' صغریٰ شوخی سے ہنستے ہوئے بولی۔
''اوہو...... بہت ہوئی شوخیاں، مجھے اب زیادہ بناؤ نہیں۔'' ثناء اللہ نے خاصے خشک لہجے میں کہا۔
''میں تو بالکل سچ کہہ رہی ہوں، اب اگر تمہیں میری بات جھوٹ لگتی ہے تو اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔'' صغریٰ نے ثناء اللہ کے لہجے اور بات کا برا منائے بغیر کہا۔
''اس وقت رات کے تین بج رہے ہیں، تمہیں سو جانا چاہیے، صبح وقت پر آنکھ نہیں کھلی تو اپنی جاب کے لیے لیٹ ہو جاؤ گی۔'' ثناء اللہ کے لہجے میں اس بار محبت رچی ہوئی تھی۔
''میں جب سے تمہیں ملی ہوں اور تم سے باتیں شروع ہوئی ہیں، جانے کیوں مجھ سے نیند روٹھ چکی ہے؟ ایک عجیب سے احساس سے دوچار ہوں، پوری رات نیند کی خواہش میں

ہی گزر جاتی ہے۔" صغریٰ نے آہستگی سے کہا۔

"اوہ ہو...... کیا بات ہے؟ کہیں تمہیں پیار تو نہیں ہو گیا اور وہ بھی فرصت سے؟" ثناء اللہ نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

"فرصت سے...... کیا مطلب؟"

"ارے بے وقوف...... "دل والے" فلم کا ڈائیلاگ ہے۔" ثناء اللہ نے مذاق اڑانے والے انداز میں کہا۔

"اوہ اچھا...... اصل میں مجھے فلم سے کبھی دلچسپی نہیں رہی اس لیے۔"

"تو پھر تمہاری دلچسپی کا سامان کیا ہے؟" ثناء اللہ نے صغریٰ کی بات کاٹتے ہوئے استہزائیہ لہجے میں سوال کیا۔

"میری دلچسپی کا سامان تم ہو ناں۔" صغریٰ نے بہت پیار سے کہا۔

"اور مجھ سے پہلے کون تھا؟" ثناء اللہ جیسے اپنی رو میں بولتا چلا گیا۔

"مطلب کیا ہے تمہارا؟" صغریٰ کی آواز میں جیسے کرنٹ دوڑ گیا۔

"وہی جو تم نے سنا۔" ثناء اللہ نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"کیا......؟" صغریٰ چیخی۔

"ارے یار...... وہی جو تم نے سنا، کیا میں یہ بات پھر کہوں؟"

"جی نہیں...... ایسی کوئی بات نہیں ہے۔" صغریٰ کچھ ناراضگی سے بولی۔

"اچھا یہ بتاؤ، تم جو اتنی رات گئے موبائل پر اتنی آزادانہ گفتگو کر رہی ہو، تمہارے گھر والوں کو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے؟"

"ان کو اس بارے میں کچھ پتا نہیں ہے۔" صغریٰ نے خاصے ناراض لہجے میں مختصر سا جواب دیا۔

"اچھا چلو...... ناراضگی چھوڑو، یہ بتاؤ...... تمہارے پاس گلابی رنگ کا کوئی سوٹ ہے؟" ثناء اللہ نے بہت ہی خوشگوار لہجے میں پوچھا۔

"ہاں...... کیوں نہیں ہے مگر تم ادھورے سوال کیوں کر رہے ہو؟ ویسے میں کل تمہارے

پاس گلابی رنگ کا سوٹ پہن کر آنے والی تھی۔" صغریٰ کے لہجے میں خوش دلی کا تاثر نمایاں تھا۔

"ارے ہاں...... مجھے تم سے ایک اور بات پوچھنی تھی؟" ثناء اللہ کو جیسے کوئی ضروری بات یاد آ گئی ہو۔ "وہ...... میں نے اپنا نمبر جس لڑکے کے ہاتھ تم تک پہنچایا تھا، اس نے کوئی ایسی ویسی بات تو تم سے نہیں کی؟" ثناء اللہ کے لہجے میں تشویش تھی۔

"کچھ نہیں کہا تھا، بس اس نے مجھے خاموشی سے نمبر دیا اور چلا گیا۔"

"سچ بتاؤ...... اس نے تمہیں تنگ کرنے کی کوشش تو نہیں کی ناں؟" ثناء اللہ نے کرید نے والے انداز میں پوچھا۔

"ارے نہیں بھئی...... اس نے مجھے بالکل بھی تنگ نہیں کیا، کیوں...... خیریت تو ہے؟"

"سب ٹھیک ہے، بس اگر اس کی طرف سے کوئی کال آئے تو اس سے بات نہیں کرنا، وہ بالکل بھی اچھا لڑکا نہیں ہے۔" ثناء اللہ نے جیسے صغریٰ کو کچھ سمجھانا چاہا۔

"کمال ہے...... جب جانتے تھے، وہ اچھا لڑکا نہیں ہے تو پھر ایسے لڑکے کے ہاتھ اپنا نمبر کیوں بھیجا......؟" صغریٰ نے حیرانی سے پوچھا۔

"بس اس وقت میرے پاس کوئی اور ذریعہ نہیں تھا۔"

"اچھا...... اپنا موڈ تو ٹھیک کرو، صغریٰ کو صرف تم پسند آئے ہو اور تمہارے علاوہ صغریٰ کو کسی کی بھی نہ خواہش ہے اور نہ طلب۔"

"سچ کہہ رہی ہے ناں؟" ثناء اللہ کے لہجے میں ایک بے چینی اور بے یقینی سی تھی۔

"سچ...... سو فیصد سچ کہہ رہی ہوں۔" صغریٰ نے زندگی سے بھرپور قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

O......O......O

"واہ...... تم تو پوری گلابو لگ رہی ہو۔" ثناء اللہ نے صغریٰ کا سر سے پاؤں تک جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

"تمہاری خوشی کے لیے یہ جوڑا پہن کر آئی ہوں ورنہ میں یہ رنگ کم ہی پہنتی ہوں۔"

صغریٰ پُر تکلف لہجے میں بولی۔

"تھینکس...... بہت پیاری لگ رہی ہو۔" ثناء اللہ کے یہ الفاظ صغریٰ کے دل کے تاروں کو ہولے سے چھو گئے۔

"اچھا...... یونہی کاؤنٹر پر کھڑی رہو گی یا اندر بھی آؤ گی؟" ثناء اللہ نے اسے دکان کے اندر آنے کی پیش کش کی۔

"یہ دکان تمہاری اپنی ہے؟" صغریٰ نے پوری دکان پر ایک طائرانہ نظر دوڑائی، جہاں کمپیوٹر اسپیئر پارٹس کے ساتھ ساتھ موبائل فون کی مرمت کا کام بھی ہو رہا تھا۔

"آؤ نا...... اندر آ کے بیٹھ جاؤ۔" دکان کے قدرے اندرونی حصے میں وہ کرسی رکھتا ہوا صغریٰ سے مخاطب تھا۔

"ہم کہیں اور چل کر نہیں بیٹھ سکتے؟" اردگرد کے ماحول سے اکتا کر صغریٰ نے پوچھا۔

"آج نہیں پھر اور کسی دن، آج میرا پارٹنر دوست چھٹی پر ہے، میں دکان نہیں چھوڑ سکتا۔"

"اچھا تو پھر ٹھیک ہے۔" یہ کہتے ہوئے صغریٰ نے دُزدیدہ نظروں سے ثناء اللہ کو دیکھا۔

"ویسے کیا تم ہمیشہ ہی اتنا تیار ہو کر گھر سے نکلتی ہو؟" ثناء اللہ نے اچانک ہی سوال کیا۔

"ہاں...... نہیں تو......" صغریٰ کا سارا اعتماد ایک پل میں ہی فضا میں دھوئیں کے مرغولے کی مانند تحلیل ہو گیا۔ "وہ...... بس...... آج کچھ خاص تیاری ہے۔" صغریٰ نے دبے، مرے سے لہجے میں کہا۔

"استاد...... بھابھی جی کے لیے کولڈ ڈرنک لاؤں یا جوس؟" ایک قدرے چھوٹے قد کے لڑکے نے اچانک ہی وہاں آ کر کچھ یوں کہا کہ وہ دونوں ہی اچھل گئے۔

"جا...... دو کولڈ ڈرنک لے آ اور تو ذرا اپنی زبان کو قابو میں رکھا کر۔" ثناء اللہ نے اس لڑکے کو گھورتے ہوئے کہا اور پھر صغریٰ کے چہرے پر نظر ڈالی جو اسے حیرت سے دیکھ رہی تھی۔

"ایسے کیا دیکھ رہی ہو؟ یہ اس لڑکے کی شرارت تھی، کم بخت، میرے دل کا راز افشاں کر گیا جو میں تمہیں نہیں کہہ سکا، وہ کہہ گیا۔"

"اچھا......" صغریٰ نے معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ اس وقت ثناء اللہ کی نگاہوں کے رنگ کسی وضاحت کے محتاج نہیں تھے۔ اس کی نگاہوں میں صغریٰ کے لیے پیار ہی پیار تھا۔

"اچھا...... اب میں چلتی ہوں۔" صغریٰ کولڈ ڈرنک ختم کر کے جانے کے لیے کھڑی ہو گئی۔

"ٹھیک ہے...... جیسی تیری مرضی۔" ثناء اللہ نے بھی اسے رکنے کے لیے نہیں کہا۔

"اچھا سنو...... یہ سم تم رکھ لو، اس سم پر نیا پیکیج آن ہوا ہے، دو روپے میں پورا گھنٹہ بات ہوتی ہے۔" ثناء اللہ نے سم کا نیا کنکشن صغریٰ کی جانب بڑھایا۔

"شکریہ...... اب میں جاؤں گی۔" ثناء اللہ کے ہاتھ سے سم لے کر صغریٰ تیزی کے ساتھ شاپ سے نکل گئی مگر ثناء اللہ کی نگاہیں دور تک اس کا پیچھا کرتی رہیں۔

O......O......O

رات ہوتے ہی صغریٰ کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ ثناء اللہ کا نمبر ملا لے مگر وہ فطری شرم اور جھجک کے آگے مجبور تھی، ابھی وہ بستر پر لیٹی کروٹیں بدل رہی تھی کہ اسکرین پر ثناء اللہ کا جھلملاتا نام دیکھ کر اس کی خوشی کا ٹھکانہ نہیں رہا، اس نے فوراً ہی کال ریسیو کر لی۔

"بزی تو نہیں تھیں ناں اس وقت؟" ثناء اللہ کے لہجے میں کچھ طنز کی آمیزش سی تھی۔

"نہیں...... میں تو تمہاری کال کا ہی انتظار کر رہی تھی۔"

"سچ کہہ رہی ہو ناں؟" ثناء اللہ کا لہجہ بالکل سپاٹ ہو گیا۔

"کیوں...... کوئی شک ہے کیا؟" ابھی صغریٰ اپنی حیرانی سمیٹ بھی نہیں پائی تھی کہ ثناء اللہ نے اگلا سوال داغ دیا۔

"گھر اطمینان سے پہنچ گئی تھیں ناں؟ کوئی مسئلہ تو نہیں ہوا راستے میں؟"

"نہیں...... مسئلہ کیسا؟ تم شاید یہ بھول گئے کہ مجھے پرائیویٹ آفس میں جاب کرتے،

گھر سے آتے جاتے ہوئے تین سال ہو گئے ہیں تو اب ڈر کیسا؟''

''تین سال سے اسی راستے پر آ...... جا...... رہی ہو، کبھی کوئی اچھا نہیں لگا تمہیں؟''

''یہ اتنی عجیب سی باتیں کیوں کر رہے ہو؟ مجھے صرف تم ہی اچھے لگے ہو، کوئی اور اچھا لگا ہوتا تو تم سے کیوں دوستی کرتی؟'' صغریٰ کا منہ جیسے اندر تک کڑوا ہو چکا تھا۔

''لڑکیوں کا کچھ پتا نہیں ہوتا ناں...... اور پھر آج کل کی لڑکیاں...... توبہ، توبہ...... لڑکوں کو گھما کر رکھتی ہیں۔'' ثناء اللہ نے مصنوعی قہقہہ لگاتے ہوئے اپنی بات مکمل کی۔

''جی نہیں...... میں ایسی لڑکی نہیں ہوں۔'' صغریٰ نے کچھ ناراضگی سے کہا۔

''کہتی تو خیر...... ساری لڑکیاں یہی ہیں مگر...... یہ بتاؤ......'' ثناء اللہ نے یہ بتاؤ، پر زور دیتے ہوئے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''کیا بتاؤں؟''

''تم مجھ سے کتنا پیار کرتی ہو؟'' ثناء اللہ کا سوال تجسس بھرا تھا۔

''یہ سوال تو بڑا بے معنی سا ہے، پیار کی تو کوئی حد نہیں ہوتی، نہ ہی کوئی سرا کہ یہاں سے تھام لیا تو اختتام یہاں ہو، پیار تو بس پیار ہے، ہو جاتا ہے۔'' صغریٰ نے ایک گہری سانس کھینچ کر جیسے اپنے خیالوں کو ثناء اللہ سے آباد کیا تھا۔

''تمہارا مطلب ہے، پیار ہو جاتا ہے، کیا نہیں جاتا؟''

''ہاں...... بالکل۔''

''سو فیصد غلط بات، آج کل کی لڑکیاں پہلے لڑکا دیکھتی ہیں پھر دوستی کرتی ہیں اور اگر لڑکا موٹی آسامی ہو تو اس سے محبت بھی کر لیتی ہیں۔''

''نہیں...... نہیں...... ایسا بالکل نہیں ہے۔'' صغریٰ نے ثناء اللہ کو بیچ میں ہی ٹوک دیا۔

''ارے...... اب ایسا ہی ہوتا ہے، لڑکا اگر کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق رکھتا ہے تو لڑکی کو اس سے محبت ہو جاتی ہے ورنہ وہ کسی اور لڑکے کی طرف راغب ہو جاتی ہے۔'' ثناء اللہ کا لہجہ بہت تلخ ہو چکا تھا۔

''تو پھر اسے محبت کہنا تو محبت کی توہین ہوگی۔ محبت تو قربانی مانگتی ہے نا کہ بینک

بیلنس......"صغریٰ بس بولتی جا رہی تھی۔

"تم تو ایسا نہیں کرو گی ناں...... میرے ساتھ؟" ثناء اللہ کے لہجے میں اپنائیت اور خدشہ ایک ساتھ ہلکورے لے رہا تھا۔"میں تمہیں بہت پسند کرتا ہوں، چاہتا ہوں، مجھے دھوکا تو نہیں دو گی ناں؟" وہ ایک ہی سانس میں سب کچھ کہہ گیا۔

"ثناء اللہ...... میں تم سے حقیقی محبت کرتی ہوں، تمہارے علاوہ میں کسی اور کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی، میرے دل کے قفل کی کنجی بس تمہارے پاس ہے، تم چاہو تو کھولو ورنہ ہمیشہ کے لیے بند کر دو۔" صغریٰ بہت جذباتی ہو گئی تھی۔

"یہ کتابی باتیں میری سمجھ سے بالاتر ہیں، میں تو بس اتنا جانتا ہوں کہ میں تمہیں پسند کرتا ہوں اور تم سے شادی کرنے کا بھی خواہش مند ہوں، آگے تمہاری مرضی۔" ثناء اللہ کی آواز صغریٰ کو اپنے دل پر دستک دیتی محسوس ہوئی۔

"پہلے میں امی سے بات کرلوں پھر تم رشتہ بھیجنے کا پروگرام بنالینا۔" صغریٰ کے لہجے میں محبت اور شرم دونوں کا رنگ نمایاں تھا۔

"تو ٹھیک ہے۔" ثناء اللہ احسان کر دینے والے لہجے کے ساتھ کال منقطع کر چکا تھا جبکہ صغریٰ کی آنکھیں نت نئے خواب سجانے کے لیے بے چین تھیں۔

O......O......O

وہ دونوں اس وقت ایک ریستوران میں بیٹھے تھے۔ ویٹر کو دو آئس کریم آرڈر کرنے کے بعد اب ثناء اللہ...... صغریٰ سے مخاطب تھا۔

"صغریٰ...... جب ہم دونوں نے ایک دوسرے کو پسند کر ہی لیا ہے تو پھر رشتہ ہونے میں دیر کیسی؟ میں چاہتا ہوں کہ جلد ہی تمہاری امی سے ملوں۔" یہ سب کہتے ہوئے وہ صغریٰ کے چہرے کو بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔

"ٹھیک ہے...... میں آج ہی امی سے بات کرتی ہوں، جب رات ہماری فون پر بات ہوگی تو میں تمہیں بتادوں گی۔" اسی دوران صغریٰ کے سیل فون کی بیل بجی، اس نے اسکرین پر نمبر دیکھتے ہی منہ بنایا اور کال کینسل کرتی ہوئی دوبارہ ثناء اللہ کی جانب متوجہ ہوگئی۔

''ٹھیک ہے...... رات تک تو انتظار کر ہی لیں گے، ہیں ناں؟'' راز دارانہ انداز میں بولتی صغریٰ کے لہجے میں شوخی تھی۔

''پہلے یہ بتاؤ...... کس کی کال تھی جو تم نے کاٹ دی؟'' ثناء اللہ نے قدرے تلخ لہجے میں سوال کیا۔

''ارے...... کوئی خاص نہیں، بس یونہی۔''

''کوئی تمہیں تنگ کر رہا ہے تو مجھے بتاؤ، میں ایک کال پر ابھی اس کا نمبر بند کروا سکتا ہوں۔'' ثناء اللہ نے منہ بگاڑتے ہوئے بولا۔

''ارے نہیں بھئی...... ایسی کوئی بات نہیں ہے، تم بے کار غلط سمجھ رہے ہو۔'' وہ آہستگی سے کرسی کو ٹیبل کے مزید قریب کرتے ہوئے خود بھی ثناء اللہ کے قریب ہوگئی۔ اسی دوران ویٹر بھی آ گیا۔

''لو...... آئس کریم کھاؤ۔'' ثناء اللہ، صغریٰ کی جانب آئس کریم کا کپ بڑھاتے ہوئے بولا اور پھر اس ویٹر کو گھورنے لگا جس کی نظریں صغریٰ کے چہرے پر مرکوز تھیں۔

''آ...... اِدھر میری جگہ بیٹھ جا......'' ثناء اللہ نے غصے سے ویٹر کو مخاطب کیا تھا تو وہ ٹپٹا کر بھاگ گیا۔

''کیا ہو گیا ہے بھئی...... کیسا موڈ ہو رہا ہے تمہارا......؟'' صغریٰ کو ثناء اللہ کی نظریں سلگتی محسوس ہوئی تھیں جیسے وہ آنکھیں نہیں، ایکس رے مشین ہوں۔

''خیر...... تم مجھے یہ بتاؤ کہ کیا مجھ سے کوئی چھپانے والی بات تھی جو تم نے میرے سامنے کال ریسیو نہیں کی؟'' ثناء اللہ نے یہ سوال کچھ ایسے انداز میں کیا کہ صغریٰ سناٹے میں آ گئی۔

''اوہ خدایا......! ارے بھئی...... میرے آفس سے کال تھی، میں امی کی بیماری کا بہانہ کر کے وہاں سے نکلی ہوں، بات کر لیتی تو ساری پول کھل جاتی......'' صغریٰ نے خفگی سے ثناء اللہ کو دیکھا۔

''ایک بات غور سے سن لو...... جو لوگ میری باتوں کو اگنور کرتے ہیں، وہ مجھے سخت زہر لگتے ہیں اور میں ان سے دور ہوتا چلا جاتا ہوں۔'' ثناء اللہ کے چہرے پر کچھ عجیب سے

تاثرات تھے۔

''ٹھیک ہے...... میں سمجھ گئی۔'' یہ کہہ کر صغریٰ نے سر جھکا لیا اور خاموشی سے آئس کریم کھانے لگی۔

''اور ہاں......تم مجھ سے شادی کرنا چاہتی ہو تو تمہیں ایک کام اور کرنا ہوگا۔''

''وہ کیا......؟'' صغریٰ نے حیرت سے ثناء اللہ کی طرف دیکھا۔

''تم اپنی یہ جاب چھوڑ دو، کہو گی تو میں کہیں اور تمہاری جاب کا بندوبست کروا سکتا ہوں۔ اصل میں تم میری شاپ کے اتنے قریب ہو کہ مجھے یقین ہے، لوگ باتیں بنائیں گے کہ ثناء اللہ اپنی بیوی سے کام کرواتا ہے۔'' ثناء اللہ کی یہ بات سن کر تو صغریٰ کا موڈ آف ہو گیا۔

''یہاں سے آپ یٹر کی جاب چھوڑ کر میں کہاں اور کیا کروں گی؟'' وہ قدرے رکھائی سے بولی۔

''یہ سوچنا میرا کام ہے، تم بس اپنا مائنڈ بناؤ کہ تمہیں جلد ہی یہاں سے جاب چھوڑ دینی ہے۔''

''عجیب سی بات ہے۔'' صغریٰ منہ ہی منہ میں بڑبڑائی۔

''اور ہاں...... اپنی امی سے بات کر کے مجھے جلدی بتا دینا تاکہ میں ان کے پاس آ کر تمہارے رشتے کے سلسلے میں بات کر سکوں۔'' احسان کر دینے والے انداز میں یہ بات کہہ کر وہ اب والٹ سے پیسے نکال رہا تھا۔

''چلو......اب اٹھو...... مجھے شاپ پر ٹائم سے پہنچنا ہے، میں تمہیں رکشہ کروا دیتا ہوں۔ گلی کے کونے پر اترنے کی ضرورت نہیں، بالکل گھر کے سامنے اترنا۔'' ثناء اللہ زچ کر دینے والے انداز میں بولتا کھڑا ہو چکا تھا جبکہ صغریٰ نظریں جھکائے کچھ سوچتی اور کھوجتی اس کے پیچھے چل رہی تھی۔

O......O......O

''ارے یار...... کتنی دیر سے کال کر رہا ہوں، نمبر ہے کہ مسلسل بزی مل رہا ہے؟'' ثناء اللہ کال ریسیو ہوتے ہی غصے سے دھاڑا۔

''نمبر بزی مل رہا ہے مگر کیوں؟ میرے پاس تو کوئی کال نہیں آئی ہے؟'' صغریٰ کے لہجے میں غصے اور حیرت کی ملی جلی آمیزش تھی۔

''تو کیا میں جھوٹ بول رہا ہوں؟ آدھے گھنٹے سے تو مسلسل نمبر ہی ملا رہا ہوں، سچ بتاؤ...... کس سے اتنی لمبی بات کر رہی تھیں؟'' ثناء اللہ کی آواز میں تناؤ تھا۔

''میں کیوں جھوٹ بولنے لگی، نمبر بزی ہوتا تو بتا دیتی۔ اب جبکہ نمبر بزی نہیں ہے تو کیا جھوٹ بولوں؟'' صغریٰ پہلی بار موبائل پر چیخی تھی۔

''ٹھیک ہے...... ہم دونوں ہی جھوٹ بول رہے ہیں، بات ختم، مجھے ایسی لڑکیوں سے نفرت ہے جو ہر بات چھپاتی ہیں۔ جو ہے، وہ ہے تو پھر چھپانے کی کیا ضرورت؟ اگر کسی اور سے بھی تمہاری دوستی ہے تو مجھے بتا دو......؟''

''شاید تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے، ایسا کچھ بھی نہیں ہے، پیکیج سسٹم کی وجہ سے نیٹ ورک بزی ہوگا اور یقیناً اسی وجہ سے تمہیں میرا نمبر بزی مل رہا ہوگا۔'' وہ غصے سے پھنکاری۔

''ہاں...... ہاں...... ایک تمہارے ہی نمبر پر یہ پرابلم ہے، میرے سیل پر تمہارا نمبر بزی آ رہا تھا تو آ رہا تھا، اب میں اس پر یقین کروں جو میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا یا پھر تمہاری بات پر یقین کروں؟'' ثناء اللہ کا لہجہ شدید غصے کا غماز تھا۔

''جس پر دل چاہے، یقین کرلو، مجھ سے بات کرنی ہے تو سکون اور تحمل سے کرو ورنہ میں موبائل بند کرتی ہوں۔'' صغریٰ نے سخت غصے اور کوفت کے عالم میں کہا۔

''ٹھیک ہے تو پھر بند ہی کر دو، صاف کیوں نہیں کہتیں کہ اپنے آشنا سے بات کرنی ہے؟''

''اوہ خدایا...... ! ثناء...... ! تم میری بات سمجھ کیوں نہیں رہے، مجھ پر بے بنیاد الزام تراشی کر رہے ہو؟'' وہ چیخی۔

''بکواس بند کرو اور جو دل چاہے، کرو، میں لائن کاٹتا ہوں۔'' لائن ڈسکنکیٹ ہو چکی تھی مگر صغریٰ کی سسکیاں بند کمرے میں دیواروں سے اپنا سر ٹکرا رہی تھیں۔ وہ جانتی تھی کہ جب محبت شدت اختیار کر جاتی ہے تو اس میں شک جنم لے ہی لیتا ہے، صغریٰ نے اپنے دل کو تسلی

دی کہ یقیناً یہ مجھ سے شدید محبت کی ہی علامت ہے کہ ثناء آج مجھ پر اتنا چیخا ہے، میں صبح اسے منالوں گی۔''

O......O......O

''کل رات جو کچھ ہوا، میں اسے بھلا دینا چاہتا ہوں، اگر تمہیں واقعی میرے ساتھ اپنی زندگی کی شروعات کرنی ہے تو مجھے کھلے دل سے سب کچھ بتا دو......؟'' ثناء اللہ سلام...... دعا سے بے نیاز صغریٰ کی کال ریسیو کرتے ہی بے ساختہ بولا۔

''کیا سب بتادوں...... میرے بارے میں تو تم سب ہی جانتے ہو؟''

''کاش...... مجھے تم نے اپنے بارے میں بھی کچھ بتایا ہوتا۔ خیر...... تم نے امی سے بات کی؟'' وہ طنزیہ جملہ اچھالتے ہوئے بولا۔

''ہاں...... امی نے کہا ہے کہ وہ تم اور تمہارے گھر والوں سے مل کر فیصلہ کریں گی۔ اب تم جب چاہو، اپنی امی کے ساتھ میرے گھر آسکتے ہو۔'' صغریٰ اندر سے جلی ہوئی تھی، سو اتنی خوشی کی خبر بھی تپے ہوئے انداز میں بتا رہی تھی۔

''دیکھو صغریٰ......! میں لڑکا بچھ الگ ٹائپ کا ہوں، لگی لپٹی رکھنے کا قائل نہیں ہوں، میں جو ہوں، سامنے ہوں اور ایسے ہی تمہاری فیملی کے سامنے آجاؤں گا لیکن جہاں تک میرے گھر والوں کی بات ہے تو میرے گھر سے کوئی نہیں آئے گا۔'' ثناء اللہ انتہائی صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولا۔

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' صغریٰ کے لہجے میں حیرت نمایاں تھی۔

''میں نے اپنی زندگی خود بنائی ہے، خود محنت کی ہے اور آج جس مقام پر ہوں، میں یہاں خود اپنے بل بوتے پر پہنچا ہوں تو اپنی زندگی کا سب سے بڑا فیصلہ کرنے میں بھی مجھے کسی کی مدد درکار نہیں۔'' ثناء اللہ کے لہجے میں غرور اور زعم تھا۔

''مگر یہ سوچیں، ہم شادی کرنے کا فیصلہ کر رہے ہیں، یہ بات تو تمہارے گھر والوں کے لیے باعث خوشی ہونی چاہیے، بھلا اس میں......''

''بس میں تو ایسا ہی ہوں، تمہیں میرے ساتھ زندگی گزارنی ہے یا میری فیملی کے

ساتھ؟'' ثناء اللہ نے صغریٰ کی بات کاٹ کر کہا۔

''یقیناً تمہارے ساتھ ثناء، لیکن ہم ان سے کٹ کر بھی تو نہیں رہ سکتے ہیں ناں؟'' صغریٰ دل گرفتگی سے بولی۔

''میں تو رشتے کے لیے اکیلے ہی آؤں گا، اگر تمہاری امی راضی ہیں تو ٹھیک ہے ورنہ تمہارے لیے تو بہت ہوں گے البتہ میں پوری زندگی اکیلے گزارنے کا فیصلہ کر چکا ہوں کہ تم نہیں تو کوئی بھی نہیں......'' ثناء اللہ نے جیسے اپنا آخری فیصلہ سنا دیا تھا۔

''ٹھیک ہے...... تم اکیلے ہی آجانا، میں امی کو سنبھال لوں گی۔'' صغریٰ نے آہستگی سے کہا۔ ویسے یہ محبت بھی عجیب شے ہے جس سے ہو جائے، اس کی خامیاں بھی خوبیاں لگتی ہیں۔

''یہ ہوئی ناں بات، میں آنے سے پہلے تمہیں بتا دوں گا۔'' ثناء اللہ نے قدرے رعب دار لہجے میں کہا اور لائن کاٹ دی۔

O......O......O

تقریباً پندرہ روز بعد صغریٰ نے ثناء اللہ کو فون پر بتایا۔ ''ثناء...... تمہاری ایک خواہش تو پوری ہو گئی، نئی جاب کے لیے جہاں میں نے اپنی C.V بھیجی تھی، وہاں سے کال آگئی ہے۔ انشاء اللہ، میں پہلی تاریخ کو جوائن کرلوں گی۔''

''یہ تو بہت اچھی خبر ہے اور امی سے دوبارہ بات ہو گئی تمہاری؟'' ثناء اللہ نے اسے کریدا۔

''امی نہیں مان رہی ہیں مگر تم بے فکر رہو، میں صبح سے بھوک ہڑتال پر ہوں، یقیناً وہ میری بات مان جائیں گی۔'' صغریٰ کے لہجے میں اعتماد تھا۔

''تو اب تمہیں دیکھنے کے لیے کافی تگ و دو کرنی پڑے گی، پہلے تو جب دل چاہتا تھا، دیدار ہو جاتا تھا مگر اب......'' ثناء اللہ قدرے اداس لہجے میں گویا ہوا۔

''ارے...... یہ تمہاری ہی تو خواہش تھی کہ میں یہاں سے جاب چھوڑ دوں؟ اب جبکہ نئی جگہ سے آفر آگئی ہے تو تم اداس ہو رہے ہو؟''

''چلو کوئی بات نہیں، ٹھیک ہے، بس تم اب نئی جگہ محتاط ہو کر کام کرنا، زیادہ کسی کو لفٹ کرانے کی ضرورت نہیں اور نہ ہی اپنا نمبر بلا ضرورت کسی کو دینا۔'' ایک کے بعد ایک نصیحت

کرتا ثناء اللہ اسے اس وقت بڑا عجیب سا لگا۔

''ٹھیک ہے، میں جانتی ہوں۔'' وہ بس اسی جملے پر اکتفا کر سکی۔

''سنو...... امی کو جلدی سے راضی کر لو ناں، اب تو تمہارے بغیر اور بے سکون دن گزریں گے، جانے کتنے دنوں بعد تمہیں دیکھنے کا موقع ملے گا؟'' وہ ایک دم چھوٹا سا بچہ بن گیا تھا۔

''ہاں...... کیوں نہیں، امی سے تو بات چل رہی ہے، ویسے اگر تم اپنی امی کو میرے گھر لے آتے تو......''

''نہیں بھئی...... یہ ممکن نہیں ہے۔'' ثناء اللہ نے فوراً ہی صغریٰ کی بات کاٹی۔ ''میرا جو مسئلہ ہے، تمہارے سامنے ہے، تمہاری امی اگر راضی ہوتی ہیں تو اچھی بات ہے ورنہ میں خود کو اکیلے جینے کے لیے تیار کر ہی لوں گا۔''

''اچھی دھمکی ہے......'' صغریٰ کچھ ناراضگی سے بولی۔ خیر...... اب مجھے کچن میں جانا ہے پھر بات کروں گی لیٹ نائٹ۔''

''ہاں، ٹھیک ہے، اگر تمہیں فرصت ہو تو ضرور بات کرنا، میں منتظر رہوں گا۔'' یہ کہہ کر لائن کاٹ دی گئی۔

O......O......O

ایک ہفتے بعد وہ دونوں ایک دوسرے کے سامنے موجود تھے۔ ''ہم آج کتنے دنوں بعد مل رہے ہیں ناں؟'' صغریٰ نے جیسے چہکتے ہوئے کہا تھا۔

''شکر ہے...... تمہاری امی راضی ہو گئیں۔'' ثناء اللہ کے چہرے پر بھی خوشی نمایاں تھی۔

''ہاں...... میری بھوک ہڑتال اور ضد آخر کام آ ہی گئی۔'' صغریٰ نے ایک ادا سے کہا۔

''بس اب میں پہلے ایک مکان کرائے پر لوں گا پھر ہم دونوں مل کر اسے سیٹ کریں گے اور جب ہماری سیٹنگ مکمل ہو جائے گی تو میں تمہیں نکاح کر کے لے جاؤں گا۔'' وہ ایک ہی سانس میں روانی سے اپنے دل کی بات صغریٰ کو بتا رہا تھا۔

''اچھا جی...... اور......؟'' صغریٰ اس کے لہجے میں چھپی شدتوں کو کھوجتے ہوئے بولی۔

''میں نکاح بالکل سادگی سے کرنے کا خواہاں ہوں۔ مجھے شور وغل، ہلہ گلہ، فضول

ہنگامہ بالکل پسند نہیں۔ بس گھر کے چار لوگوں میں ہم نکاح کریں گے۔ اب میں گھر ارینج کرنے کی تیاری پکڑتا ہوں۔"

"نکاح سے پہلے تو میں تمہارے ساتھ کہیں بھی نکلوں گی تو امی کو اعتراض ہوگا، کیوں ناں، ہم پہلے منگنی کرلیں؟" بڑی مشکلوں سے صغریٰ کے دل کی بات اس کے لبوں تک آئی تھی۔

"ہاں...... یہ بھی ٹھیک رہے گا، میں کل ہی مٹھائی اور انگوٹھی کے ساتھ تمہارے گھر آجاتا ہوں۔" ثناء اللہ نے فوراً ہی اس مسئلے پر آمادگی ظاہر کی تو صغریٰ کے چہرے پر انجانی خوشی کے رنگ نمایاں ہوگئے۔

O......O......O

پندرہ روز بعد ثناء اللہ اور صغریٰ کی منگنی ہوگئی۔ "دیکھو صغریٰ...... ! میں نے اپنا وعدہ نبھایا ہے، تم سے شدید محبت کا ثبوت میرے نام کی یہ انگوٹھی ہے جو آج تمہاری انگلی میں جگمگا رہی ہے۔" ثناء اللہ نے محبت سے مخمور لہجے میں کہا۔

"ہاں ثناء...... ! میں تمہاری محبت کی دل سے قدر کرتی ہوں۔"

"اور سنو...... میری اس نشانی کی حفاظت کرنا جو تمہاری انگلی میں جگمگا رہی ہے اور ہاں...... خبردار، جو اب ان انگلیوں سے کسی غیر کا نمبر ملایا یا کسی غیر کی کال ریسیو کی۔"

"مطلب......؟" ایک ہی پل میں صغریٰ کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔

"مطلب یہ کہ میں تمہاری انگلیاں توڑ دوں گا۔ اب تم میری ہو چکی ہو۔" ثناء اللہ نے مسکراتے ہوئے دھمکی دی۔

"ابھی کہاں...... ابھی ان انگلیوں نے نکاح نامے پر دستخط نہیں کیے ہیں۔" صغریٰ جیسے چڑ کر بولی۔

"ارے...... وہ دن بھی آجائے گا، بس تم اب اپنی خیر مناؤ۔"

"آج آپ مجھے دھمکیاں کیوں دے رہے ہیں؟" صغریٰ نے غصے میں چیختے ہوئے موبائل اپنے دوسرے کان پر منتقل کیا۔

"چلو...... آج تو مجھے سچ سچ بتادو کہ تم رات میں اور کس سے بات کرتی ہو؟"

''یہ کیا بکواس ہے؟'' ثناء اللہ کے اس سوال پر صغریٰ غصے میں چیخ اٹھی۔

''ہاں ناں ...... مجھے آج بھی تمہارا نمبر دس منٹ تک بزی ملا ہے مگر میں اتنا اچھا موڈ خراب نہیں کرنا چاہتا اس لیے تمہیں بڑے سکون سے بتا رہا ہوں بلکہ تنبیہ بھی کر رہا ہوں کہ اب محتاط ہو جاؤ۔''

''آپ کے اس دماغی خلل کا میرے پاس کوئی علاج نہیں، بہتر ہوگا کہ آپ اپنی غلط فہمی خود دور کرلیں یا دل چاہے تو میرا نمبر ٹریس کروالیں۔'' صغریٰ کی منگنی کی ساری خوشی دودھ میں آئے ابال کی طرح پل میں بیٹھ چکی تھی اور اب وہ اپنے کردار کے حوالے سے صفائیاں پیش کر رہی تھیں۔

''کب تک چھپاؤ گی مجھ سے؟ ایک دن تو پکڑی جاؤ گی اور یاد رکھنا، اس دن تمہاری خیر نہیں ہوگی۔''

''لیکن یہ تو بالکل بے بنیاد الزام ہے۔ تم کوئی ثبوت تو دو کہ واقعی میں تمہیں چیٹ کر رہی ہوں؟ یہ بہت غلط بات ہے ثناء اللہ......!'' وہ اب ایک بار پھر آپ سے تم پر آگئی تھی اور رونے لگی تھی۔

''بس...... بس...... یہ فضول لڑکیوں کی طرح آنسوے بہانا بند کرو، جس دن ثبوت میرے ہاتھ آگیا، میں تمہارے منہ پر دے ماروں گا پھر تم اپنی شکل دیکھنا......'' ثناء اللہ کے لہجے سے ناگ جیسی پھنکار نکل رہی تھی۔

''جب اتنا شک کرتے ہو مجھ پر تو مجھ سے منگنی کیوں کی؟'' وہ اب باقاعدہ ہچکیوں سے رونے لگی تھی۔

''اچھا...... اچھا بس...... یہ رونا دھونا جب بند ہو جائے تو مجھ سے بات کر لینا، فضول میں میرا دماغ خراب نہیں کرو۔'' ثناء اللہ نے تیزی سے اپنی بات مکمل کر کے لائن کاٹ دی۔

O......O......O

تین دن گزر گئے تھے، صغریٰ نے اپنا موبائل آف کر دیا تھا، اسے ثناء اللہ کی باتوں سے سخت صدمہ ہوا تھا۔ اس کے نزدیک خاموشی ثناء اللہ کا بہترین علاج تھی جس کے ذریعے وہ

اسے یقین دلانا چاہتی تھی کہ وہ جھوٹ نہیں بول رہی۔ اس روز صغریٰ کے خاموش احتجاج کا چوتھا دن تھا، وہ ذرا دیر پہلے ہی جاب سے فری ہو کر گھر آئی تھی کہ اس کی چھوٹی بہن بھاگتی ہوئی آئی۔

''آپی......! ثناء بھائی آپ سے ملنے آئے ہیں، میں نے انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا ہے۔''

''اچھا کیا......'' وہ خوش دلی سے بولی۔ کیونکہ اس کے خیال میں ثناء اسے منانے آیا تھا۔

''امی نہیں ہیں گھر میں؟'' ثناء اللہ اچانک اس کے کمرے میں ہی آ گیا تو وہ ٹپٹا سی گئی۔

''نہیں......وہ کسی کام سے منگھوپیر تک گئی ہیں......آپ بیٹھو ناں۔''

''نہیں...... میں بیٹھنے نہیں آیا...... مجھے صاف صاف بتاؤ کہ آخر تم چاہتی کیا ہو؟''

''میں بے قصور ہوں، بس اسی بات کا یقین تمہیں دلانا چاہتی ہوں۔'' وہ آہستگی سے بولی۔

''تم منہ سے کچھ بھی کہہ لو مگر جب تک اپنی یہ عادت ترک نہیں کرو گی، میں نہیں مانوں گا۔''

''کون سی عادت؟ تم کیوں مجھ پر الزام تراشی کر رہے ہو؟'' وہ بہت زور سے دھاڑی۔

''آواز نیچی رکھو اپنی، ورنہ تمہارا گلہ دبا دوں گا......'' ثناء اللہ نے اسے آنکھیں دکھائیں۔

''ہاں......تو دبا دو...... بس دیکھ لی تمہاری شدید محبت...... شکی مزاج ہو خود اور شک میرے کردار پر کر رہے ہو۔''

''بس اب ایک لفظ نکلا تمہاری زبان سے تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا......'' ثناء اللہ نے آگے بڑھ کر دونوں ہاتھ صغریٰ کے گلے پر رکھ دیے۔

''ایسا نہیں کرو ثناء...... مجھے تکلیف ہو رہی ہے...... ہٹاؤ اپنے ہاتھ......'' وہ بہت نڈھال سی چیخ رہی تھی اور پھر اس کی آواز بند ہوتی چلی گئی۔ ثناء اللہ اسے اب بیڈ پر پٹخ چکا تھا۔ وہ ابلی ہوئی آنکھوں کے ساتھ دونوں ہاتھ گلے پر رکھے بس ثناء اللہ کو گھور رہی تھی۔ وہ صغریٰ کی ایسی حالت دیکھ کر گھبرا گیا اور باہر کی جانب تیزی سے بھاگا۔

O......O......O

مورخہ 23 مئی کو بائیس سالہ صغریٰ عرف نوشین کو ثناء اللہ گلہ دبا کر، ہلاک کرنے کے

بعد بھاگا تو تھا مگر وہ پولیس سے بچ نہیں سکا، اسے پکڑ لیا گیا تھا، پکڑے جانے کے بعد اب وہ پاگلوں کی طرح اسی بات کی گردان کرتا رہتا ہے کہ صغریٰ کا فون انگیج رہتا تھا اور جب میں اسے تنبیہ کرتا تھا تو وہ الٹا مجھ سے لڑنے لگ جاتی تھی۔

یہ واقعہ سرجانی تھانے کی حدود صدیق گوٹھ میں پیش آیا تھا جبکہ اسی نوعیت کا دوسرا واقعہ 22 مئی کو تیموریہ تھانے نارتھ ناظم آباد کے عقب میں بھی پیش آیا جہاں ملزم غلام صداقت کو اپنی بیوی پر شک تھا کہ وہ رات گئے کسی نامعلوم شخص سے باتیں کرتی ہے اور اس شک کی بنا پر اس نے ساجدہ کو چھری کے پے در پے وار کر کے قتل کر دیا۔ اسی طرح کا ایک اور واقعہ نیو کراچی کے علاقے صبا سینما کے قریب پیش آیا جہاں ملزم شیر محمد نے اپنی بیوی مہناز پر شک کی بنا پر پہلے اس کی شہ رگ کاٹی اور اس کے بعد پھندا لگا کر لاش پنکھے سے لٹکا کر خودکشی کا تاثر دینے کی کوشش کی مگر ملزم شیر محمد بھی موقع پر پکڑا گیا۔ اسی طرح کا ایک اور واقعہ سائٹ ٹاؤن تھانے کی حدود غنی چورنگی کے پاس پیش آیا جہاں نذیر آصف نے اپنی بیٹی کو موبائل پر تنگ کرنے والے زین الحسن کو گولی مار کر اس کی موت کو ٹارگٹ کلنگ کا رنگ دینے کی کوشش کی تھی۔

کراچی جیسے ترقی یافتہ شہر میں جہاں ایک کال پر ہزاروں، لاکھوں کا بزنس ہو رہا ہے، ایک کال نے میلوں کے سفر کو منٹوں پر محیط کر دیا ہے، وہیں پیکیج سسٹم نے گفتگو کا ٹائم ڈیوریشن بھی بڑھا دیا ہے جس کی بدولت اب کام کی باتوں کے علاوہ یہ ٹائم پاس کرنے کا ذریعہ بن چکا ہے۔ چھوٹی سے چھوٹی باتوں اور پل بھر میں آنے والا خیال سیکنڈوں میں میسج کے ذریعے مقابل تک پہنچ جاتا ہے جس کی بنا پر شک کا بیج بھی باآسانی نمو پانے لگ جاتا ہے اور پھر اس پر لمبی لمبی کال، صفائیاں اسے مزید بڑھاوا دینے میں اپنا کردار ادا کر رہی ہیں۔

قارئین......! بات ساری ہماری سوچ کی ہے کہ اس سہولت کے مثبت رخ کو اپنایا جائے یا منفی کو؟ یقیناً آج ہماری نسل اپنے نفس کے آگے گھٹنے ٹیک چکی ہے۔ اسے تو آج اپنی انگلیوں پر بھی بھروسہ نہیں رہا جو عالم بے خودی میں خود اپنے ہاتھوں اپنا مستقبل تباہ کرنے کے لیے کوشاں ہیں۔

☆......☆......☆

یہ کھیل محبت کے

سرجانی ٹاؤن پولیس اسٹیشن کا اسٹاپ آنے تک ساری بس بھر گئی تھی اور مجھے پتا بھی نہیں چلا۔ میں جو ارد گرد سے بے خبر آنکھیں بند کیے، سیٹ کی پشت سے ٹیک لگائے بیٹھی ہوئی تھی، کنڈیکٹر کی آواز اور عورتوں کے شور نے مجھے آنکھیں کھولنے پر مجبور کر دیا۔ میں نے ایک بے زاری نظر رنگ برنگے کپڑوں میں ملبوس ان خواتین پر دوڑائی۔ کنڈیکٹر کے ساتھ تکرار کرتیں ان خواتین نے سرد موسم کو خاصا گرما دیا تھا مگر میں ان باتوں سے لاتعلق دوبارہ آنکھیں موند چکی تھی، اس وقت میرا دل ایک عجیب دکھ میں ڈوبا ہوا تھا اور میری بے ربط سوچیں مجھے کرب کے ایک الاؤ میں دھکیل رہی تھیں کہ یہ ''لا'' کا سفر ''لا'' ہی رہے گا......! اس کا کچھ حاصل نہیں ہوگا؟ اور میں بھی زمین پر، بس زمین ہی کی طرح چل رہی ہوں، اپنے محور سے ہٹتی ہی نہیں۔ ہر دم ''سچی کہانیوں'' کی تلاش میں سرگرداں رہتی ہوں اور میں اپنی تلاش کے اسی سفر میں اس وقت سرجانی ٹاؤن تھانے کے عقب میں واقع ایک فلیٹ سے واپس آ رہی ہوں، اس فلیٹ کی پہلی منزل پر عروج اور طاہر رہتے تھے۔

O......O......O

طاہر اور عروج نے چار ماہ قبل شادی کی تھی۔ طاہر بتاتا ہے کہ عروج سے وہ پندرہ سال سے محبت کر رہا ہے، دونوں کی محبت اتنی شدت اختیار کر چکی تھی کہ دونوں نے فیصلہ کر لیا کہ انہیں اب شادی کے بندھن میں بندھ جانا چاہیے۔ عروج کیونکہ طاہر کی تایا زاد کزن تھی اس

لیے طاہر نے برملا اپنی ماں عزیز النساء بیگم سے اظہار کر دیا کہ "وہ شادی کرے گا تو عروج سے ہی کرے گا۔" مگر طاہر کی یہ بات سن کر عزیز النساء بیگم نے اس رشتے سے انکار کر دیا بلکہ طاہر کو سختی سے کہہ بھی دیا کہ وہ عروج کا خیال اپنے دل و دماغ سے نکال دے۔

کیوں کہ ان کے اپنے جیٹھ کے گھرانے سے تعلقات کشیدہ تھے۔

عزیز النساء بیگم ایک سرکاری اسکول کی ہیڈ مسٹریس ہیں۔ ہیڈ مسٹریس کا نام آتے ہی ایک علم دوست شخصیت کا خیال ذہن میں آجاتا ہے مگر میں حیران ہوں کہ علم کی تقسیم جس شخصیت کا پیشہ ہو، وہ اتنی سفاک کیسے ہو سکتی ہے؟

طاہر نے عزیز النساء بیگم کے منع کرنے کے باوجود خفیہ طور پر عروج سے شادی کر لی اور اسے سرجانی ٹاؤن میں واقع ایک فلیٹ میں رکھ لیا مگر بدقسمتی سے شادی کے چوتھے مہینے ہی عزیز النساء بیگم کو طاہر پر شک ہو گیا کیوں کہ طاہر بہانے کر کے گھر سے باہر رہنے لگا اور اکثر وہ دو، دو دن غائب رہتا۔ طاہر کی ان مشکوک حرکات و سکنات کی بنا پر عزیز النساء بیگم نے اپنے ایک واقف کار عدنان جو کہ ان کے ساتھ ان کے گھر پر ہی رہتا تھا، سے کہا کہ وہ طاہر کا پیچھا کرے اور پھر عدنان نے دو دن کے اندر ہی سراغ لگا لیا کہ طاہر سرجانی ٹاؤن کے فلاں فلیٹ میں رہ رہا ہے اور اس نے عروج سے شادی بھی کر لی ہے۔ یہ خبر عزیز النساء بیگم کے اوسان خطا کر گئی۔

بس ایک جھٹکے کے ساتھ رکی تو میں بھی سوچوں کی دنیا سے باہر آ گئی۔ میرا مطلوبہ اسٹاپ بھی قریب تھا اس لیے میں کھڑی ہو گئی۔ بس میں خواتین کے کمپارٹمنٹ میں اس وقت شہر میں ہونے والی قتل و غارت گری زیر بحث تھی۔

ایک وقت تھا جب میں سوچتی تھی کہ زندگی بڑی مہربان ہے لیکن نہیں، میں غلط تھی، زندگی تو نیشِ عقرب ہے، یہ ایسے ایسے لوگوں سے ملاتی ہے، ایسے ایسے واقعات کی نشاندہی کرتی ہے کہ میں دہل کر رہ جاتی ہوں، یہ زندگی تو بڑے ہی ظالم اور سفاک روپ میں ظاہر ہوتی ہے جیسے عزیز النساء بیگم کا یہ سفاک روپ......!!

عزیز النساء بیگم اس روز طاہر سے چھوٹے بیٹے مظہر اور اپنے واقف کار عدنان کے

ساتھ طاہر کی غیر موجودگی میں عروج کے گھر پہنچ گئیں۔ عروج نے اپنی ساس کی آمد پر ان کا کھلے دل سے استقبال کیا کیوں کہ وہ عروج کی نہ صرف ساس تھیں بلکہ چاچی بھی تھیں اس لیے وہ کوشش کرتی رہی کہ اس کی ساس اس شادی کو دل سے تسلیم کرلیں مگر عزیز النساء بیگم بضد تھیں کہ وہ طاہر سے طلاق لے، وہ عروج کو طلاق کے لیے اکساتی رہیں اور عروج منع کرتی رہی۔ عروج کے مسلسل انکار نے عزیز النساء بیگم سمیت عدنان کو بھی طیش میں مبتلا کر دیا۔ اسی دوران عدنان اور مظہر تیزی سے آگے بڑھے اور انہوں نے عروج کو نیچے گرا کر اس کے ہاتھ اور پاؤں پکڑ لیے اور اس کے منہ میں دوپٹہ ٹھونس دیا جبکہ عزیز النساء بیگم نے روٹی پکانے والے بیلن سے عروج پر وار کرنے شروع کر دیئے۔ عروج کے سر پر پے در پے وار کرنے سے وہ شدید زخمی ہو گئی اور اس پر بھی بس نہیں چلا تو انہوں نے قینچی کے وار کر کے عروج کو ہلاک کر دیا۔ تینوں ملزمان نے انتہائی چالاکی سے پورے گھر کی صفائی کی اور دروازہ اندر سے بند کر کے واپس اپنے گھر روانہ ہو گئے جبکہ طاہر کی گھر آمد پر یہ انکشاف سب پر ہوا کہ اس کی شریک حیات عروج قتل ہو چکی ہے...... پولیس نے تحقیقات کی تو عزیز النساء بیگم کے بیان اور الٹی سیدھی باتوں نے اس واردات کی ساری پول کھول دی اور اب عزیز النساء بیگم، عدنان اور مظہر پولیس کی حراست میں ہیں جبکہ شدت غم سے نڈھال طاہر کی حالت تشویش ناک ہے۔ وہ گزشتہ پندرہ سالوں سے اپنی محبت عروج کے ساتھ ویلنٹائن ڈے مناتا چلا آ رہا تھا اور آج جب وہ اس کی شریک حیات بن چکی تھی تو......؟ وہ وقت کے اس فیصلے پر سر جھکائے اپنی ماں کی سفاکی پر حیران، زندہ ہوتے ہوئے بھی موت کی راہ سے گزر رہا تھا۔

کراچی جو عروس البلاد سمجھا جاتا ہے، اس شہر کے باسیوں کے لیے محبت کی شادی کرنا آج بھی جرم ہے۔ عروج کو کتنی بے دردی سے ایک ایسی عورت نے مارا جو شعبۂ تعلیم سے منسلک ہے۔ تعلیم جو عقل و شعور بیدار کرتی ہے جس کی بدولت انسان وحشت اور درندگی سے دور ہو جاتا ہے، عزیز النساء بیگم اس مقدس شعبے سے وابستہ ہو کر بھی درندہ بن گئیں۔ تین مہینے کی حاملہ بہو کو بیلن اور قینچی کے وار کر کے ختم کر دیا...... ویسے کیا یہ سوچنے کی بات نہیں کہ ایسی ذہنی مریضہ شعبۂ تعلیم کے زوال اور پسماندگی کا بھی تو باعث بنی ہو گی......!!

کبھی کبھی میں سوچتی ہوں کہ میں یہ کیسی کہانیاں تاریخ کے حوالے کر رہی ہوں لیکن میں کیا کر سکتی ہوں؟ مجھے ورثے میں آنسو ملے ہیں، شاید اس لیے آج میرا حال منقل بن چکا ہے۔ میں بہاروں کو کفن پہنانا نہیں چاہتی لیکن میں کیا کروں، عروج اور طاہر کی بے لوث محبت نے میری آنکھیں نم ناک کر دی ہیں۔ کیا محبت کا انجام اتنا ہی برا ہوتا ہے؟

مجھے لگتا ہے...... آج کے دور میں محبت نایپد ہو چکی ہے، محبت کبھی ہوس کا روپ دھار لیتی ہے تو کبھی طلب کے پیراہن میں خود غرض بن جاتی ہے۔ کیا آج بھی وہ جذبے زندہ ہیں جو رواجوں کی زنجیر توڑ کر وفاؤں پر اصرار کرتے ہیں؟ محبت کا اظہار کرتے ہیں؟ محبت کے بھی تو کتنے روپ ہوتے ہیں، کہیں سچی محبت قربان ہو رہی ہوتی ہے تو کہیں محبت کی آڑ میں گھناؤنے کھیل کھیلے جا رہے ہوتے ہیں۔

O......O......O

حیدر آباد کے مضافات میں یوسف گوٹھ کا علاقہ ہے، وہاں کی رہائشی عرفانہ ملاح کی دوستی کراچی کے سرفراز سے انٹرنیٹ پر ہوئی، فیس بک سے شروع ہوئی یہ دوستی دن رات دونوں کی شدتوں میں اضافہ کر رہی تی۔ آن لائن چیٹنگ کرتے کرتے بالآخر دونوں نے اپنے نمبرز ایکسچینج کر لیے۔ اب انٹرنیٹ کے ساتھ ساتھ عرفانہ اور سرفراز کی موبائل پر بھی گفتگو ہونے لگی۔ اب سرفراز کا یہ اصرار دن بہ دن بڑھتا چلا جا رہا تھا کہ وہ عرفانہ کو حقیقت میں دیکھنا چاہتا ہے۔ ایک دوسرے کی تصویریں دیکھنا اور موبائل پر آواز سننا ان کی طلب بڑھا رہا تھا۔ بالآخر ایک دن سرفراز کا اصرار عرفانہ کو مجبور کر گیا اور وہ حیدر آباد، اپنا گھر بار چھوڑ کر چوری چھپے کراچی کے لیے روانہ ہو گئی۔

”یہ لڑکیاں اتنی بے وقوف کیوں ہوتی ہیں یا شاید مرد ہی شاطر ہوتا ہے جو انہیں اپنے جال میں آسانی سے پھنسا لیتا ہے یا پھر محبت اندھی ہوتی ہے جو اچھے اور برے کے فرق کو مٹا دیتی ہے۔“ میں نے دکھی دل سے سوچا مگر اگلے ہی لمحے میں بس ایک لکھاری بن گئی اور ہمیشہ کی طرح اپنے دکھ کا گلا گھونٹ دیا۔ اگر میں ایسا نہ کروں تو شاید میں لکھنا ہی بھول جاؤں۔

عرفانہ کینٹ اسٹیشن تو پہنچ گئی مگر وہاں سرفراز کو نہ پا کر پریشان ہو گئی اور بار بار سرفراز کا

موبائل نمبر ملاتی رہی، مسلسل آدھے گھنٹے کی تگ و دو کے بعد آخر اس کی بات سرفراز سے ہو ہی گئی۔ سرفراز نے کہا، وہ مزید آدھے گھنٹے اس کا پلیٹ فارم پر انتظار کرے، وہ پہنچ رہا ہے۔ عرفانہ اپنا سفری بیگ لیے ایک بینچ پر بیٹھی سرفراز کا انتظار کرنے لگی اور دوسری طرف سرفراز نے اپنے دوست نوید کا نمبر ملایا اور اس سے کہا کہ...... "ایک لڑکی میرے جال میں پھنس چکی ہے، تم اسے اسٹیشن سے کسی قریبی ہوٹل میں لے جاؤ اور وہاں روم بھی بک کروالینا، باقی میں سنبھال لوں گا۔"

نوید آدھے گھنٹے میں ہی اسٹیشن پہنچ چکا تھا، اس نے عرفانہ سے کہا کہ سرفراز نے اسے بھیجا ہے۔ وہ خود ایک گھنٹے تک پہنچے گا، اسی اثناء میں عرفانہ کے سیل پر سرفراز کی کال بھی آ گئی۔ عرفانہ سرگوشیوں کے انداز میں سرفراز سے باتیں کرتی کھڑی ہوگئی۔ وہ نوید کے ساتھ جانے کے لیے ذہنی طور پر تیار ہو چکی تھی۔ اسٹیشن کے قریب ہی ہوٹلوں میں سے ایک ہوٹل میں نوید نے عرفانہ کے لیے کمرہ بک کروالیا اور کچھ دیر آرام کا بہانہ کر کے وہ عرفانہ کے ساتھ کمرے میں آ گیا۔ اب عرفانہ اس کی مکمل دسترس میں تھی۔ نوید نے عرفانہ کے ساتھ زبردستی شروع کی اور پھر اپنی ہوس کا نشانہ بنالیا۔ اسی اثناء میں سرفراز بھی وہاں پہنچ گیا۔ عرفانہ کا رو رو کر برا حال تھا۔ وہ اپنی کشیدہ حالت سنبھالتی اپنے لٹنے کا قصہ سرفراز کو سنا رہی تھی کہ وہ پاگلوں کی طرح ہنسنے لگا۔

"ارے...... یہ محبت وحبت تو سب ڈرامہ ہے، میں تو تمہیں بے وقوف بنا رہا تھا۔" یہ سنتے ہی عرفانہ کے اوسان خطا ہو گئے اور پھر وہ سرفراز کی زیادتی کا بھی نشانہ بنی...... عرفانہ کی حالت اب پاگلوں جیسی ہو گئی تھی، وہ بے تحاشہ چیخ رہی تھی اور رو رہی تھی، فوراً ہی ہوٹل کا عملہ جمع ہو گیا...... نوید تو موقع پر ہی گرفتار ہو گیا جبکہ وہاں سے فرار ہونے والے سرفراز کو بھی تگ و دو کے بعد پکڑ لیا گیا۔ وہ دونوں اس وقت پولیس کی حراست میں ہیں جب کہ عرفانہ کو دارالامان بھیج دیا گیا ہے۔ وہ جو اپنی آنکھوں میں محبت کے سہانے خواب سجا کر کراچی پہنچی تھی، آج دارالامان میں اپنی قسمت کو کوس رہی ہے۔

کتنی عجیب بات ہے، کمرے کے ایک کونے میں رکھا یہ "ڈبہ" (کمپیوٹر) انسان کو اپنے

ماحول سے کاٹ کر پوری دنیا کے سامنے لا کھڑا کرتا ہے، انٹرنیٹ کے جہاں بے شمار فوائد ہیں، وہیں نقصانات بھی ہیں۔ محبت کے نام پر کھیلے جانے والے یہ کھیل کیسے زندگیاں برباد کر دیتے ہیں، آج یہ خبریں ہمارے اخبارات کا حصہ بن رہی ہیں مگر اس کے باوجود کوئی ان سے سبق حاصل نہیں کر رہا۔

آج ندامت وغم میں ڈوبی عرفانہ چپ کی سورت نظر آ رہی ہے۔ اس کے ماں باپ سب کچھ جانتے ہوئے بھی اس سے لاتعلق ہیں جبکہ دوسری طرف عزیز النساء بیگم نے صرف اپنے بیٹے کی دنیا ہی نہیں اجاڑی بلکہ اپنی عاقبت بھی خراب کر لی ہے۔

کتنی عجیب بات ہے ناں......! کہ انسان تو سارے انسان ہیں مگر وہ ایک جیسے نہیں ہوتے۔ ان کی سوچ، رویے اور محبت بھی جدا ہوتی ہے، محبت کے ایسے ایسے بھیانک روپ، چہرے اور انداز سامنے آ رہے ہیں کہ کبھی کبھی اس رشتے سے اعتبار اٹھتا محسوس ہوتا ہے۔ لیکن میں یہ بھی جانتی ہوں کہ محبت کا سیل گر رک جائے تو آدمی، آدمی سے بچھڑ جائے گا اور اسرار ہستی میں ایسا خلل آئے گا کہ حسنِ ازل کی کشش بھی کوئی دل مسخر نہ کر پائے گی، پس شرط یہ ہے کہ محبت سچی ہونی چاہیے، چاہے وہ کسی سے بھی ہو......!!

☆......☆......☆

تعارفِ مصنفہ

نام و ولدیت	:	ارم زہرا ولد مرزا احمد لطیف
تعلیم	:	ایم اے
تاریخ و جائے پیدائش	:	8 دسمبر، کراچی
تخلیقات	:	چاند میرا منتظر (ناول)
		میرے شہر کی کہانی (کہانیاں)
اصنافِ سخن	:	شاعری، ناول نگاری، کالم نگاری، افسانہ نگاری
اشاعت پذیر	:	ڈیلی اُردو نیوز (سعودی عرب) فکاہیہ کالم
		ماہنامہ میگزین ''کائنات'' (کولکتا، انڈیا)
		پھول میگزین (لاہور)
		ماہنامہ دوشیزہ ڈائجسٹ (کراچی)
		ماہنامہ سچی کہانیاں ڈائجسٹ
		روزنامہ قومی اخبار
		روزنامہ جرأت اخبار
		روزنامہ جہان پاکستان
سابقہ عہدے	:	ایڈیٹر : ماہنامہ کومل ڈائجسٹ
		انچارج : بزمِ خواتین، روزنامہ ریاست
ایوارڈز	:	کُل کراچی تقریری مقابلہ میڈل
		ہفت روزہ رنگِ صحافت، کالمسٹ ایوارڈ
		سچی کہانیاں ڈائجسٹ کراچی، بہترین کہانی ایوارڈ
		شریف اکیڈمی (جرمنی) ادبی خدمات کے سلسلے میں میڈل
		کومل ڈائجسٹ، بہترین کارکردگی پر شیلڈ

Mery Shahr Ki Kahani



erumzehra8@hotmail.com

ارم زہرا کی نظر معاشرے میں رونما ہونے والے اُن واقعات پر ہے جن پر توجہ نہ دی گئی تو وہ اس معاشرے کی تباہی کا باعث بھی بن سکتے ہیں اور کسی قوم وملت کے زوال کا سبب بھی۔ اُن کی کہانیوں میں نہ صرف سماجی و زندگی پر مبنی واقعات کا بیان ہے بلکہ اُن مسائل کا حل بھی پوشیدہ ہے جن کی وجہ سے یہ واقعات جنم لیتے ہیں۔ اس قسم کے فن اور عمیق نظری کا شمار ارم زہرا کی انفرادیت میں ہوتا ہے اور یہ انفرادیت ارم زہرا کو اُن کی ہم عصر خواتین سے منفرد و ممتاز کرتی ہے۔

میری دعائیں اُن کے ساتھ ہیں کہ اللہ رب العزت انھیں اور اُن کے قلم کی روانی کو حاسدین کے حسد اور شریروں کے شر سے محفوظ رکھے اور انھیں ہر قدم پر نت نئی کامیابیوں سے نوازے اور اُن کے اس تخلیقی سفر میں ہر قدم اُن کی مدد کرے۔ آمین

شاعر علی شاعرؔ

رنگِ ادب پبلی کیشنز، کراچی

0345-2610434